مکالماتِ افلاطون

مُکالماتِ افلاطون

مترجمہ

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پہلی بار ۱۹۴۲ء

دوسری بار مارچ ۱۹۸۲ء تعداد ۱۰۰۰ قیمت =/36

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

دیباچہ

دنیائے اُردو میں شاید ہی کسی فلسفی کا نام اتنا مشہور ہو جتنا افلاطون کا ہی۔ اس کے باوجود افلاطون کی تصانیف سے لوگ عموماً ناواقف ہیں۔ صرف ایک کتاب "ریاست" کا ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کیا ہی اور انجمن ترقیِ اُردو سے شائع ہوا ہی۔ دو ایک اور مکالمات کے ترجمے سلسلہ وار بعض رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ شاید اس کی نوبت نہیں آئی کہ وہ کتابی شکل میں چھاپے جائیں۔
اب سے پندرہ سولہ برس پہلے مولوی عبدالحق صاحب قبلہ نے مجھ سے افلاطون کے منتخب مکالمات کا ترجمہ کرنے کی فرمایش کی تھی مگر مَیں نے یہ عذر کیا کہ مَیں یونانی زبان برائے نام جانتا ہوں، کسی اور شخص کو تلاش کرنا چاہیے جو قدیم یونانی پر عبور رکھتا ہو اور اصل سے ترجمہ کر سکے۔ جب برسوں تک کوئی صاحب ایسے نہ مل سکے جو یونانی اور اُردو دونوں زبانیں اچھی طرح جانتے ہوں تو مَیں نے خود ہی کہہ کر مولوی صاحب سے ان آٹھ مکالمات کا ترجمہ کرنے کی اجازت لی یہ ترجمہ جوئیٹ[1] کے مشہور انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہی جو صحت کے لحاظ سے مُستند سمجھا جاتا ہی۔ ظاہر ہی کہ اِس میں وہ بات تو ہو نہیں سکتی جو براہِ راست یونانی سے ترجمہ کرنے میں ہوتی۔ پھر بھی جوئیٹ کے واسطے سے افلاطون کا مفہوم صحت اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کی گئی ہی۔
مکالمات کے انتخاب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہی کہ ان کا مطالعہ

---

[1] Jowett

صرف فلسفے کے شائقین کے لیے نہیں بلکہ عام ناظرین کے لیے دل چسپ ہو اس معیار پر وہی مکالمے پورے اُترتے ہیں جن میں افلاطون کے خیالات سقراط کی تعلیم اور اس کے طریق بحث کے مطابق یا اس سے قریب تر ہیں۔ اگرچہ سقراطی طریقہ پہلی نظر میں سوال جواب کا ایک گورکھ دھندا سا معلوم ہوتا ہے اور جس طرح قدم قدم پر رک کر بال کی کھال نکالی جاتی ہے اس سے طبیعت کو اُلجھن ہونے لگتی ہے۔ لیکن ذرا صبر کے ساتھ جی لگا کر مطالعہ کیا جائے تو یہی موشگافیاں مضمون میں جان ڈال دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ طنز اور ظرافت کی چاشنی، خیالات اور طبائع کے تصادم اور مناظرے کے اتار چڑھاؤ سے خشک علمی بحث میں ڈرامے کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض عام ادبی ذوق رکھنے والوں کو فلسفے کے مسائل اور مباحث سے مانوس کرنے کے لیے افلاطون کے یہ مکالمات جن میں منطق اور فلسفے کے نکتے تسبیح کے دانوں کی طرح ادب کے رشتے میں پروئے ہوئے ہیں خاص طور پر موزوں ہیں۔ اب رہے وہ حضرات جو افلاطون کے نظامِ فکر کا مکمل مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، انھیں بھی "ریاست" "تھیاٹیٹس" "قوانین" اور دوسرے طویل اور ادق مکالمات کے مطالعے میں اس مجموعے کے پڑھنے سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

سید عابد حسین

جامعہ نگر دہلی　　جنوری ۱۹۵۸ء

مقدّمہ

پس منظر

افلاطون اور سقراط کی شخصیت اور ان کی تعلیم کی صحیح قدر و قیمت سمجھنے کے لیے اس عہد کے یونان پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

پانچویں صدی قبلِ مسیح میں یونان کا ملک بہت سی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم تھا۔ ان میں سے تین ریاستیں کارنتھ، اسپارٹا اور ایتھنس خاص امتیاز رکھتی تھیں۔ کارنتھ تجارت میں مشہور تھی۔ اسپارٹا فوجی نظام، فوجی تعلیم، ضبط اور جفاکشی میں۔ ایتھنس کی ریاست جس کا رقبہ سات سو مربع میل اور آبادی ساڑھے تین لاکھ نفوس سے زیادہ نہ تھی، دنیا کی یا کم سے کم یورپ کی تاریخ میں پہلی جمہوری ریاست تھی وہ ایک سلطنت کی مالک تھی اور اس کی تجارت تمام بحرِ روم میں پھیلی ہوئی تھی۔ مادّی جاہ و حشمت کے علاوہ علم و حکمت، شعر و ادب اور آرٹ میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ ۴۳۱ق م میں جب سقراط چالیس برس کا تھا اور افلاطون پیدا ہوا تھا اسپارٹا، کارنتھ، تھیبس اور دوسری ریاستوں نے مل کر ایتھنس کے خلاف پیلو پونیشی جنگ شروع کی جس کا خاتمہ ۴۰۴ق م میں ایتھنس کی شکست پر ہوا۔ بیرونی مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل گئے اور وہ ایک چھوٹی سی ریاست رہ گئی۔ اس جنگ کے دوران میں (۴۱۱ق م سے ۴۰۳ق م تک)، ایتھنس کی ریاست نے کئی بار پلٹا کھایا اور اس کا دستور کئی بار بدلا گیا۔ یہاں پہلے ایک معتدل چند سری[۱] حکومت تھی

۱۔ Oligarchy

پھر ایک محدود جمہوریت قائم ہوئی جس سے بہتر حکومت ارسطو کے نزدیک ایتھنس کو کبھی نصیب نہیں ہوئی آگے چل کر یہ غیر محدود جمہوریت بن گئی۔ جنگ کے خاتمہ پر تیس عمائد کی حکومت کا دور دورہ ہوا جس نے آٹھ مہینے کے اندر جبر و تشدد کی انتہا کر دی۔ آخرکار پھر جمہوریت واپس آئی اور اس کا سلسلہ اسی برس تک چلتا رہا۔

یہ الٹ پھیر اور افراتفری صرف سیاست ہی میں نہ تھی بلکہ ذہنی انتشار بھی اس حد تک پیدا ہو گیا تھا۔ مذہب اور اخلاق کے خلاف مروجہ اصولوں پر تنقید شروع ہو گئی تھی۔ ایک طرف تو کائنات کی حقیقت اور نشو و نما کے بارے میں مذہبی توجیہات کی جگہ علمی توجیہات سے کام لیا جاتا تھا اور دوسری طرف اخلاقی مسلّمات کو رد کر کے نئے اصولِ اخلاق قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ طبیعی مسائل کے محقق تو سنجیدہ فلسفی تھے جو گہرے غور و فکر اور علمی استدلال سے کام لیتے تھے مگر اخلاقی اور عمرانی مسائل پر بحث کرنے والا "نئی روشنی" کا عَلَم بردار سوفسطائیوں کا طبقہ تھا۔ جمہوریت نے عوام میں خصوصاً نوجوانوں میں یہ شوق پیدا کر دیا تھا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں تاکہ حکومت اور سیاست کے مسائل کو سمجھ سکیں اور عمومی زندگی میں کام یاب ہو سکیں۔ اس وقت تک اعلیٰ تعلیم کے لیے کوئی دارالعلوم یا یونیورسٹی موجود نہیں تھی۔ نئی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک نئی جماعت پیدا ہو گئی جو سوفسطائی کہلاتی تھی۔ سوفسطائی ایتھنس اور دوسری ریاستوں میں دورہ کر کے لکچر دیا کرتے تھے اور سننے والوں سے فیس لیتے تھے۔ ان میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ بعض قابل، معقول اور مخلص تھے۔ بعض نالائق، برخود غلط اور خود غرض تھے۔ مگر ایک چیز سب میں مشترک تھی اور وہ یہ تھی کہ ان کا علم اور تعلیم کا تصور بالکل سطحی تھا۔ وہ پرانے خیالات پر تنقید کرتے لیکن نئے خیالات کو بغیر تحقیق اور تنقید کے مانتے تھے اور منوانا چاہتے تھے۔ تعلیم کا نصب العین

ان کے نزدیک یہ تھا کہ نوجوانوں کے ذہن میں تیزی اور زبان میں طراری پیدا ہو جائے تاکہ وہ عوام پر اثر ڈال سکیں اور ان کی قیادت حاصل کر سکیں۔ اصل میں وہ نوجوانوں کو خطابت کا فن سکھاتے تھے اور اس کے سلسلے میں ہر قسم کے سیاسی اور عمرانی مسائل پر مناظرہ کرتے تھے جس کا مقصد امر حق کا معلوم کرنا نہیں بلکہ مخالف کو قائل کرنا ہوتا تھا۔

افلاطون اس ماحول میں افلاطون نے جو ۴۲۷ ق م میں پیدا ہوا تھا، نشو و نما پائی۔ اس کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے قدیم شاہانِ ایتھنس سے اور ماں کی طرف سے مشہور واضع قوانین حکیم سولن سے ملتا تھا۔ اس کا چچا چارمس اُن تیس عمائد میں سے تھا جنھوں نے پیلوپونیشی جنگ کے خاتمے کے بعد چند مہینے ایتھنس پر حکومت کی تھی۔ جمہوری ریاست کے قائم ہونے کے بعد اس قدیم عمائدی خاندان کی کوئی خاص قدر نہیں رہی بلکہ لوگ اُسے جمہوریت کا مخالف سمجھ کر شبہہ کی نظروں سے دیکھتے تھے

افلاطون کو ابتدا سے ادب اور حکمت سے ذوق تھا۔ پہلے وہ کریٹیلس کا شاگرد تھا جو ہراکلیٹس کے فلسفۂ تغیر کا معتقد تھا۔ اس لیے افلاطون کے ذہن پر پہلا نقش اسی فلسفے کا بیٹھا اس کے بعد غالباً ابن الوقت سوفسطائیوں کی تعلیم نے اُسے اپنی طرف کھینچا ہوگا۔ اس لیے کہ جو جلی کٹی افلاطون نے اپنے مکالمات میں سوفسطائیوں کو سنائی ہے اس سے ایک خاص قسم کا غصہ جھلکتا ہے جو دھوکے کا طلسم ٹوٹنے کے بعد دھوکا کھانے والے کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس طلسم کو توڑنے والا ایک آزاد منش درویش صفت بوڑھا سقراط نامی تھا۔ اس بوڑھے کو بہت سے لوگ سنکی سمجھتے تھے اس لیے کہ وہ عام روش کے خلاف اخلاقی اور عمرانی مسائل کو خطابت کے بجائے علمی استدلال سے حل کرنا چاہتا تھا اور

زمانہ سازی کے مذہب کے بجائے حق جوئی اور حق پرستی کے مذہب کی تبلیغ کرتا تھا۔ سقراط کی زندگی میں افلاطون اس سے متاثر تو ہوا لیکن محض ذہنی طور پر۔ قلبی اور روحانی اثر جو خون بن کر افلاطون کے رگ وپے میں دوڑنے لگا اس وقت پڑا جب سقراط نے حق کی راہ میں اپنی جان قربان کر دی۔

جب سقراط نے زہر کا پیالہ پیا ہے اُن دنوں افلاطون بیمار تھا۔ استاد کی موت کے بعد اُس سے ایتھنس میں نہ ٹھیرا گیا وہ میگارا چلا گیا اور اس کے بعد کئی سال تک اٹلی، سائرین، سسلی اور مصر میں پھرتا رہا۔ سفر سے واپس آکر اُس نے ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی جو اکیڈمی کہلاتی تھی۔ کوئی چالیس برس افلاطون اس اکیڈمی میں فلسفے اور ریاضی کا درس دیتا رہا۔

ساٹھ برس کی عمر میں افلاطون کو اس کا موقع ملا کہ فلسفی حکمراں کی تعلیم کے متعلق جن خیالات کا اظہار اس نے اپنی "ریاست" میں کیا تھا ان کو سیراکیوز کے حکمراں ڈایونیسس کی تعلیم میں آزما کر دیکھے۔ یہ تیس برس کا نوجوان ابھی ابھی تخت پر بیٹھا تھا اس کے برادر نسبتی نے افلاطون کو دعوت دی کہ سسلی آکر نوعمر فرماں روا کی اتالیقی کے فرائض انجام دے۔ افلاطون نے اس دعوت کو خوشی سے منظور کر لیا اس لیے کہ اس زمانے میں سسلی پر کارتھج کے حملے کا اندیشہ تھا اور یونان کا اقتدار خطرے میں تھا۔ افلاطون کو یہ اُمید تھی اگر ڈایونیسس کو اس نے اپنے نظریات کے مطابق تعلیم دی تو وہ ایک کامیاب حکمراں ثابت ہوگا اور اہلِ کارتھج کی پیش قدمی کو بھی روک سکے گا لیکن تھوڑے ہی دن میں ڈایونیسس اُس دماغ سوزی سے تنگ آگیا جو اُسے تحصیلِ علم میں کرنی پڑتی تھی اور افلاطون کو سسلی سے رخصت ہونا پڑا۔ دوسرے سال وہ پھر گیا مگر اس مرتبہ بھی ناکام واپس آیا۔

اب افلاطون نے پھر اکیڈمی میں درس دینا شروع کیا اور اپنی زندگی کے بقیہ بیس سال اسی شغل میں گزار دیے۔ ۳۵۱ق م میں اکیاسی برس کی عمر میں وہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔

افلاطون کا فلسفہ جو آگے چل کر ایک بحرِ ذخّار بن گیا" ابتدا میں ایک چھوٹا سا دریا تھا جس کا سرچشمہ سقراط کی ذات تھی۔ اس فلسفے کو سمجھنے کے لیے سقراط کی سیرت اور اس کے خیالات سے واقف ہونا نہایت ضروری ہی۔

سقراط

سقراط کی زندگی کے بڑے حصے کے متعلق ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں۔ صرف اس کے بڑھاپے کے حالات ہم تک تین راویوں کے ذریعے پہنچے ہیں۔ ان میں سے ایک اسی زمانے کا مشہور ڈراما نگار، ارسٹوفنیس ہی جس نے اپنی کامیڈی "بادل" میں سقراط کا خاکہ اڑایا ہی۔ دوسرا سقراط کا مایۂ ناز شاگرد افلاطون ہی جس نے" اپنے "مکالماتِ سقراط" میں اپنے استاد کی سیرت اور اس کی تعلیمات کو اپنے خاص رنگ میں پیش کیا ہی، تیسرا ایتھنس کا ایک سپاہی منش رئیس زادہ زینوفن جو سقراط کے معتقدوں میں سے تھا اور جس نے اپنے "مذاکرات" میں سقراط کی زندگی کے حالات اور اس کے افکار و خیالات کو جہاں تک وہ انھیں سمجھ سکتا تھا سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیا ہی۔ ان میں سے ارسٹوفنیس نے تو قصداً سقراط کے اصلی خد و خال کو مسخ کر کے دکھایا ہی۔ افلاطون جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بعض مکالمات میں سقراط کی اصلی تصویر تخیل اور عقیدت کی رنگ آمیزی کے ساتھ کھینچتا ہی اور بعض میں سقراط کے پردے میں خود اپنے خیالات پیش کرتا ہی جو اس کے نزدیک استاد کی تعلیم کی اصلی روح کو ظاہر کرتے ہیں۔ اب رہا زینوفن تو اس کا بیان واقعات کی صحت کے

لحاظ سے زیادہ قابلِ وثوق ہے لیکن وہ سقراط کی شخصیت اور اس کی تعلیم کے محض سطحی پہلو کو دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا راوی بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ اصلیت دوسرے اور تیسرے کی روایات کو جمع کر کے درایت کی کسوٹی پر کسنے سے ہاتھ آتی ہے۔

۳۹۹ ق م میں سقراط کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہو چکی تھی۔ اس نے شادی تھوڑے دن پہلے کی تھی اور اس کے بیٹے کی عمر تین چار برس کی تھی۔ دو بچے اس کے بعد اور ہوئے اس کی بیوی زان تھیپ امیر خاندان کی تھی وہ ایک تیز مزاج عورت تھی اور ایتھنس کی عام عورتوں کی طرح زیورِ علم سے عاری تھی اس وجہ سے سقراط کی گھریلو زندگی کچھ خوش گوار نہ تھی۔ اس کی ذاتی املاک سے کچھ تھوڑی سی آمدنی تھی اور یہ اس جیسے قناعت پسند سادہ مزاج آدمی کے لیے کافی تھی۔ اس لیے اُسے اپنا سارا وقت اپنے محبوب مشاغل میں صرف کرنے کا موقع ملتا تھا۔ یہ مشاغل دو تھے۔ تحقیق اور تعلیم۔ تحقیق کے نام سے ہمارے ذہن میں کتب خانے کی الماریوں اور تعلیم کے نام سے مدرسے کے کمروں کا خیال آجاتا ہے۔ لیکن سقراط ان دونوں سے بے نیاز تھا وہ اپنے زمانے کے علوم سے بہ خوبی واقف تھا لیکن کتابیں پڑھنے سے اسے کوئی خاص شغف نہیں تھا اور لکھنے کے جھگڑے میں تو وہ کبھی پڑا ہی نہیں۔ اسی طرح تعلیم بھی وہ باضابطہ مسندِ درس پر بیٹھ کر نہیں دیتا تھا۔ اس کے کتب خانے، اس کے مدرسے، ایتھنس کے بازار، ورزش خانے اور تفریح گاہیں تھیں جہاں لوگ خصوصاً نوجوان کثرت سے جمع ہوتے تھے۔ اس کی کتابیں، ان کی زندگیاں تھیں جن کا وہ گہری نظر سے مطالعہ کرتا تھا اور اس کی بیاضیں ان کے دل تھے جن پر وہ اپنے نتائجِ فکر تحریر کرتا تھا۔ وہ سوفسطائیوں کا مدِ مقابل اور

حریف تھا۔ سوفسطائی جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں پیشہ ور معلم تھے۔ ان میں اور سقراط میں یہ بات مشترک تھی کہ دونوں اخلاق و معاشرت و تمدن اور سیاست کے مسائل کی تعلیم دیتے تھے لیکن سقراط کی تعلیم کا طریقہ اور تھا، مقصد اور تھا، روح اور تھی۔ وہ نہ اپنی خدمت کا معاوضہ لیتا تھا نہ مسندِ درس پر بیٹھتا تھا اور نہ اپنے خیالات باقاعدہ خطابت کے ذریعے سے ظاہر کرتا تھا۔ وہ تو محض اپنے شوق سے بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ اس جوہر کو کام میں لانے کے لیے جو فطرت نے اسے ودیعت کیا تھا چلتے چلاتے، اٹھتے بیٹھتے، موقع پاکر یا موقع پیدا کرکے کسی مسئلے پر بحث چھیڑ دیتا تھا۔ سوال و جواب کے ذریعے دلوں کو ٹٹولتا تھا کہ ان میں علمِ حق کتنا ہے اور زعمِ باطل کتنا ہے، سچائی کی لگن کتنی ہے اور بات کی پچ کتنی ہے۔ وہ ان پر مسلسل جرح کرتا تھا یہاں تک کہ ان میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہم زندگی کے مسائل کا محض سرسری اور سطحی علم رکھتے ہیں جو بات کی تہ تک نہیں پہنچتا۔ علم نام ہے جزئیات سے کلیات تک، اتفاقی مظاہر سے ابدی حقائق تک پہنچنے کا اور اس کے لیے سنی سنائی باتوں کو چھوڑ کر ذاتی تحقیق، غور و فکر کدّ و کاوش کی ضرورت ہے۔ اسی طریقے سے سچا علم حاصل ہو سکتا ہے اور اسی سچے علم پر اچھی عملی اور اخلاقی زندگی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ دراصل سقراط مروّجہ معنیٰ میں تعلیم نہیں دیتا تھا بلکہ لوگوں میں یہ مادّہ پیدا کرتا تھا کہ اس علم کو جو ان کے اندر موجود ہے غور و فکر کے ذریعے سے باہر نکالیں یعنی اپنے دھندلے خیالات میں وضاحت پیدا کریں۔ اس کی تعلیم بس اتنی ہی تھی کہ علم کی سچی طلب اور تحقیق کی سچی روح پیدا کرو۔ اس کے بغیر نظری مسائل کی طرح علمی اور اخلاقی مسائل بھی حل نہیں ہو سکتے۔ دو اقوال میں جو یقینی طور پر سقراط کی طرف منسوب کیے جا سکتے ہیں اس کی ساری حکمت کا نچوڑ ہے " اپنے

آپ کو پہچان" "نیکی علم کا نام ہے۔"

دنیا کی ذہنی تاریخ میں سقراط کی اہمیت اس لحاظ سے کچھ کم نہیں کہ اس نے سب سے پہلے صحیح علمی طریقِ فکر کو دریافت کیا اور اسے اجتماعی اور تمدنی مسائل کے حل کرنے میں استعمال کیا۔ لیکن اُس کی حقیقی عظمت اُس کی بے مثل اخلاقی سیرت پر مبنی ہے۔ اس کی شخصیت کا جو زبردست اثر اس کے ہم عصروں پر پڑتا تھا اس کا اندازہ بزمِ طرب میں الکبیاڈیس کی تقریر سے ہوتا ہے وہ کہتا ہے "میں نے پیریکلیس اور دوسرے زبردست خطیبوں کو سنا ہے لیکن وہ کبھی میری روح کی گہرائیوں میں وہ تلاطم پیدا نہیں کر سکے جو سقراط پیدا کر دیتا ہے۔ اُس نے تو اکثر میری یہ حالت کر دی کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اپنی موجودہ زندگی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا اور میں جانتا ہوں کہ اگر میں اس کی باتوں کی طرف سے کان نہ بند کروں ..... تو میرا بھی وہی انجام ہوگا جو اوروں کا ہوا۔" اس تقریر میں الکبیاڈیس نے سقراط کی فرض شناسی، جفاکشی، استقلال اور بہادری کی حیرت انگیز مثالیں بیان کی ہیں۔ سقراط کی اخلاقی جرأت کا اندازہ ایک اس بات سے ہوتا ہے کہ اس نے ایتھنس کی اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے سارے شہر کے قہر و غضب کا تن تنہا مقابلہ کیا اور ایک ناجائز تجویز پر رائے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس حق پرستانہ اور مجاہدانہ زندگی کی معراج سقراط کا واقعۂ شہادت ہے۔ ۳۹۹ ق م میں اہلِ ایتھنس کی ایک جوری کے سامنے جو غالباً ۵۰۰ آدمیوں پر مشتمل تھی تین اشخاص نے جن میں ایک خطیب لائکن ایک معمولی شاعر ملیٹس اور ایک زبردست اور با اثر لیڈر انائیٹس تھا، سقراط پر دو الزام لگائے۔ ایک یہ کہ وہ ایتھنس کے قومی دیوتاؤں کا قائل نہیں بلکہ نئے دیوتاؤں کو مانتا ہے اور دوسرے یہ کہ

وہ نوجوانوں کے اخلاق کو بگاڑتا ہے۔ الزاموں کو سمجھنے کے لیے اس زمانے کے مخصوص حالات کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ اس دورِ تغیّر میں نوجوانوں کے اندر مروجہ مذہب اور اخلاق سے بے اطمینانی اور زندگی کے ایک نئے نصب العین کی تلاش کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا جسے ایک طرف سوفسطائی اور دوسری طرف سقراط اپنے اپنے رنگ میں اور تیز کر رہے تھے۔ سوفسطائیوں سے بھی عام لوگ بہت ناراض تھے لیکن یہ حضرات زمانہ سازی میں ماہر تھے جہاں نوجوانوں کو "ترقی پسندی" سے پرچاتے تھے وہاں ان کے بزرگوں کو موجودہ سیاسی نظام کی حمایت اور ایتھنس کے قوانین کی جا بیجا تعریف سے خوش کرتے تھے۔ سقراط یوں تو اپنے زمانے کی مذہبی رسوم اور شہری قوانین کا دل سے پابند تھا لیکن وہ زندگی کے اور شعبوں کی طرح مذہب اور سیاست میں بھی مروجہ خیالات اور تعصبات کو اندھا دھند تسلیم نہیں کرتا تھا بلکہ ان کو تحقیق کی کسوٹی پر کس کر کھوٹا کھرا الگ کرنا چاہتا تھا۔ یہ وہ قصور ہے جسے عام لوگ کسی زمانے میں بھی معاف نہیں کرتے۔ سقراط نے اپنے صفائی کے بیان میں اپنی پابندیِ مذہب اور پابندیِ قانون پر تو زور دیا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ "اندرونی آواز" کا بھی ذکر کر دیا ہے جو اسے بعض کاموں کے کرنے سے روکا کرتی تھی۔ رائے عامہ کے مقابلے میں ضمیر کی آواز پر کان دھرنا، یہ جرم بھی کچھ کم سنگین نہ تھا۔ لیکن عوام سے قطع نظر کرکے اناٹیلس جیسے معقول اور ذمے دار اشخاص کے نزدیک زیادہ خطرناک سقراط کا وہ فعل تھا جس کا دوسرے الزام میں ذکر کیا گیا ہے یعنی "نوجوانوں کے اخلاق کو بگاڑنا۔" اس سے مراد ہے اس بے اطمینانی کو جو نئی نسل کو موجودہ مذہبی تمدنی اور سیاسی نظام سے پیدا ہو گئی تھی اپنی تنقید پسندی اور حق جوئی سے اور شہ دینا۔ ہم اوپر کہہ

چکے ہیں کہ ۴۰۴ ق۔م میں ایتھنس کو پیلو پونیشی جنگ میں زبردست شکست ہوئی تھی اور دوسری جمہوری ریاست جو اس کے بعد قائم ہوئی تھی ابھی تک اپنے قدم مضبوطی سے نہیں جما سکی تھی۔ ایسی حالت میں سقراط کی ذہنی انقلاب کی تحریک آسانی سے سیاسی انقلاب کی شکل اختیار کر سکتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ الکیباڈیس، چارمڈیس اور کریٹیاس جو جمہوریت کے دشمن سمجھے جاتے تھے سقراط کے خاص دوست اور ہر وقت اس کی صحبت میں بیٹھنے والے تھے اسی وجہ سے انائیٹس اور دوسرے جمہوریت پسند لیڈر سقراط سے بدظن ہو گئے تھے ایسی فضا میں مشکل تھا کہ پان سو آدمیوں کی ایک جوری جس کے بہت سے افراد سقراط کی جرح کا زخم کھائے ہوئے تھے، اس کے مقدمے کے فیصلے میں انصاف اور حق پسندی کے اعلیٰ اصولوں کو پیش نظر رکھتی۔ چنانچہ فیصلہ سقراط کے خلاف ہوا اور تعجب یہ کہ صرف ساٹھ کی اکثریت سے ہوا۔

اس کے بعد ایتھنس کے دستور کے مطابق سقراط کو موقع دیا گیا کہ جوری کی تجویز کی ہوئی سزائے موت کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی اور سزا تجویز کرے۔ اس دستور کا مقصد دراصل یہ تھا کہ مجرم اپنے جرم کو مان کر تخفیفِ سزا کے لیے معقول عذر پیش کرے یا بغیر کسی عذر کے رحم کی درخواست کرے۔ اگر سقراط یہ کہتا کہ موت کے بجائے اُسے جلاوطنی کی سزا دی جائے تو جوری اسے یقیناً منظور کر لیتی مگر اس کی دیدہ دلیری دیکھیے کہ تخفیفِ سزا کی درخواست کے بجائے یہ مطالبہ کیا کہ میں نے اہلِ ایتھنس کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کے صلے میں وہ مجھے اپنا معزز مہمان بنا کر ایوان بلدیہ میں رکھیں۔ ظاہر ہے کہ اس پر لوگ اور بھی برہم ہوئے ہوں گے۔ پھر بھی پان سو میں سے کوئی دو سو آدمیوں نے سزائے موت کی مخالفت کی یعنی یہ سزا صرف ۱۰۰ کی اکثریت سے

منظور ہوئی ۔

سقراط نے جس بے پروائی سے سزا کا حکم سنا اور پھر چند روز کے بعد جس سکون و اطمینان سے موت کا سامنا کیا وہ اس کی حقیقی عظمت کی دلیل ہے۔ اس کا دولت مند اور با اثر شاگرد کریٹو چاہتا تھا کہ جیل خانے کے محافظوں کو رشوت دے کر سقراط کو قید سے نکال لے جائے اور کسی دوسری ریاست میں پہنچا دے مگر سقراط نے اپنے خاص انداز میں بحث کر کے قائل کر دیا کہ اگر وہ قانون کو توڑ کر اپنی جان بچا لے تو اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرنے کی کوشش جو وہ عمر بھر کرتا رہا ہے ناکام رہے گی اور اس کی زندگی اکارت جائے گی۔ آخر کار راہِ حق کا یہ جاں باز سالک زہر کا پیالہ پی کر ہنستا بولتا دنیا سے رخصت ہو گیا ۔

سقراط اور افلاطون

سقراط کی زندگی اکارت نہیں گئی اس کی تعلیم اور اس کی مثال نے کم سے کم اس کے شاگردوں کی ایک چھوٹی سی جماعت میں علمی تحقیق اور عملی اصلاح کا سچا جذبہ پیدا کر دیا اور ان میں سے ایک شخص افلاطون نے اپنے استاد کے حکیمانہ اشارات کی بنا پر فلسفے کا ایک عظیم بالشان نظام مرتب کر دیا جس کا فیض یونانی، رومی تہذیب کو صدیوں تک پہنچتا رہا اور مغرب کو بلا واسطہ، مشرق کو بالواسطہ یعنی اشراقی حکمت اور تصوف کے ذریعے سے آج تک پہنچ رہا ہے ۔

افلاطون اور اس کے افکار و تصورات پر سقراط کی زندگی اور زندگی سے زیادہ اس کی موت کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ ابتدا میں جب اس نے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو غالباً اس کا مقصد محض اتنا ہی تھا کہ اپنے استاد کی سیرت کی تصویر اور اس کے خیالات کی تفسیر پیش کر کے دنیا پر اس کی صداقت اور عظمت ثابت کر دے۔ اس کی ابتدائی تصانیف میں سقراط کی زندگی کا

نقشہ اور اس کے خیالات کا چربا بہت کامیابی سے اتارا گیا ہے۔ اس کے بعد کے مکالمات میں افلاطون نے سقراط کی تعلیم کے ساتھ نظریۂ اعیان کا جو خود اس کی فکر کا نتیجہ ہے، پیوند لگا دیا ہے۔ آگے چل کر "ریاست" "قوانین" وغیرہ میں تو سقراط کا نام ہی نام رہ جاتا ہے ورنہ دراصل خود افلاطون اپنے مابعد الطبیعی اور سیاسی نظریات کو پیش کرتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اس نے شعوری طور پر یہ کوشش نہیں کی ہے کہ اپنے خیالات سقراط کے سر منڈھے بلکہ اس کے نزدیک اس کا سارا فلسفہ سقراط ہی کے بنیادی تصورات کی توسیع اور تکمیل ہے۔ اپنی تصنیفات کے لیے مکالمے کی طرز کو منتخب کرنے میں افلاطون کے پیشِ نظر اور مصلحتوں کے علاوہ غالباً یہ مصلحت بھی تھی کہ سقراط تلقین اور تبلیغ کا کام خطبات اور مواعظ کے ذریعے سے نہیں بلکہ سوال و جواب کے ذریعے سے کرتا تھا اور اس کے خیالات کی تفسیر کے لیے مکالمے سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

مکالمات

جن آٹھ مکالمات کا ترجمہ اس کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے ان میں سے پہلے پانچ مکالمے سقراط کی زندگی اور اس کی تعلیم کا ایک مکمل خاکہ پیش کرتے ہیں۔ "صفائی کا بیان" اور "کریٹو" اس معلومات کے بڑے حصے کے ماخذ ہیں جو ہمیں سقراط کی سیرت اور سوانح حیات کے متعلق حاصل ہے۔ "لائیسس" "یوتھائفرو" اور "پروٹاگورس" سقراط کے مخصوص طرزِ بحث کے عمدہ نمونے ہیں اور ان فلسفیانہ افکار پر روشنی ڈالتے ہیں جو افلاطون نے براہِ راست سقراط سے اخذ کیے۔ باقی تینوں مکالموں "فیڈو" "فیڈرس" "بزمِ طرب" میں افلاطون نے ان نتائج کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کے نزدیک سقراط کے مقدمات سے نکلتے ہیں۔ زیادہ مفصل اور مدلل طور پر

ان نتائج کی بحث طویل مکالمات "ریاست" "قوانین" وغیرہ میں ہے جن کا پڑھنا افلاطون کے باضابطہ مطالعے کے لیے ناگزیر ہے لیکن عام ناظرین کو ان آٹھ مکالمات کے ذریعے سے افلاطون کے فلسفے سے اچھی خاصی واقفیت ہو سکتی ہے۔ فلسفیانہ مطالب کے علاوہ ادبی خوبیوں کے لحاظ سے بھی یہ یونانی ذہن کا شاہ کار کہے جا سکتے ہیں۔ زبان کا لطف تو ظاہر ہے صرف انھی لوگوں کو آ سکتا ہے جو ان مکالموں کو اصل یونانی میں پڑھیں لیکن معنوی محاسن کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ ترجمے سے بھی ہو سکتا ہے۔ پیچیدہ مسائل کو باتوں باتوں میں سلجھانا، تصورات اور معانی کے باریک فرقوں کو صحت اور وضاحت سے ادا کرنا اور مناسب مثالوں سے سمجھانا، شوخی، طنز اور ظرافت کی چاشنی سے پڑھنے والوں کی دل چسپی کو قائم رکھنا، چند لفظوں میں مقامات اور مواقع، واقعات اور حالات کا نقشہ کھینچ دینا، چند اشاروں میں اشخاص کی جیتی جاگتی تصویر دکھا دینا، بحث اور استدلال کے اتار چڑھاؤ، خیالات کے تصادم، کرداروں کے ٹکراؤ سے فلسفیانہ مکالمے میں ڈرامے کا اثر پیدا کرنا افلاطون کے قلم کی وہ خصوصیات ہیں جن کی بدولت اس کی کل تصانیف خصوصاً زیرِ نظر مکالمے بلند اور پاکیزہ ادب کے بے مثل نمونے بن گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تمثیلی قصوں میں افلاطون کا پُرزور تخیل شاعرانہ جوش کی حد سے گزر کر عارفانہ اور ملہمانہ جذب کی شان دکھانے لگتا ہے۔

ان مکالموں کی عام خوبیوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم انھیں ایک ایک کر کے دیکھیں گے۔ "صفائی کا بیان" اور "کریٹو" ان دونوں کا ذکر سقراط کی سیرت کے سلسلے میں آ چکا ہے۔ اب نہایت اختصار کے ساتھ باقی چھ کا خلاصہ پیش کر کے ہم ان میں افلاطون کے خیالات کا ارتقا ان سادہ افکار سے شروع کر کے جو اس نے سقراط سے ورثے میں پائے تھے اس منزل تک دکھائیں گے

جہاں سے اس نے اپنے جداگانہ نظام فلسفہ کی تعمیر شروع کر دی۔

لائیسس کا منظر ایتھنس کی ایک ورزش گاہ ہے جہاں شہر کے نوجوان کسرت اور تفریح کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ سقراط بھی ادھر آنکلتا ہے۔ ہپوتھالیس اُسے اندر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ سقراط تو ایسے موقعوں کی تلاش ہی میں رہتا تھا فوراً دعوت منظور کر لیتا ہے تاکہ نوجوانوں سے بات چیت کرنے کا موقع ملے۔ یہاں پنج کردہ ایک حسین اور بھولے بھالے نوجوان لائیسس سے جس سے ہپوتھالیس محبت کرتا ہے گفتگو چھیڑ دیتا ہے اور اسے یہ سمجھاتا ہے کہ انسان کی قدر علم اور نیکی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دراصل سقراط کا مقصد ہپوتھالیس کے سامنے اس کا نمونہ پیش کرنا ہے کہ دوست کو دوست سے خوشامد کی نہیں بلکہ نصیحت کی گفتگو کرنی چاہیے۔ دانش مندی کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے دوست کو اس کے نقائص سے آگاہ کر کے اس کے دل میں عجز و انکسار پیدا کرے یہ نہیں کہ اس کی ہر بات کی جھوٹی سچی تعریف کر کے اُسے مغرور بنا دے اور پھر بیٹھا ہوا سوچا کرے:۔

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ
جس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

اتنے میں ایک اور نوجوان مینکسینس آجاتا ہے۔ لائیسس کی فرمائش ہے کہ سقراط اس کو بھی یہی نصیحت کرے۔ مینکسینس ضدی اور خود پسند آدمی ہے اس لیے سقراط کو اس کے مقابلے میں اپنا جرح اور طنز کا حربہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ سوال چھیڑ کر کہ دوست کسے کہتے ہیں اور دوستی کی ماہیت کیا ہے اسے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ دوستی کے بارے میں جو عام تصورات ہیں مثلاً اس کی بنا باہمی مشابہت یا غیر مشابہت، اتحادِ مذاق یا اختلافِ مذاق پر ہے انھیں ایک ایک

کرکے منطق کی کسوٹی پر کستا اور کس کر رد کر دیتا ہے۔ آخر میں مینکسینس کو بہ خوبی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ دوستی کی حقیقت سے بالکل ناواقف ہے اور اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے اس کے کلّی تصور کا تعین یا تعریف ضروری ہے۔ بظاہر مکالمے کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا یعنی دوستی کی کوئی تعریف متعین نہیں ہوتی اور یہ سقراط کا مقصد بھی نہیں تھا پھر بھی ہمارے ذہن کی فضا میں یہ خیال منڈلانے لگتا ہے کہ دوستی نیکی کی بنا پر ہوتی ہے اور نیک آدمی کو ہر شخص اس کی نیکی کی وجہ سے دوست رکھتا ہے۔

یوتھائفرو میں اس مسئلے کی بحث ہے کہ دین داری کیا چیز ہے؟ سقراط کی ملاقات ایک پجاری یوتھائفرو سے ہوتی ہے جس نے اپنی دین داری کے زعم میں اپنے باپ پر ایک غلام کے قتل کا مقدمہ چلایا ہے۔ سقراط اپنے خاص انداز میں اس سے کہتا ہے کہ حقیقت کا محرم تم سے بڑھ کر کون ہوگا۔ ذرا مجھے سمجھا دو کہ دین داری کیا چیز ہے؟ یوتھائفرو بڑے وثوق سے جواب دیتا ہے دین داری سے مراد ہیں وہ کام جس سے دیوتا خوش ہوں۔ سقراط کی بے پناہ جرح شروع ہو جاتی ہے۔ اصل تنقیح یہ ہے کہ آیا کسی فعل میں دین داری کی صفت محض اس بنا پر پیدا ہو جاتی ہے کہ دیوتا خواہ مخواہ اسے پسند کرتے ہیں یا وہ اس فعل کو پسند ہی اس وجہ سے کرتے ہیں کہ اس میں دین داری کی صفت موجود ہے۔ پہلی صورت کو تو عقل کسی طرح قبول نہیں کرتی۔ دوسری صورت میں یہ سوال بدستور باقی رہتا ہے کہ دین داری ہے کیا چیز؟ آخر اس بحث کا بھی وہی منفی نتیجہ نکلتا ہے۔ یوتھائفرو قائل ہو جاتا ہے گو وہ زبان سے اس کا اعتراف نہیں کرتا اور یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جب تک دین داری کا کلّی تصور واضح نہ ہو جائے کسی فعل کے متعلق یہ کہنا ناممکن ہے کہ اس میں دین داری پائی جاتی ہے یا نہیں۔

اسی کے ساتھ پڑھنے والے کے دل میں اس تصور کا بیج پڑ جاتا ہے کہ دین داری دراصل نیکی کا نام ہے یعنی مذہب کا معیارِ قدر بھی اخلاق پر مبنی ہے۔

"پروٹاگورس" نام کے مکالمے میں سقراط اور اس عہد کے مشہور سوفسطائی پروٹاگورس میں اس مسئلے پر بحث ہوتی ہے کہ کیا نیکی کوئی ایسی چیز ہے جو ایک شخص دوسرے شخص کو سکھا سکے۔ ایک نوجوان ہپوکراٹیس پروٹاگورس کا بہت معتقد ہے اور اس کا شاگرد ہونا چاہتا ہے۔ نوعمری کے حجاب کی وجہ سے وہ اکیلا پروٹاگورس کے پاس نہیں جاتا بلکہ سقراط کو سفارش کے لیے لے جاتا ہے سقراط جو ذہنی احتساب کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پروٹاگورس سے پوچھتا ہے کہ تمھاری تعلیم سے نوجوانوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ پروٹاگورس ایک دھواں دھار تقریر میں جواب دیتا ہے کہ میں انھیں اچھے شہری بناتا ہوں۔ سقراط یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا اچھائی یا نیکی ایسی چیز ہے جو سکھائی جا سکے؟ پروٹاگورس کا عملی دعویٰ ہے کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہے سقراط بحث کو آگے بڑھانے کی غرض سے اس سے انکار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے پہلے اس بات کو طے کرنا ہے کہ نیکی ہے کیا چیز؟ یونانیوں کے ہاں حکمت، شجاعت، عفت، عدالت چار بنیادی نیکیاں سمجھی جاتی تھیں۔ سقراط ان چاروں کی تحلیل کر کے یہ ثابت کرتا ہے کہ سب کی اصل ایک ہے اور وہ کیا؟ صحیح علم۔ پروٹاگورس کھسیانا ہو گیا ہے اس لیے قائل ہو جانے کے باوجود سقراط کی تائید نہیں کرتا۔ اب گویا معاملہ الٹا ہو گیا ہے سقراط کہہ رہا ہے کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہے اور پروٹاگورس کو اس کے ماننے میں تامل ہے مگر مکالمے کا نتیجہ جو افلاطون نکالنا چاہتا ہے درحقیقت کچھ اور ہے جو بات ضمنی طور پر کہی گئی کہ نیکی صحیح علم کا نام ہے وہی ساری گفتگو کا ماحصل ہے۔

یہاں افلاطون کے ارتقائے فکر کی پہلی منزل ختم ہوتی ہے اس میں اس کے بنیادی نظریات جو سقراط کی تعلیم پر مبنی ہیں یہ ہیں کہ صحیح علم حاصل کرنے کے لیے منفرد اشیا کے کلی تصورات کو متعین کرنا لازمی ہے۔ اسی صحیح علم پر صحیح عمل منحصر ہے یعنی اخلاقی افعال کلی اخلاقی تصورات کے تابع ہیں۔ نیکی اصل میں کلی تصور خیر کی معرفت کا نام ہے اگر یہ معرفت حاصل ہو تو انسان کا عمل خود بخود نیک ہو جاتا ہے۔

"فیڈو" "فیڈرس" اور "بزم طرب" میں افلاطون اس سے آگے قدم بڑھاتا ہے اب وہ کلیات جن پر علم کی بنیاد قائم ہے محض منطقی تصورات نہیں رہتے بلکہ اعیان یعنی اشیا کے کامل نمونے بن جاتے ہیں جو محض ہمارے ذہن میں داخلی وجود نہیں بلکہ عالم مثال میں خارجی وجود رکھتے ہیں۔ دنیا کی اشیا بذاتِ خود محض ان اعیان کی پرچھائیاں ہیں اور اسی حد تک اصلیت رکھتی ہیں جس حد تک ان میں اعیان کی جھلک موجود ہے۔ تینوں مکالموں میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اب افلاطون بحث کو بجائے اس منفی نتیجے پر ختم کرنے کے کہ کوئی ذہنی اور اخلاقی مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے موضوع کا کلی تصور متعین اور واضح نہ ہو جائے اب مثبت نتائج پر ختم کرتا ہے یعنی اس بات کو مسلّم سمجھ کر کہ کلی تصورات جنھیں اس نے اعیان بنا دیا ہے خارجی وجود رکھتے ہیں اور منفرد اشیا کے وجود کا باعث ہیں۔ اس کی بنا پر ہر نزاع کو ایک حد تک فیصل کر دیتا ہے۔ نہ ابھی اعیان کی پوری تشریح کی گئی ہے اور نہ ان کے وجود کا مدلّل اور مفصّل ثبوت پیش کیا گیا ہے گویا یہ مسئلہ ابھی تک نظریے کی حیثیت نہیں بلکہ محض فرضیے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اب افلاطون صرف سقراط کے خیالات

کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ خود اپنے خیالات بھی سقراط کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

"فیڈو" کا منظر بھی "کریٹو" کی طرح قید خانہ ہے۔ سقراط کی سزائے قتل کے عمل میں آنے کا وقت آگیا ہے صرف چند ساعت کی دیر ہے۔ اس کے شاگرد اور معتقد جمع ہیں۔ دو اجنبی سیبیس اور سیمیاس بھی اُس سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں بھی سقراط کو حق کی جستجو اور تلقین کی دُھن ہے۔ ان اجنبیوں سے بقائے روح کے مسئلے پر بحث چھڑ جاتی ہے، کیا انسان کی روح اس کی پیدائش سے پہلے موجود تھی؟ کیا وہ اس کے مرنے کے بعد باقی رہے گی؟ پہلے مسئلے کو افلاطون سقراط کی زبانی نظریۂ تذکّر کی مدد سے حل کراتا ہے۔ بہت سے حقائق مثلاً ریاضی کے علومِ متعارفہ ایسے ہیں کہ جاہل سے جاہل انسان بھی ذرا سے اشارے میں انھیں سمجھ لیتا ہے یعنی دراصل وہ ان سے پہلے واقف ہوتا ہے۔ پیدائش کے بعد تو اس کو یہ باتیں کسی نے سکھائی نہیں اس لیے ظاہر ہے کہ پیدائش سے پہلے سکھائی گئی ہوں گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی روح پیدائش سے پہلے موجود ہوگی۔ اب رہا دوسرا مسئلہ کیا روح مرنے کے بعد باقی رہے گی؟ اس کے حل کرنے میں نظریۂ اعیان سے مدد لی جاتی ہے۔ ہر چیز کا وجود اس وجہ سے ہے کہ اس میں کسی عین کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ روح کے اندر عینِ زندگی موجود ہے۔ عینِ زندگی اپنی ضد یعنی موت سے بَری ہے اس لیے روح بھی جو عینِ زندگی کی حامل ہے موت سے بَری ہے یعنی ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس کے بعد سقراط ایک مثالی افسانہ بیان کرتا ہے۔ افلاطون کا اور شاید ہر حکیم اور عارف کا قاعدہ ہے کہ ان محکم ترین عقائد کو جن کی جڑیں اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہیں اور جن کو وہ منطقی دلائل سے ثابت نہیں کر سکتا تمثیل کے پیرائے میں ادا

کر دیتا ہے۔ مکالمہ اس موثر منظر پر ختم ہوتا کہ سقراط زہر کا پیالہ شربت کے گھونٹ کی طرح پیتا ہے اور تھوڑی دیر میں دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

"فیڈرس" میں حسن و عشق کی بحث ہے۔ اسی مناسبت سے افلاطون نے اس مکالمے کے لیے شہر کی گلیوں کے بجائے بیرونِ شہر ایک دل کش رومانی فضا پیدا کی ہے۔ فیڈرس نام کا ایک نوجوان سیر کے لیے جا رہا ہے۔ راہ میں اسے سقراط مل جاتا ہے اور دونوں میں گفتگو چھڑ جاتی ہے۔ فیڈرس مشہور خطیب لیسیاس کا ایک خطبہ سن کر آیا ہے اور اس کے مزے لے رہا ہے۔ سقراط کے اصرار پر وہ اس خطبے کی نقل جو اس کی جیب میں موجود ہے پڑھ کر سناتا ہے اس میں حسینوں کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ غیر عاشق کو عاشق پر ترجیح دیں یعنی اس مجذوب کے مقابلے میں جو محبت میں از خود رفتہ ہو کر ضبط اور مصلحت کا دامن چھوڑ دے، اس سالک کی قدر کریں جو کبھی رازِ محبت کو فاش نہیں کرتا اور وضعِ احتیاط کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ سقراط بھی اسی رنگ میں اس سے زیادہ پُر زور تقریر کرتا ہے۔ یہ صرف فیڈرس کو محظوظ کرنے کے لیے ہے ورنہ در اصل سقراط کا مقصد کچھ اور ہے وہ فوراً بات پلٹتا ہے۔ اپنی پہلی تقریر میں اس نے عاشق کو دیوانہ یا مجذوب قرار دے کر بُرا بھلا کہا تھا اب وہ جذب کی متعدد قسمیں کر کے آرٹسٹ کے جذب اور عاشق کے جذب کی بڑے جوش و خروش سے تعریف کرتا ہے۔ پھر ایک مثالی افسانے کے ذریعے سے یہ سمجھاتا ہے کہ عشق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ادنیٰ یعنی خواہشِ نفسانی دوسری اعلیٰ یعنی حسنِ مطلق کی محبت۔ اور ان مدارج کا ذکر کرتا ہے جنھیں روح حسنِ مطلق تک پہنچنے میں طے کرتی ہے۔ یہ وہی مجاز کو حقیقت کا زینہ بنانے کا مسئلہ ہے جو پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی متصوفانہ شاعری کا ایک اہم موضوع

بن گیا تھا۔ فیڈرس سقراط کی تقریر سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی بہت تعریف کرتا ہے لیکن سقراط اس سے مطمئن نہیں کیونکہ وہ اپنی تقریر کی ادبی شان اور خطیبانہ خوبیوں کی داد کا طالب نہیں بلکہ یہ چاہتا ہے کہ جو حقائق اس میں بیان کیے گئے ہیں وہ فیڈرس کے ذہن میں آ جائیں اور دل میں اُتر جائیں۔ وہ یہ بحث چھیڑ دیتا ہے کہ ایک اچھے خطبے میں کیا خصوصیات ہونی چاہییں اور فیڈرس سے یہ تسلیم کرا لیتا ہے کہ اچھے خطبے کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقائق پر مشتمل ہو۔ اچھا خطبہ وہ ہے جو اشیا کی حقیقت کو سمجھ سکے اور سمجھا سکے یعنی خود اعیان کا محرم ہو اور دوسروں کو ان کا محرم بنا سکے۔

"بزمِ طرب" اس سلسلے کا آخری مکالمہ ہے۔ اس کا موضوع بھی عشق و محبت ہے۔ نوجوان ڈراما نگار اگاتھن کو اس کے ایک المیے پر انعام ملا ہے۔ اگاتھن نے اس کے شکرانے میں قربانی اور دعوت کی ہے۔ سقراط بھی وہاں پہنچتا ہے۔ بے تکلف دوستوں کا مجمع ہے۔ شراب کا دَور چل رہا ہے۔ کام و دہن کے ساتھ ساتھ قلب و روح کو محظوظ کرنے کے لیے یہ تجویز کی جاتی ہے کہ سب یارانِ بزم عشق کی تعریف میں تقریریں کریں۔ ہر شخص اپنے اپنے انداز میں خوش بیانی کے جوہر دکھاتا ہے یہاں تک کہ سقراط کی باری آتی ہے وہ اپنی اور ایک کاہنہ دیوتیما کی فرضی گفتگو کے پیرایے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عشق وسیع معنی میں خیرِ مطلق کی محبت اور تنگ اور مخصوص معنی میں حسنِ مطلق کی محبت کا نام ہے۔ عاشق کو کسی حسین انسان میں حسنِ مطلق کی ایک جھلک نظر آتی ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے دل میں سچائی اور نیکی کی تخلیق کی کوشش کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ روحانی ترقی کے مدارج طے کر کے حسنِ مطلق اور خیرِ مطلق کی محبت تک

پہنچ جاتا ہے۔ گفتگو یہاں تک پہنچتی ہے کہ الکیبیاڈیس نشے میں چور آتا ہے اور اگر سقراط کی تعریف میں ایک پُرجوش تقریر کرتا ہے جس سے سقراط کی سیرت خصوصاً اس کی پاک بازی پر روشنی پڑتی ہے۔ آخر یہ صحبت اس طرح ختم ہوتی ہے کہ سقراط کے سوا اور سب شراب کے نشے میں مدہوش ہیں اور سقراط اپنی دھن میں محو ان متوالوں کے سامنے اس مسئلے پر تقریر کر رہا ہے کہ المیہ اور فرحیہ ڈرامے کی لوح ایک ہی ہے جو اچھا المیہ لکھ سکتا ہے وہ اچھا فرحیہ بھی لکھ سکتا ہے۔

افلاطون کے ارتقاے فکر کی دوسری منزل جس میں اس نے سقراط کی تعلیم میں اپنے فلسفے کا پیوند لگایا ہے اور اپنے بنیادی نظریۂ اعیان کا بالاجمال ذکر کیا ہے یہاں ختم ہوتی ہے۔ تیسری منزل جہاں اس نے نظریۂ اعیان کی تفصیل اور توجیہ کے لیے مجرد اور دقیق فلسفیانہ بحثیں شروع کر دی ہیں اور اس کا ذہن سقراط کی تنقیدی فکر کی زمین کو چھوڑ کر مابعد الطبیعیات کی خیالی فضا میں پرواز کرنے لگا ہے۔ اس مقدمے کے دائرۂ نظر سے باہر ہے۔

لائیسِ

یا

دوستی

اشخاص مُکالمہ

سقراط، جو ایک گزرا ہؤا واقعہ بیان کر رہا ہے ——— مینکسینس
ہپوتھالیس ——————— لائیسس
کٹیسپس

منظر۔ ایک نوتعمیر ورزش گاہ ایتھنس کی شہر پناہ کے باہر

میں اکادمی سے سیدھا لیسیم جا رہا تھا اور چاہتا تھا کہ باہر ہی باہر اس سڑک سے نکل جاؤں جو شہر پناہ کے برابر چلی گئی ہے۔ پنابس کے فوارے کے قریب شہر کے پچھلے پھاٹک پر پہنچا تو ہیرونیمس کے بیٹے ہپوتھالیس پیتیا کے کٹیسپس

اور چند نوجوانوں کو وہاں کھڑا ہوا پایا۔ ہپوتھالیس نے مجھے آتے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہاں سے آرہے ہو اور کدھر کا ارادہ ہے۔

میں نے جواب دیا "اکادمی سے لیسیم جارہا ہوں"۔

وہ بولا "تو پھر سیدھے ہمارے پاس آؤ اور اندر چلو۔ ابھی آبھی جاؤ"۔

میں نے پوچھا "تم لوگ کون ہو اور مجھے کہاں لیے چلتے ہو"؟

اس نے شہر پناہ سے متصل ایک احاطے اور اس کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ عمارت ہے جہاں ہم سب جمع ہوتے ہیں اور اچھی صحبت رہتی ہے"۔

میں نے پوچھا "یہ کونسی عمارت ہے اور اس میں کیا دلچسپی کی چیز ہے"۔

اس نے جواب دیا "یہ عمارت ایک ورزش گاہ ہے جو ابھی نئی نئی بنی ہے اور دلچسپی کی چیز یہاں عموماً گفتگو ہوتی ہے تم شوق سے چل سکتے ہو"۔

میں نے کہا "شکریہ۔ وہاں کوئی معلم بھی ہے؟"

وہ بولا "ہاں تمھارے پرانے دوست اور معتقد میکس موجود ہیں"۔

میں نے کہا "ان کا کیا کہنا۔ بڑے پائے کے اُستاد ہیں"۔

"تو پھر چل کر ان لوگوں سے ملوگے؟"

"ہاں چلتا ہوں۔ مگر پہلے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کیا چاہتے ہو اور تمھارا منظور نظر کون ہے"۔

"کسی کا کوئی ہے، سقراط، اور کسی کا کوئی"۔

"تمھارا کون ہے، ہپوتھالیس؟"

یہ سُن کر اس کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی اور میں نے اس سے کہا "اے ہیرونیمس کے بیٹے، ہپوتھالیس، میں تم سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم عشق

میں مبتلا ہو یا نہیں۔ اب یہ اعتراف بعد از وقت ہی کیونکہ میں دیکھتا ہوں تمھیں عشق کا آزار ہی اور شدت سے ہی۔ میں سیدھا سادھا بے وقوف سا آدمی ہوں مگر دیوتاؤں نے مجھے یہ مادّہ عطا کیا ہی کہ اس قسم کی حالتوں کو بھانپ لیتا ہوں"۔

اس پر وہ اور بھی شرمایا۔

کٹیسپس نے کہا "ہپوتھالیس، تمھاری یہ شرم اور سقراط کو اپنے محبوب کا نام بتانے میں یہ ہچکچاہٹ بھی خوب ہی۔ حالانکہ اگر تمھارا اِن کا ذرا دیر بھی ساتھ رہتا تو تم اس کے سوا کسی چیز کا ذکر ہی نہ کرتے یہاں تک کہ اِن کا ناک میں دم آجاتا۔ سچ مچ سقراط یہ شخص لائیسس کی تعریف کرتے کرتے کان کھا جاتا ہی اور جو کہیں ذرا سا نشہ ہو تو بس سمجھ لو کہ لائیسس کی پکار سے ہماری نیند حرام ہی اور نثر تو نثر نظم ان حضرت کی اور بھی غضب ہی۔ جب یہ ہمیں اپنے رشحات فکر سے شرابور کرنا شروع کرتے ہیں تو مصیبت ہی آجاتی ہی۔ پھر جس انداز سے یہ ان اشعار کو اپنے محبوب کی شان میں گاتے ہیں وہ اس سے بھی بدتر ہی۔ ان کی آواز جس سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں مجبوراً سننی پڑتی ہی اور اب یہ مزا دیکھو کہ تم نے ایک سوال پوچھا تو شرمائے جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "یہ لائیسس کون ہی؟ غالباً ابھی بہت کم سن ہوگا کیونکہ مجھے اس نام کا کوئی شخص یاد نہیں پڑتا۔"

اُس نے جواب دیا "ابھی اس کا باپ بہت مشہور آدمی ہی اس لیے وہ ابھی تک اُسی کے نام سے پُکارا جاتا ہی۔ خود اس کا نام بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ لیکن باوجودیکہ تم اس کا نام نہیں جانتے مجھے یقین ہی کہ اس کی شکل سے ضرور واقف ہوگے کیونکہ وہ ہزاروں میں پہچانی جاتی ہی۔"

"مگر یہ تو بتاؤ وہ کس کا لڑکا ہے؟"

"قصبہ ایکسون کے ڈیموکراٹیس کا سب سے بڑا بیٹا"۔

میں نے کہا "واہ بھئی ہپوتھالیس تم نے بڑا عالی خاندان اور بے مثل محبوب پایا ہے! کاش تم اتنی عنایت کرو کہ جس طرح اوروں کے سامنے عشق کا اظہار کرتے ہو میرے سامنے بھی کر دو۔ پھر میں اندازہ کر سکوں گا کہ تم جانتے ہو یا نہیں کہ انسان کو اپنے عشق کے بارے میں خود معشوق سے اور دوسروں سے کیا کہنا چاہیے"۔

وہ بولا "نہیں سقراط، تم اس شخص کے کہنے کو کوئی اہمیت نہ دو"۔

میں نے پوچھا "کیا تمھارا یہ مطلب ہے کہ تم اُس شخص کی محبت سے جسے اس نے تمھارا محبوب بتایا انکار کرتے ہو؟"

"نہیں۔ مگر اس سے انکار کرتا ہوں کہ میں اس کی تعریف میں شعر وغیرہ کہتا ہوں"۔ ہپوتھالیس نے کہا۔ "اس کے تو حواس درست نہیں۔ اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے۔ بالکل پاگل ہے"۔

میں نے کہا "میاں ہپوتھالیس اگر تم نے اپنے محبوب کی شان میں شعر یا گیت تصنیف کیے ہوں تو میں انھیں نہیں سننا چاہتا۔ مجھے تو ان کا خلاصہ بتا دو تاکہ میں یہ اندازہ کر لوں کہ تم اپنے مہ جبین سے کس طرح باتیں کرتے ہو"۔

وہ بولا "یہ تو کٹیسپس نہیں بتا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ قول اس کے میری آواز اس کے کانوں میں ہر وقت گونجا کرتی ہے تو اسے ان چیزوں کا علم ہوگا"

کٹیسپس نے کہا "بے شک ایسا علم ہے کہ بس دل ہی جانتا ہے۔ مگر ہے بڑی مضحک داستان۔ اگرچہ یہ عاشق ہیں اور ایسے ویسے نہیں بلکہ عاشق صادق لیکن اپنے محبوب سے باتیں بالکل بچوں کی سی کرتے ہیں۔ آپ ہی دیکھیے، ان کی باتیں

ہنسنے کے قابل ہیں یا نہیں؟ ان کو بس ایک ہی ذکر آتا ہے ڈیموکراٹیس کی دولت جسے شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے، لائیسس کے دادا پر دادا، ان کے گھوڑوں کے اصطبل ان کا چوکڑی کی دوڑ اور اکیلی دوڑ میں فتح پانا، پیتھیا کے کھیلوں، استھمس اور نیمیا کے مقابلوں میں ــــــ یہ قصے ہیں جن کے یہ گیت بنا کر گاتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر خرافات ہوتی ہیں۔ ابھی پرسوں کا ذکر ہے اس نے ایک نظم پڑھی جس میں ہراکلیس کی دعوت کا ذکر تھا جو لائیسس کے خاندان سے کچھ تعلق رکھتا تھا۔ اس میں دکھایا تھا کہ لائیسس کے کسی دادا پر دادا نے رشتہ داری کی بنا پر ہراکلیس کی بڑی خاطر و مدارات کی۔ یہ بزرگ خود زیس بیٹے تھے بانیٔ قصبہ کی بیٹی کے بطن سے۔ اس قسم کی بڑھیوں کی کہانیاں وہ ہمیں گا کر اور پڑھ کر سنایا کرتا ہے اور ہمیں سننی پڑتی ہیں۔"

یہ سُن کر میں نے کہا، "تم بھی عجیب مسخرے ہو ہپوتھالیس! بھلا یہ کیا بات ہے کہ اپنی جیت ہونے سے پہلے تم اپنی تعریف میں گیت بنا کر گاتے ہو؟"

"مگر سقراط، میرے گیت اور نظمیں کچھ اپنی تعریف میں تھوڑی ہوتی ہیں۔"

"تمھارے خیال میں نہیں ہوتیں؟"

"نہیں، مگر تمھارا کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا "یقیناً یہ سب تمھاری تعریف میں ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ اگر تم اپنے حسین معشوق کو جیت لو تو یہ خطبے اور گیت تمھاری شہرت کو چمکا دیں گے اور بجا طور پر کہا جا سکے گا کہ حقیقت میں یہ قصیدے خود تمھاری شان میں ہیں کہ تم نے ایسے معشوق کو رام کر لیا۔ لیکن اگر وہ تمھارے ہاتھ سے نکل گیا تو جتنی زیادہ تم نے اس کی تعریف کی تھی اتنے ہی تم ہنسے جاؤ گے کہ اس بہترین نعمت کو کھو بیٹھے۔ اس لیے دانشمند عاشق اپنے معشوق کی تعریف اس وقت تک نہیں کرتا جب تک

وہ قابو میں نہ آجائے اس لیے کہ وہ ڈرتا ہے نہ جانے کیا حادثہ پیش آئے۔ پھر ایک اور خطرہ بھی ہے۔ حسینوں کی جہاں کسی نے بڑھا چڑھا کر تعریف کی وہ غرور اور نخوت سے پھول جاتے ہیں؟"

"—— ہے تو۔"

"اور جتنے وہ مغرور ہوں اتنا ہی قابو میں آنا مشکل ہے؟"

"سچ کہتے ہو۔"

"بھلا تم اس شکاری کو کیا کہو گے جو اپنے شکار کو بھڑکا دے اور اس کا قابو میں آنا دشوار کر دے۔"

"یقیناً وہ برا شکاری کہلائے گا۔"

اور اُسے چمکارنے کے بجائے باتوں اور گیتوں سے اور غصہ دلا دے؟ یہ تو بڑی بے وقوفی ہوگی، ہے کہ نہیں؟"

"ٹھیک ہے؟"

"اب ذرا اپنے دل میں سوچو، ہپوتھالیس! کہ شعر کہنے میں یہ سب غلطیاں تم سے سرزد ہوئی ہیں یا نہیں۔ تم شاید ہی اس شخص کو اچھا شاعر کہو جو اپنی شاعری سے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہو۔"

"ہرگز نہیں کہوں گا۔ ایسا شاعر محض احمق ہے۔ اسی لیے، سقراط! میں تم سے مشورہ چاہتا ہوں، اور تم جو کچھ مزید ہدایتیں دو گے انھیں خوشی سے قبول کروں گا۔ بتاؤ آخر میں کیا کہوں اور کیا کروں جس سے میرا محبوب مجھ پر مہربان ہو جائے۔"

"اس کا الفاظ میں تعین کرنا مشکل ہے۔ لیکن اگر تم اپنے محبوب کو میرے پاس لے آؤ اور مجھے اُس سے باتیں کرنے دو تو شاید میں تمھیں یہ دکھا سکوں

کہ اس سے کیونکر باتیں کرنی چاہییں، بجائے اس طرح گانے اور شعر پڑھنے کے جس کے تم ملزم ٹھہرائے جاتے ہو۔"

"اسے لانے میں تو کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اگر تم اتنی عنایت کرو کہ کٹیپس کے ساتھ ورزش گاہ میں چلے چلو تو وہ خود ہی آجائے، سقراط، کیونکہ اُسے گفتگو سننے کا شوق ہے۔ آج ہرمیا کا تہوار ہے اس لیے جوان اور لڑکے سب ایک جگہ جمع ہیں ان میں کوئی فصل نہیں ہے۔ وہ یقیناً آئے گا لیکن اگر نہ آیا تو کٹیپس جس سے اس کی بے تکلفی ہے اور جس کا عزیز مینکسینس اس کا بڑا دوست ہے، اسے بلا لائے گا۔" میں نے کہا "ہاں یہ ترکیب ٹھیک ہے۔" چنانچہ میں کٹیپس کو لے کر ورزش گاہ کی طرف روانہ ہوا اور دوسرے ہمارے پیچھے پیچھے چلے۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ لڑکے ابھی ابھی قربانی کر رہے تھے اور تہوار کا یہ حصہ ختم کے قریب ہے۔ وہ سب سفید پوشاک پہنے تھے اور پانسے کا کھیل ہو رہا تھا۔ بہت سے باہر کے صحن میں تفریح میں مصروف تھے لیکن بعض ایک کونے میں بید کی چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں سے پانسے پھینک کر طاق جفت کا کھیل کھیل رہے تھے۔ ان کے گرد تماشائیوں کا حلقہ تھا جن میں لائسیس بھی شامل تھا۔ وہ اور لڑکوں اور جوانوں کے ساتھ، سر پر مکٹ رکھے، ایک پیکر جمال بنا کھڑا تھا جو حُسنِ سیرت میں حسنِ صورت سے کم قابلِ تعریف نہ تھا، ہم انھیں چھوڑ کر کمرے کی دوسری طرف چلے گئے اور ایسی جگہ دیکھ کر جہاں خاموشی تھی بیٹھ گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ لائسیس ادھر متوجہ ہو گیا اور مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارے پاس آنا چاہتا ہے۔ کچھ دیر وہ ہچکچاتا رہا اور اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اکیلا چلا آئے۔ مگر پہلے اس کا دوست مینکسینس اپنا کھیل چھوڑ کر پیش صحن سے ورزش گاہ میں داخل ہوا

اور جب اس نے مجھے اور کٹیسپس کو دیکھا تو ہمارے قریب آبیٹھا، اس کے بعد لائیسس اس کو دیکھ کر چلا آیا اور اس کے برابر بیٹھ گیا اور پھر اور لڑکے جمع ہو گئے۔ میں یہ بھی کہ دوں کہ ہپوتھالیس نے جب یہ ہجوم دیکھا تو اُس کے پیچھے ایسی جگہ چھپ گیا جہاں لائیسس کی نظر نہ پڑ سکے اس ڈر سے کہ کہیں وہ خفا نہ ہو جائے، اور یہاں کھڑا ہو کر ہماری باتیں سننے لگا۔

میں نے مینکسینس کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا "ڈیموفون کے بیٹے، تم دونوں میں بڑا کون ہے؟"

اس نے جواب دیا "اسی بات پر تو ہم میں جھگڑا ہے۔"

"اور زیادہ شریف کون ہے، کیا اس میں بھی اختلاف ہے۔"

"ایک اور اختلافی مسئلہ یہ ہے کہ دونوں میں زیادہ حسین کون ہے؟"

دونوں لڑکے ہنسنے لگے۔

"یہ میں نہیں پوچھوں گا کہ زیادہ دولت مند کون ہے کیوں کہ تم آپس میں دوست ہو نا؟"

"بے شک ہیں۔"

اور دوستوں میں ہر چیز مشترک ہوتی ہے لہذا تم میں سے کوئی دوسرے سے زیادہ دولت مند نہیں ہو سکتا، اگر تمھارا یہ دعویٰ سچ ہے کہ تم آپس میں دوست ہو" انھوں نے اسے تسلیم کر لیا۔ میں پوچھنے والا تھا کہ دونوں میں زیادہ عادل کون ہے اور زیادہ دانشمند کون ہے مگر اسی وقت کسی نے مینکسینس سے کہا کہ جمناسٹک ماسٹر بلا رہے ہیں۔ شاید اسے قربانی کرنی تھی چنانچہ وہ چلا گیا اور میں لائیسس سے سوال کرنے لگا۔

"تمھارے ماں باپ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

"یقیناً"۔

"اور وہ چاہتے ہیں کہ تمھیں پوری پوری خوشی حاصل ہو؟"

"جی ہاں"۔

"اور اگر وہ تم سے محبت کرتے ہیں اور تمھاری خوشی چاہتے ہیں تو اس میں کوئی شبہہ نہیں ہوسکتا کہ ہر وقت وہ تمھاری خوشی کا سامان کرنے کے لیے تیار ہیں؟"

"کوئی شبہہ نہیں"۔

"کیا انھوں نے تمھیں اجازت دے رکھی ہے کہ جو جی چاہے کرو، اور نہ کبھی تنبیہ کرتے ہیں نہ کسی کام سے روکتے ہیں؟"

"نہیں سقراط، بہت سے کام ہیں جن کے کرنے سے وہ مجھے روکتے ہیں؟"

"اس کے کیا معنیٰ؟ وہ تمھاری خوشی چاہتے ہیں اور پھر بھی تمھیں اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے سے روکتے ہیں، مثلاً اگر تم اپنے باپ کی لمبی رتھ میں بیٹھ کر دوڑ کے موقع پر خود ہانکنا چاہو تو تمھیں اجازت نہیں دیں گے بنع کردیں گے؟"

"ہرگز اجازت نہیں دیں گے"۔

"تو پھر کس کو اس کی اجازت دیں گے؟"

"رتھ بان جو ہے۔ میرے باپ سے اسی کی تنخواہ پاتا ہے"۔

"وہ ایک نوکر پر تم سے زیادہ بھروسا کرتے ہیں! اُسے اجازت ہے کہ گھوڑوں سے جس طرح چاہے کام لے؟ اور اوپر سے تنخواہ بھی دیتے ہیں؟

"جی ہاں"۔

"مگر میرے خیال میں تم یہ تو کرسکتے ہو کہ ہاتھ میں چابک لے کر خچر گاڑی ہنکاؤ؟ اس کی تو وہ اجازت دیں گے"؟

"مجھ کو ابھی اجازت نہیں دیں گے"۔

"تو پھر کسی شخص کو اجازت نہیں کہ خچروں کو کوڑے لگائے؟"

"ہر کیوں نہیں، خچر والے کو اجازت ہے"۔

"اور وہ غلام ہے یا آزاد؟"

"غلام"۔

"تو ان کی نظر میں ایک غلام کی تم سے، جو اُن کے بیٹے ہو، زیادہ قدر ہے؟ وہ اپنی چیز تمھارے سپرد نہیں کرتے مگر اس کے سپرد کر دیتے ہیں؟ وہ جو چاہتا ہے کرنے دیتے ہیں مگر تمھیں منع کر دیتے ہیں؟ اچھا یہ بتاؤ تم اپنے معاملات میں آزاد ہو یا ان پر بھی تمھیں کوئی اختیار نہیں؟

"ظاہر ہے۔ مجھے کوئی اختیار نہیں؟"

"تو تمھارا کوئی نگراں ہے؟"

"ہاں میرا اتالیق۔ دیکھو یہ ہے"۔

"اور وہ غلام ہے؟"

"بے شک ہمارے گھر کا غلام ہے"۔

"بھئی یہ تو عجیب بات ہے کہ ایک آزاد شخص پر غلام حکومت کرے۔ اور وہ تمھارے ساتھ کیا کرتا ہے؟"

"مجھے استادوں کے پاس لے جاتا ہے"۔

"تو تمھارا مطلب یہ ہے کہ تمھارے استاد بھی تم پر حکومت کرتے ہیں؟"

"اور کیا، کرتے ہی ہیں"۔

"پھر تو بھئی تمھارے والد نے تم پر بہت سے حاکم اور آقا مسلط کر رکھے ہیں۔ لیکن کم سے کم جب تم گھر میں اپنی ماں کے پاس جاتے ہو تو وہ ضرور تمھیں جو تم چاہو کرنے دیتی ہوں گی اور تمھاری خوشی میں حائل نہ ہوتی ہوں گی، اُن کی اُون اور جو کپڑا وہ بن رہی ہوں ہر وقت تمھارے لیے حاضر رہتا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم

ان کے اڈّے یا کنگھے یا کسی اور اوزار کو چھونا چاہو تو کوئی روکنے والا نہ ہوگا۔"

"وہ ہنس کر بولا" نہیں سقراط، وہ مجھے صرف روکتی ہی نہیں بلکہ اگر میں کسی چیز کو ہاتھ لگاؤں تو پِٹ جاؤں۔"

"بھئی واہ! یہ تو عجیب بات ہے"۔ اچھا کبھی تم نے اپنے ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی تو نہیں کی؟"

"کبھی نہیں"۔

"لیکن پھر وہ کیوں اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ تمھاری خوشی میں حائل ہوں اور تمھیں اپنی رائے پر نہ چلنے دیں؟ تمھارے سارے دن دوسرے کی نگرانی میں رکھتے ہیں مختصر یہ کہ اپنی خواہش سے کوئی کام بھی نہیں کرنے دیتے۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اتنی بڑی املاک سے تم کو کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ خود اپنی ذات پر بھی اختیار نہیں۔ اس کی خبرگیری اور نگرانی دوسرے کے سپرد ہے۔ تم نہ کسی چیز کے مالک ہو اور نہ کچھ کر سکتے ہو۔"

"اس کی وجہ یہ ہے، سقراط، کہ میں ابھی نابالغ ہوں"۔

"مجھے تو یقین نہیں کہ یہ وجہ ہے۔ میرے خیال میں تمھارے والد ڈیموکراٹیس، اور تمھاری والدہ دونوں بہت سے کام تم سے اب بھی لیتے ہیں اور تمھارے بالغ ہونے کا انتظار نہیں کرتے۔ مثلاً اگر انھیں کچھ لکھوانا یا پڑھوانا ہو تو غالباً گھر بھر میں سب سے پہلے تمھی کو بلواتے ہوں گے؟"

"یہ تو واقعہ ہے"۔

"اور تمھیں اجازت ہوگی کہ خط جس طرح مناسب سمجھو پڑھو یا لکھو یا بربط اٹھا کر اُس کے سُر ٹھیک کرو اور انگلیوں سے یا مضراب سے جیسے جی چاہے بجاؤ۔ اس میں نہ تمھارے والد دخل دیتے ہوں گے اور نہ والدہ۔"

"ٹھیک ہے"۔

"تو پھر کیا بات ہے لائیسِس، کہ کسی کام کی تو تمھیں اجازت ہے اور کسی کی نہیں ہے؟"

"شاید اس کا یہ سبب ہو کہ ایک کام کو میں جانتا ہوں اور دوسرے کو نہیں جانتا"۔

"ہاں، عزیزِ من! اَصل وجہ عُمر کی کمی نہیں بلکہ علم کی کمی ہے اور جب تمھارے باپ یہ سمجھ لیں گے کہ تم ان سے زیادہ دانش مند ہو تو فوراً اپنے آپ کو اور اپنی املاک کو تمھارے سپرد کر دیں گے"۔

"غالباً"۔

"اور تمھارا ہمسایہ؟ کیا اس پر بھی وہی بات صادق نہیں آتی جو تمھارے باپ پر صادق آتی ہے؟ اگر یہ اطمینان ہو جائے کہ تم خانہ داری اس سے بہتر جانتے ہو تو وہ اپنا کارخانہ خود چلاتا رہے گا یا تمھارے سپرد کر دے گا"۔

"غالباً میرے سپرد کر دے گا"۔

"اور کیا اہلِ ایتھنز اپنے معاملات تمھارے ہاتھ میں نہ دے دیں گے جب وہ دیکھیں گے تم اتنے دانش مند ہو کہ ان معاملات کا بخوبی انتظام کر سکتے ہو؟"

"ہاں دے دیں گے"۔

"اچھا اب میں ایک اور مثال تمھارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہ جو شہنشاہ ہے اور اس کا بڑا بیٹا ایشیا کا شہزادہ ـــــــ فرض کرو ہم تم اس کے پاس جا کر اسے اطمینان دلا دیں کہ ہم کھانا اس کے بیٹے سے اچھا پکاتے ہیں تو کیا

وہ ہم کو یہ حق عطا کرے گا کہ ہم سوپ تیار کریں اور جس وقت ہنڈیا چولھے پر چڑھی ہو جو کچھ ہمارا جی چاہے اس میں ڈالیں، یا اپنے بیٹے شہزادہ ایشیا کو؟"

"ظاہر ہے کہ ہم کو"۔

"اور ہمیں اختیار ہوگا کہ مٹھی بھر بھر کر نمک جھونک دیں لیکن اس کے بیٹے کو چٹکی بھر ڈالنے کا بھی اختیار نہ ہوگا"۔

"یا فرض کرو کہ اس کے بیٹے کی آنکھیں خراب ہیں اور وہ طب بالکل نہیں جانتا تو کیا شہنشاہ اُسے یہ اجازت دے گا کہ خود اپنی آنکھوں کو چھیڑے"؟

"ہرگز نہیں دے گا"۔

لیکن اگر وہ ہمیں طب کا ماہر سمجھتا ہے تو ہم جو کچھ اس کے ساتھ کرنا چاہیں کرنے دے گا —— یہاں تک کہ ہم چاہیں تو اس کی آنکھیں چیر کر راکھ بھر دیں، کیونکہ اس کے خیال میں ہم جانتے ہیں کہ بہترین تدبیر کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے"۔

"غرض ہر کام جس میں وہ ہمیں اپنے اور اپنے بیٹے کے مقابلے میں زیادہ دانشمند سمجھتا ہے ہمارے سپرد کر دے گا؟"

"بالکل ٹھیک ہے سقراط"۔

"تم نے دیکھا، پیارے لائسس، کہ جن چیزوں کا ہم علم رکھتے ہیں ان میں ہر شخص خواہ وہ یونانی ہو یا بدیسی، عورت ہو یا مرد —— ہم پر بھروسا کرتا ہے۔ ان کے بارے میں ہم جو چاہیں کریں کوئی ہمارے کام میں دخل نہیں دے گا، ہمیں پوری آزادی ہوگی اور دوسرے ہمارے حکم کے پابند ہوں گے۔ یہ چیزیں درحقیقت ہماری ہوں گی اس لیے کہ ہم ان سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ لیکن جن باتوں کو ہم بالکل نہیں جانتے ان میں کوئی ہمیں اپنی مرضی سے کام نہیں کرنے دے گا ——

بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا لوگ ہمیں روکیں گے نہ صرف اجنبی بلکہ ماں باپ اور خود اپنا دوست جوان سے بڑھ کر عزیز ہوتا ہے۔ یہ چیزیں ہماری نہیں ہوں گی کیونکہ ہم ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ تمہیں اس سے اتفاق ہے؟"

اس نے اتفاق ظاہر کیا۔

"اور کیا دوسرے ہم سے دوستی اور محبت رکھیں گے جب کہ ہم ان کے لیے بیکار ہوں؟"

"ہرگز نہیں"۔

"اور خود تمھارے ماں باپ بھی تم سے محبت نہیں کریں گے بلکہ کوئی کسی سے محبت نہیں کرے گا جب کہ وہ اس کے لیے بیکار ہو؟"

"کوئی نہیں کرے گا"۔

"بس عزیز من، اگر تم دانشمند ہو تو سب تمھارے دوست اور عزیز بن جائیں گے اس لیے کہ تم اچھے اور کام کے آدمی ثابت ہو گے۔ لیکن اگر تم دانشمند نہیں ہو تو باپ، ماں، عزیز، قریب غرض کوئی بھی تمھارا دوست نہیں بنے گا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جن چیزوں کا ہم علم نہیں رکھتے ان میں تمھیں اپنے علم پر گھمنڈ ہو سکتا ہے؟"

"ہرگز نہیں"۔

"اور تم تو لائیسس، علم کے محتاج ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ تم ابھی تک دانش مند نہیں ہو"

"ٹھیک ہے"۔

"چنانچہ تمھیں ذرا بھی گھمنڈ نہیں اس لیے کہ کوئی ایسی چیز ہی نہیں جس پر تم گھمنڈ کرو"۔

"واقعی، سقراط، کوئی چیز نہیں"۔

جب اس نے یہ کہا تو میں ہپوتھالیس کی طرف مڑا اور قریب تھا کہ مجھ سے ایک بڑی سخت غلطی سرزد ہو کیونکہ میں اس سے کہنے والا تھا: دیکھو ہپوتھالیس اس طرح اپنے محبوب سے باتیں کیا کرو۔ اس کا غرور توڑنا چاہیے نہ یہ کہ کوئی تمھاری

طرح آسمان پر چڑھا کر اس کی عادت بگاڑ دے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان باتوں کو سن کر وہ بہت بے چین اور پریشان نظر آتا ہے اور مجھے یاد آگیا کہ وہ اس قدر قریب ہونے کے باوجود یہ نہیں چاہتا کہ لائسیس کی اس پر نظر پڑے۔ یہ سوچ کر میں نے کچھ نہیں کہا۔

اتنے میں منیکسینس واپس آگیا، میں نے کچھ نہیں کہا۔ اپنی پہلی جگہ پر لائسیس کے قریب بیٹھ گیا۔ لائسیس نے بچوں کی طرح محبت سے میرے کان میں یہ بات کہی تاکہ منیکسینس نہ سننے پائے "میرے سقراط، جو کچھ مجھ سے کہہ رہے تھے منیکسینس سے بھی کہہ دو۔"

"تم خود ہی کیوں نہ کہو —— یقیناً تم نے سنا تو غور سے ہوگا۔"

"بے شک"۔

"تو پھر کوشش کر کے میرے الفاظ یاد کرنا اور جہاں تک ہو سکے انھیں بالکل اسی طرح دہرانا جس طرح میں نے کہا تھا۔ اگر بھول جاؤ تو اب کی ملاقات میں پوچھ لینا"

"میں یہی کروں گا، سقراط مگر اس سے کچھ اور باتیں کرو تاکہ جب تک مجھے ٹھہرنے کی اجازت ہے میں بھی سن سکوں۔"

"بھلا جب تم کہو تو میں کیونکر انکار کر سکتا ہوں۔ مگر تم جانتے ہو منیکسینس بڑا جھگڑالو ہے۔ اس لیے اگر وہ مجھے دق کرے تو تم میری مدد کرنا۔"

"واقعی بڑا جھگڑالو ہے اسی لیے تو چاہتا ہوں کہ تم اس سے بحث کرو۔"

"تاکہ میں بے وقوف بنوں؟"

"نہیں نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی خوب خبر لو۔"

"یہ تو کچھ سہل کام نہیں کیونکہ وہ بڑا بے ڈھب آدمی ہے —— کٹیپس کا شاگرد اور کٹیپس خود بھی تو موجود ہیں۔ تم نے دیکھا؟"

جو کچھ بھی ہو سقراط، تمہیں اس سے ضرور بحث کرنی ہوگی۔"

"خیر پھر تو مجبوراً کرنی ہی پڑے گی"۔

اس پر کٹیپس نے شکایت کی کہ ہم لوگ چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں اور اس صحبت میں دوسروں کو شریک نہیں کرتے۔

میں نے کہا میں تو بڑی خوشی سے تیار ہوں۔ یہ میاں لائسس، ایک بات جو میں نے کہی تھی نہیں سمجھے اور چاہتے ہیں کہ مینکسینس سے پوچھوں۔ ان کے خیال میں وہ جانتا ہوگا۔"

وہ بولا "تو پھر تم اس سے پوچھتے کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "اچھی بات ہے پوچھتا ہوں۔ لو بھئی مینکسینس جواب دو۔ مگر پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں وہ شخص ہوں جسے بچپن سے ایک ہی چیز کی دھن ہے۔ ہر شخص کو کسی نہ کسی چیز کا شوق ہوتا ہے، کسی کو گھوڑوں کا، کسی کو کتوں کا۔ کسی کو زر کا، کسی کو جاہ و منصب کا۔ مجھے ان میں سے ایک کی بھی اتنی زیادہ خواہش نہیں البتہ دوستوں سے عشق ہے۔ ایک اچھا دوست میرے لیے دنیا کے بہترین مرغ اور بٹیر، بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ بہترین گھوڑے اور کتے سے بھی زیادہ قابل قدر ہے۔ مصر کے کتے کی قسم، ایک سچے دوست کو میں دارا کی ساری دولت، بلکہ خود دارا پر ترجیح دیتا ہوں۔ اس درجہ مجھے دوستوں سے محبت ہے۔ اور جب میں تمہیں اور لائسس کو دیکھتا ہوں کہ اس عمر میں اتنی آسانی سے۔ اور اس قدر جلد یہ نعمت ہاتھ آگئی، تم کو وہ اور اس کو تم مل گئے، تو بڑی حیرت اور مسرت ہوتی ہے حالانکہ مجھے اس بڑھاپے میں بھی دوست کا پانا تو درکنار، یہ تک نہ معلوم ہوا کہ اُسے ڈھونڈنا کیونکر چاہیے۔ لیکن میں تم سے اس کے متعلق ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں اس لیے کہ تمہیں تجربہ ہے۔ یہ بتاؤ کہ جب ایک شخص دوسرے سے

محبت کرتا ہے تو ان میں سے دوست کون ہے ، محبت کرنے والا یا وہ شخص جس سے محبت کی جائے یا دونوں ؟

"میرے خیال میں تو دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو سکتے ہیں ؟"

"کیا تمھارا مطلب یہ ہے کہ اگر اُن میں سے صرف ایک ہی کو دوسرے سے محبت ہو تو بھی دونوں باہم دوست کہلائیں گے ؟"

"ہاں یہی مطلب ہے"۔

"لیکن اگر ایک محبت کرتا ہے اور دوسرا نہیں کرتا جیسا کہ بہت سی صورتوں میں ہو سکتا ہے"۔

"ہاں ہو تو سکتا ہے"۔

"بلکہ نفرت کرتا ہے" جس کا گمان عاشق کو معشوق پر اکثر ہوتا ہے۔ اُسے کتنی ہی محبت ہو لیکن وہ سمجھتا ہے کہ دوسرے کو اس سے محبت نہیں یا نفرت ہے ٹھیک ہے نا ؟"

"بالکل ٹھیک ہے"۔

"تو اس صورت میں ایک محبت کرتا ہے اور دوسرے سے محبت کی جاتی ہے ؟"

"جی ہاں"۔

تو پھر کون کس کا دوست ہے ؟ کیا عاشق معشوق کا دوست ہے خواہ معشوق کو اس سے محبت ہو یا نفرت ، یا معشوق دوست ہے یا پھر دونوں میں سے کوئی دوست نہیں جب تک کہ ان میں باہمی محبت نہ ہو ؟"

"بظاہر دونوں میں کوئی دوست نہیں"۔

"تو پھر یہ خیال ہمارے پہلے خیال سے مطابقت نہیں رکھتا ؟ ہم نے تو کہا تھا کہ اگر صرف ایک کو دوسرے سے محبت ہو تو دونوں باہم دوست کہلائیں گے۔ اب ہم یہ کہتے ہیں کہ جب تک دونوں کو محبت نہ ہو ان میں سے کوئی دوست نہیں"۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے"۔

"توجو چیز محبت کے بدلے محبت نہ کرتی ہو اس سے کوئی محبت کرتا ہی نہیں؟"

"میرے خیال میں تو نہیں کرتا"۔

گویا جن لوگوں سے گھوڑوں کو محبت نہ ہو انہیں گھوڑوں سے محبت نہیں ہو سکتی، نہ کسی شخص کو بٹیروں سے یا کتوں سے یا شراب سے یا ورزش سے محبت ہو سکتی ہے جب تک کہ یہ چیزیں بھی اس سے محبت نہ کرتی ہوں۔ اور نہ حکمت سے جب تک حکمت اس سے محبت نہ کرتی ہو یا ہم یہ کہیں کہ نہیں وہ شخص ان چیزوں سے محبت کرتا ہے باوجودیکہ یہ اس سے محبت نہیں کرتیں۔ کیا شاعر نے غلط کہا ہے:۔

"مبارک ہے وہ شخص جسے اپنے بچوں سے محبت ہو اور ایک سُم کے گھوڑوں سے اور شکاری کتوں سے اور انجان بدیسیوں سے"۔

"میں تو سمجھتا ہوں کہ اُس نے غلط نہیں کہا"۔

"تمھارے خیال میں اس کا یہ قول صحیح ہے؟"

"ہاں صحیح ہے"۔

"تو پھر منکسینس یہ نتیجہ نکلا کہ ایک شخص ایک چیز سے محبت کر سکتا ہے خواہ وہ چیز اس سے محبت کرتی ہو یا نفرت۔ مثلاً بہت چھوٹے بچے جو ابھی ماں باپ سے محبت کرنا نہیں جانتے بلکہ جس وقت ان کے ہاتھ سے سزا پاتے ہیں اس وقت تو ان سے نفرت ہی کرتے ہیں ان کو اس نفرت کی حالت میں اور بھی زیادہ عزیز ہوتے ہیں"۔

"میری رائے میں تم ٹھیک کہتے ہو"۔

"اگر ایسا ہے تو گویا محبت کرنے والا نہیں بلکہ وہ جس سے محبت کی جائے دوست یا حبیب ہے؟"

"ہاں"۔

"اور نفرت کرنے والا نہیں بلکہ وہ جس سے نفرت کی جائے دشمن ہے؟"

"ظاہر ہے"

"تو پھر بہت سے لوگوں سے ان کے دشمن محبت کرتے ہیں اور ان کے دوست نفرت کرتے ہیں اور وہ اپنے دشمنوں کے دوست اور دوستوں کے دشمن ہیں۔ مگر عزیز من، یہ الٹی بات کس قدر مہمل بلکہ خلاف عقل ہے کہ انسان اپنے دوست کا دشمن اور دشمن کا دوست ہو۔"

"میں تم سے بالکل متفق ہوں، سقراط"۔

"جب یہ خلاف عقل ہے تو پھر محبّت کرنے والا اس کا دوست ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔"

"بے شک"۔

"اور نفرت کرنے والا اس کا دشمن ہے جس سے وہ نفرت کرتا ہے۔"

"یقیناً"۔

"مگر سابقہ مثال کی طرح یہاں بھی ماننا پڑے گا کہ انسان ایسے شخص کا دوست ہو سکتا ہے جو اس کا دوست نہ ہو بلکہ ممکن ہے دشمن ہو، اس صورت میں جب ایک شخص دوسرے سے محبت کرتا ہے مگر دوسرا اس سے محبت نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات نفرت کرتا ہے۔ اسی طرح وہ دوسرے کا دشمن ہو سکتا ہے جو اس کا دشمن نہ ہو بلکہ ممکن ہے دوست ہو، مثلاً جب ایک شخص دوسرے سے نفرت کرتا ہے مگر دوسرا اس سے نفرت نہیں کرتا بلکہ بعض صورتوں میں محبت کرتا ہے"۔

"بات تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے"۔

"مگر جب نہ تو محبت کرنے والا دوست ہے نہ وہ جس سے محبت کی جائے اور نہ یہ دونوں باہم، تو پھر ہم کہیں کیا؟ آخر کن کو ایک دوسرے کا دوست کہیں؟ کوئی باقی بھی رہتا ہے؟"

"واقعی سقراط، میرے خیال میں تو، کوئی باقی نہیں رہتا"۔
"مگر بھئی مینیکسینس کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے نتیجہ نکالنے میں غلطی کی ہی"!
لائسیس بول اٹھا "یقیناً ہم نے غلطی کی ہی سقراط"۔ یہ کہتے ہوے اس کے چہرے پر حجاب کی سرخی دوڑ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ الفاظ بے اختیار اس کی زبان سے نکل گئے کیونکہ وہ بحث کی طرف اس قدر متوجہ تھا کہ بالکل محو ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ نہایت غور سے سن رہا ہی۔
مجھے لائسیس کی اس دلچسپی کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، اور میں مینیکسینس کو ذرا سستانے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس لیے اب میں نے اُسے مخاطب کر کے کہا "میرے خیال میں لائسیس تمھارا کہنا ٹھیک ہی اگر ہم صحیح راہ پر ہوتے تو ہرگز اتنا نہ بھٹکتے اب ہمیں چاہیے کہ اس سمت میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھیں (اس لیے کہ راستہ گڈھب ہوتا جاتا ہے بلکہ دوسری پگڈنڈی جو نظر آئی تھی اس پر چلیں اور یہ دیکھیں کہ شاعر کیا کہتے ہیں اس لیے کہ ہمارے نزدیک وہ ایک طرح سے حکمت کے مورث اور بانی ہیں اور وہ دوستوں کا ذکر یوں معمولی اور سرسری طور پر نہیں کرتے بلکہ بہ قول ان کے خدا خود لوگوں کو ایک دوسرے کا دوست بناتا ہی اور انھیں ایک دوسرے کی طرف مائل کرتا ہی۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو انھوں نے اس مطلب کو یوں ادا کیا ہی:۔
"خدا ہمیشہ امثال کو ایک دوسرے کی طرف مائل کرتا ہی اور ان میں ملاقات کراتا ہی"۔
"تم نے یہ قول سنا تو ہوگا؟"
"ہاں، سنا ہی"۔
اور فلسفیوں کے رسالے بھی پڑھے ہوں گے جن میں کہا گیا ہی کہ امثال

میں باہم الفت ہونا لازمی ہے۔ یہ وہی حضرات ہیں جو فطرت اور کائنات کے متعلق بحث کرتے ہیں اور کتابیں لکھتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے"۔

"کیا ان کا یہ قول صحیح ہے؟"

"ممکن ہے صحیح ہو"۔

"میں نے کہا" غالباً آدھا صحیح ہے یا اگر ہم اس کا مطلب ٹھیک ٹھیک سمجھ لیں تو شاید پورا ہی صحیح ہو۔ اس لیے کہ ایک بُرے کو دوسرے بُرے سے جتنا زیادہ سابقہ پڑے اتنی زیادہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ سے نقصان اٹھاتا ہے اور نقصان پہنچانے والے اور نقصان اٹھانے والے میں دوستی نہیں ہو سکتی۔ ٹھیک ہے یا نہیں؟"

"ٹھیک ہے"۔

"اس لیے اگر بُرے ایک دوسرے کی مثل ہوتے ہیں تو اس قول میں سے آدھا غلط ہے۔"

"بے شک"۔

لیکن میرے خیال میں تو اس قول کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ اچھے ایک دوسرے کے مثل اور دوست ہوتے ہیں اور بُرے جیسا کہ ان کے متعلق کہا جاتا ہے نہ ایک دوسرے سے موافقت رکھتے ہیں اور نہ اپنے آپ سے اس لیے کہ ان کے اندر ایک ہیجان اور بے چینی رہا کرتی ہے اور جو چیز خود اپنی مخالف اور دشمن ہو وہ کسی اور چیز سے متحد یا ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ کیا تمھیں اس سے اتفاق نہیں؟"

"بالکل اتفاق ہے"۔

"پس عزیز من جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امثال ایک دوسرے کے دوست

ہوتے ہیں اُن کا مطلب اگر میں نے صحیح سمجھا ہے یہ ہے کہ صرف اچھے ہی اچھوں کے دوست ہوتے ہیں اور صرف اُنھیں کے، بُروں کو کبھی حقیقی دوستی نصیب ہی نہیں ہوتی اچھوں کی ہو یا بُروں کی، تم بھی اسے تسلیم کرتے ہو؟"

اس نے سر کے اشارے سے اقرار کیا۔

"تو اب ہمیں معلوم ہو گیا اس سوال کا کہ "دوست کون ہے؟ کیا جواب دینا چاہیے اس لیے کہ ہماری بحث یہ ظاہر کرتی ہے کہ اچھے لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں"۔

اس نے کہا "بالکل درست ہے"۔

میں نے کہا "ہاں درست تو ہے مگر پھر بھی میں اس جواب سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں میں بتاؤں کہ مجھے اس میں کیا شبہہ پیدا ہو گیا ہے؟ اچھا بتاتا ہوں۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ایک شخص جو دوسرے کا مثل ہے اس کا دوست اور اس کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ میں اس بات کو دوسرے طریقے سے کہوں: کیا کوئی شخص اپنے جیسے دوسروں کو کسی قسم کا فائدہ یا نقصان پہنچا سکتا ہے جو وہ اپنے آپ کو نہ پہنچا سکتا ہو یا اس کا مثل اُس کے ساتھ کچھ کر سکتا ہے جو وہ خود اپنے ساتھ نہ کر سکتا ہو؟ اگر وہ ایک دوسرے کے لیے بیکار ہیں تو ان میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے؟ بتاؤ، ہو سکتی ہے؟"

"نہیں ہو سکتی"۔

"اگر محبت نہ ہو تو وہ ایک دوسرے کے دوست کہلائیں گے؟"

"ہرگز نہیں"۔

لیکن فرض کرو، دو شخص جو ایک دوسرے کے مثل ہیں مثل کی حیثیت سے دوست نہیں ہو سکتے، لیکن دو اچھے آدمی اچھے ہونے کی حیثیت سے تو دوست ہو سکتے ہیں؟"

"ٹھیک ہے"۔

"مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ کیا اچھا آدمی بہ حیثیت اچھا ہونے کے غیر سے بے نیاز نہیں ہی؟ یقیناً ہی۔ اور جو بے نیاز ہو اسے کسی چیز کی حاجت نہیں۔ لفظ بے نیاز کا مفہوم ہی یہ ہی۔"

"ظاہر ہی۔"

"اور جس کو کسی چیز کی حاجت نہیں اسے کسی چیز کی خواہش بھی نہیں ہوگی؟"

"نہیں ہوگی۔"

"اور جس چیز کی خواہش نہ ہو اس کی محبت بھی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں ہو سکتی۔"

"اور جسے کسی چیز کی محبت نہیں وہ چاہنے والا یا دوست نہیں کہلائے گا۔"

"ظاہر ہی کہ نہیں کہلائے گا۔"

تو پھر دوستی کے لیے کہاں گنجائش رہ جاتی ہی جب یہ صورت ہی کہ نیک آدمی اگر الگ ہوں تو بھی انھیں ایک دوسرے کی ضرورت نہیں (کیونکہ وہ تنہائی میں بھی بے نیاز ہیں)، اور اگر یکجا ہوں تو بھی ایک دوسرے کے کسی کام کے نہیں؟ آخر وہ ایک دوسرے کی قدر کیوں کریں گے؟"

"واقعی نہیں کریں گے۔"

"اور جب تک ایک دوسرے کی قدر نہ کریں دوست نہیں کہلا سکتے؟"

"بالکل ٹھیک ہی۔"

مگر سوچو تو لائسیس، کہیں ہمیں دھوکا نہ ہوا ہو — جو کچھ ہم نے کہا ہی وہ سب کا سب غلط نہ ہو۔"

"وہ کیسے؟"

مجھے ابھی یاد آیا میں نے کسی شخص سے سنا تھا کہ امثال ایک دوسرے کے،

نیک نیکوں کے جانی دشمن ہوتے ہیں۔ اور اس نے ہیسیڈ کی سند پیش کی تھی جس نے کہا ہے:۔

"کمہار کمہار سے لڑتا ہے، بھاٹ بھاٹ سے،
اور بھکاری سے بھکاری"

اس طرح اور سب چیزوں کے متعلق بھی اس نے کہا تھا "ضرورت کا تقاضا ہے کہ جتنی زیادہ باہم مماثلت ہو اتنا ہی آپس میں حسد، جھگڑا، نفرت اور جتنا زیادہ تضاد ہو دوستی ہونی چاہیے۔ غریب کو مجبوراً امیر سے دوستی کرنی پڑتی ہے، کمزور کو طاقت ور سے، بیمار کو طبیب سے مدد لینی پڑتی ہے، جاہل کو عالم کا نیازمند ہونا پڑتا ہے" اور وہ بڑے شاندار الفاظ میں کہتا رہا کہ امثال میں دوستی ہونے کا تصور حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ حقیقت کے بالکل برعکس ہے بلکہ سب سے زیادہ متضاد چیزوں میں سب سے زیادہ دوستی ہوتی ہے مثلاً خشک کو تر کی چاہ ہوتی ہے۔ سرد کو گرم کی، تلخ کو شیریں کی، تیز کو کند کی، پُر کو خالی کی وقس علیٰ ہذا کیونکہ ہر چیز کی ضد اس کی غذا ہے مگر اپنے مثل سے اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مجھے تو وہ شخص جس نے یہ کہا تھا اور اس کی تقریر بہت پسند آئی۔ تم سب کی کیا رائے ہے؟"

مینکسینس بولا "بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک کہتا ہے"۔

"تو پھر ہم کہیں کہ دوستی اضداد میں ہوا کرتی ہے؟"

"بے شک"۔

"مگر مینکسینس یہ تو بالکل مہمل جواب ہوگا، عقل کُل مناظرہ کرنے والوں کی بن آئے گی وہ ہم پر ٹوٹ پڑیں گے اور پوچھیں گے کہ کیا محبت نفرت کی ضد نہیں ہے۔ بتاؤ انھیں کیا جواب دیں گے ـــــ سچی بات کہنی پڑے گی یا نہیں؟"

"ضرور کہنی پڑے گی"۔

"پھر وہ یہ پوچھیں گے کہ دشمن دوست کا دوست ہوتا ہے یا دوست دشمن کا دوست؟"

"نہ یہ صحیح ہے اور نہ وہ"۔

"اچھا عادل ظالم کا دوست ہوتا ہے، یا اعتدال پسند غیر اعتدال پسند کا یا اچھا بُرے کا۔"

"کیسے ہو سکتا ہے"۔

"لیکن اگر دوستی تضاد پر مبنی ہوتی تو اضداد ایک دوسرے کے دوست ہوتے"۔

"ضرور ہوتے"۔

"تو پھر نہ امثال میں دوستی ہوتی ہے نہ اضداد میں"۔

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے"۔

"ابھی ایک چیز اور قابل غور ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوستی کے یہ سب تصورات غلط ہیں اور وہ جو نہ اچھا ہے نہ بُرا اچھے کا دوست ہوتا ہے؟"

"وہ کیسے؟"

"بھئی سچ پوچھو تو مجھے خود نہیں معلوم۔ اس بحث پر غور کرتے کرتے میرا سر چکرا گیا ہے اس لیے میں یونہی قیاساً کہتا ہوں کہ ایک پرانی مثل کے مطابق حسین چیز دوست ہوتی ہے۔ حُسن یقیناً ایک نرم، چکنی اور گدگدی چیز ہے اس لیے اس کی خاصیت ہے کہ بڑی آسانی سے ہماری روحوں میں اتر کر سما جاتا ہے۔ اور یہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ نیکی حسین ہوتی ہے۔ تم اس سے متفق ہو؟"

"جی ہاں"۔

"تو یہ میں محض اپنے خیال کی بنا پر کہتا ہوں کہ جو چیز نہ اچھی ہے نہ بُری اچھی اور حسین چیز کی دوست ہوتی ہے۔ اب اپنے اس خیال کی وجہ بھی بتا دوں۔ اشیا تین طرح کی ہوتی ہیں اچھی، بُری، اور نہ اچھی نہ بُری۔ تمھیں اس سے اتفاق ہے یا نہیں؟"

"مجھے اتفاق ہے"۔

"اور نہ تو اچھا اچھے کا دوست ہے، نہ بُرا بُرے کا، اور نہ اچھا بُرے کا؛ یہ تینوں صورتیں ہماری سابقہ بحث میں رد کی جا چکی ہیں اس لیے اگر دوستی یا محبت سرے سے وجود رکھتی ہے تو لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو چیز نہ اچھی ہے نہ بُری وہ یا تو اچھے کی دوست ہے یا اس کی جو نہ اچھا ہے نہ بُرا اس لیے کہ بُرے کی تو کوئی چیز دوست ہو ہی نہیں سکتی"۔

"ٹھیک ہے"۔

"اور امثال بھی ایک دوسرے کے دوست نہیں ہو سکتے جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں"۔

"درست ہے"۔

"تو پھر وہ چیز جو نہ اچھی ہے نہ بُری کسی ایسی چیز کی دوست نہیں ہو سکتی جو نہ اچھی ہے نہ بُری"۔

"ظاہر ہے کہ نہیں ہو سکتی"۔

"لہٰذا صرف اچھی چیز دوست ہو سکتی ہے اُس چیز کی جو نہ اچھی ہے نہ بُری"۔

"یہ بات یقینی سمجھی جا سکتی ہے"۔

"اب تو معلوم ہوتا کہ ہم سیدھے راستے پر لگ گئے ہیں"۔ "ذرا سوچو کہ جو جسم صحت کی حالت میں ہو اُسے نہ طبّی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کسی اور مدد کی اس لیے کہ وہ تو خود ہی بھلا چنگا ہے اور تندرست شخص کو طبیب سے محبت نہیں ہوتی اس لیے کہ اس کی صحت اچھی ہے"۔

"واقعی نہیں ہوتی"۔

"لیکن مریض کو اُس سے محبت ہوتی ہے اس لیے کہ وہ مریض ہے"۔

"بے شک"۔

"اور مرض بُری چیز ہے اور طب کا فن اچھی اور مفید چیز ہے؟"

"جی ہاں"۔

"اور انسان کا جسم بہ حیثیت جسم کے نہ اچھا ہے اور نہ بُرا؟"

"ٹھیک ہے"۔

"اور جسم مرض کی وجہ سے فن طب سے دوستی کرنے پر مجبور ہوتا ہے؟"

"جی ہاں"۔

"تو وہ چیز جو اچھی ہے نہ بُری اچھی چیز کی دوست بن جاتی ہے بُرائی کی موجودگی کی وجہ سے"۔

"ہاں یہی نتیجہ نکلتا ہے"۔

اور ظاہر ہے کہ یہ اُس سے قبل واقع ہوا ہوگا کہ اس چیز کو جو نہ اچھی ہے نہ بری۔ بُرائی کا عنصر بالکل ہی خراب کردے"۔ ——— اگر بدی نے اس چیز کو مسخ کر دیا ہوتا تو اس کو اب تک نیکی کی خواہش اور محبت نہ ہوتی کیونکہ جب ہم کہہ رہے تھے کہ بُرا اچھے کا دوست نہیں ہو سکتا"۔

"بے شک نہیں ہو سکتا"۔

پھر بھی مجھے اس بات کی طرف توجہ دلانی ہے کہ بعض اشیا جب ان کے ساتھ دوسری اشیا موجود ہوں، مل کر ایک ذات بن جاتی ہیں اور بعض نہیں بن سکتیں مثلاً کسی رنگ یا روغن کو لے لیجیے جو کسی چیز پر کیا جائے"۔

"اچھا پھر"۔

"اس صورت میں وہ چیز جس پر رنگ روغن کیا جائے اس رنگ یا روغن سے مل کر ایک ذات ہو جاتی ہے؟"

"میں سمجھا نہیں تمھارا مطلب کیا ہے"۔

میرا مطلب یہ ہے کہ فرض کرو میں تمھارے سنہرے بالوں کو سیسے سے رنگ دوں

تو وہ سچ مچ سفید ہو جائیں گے یا فقط دیکھنے میں سفید ہوں گے ؟"

"فقط دیکھنے میں سفید ہوں گے"۔

"تاہم سفیدی ان میں موجود ہوگی"۔

"بے شک"۔

"لیکن باوجود اس کے کہ ان میں سفیدی موجود ہے وہ سفید نہیں ہوں گے۔ اسی طرح جیسے کالے نہیں ہوں گے"۔

لیکن جب بڑھاپا بالوں کو سفید کر دے تو وہ سفیدی کے ساتھ مل کر ایک ذات ہو جاتے ہیں اور سفیدی کی موجودگی کی وجہ سے سفید ہوتے ہیں"۔

"یقیناً"۔

"اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہر صورت میں ایک چیز دوسری چیز کی موجودگی میں اس کے ساتھ مل کر ایک ذات ہو جاتی ہے یا یہ موجودگی کسی خاص قسم کی ہونی چاہیے"۔

"ایک خاص قسم کی ہونی چاہیے"۔

تو وہ چیز جو نہ اچھی ہے نہ بری۔ ممکن ہے برے کے ساتھ موجود ہو لیکن خود بری نہ ہو اور یہ پہلے واقع ہو چکا ہے؟"

"جی ہاں"۔

اور جب کوئی چیز برے کے ساتھ ہو لیکن خود بری نہ ہو تو کسی اچھی چیز کی موجودگی اس کے اندر نیکی کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ لیکن اگر برے کے ساتھ ہونے سے وہ چیز خود بری ہو جائے تو اس میں نیکی کی خواہش اور محبت باقی نہیں رہتی اس لیے کہ جو پہلے اچھے اور برے کا مجموعہ تھا وہ اب محض برا ہو کر رہ گیا ہے اور یہ تو ہم مان ہی چکے ہیں کہ اچھے اور برے میں دوستی نہیں ہو سکتی ؟"

"بالکل نہیں ہو سکتی"۔

چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو لوگ پہلے ہی سے دانشمند ہیں خواہ وہ دیوتا ہوں یا آدمی محب حکمت نہیں ہوتے اسی طرح وہ لوگ بھی محب حکمت نہیں ہو سکتے جن کی جہالت بدی کی حد تک پہنچ گئی ہے اس لیے کہ کوئی بد یا جاہل آدمی حکمت کا طلبگار نہیں ہوتا۔ اب رہ گئے وہ جو بد قسمتی سے جاہل ہیں لیکن ابھی تک اپنی جہالت میں بگے یا سمجھ سے خالی نہیں ہیں اور جو چیز نہیں جانتے اس کے جاننے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ یہی لوگ جو ابھی تک نہ اچھے ہیں نہ بُرے، محب حکمت ہیں۔ لیکن بُرے اور اچھے دونوں حکمت کو دوست نہیں رکھتے اس لیے کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نہ تو امثال ایک دوسرے کے دوست ہوتے اور نہ اضداد۔ تمھیں یاد ہے نہ؟"

دونوں نے کہا "جی ہاں"۔

"تو بھئی لائسیس اور مینکسینس ہم نے دوستی کی ماہیت دریافت کرلی۔ اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجایش نہیں: دوستی نام ہے اس محبت کا جو برائی کی موجودگی کی وجہ سے وہ چیز جو نہ اچھی ہے نہ بری نیکی سے رکھتی ہے خواہ وہ روحانی ہو یا جسمانی یا کسی اور شکل میں۔

ان دونوں نے بالاتفاق اسے تسلیم کرلیا اور میں ذرا دیر کے لیے خوش اور مطمئن ہوگیا اس شکاری کی طرح جس نے شکار کو قبضے میں کرلیا ہو لیکن اس کے بعد خدا جانے کیونکر میرے دل میں شبہ پیدا ہوگیا اور میں نے محسوس کیا کہ یہ نتیجہ صحیح نہیں ہے مجھے سخت تکلیف ہوئی اور میں نے کہا "افسوس! لائسیس اور مینکسینس، مجھے تو اب معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز ہمارے ہاتھ آئی وہ محض پرچھائیں ہے"۔

مینکسینس نے پوچھا "کیوں خیر تو ہے؟"

میں نے جواب دیا "میرے خیال میں دوستی کے بارے میں ہم نے جو دلائل پیش کیے وہ جھوٹے ہیں۔ دلائل بھی اکثر آدمیوں کی طرح رنگے سیار ہوتے ہیں"۔

"آخر تمھارا مطلب کیا ہے؟"

"اچھا دیکھو اس معاملے میں یوں غور کرو۔ دوست تو کسی شخص یا چیز کا ہوتا ہے نہ؟"

"یقیناً"۔

"اور اس کی دوستی کا کوئی محرک یا مقصد ہوتا ہے، یا کوئی نہیں ہوتا؟"

"یقیناً کوئی محرک اور مقصد ہوتا ہے"۔

"اور جس مقصد سے وہ دوستی کرتا ہے وہ اُسے عزیز ہوتا ہے یا نہیں؟"

"میں تمھارا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھا"۔

"کوئی تعجب نہیں کہ تم نہیں سمجھے۔ لیکن اگر میں اسے دوسری طرح بیان کر دوں تو شاید تم بھی سمجھ جاؤ اور خود میرے ذہن میں بھی زیادہ واضح ہو جائے۔ مریض جیسا میں ابھی کہہ رہا تھا طبیب کا دوست ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے نہ؟"

"جی ہاں"۔

"اور وہ طبیب کا دوست ہوتا ہے مرض کی وجہ سے اور صحت کی خاطر"۔

"جی ہاں"۔

"اور مرض بُری چیز ہے"۔

"یقیناً"۔

"اور صحت، وہ اچھی چیز ہے یا بُری، یا نہ اچھی نہ بُری؟"

"اچھی"۔

"اور ہم یہ کہہ رہے تھے کہ جسم جو اچھا ہے نہ بُرا مرض یعنی بُری چیز کی وجہ سے طب کا دوست ہوتا ہے اور طب اچھی چیز ہے۔ اور طب سے اس کی دوستی صحت کی

خاطر ہی اور صحت بھی اچھی چیز ہی"۔

"ٹھیک ہی"۔

"اچھا صحت دوست ہی یا نہیں"؟

"ہی"۔

"اور مرض دشمن ہی؟"

"ہاں"۔

"تو وہ چیز جو نہ اچھی ہی نہ بری اچھے کی دوست ہی برے اور دشمن کی وجہ سے اچھے اور دوست کی خاطر؟"

"ظاہر ہی"۔

اور دوست کی دوستی دوست کی خاطر اور دشمن کی وجہ سے ہی؟"

"یہی نتیجہ نکلتا ہی"۔

"اس مقام پر پیارے لڑکو ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے اور دھوکے سے بچنا چاہیے۔ اب میں یہ نہیں کہوں گا کہ دوست دوست کا اور مثل مثل کا دوست ہوتا ہی کیونکہ اسے ہم ناممکن قرار دے چکے ہیں۔ لیکن اس خیال سے کہ کہیں یہ نیا قول ہمیں دھوکے میں نہ ڈال دے ہمیں ایک اور پہلو پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے جو میں تمھیں سمجھاتا ہوں۔ ہم یہ کہہ رہے تھے کہ طب کو ہم دوست یا عزیز رکھتے ہیں صحت کی خاطر؟"

"جی ہاں"۔

"اور صحت بھی عزیز ہی"۔

"بے شک"۔

اور اگر عزیز ہی تو کسی چیز کی خاطر عزیز ہوگی؟"

"جی ہاں"۔

"اور ظاہر کہ خود یہ چیز بھی عزیز ہوگی جیسا کہ ہمارے سابقہ اعترافات سے ظاہر ہوتا ہے۔"

"جی ہاں"۔

"اور یہ عزیز چیز کسی اور عزیز چیز سے وابستہ ہے؟"

"جی ہاں"۔

لیکن اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے تو کیا ہم دوستی اور محبت کے مبدا تک نہ پہنچ جائیں گے جسے کسی اور چیز سے نسبت نہیں دی جا سکتی، جس کی خاطر اور سب چیزیں عزیز ہیں اور وہاں پہنچ کر نہ رُک جائیں گے؟"

"بے شک"۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اور سب چیزیں جن کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ کسی اور چیز کی خاطر عزیز ہیں محض فریب خیال اور سراب نظر ہیں البتہ ان سب کا مبدا، دوستی کا حقیقی نصب العین ہے۔ دیکھو میں اس بات کو اس طرح سمجھاتا ہوں۔ فرض کرو کوئی خزانہ ہے، مثلاً بیٹا جو باپ کے لیے سب خزانوں سے بڑھ کر ہے اب باپ جو اپنے بیٹے کی دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قدر کرتا ہے اور سب چیزوں کی قدر بھی اپنے بیٹے ہی کی خاطر کرے گا۔ مثلاً اگر بیٹا زہریلا عرق پی گیا ہے اور باپ سمجھتا ہے کہ شراب پلانے سے وہ بچ جائے گا تو شراب کی قدر کرے گا یا نہیں؟"

"ضرور کرے گا"۔

"اور اس برتن کی بھی جس میں شراب بھری ہو"۔

"یقیناً"۔

"لیکن کیا وہ شراب کے تین پیالوں کی یا ایک صراحی کی اتنی ہی قدر کرے گا جتنی اپنے بیٹے کی؟"

"کیا صحیح صورت حال یہ نہیں کہ اسے جو کچھ فکر ہے وہ ان ذرائع کی نہیں جو مقصد کے لیے بہم پہنچائے جائیں بلکہ اس مقصد کی جس کے لیے ذرائع بہم پہنچائے جاتے ہیں. ہم اکثر کہا کرتے ہیں کہ ہم سونے اور چاندی کی نہایت قدر کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ کوئی نہ کوئی مقصد اور ہے جس کی ہم سب سے زیادہ قدر کرتے ہیں اور جس کی خاطر سونا چاندی اور دوسری چیزیں جمع کیا کرتے ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے؟"

"یقیناً صحیح ہے"۔

"کیا یہی بات دوست پر صادق نہیں آتی! خود اُس چیز کو جو ہمیں محض کسی دوسری چیز کی خاطر عزیز ہو عزیز کہنا بے جا ہے۔ حقیقت میں عزیز وہ ہے جس پر نام نہاد دوستی اور محبت کا سلسلہ ختم ہوتا ہے"۔

"بات تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے"۔

"اور جو حقیقت میں عزیز ہے یعنی دوستی کا مبدا وہ کسی اور عزیز شی کی خاطر نہیں ہے"۔

"ٹھیک ہے"۔

"تو پھر ہم نے اس خیال کو چھوڑ دیا کہ دوستی کا اس کے آگے کوئی مقصد ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نیکی ہی حقیقی دوست ہے؟"

"میرے خیال میں تو نکلتا ہے"۔

"اور نیکی سے محبت بدی کی وجہ سے کی جاتی ہے؟ آؤ اس کو یوں سمجھاؤں، فرض کرو یہ تین جوہر ہیں: نیک، بد اور نہ نیک نہ بد، ان میں سے صرف پہلا اور تیسرا باقی رہ جائیں، اور بدی غائب ہو جائے اور اس کا کوئی اثر ہماری روح یا جسم پر یا اور چیزوں پر نہ پڑتا ہو جو بجائے خود اچھی ہیں نہ بُری۔ اس صورت میں کیا نیکی ہمارے لیے بالکل بے کار نہ ہو گی؟ اس لیے کہ جب کوئی ایسی چیز ہی

نہ رہی جو ہمیں نقصان پہنچاتی ہو تو ہم کو کسی ایسی چیز کی بھی ضرورت نہ رہے گی جو ہمیں فائدہ پہنچاتی ہو۔ اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ ہمارے دل میں نیکی کی محبت اور خواہش صرف بدی کی وجہ سے ہے۔ ہمیں نیکی اس حیثیت سے عزیز ہے کہ وہ بدی کے مرض کی دوا ہے لیکن اگر مرض ہی نہ ہوتا تو دوا کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیا نیکی کی یہ حقیقت نہیں ہے۔ کہ ہم جو نیکی اور بدی کے بیچ میں کھڑے ہیں اسے بدی کی وجہ سے عزیز رکھتے ہیں؟ ورنہ بجائے خود نیکی کسی کام کی نہیں"۔

"میرے خیال میں کسی کام کی نہیں"۔

"تو پھر دوستی کا مبدا جہاں پہنچ کر دوستیوں کا سارا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے یعنی ان چیزوں کا جو ہمیں اضافی طور پر کسی دوسری چیز کی خاطر عزیز ہیں، ان سب سے بالکل مختلف ہے۔ اس لیے کہ یہ سب تو کسی دوسری عزیز شے کی خاطر عزیز کہلاتی ہیں لیکن حقیقی محبوب یا دوست کی صورت اس کے برعکس ہے۔ اس کے متعلق تو یہ ثابت ہوا کہ وہ اُس شے کی وجہ سے عزیز ہے جس سے ہمیں نفرت ہے اور اگر یہ موضوع نفرت نہ رہے تو اس محبوب کی محبت بھی نہ رہے گی"۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ کم از کم اس صورت میں کہ ہماری موجودہ رائے صحیح ہو"۔

"مگر تمھیں بتاؤ کہ اگر بدی معدوم ہو جائے تو پھر ہمیں بھوک پیاس یا اس قسم کی کوئی اور خواہش باقی رہے گی؟ یا ہم یہ سمجھیں کہ بھوک تو اس وقت تک رہے گی جب تک آدمی اور جانور باقی ہیں لیکن نقصان دہ نہیں رہے گی؟ اسی طرح کیا پیاس اور دوسری خواہشیں باقی رہیں گی مگر بدی کے معدوم ہو جانے کی وجہ سے ان سے نقصان نہیں پہنچے گا؟ یا پھر مجھے یہ کہنا چاہیے یہ سوال ہی مہمل ہے کہ اس وقت کیا ہو گا کیا نہیں ہو گا اس لیے کہ کسی کو خبر نہیں؟ اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ موجودہ حالت میں بھوک سے ہمیں نقصان بھی پہنچ سکتا ہے اور فائدہ بھی۔

ٹھیک ہے یا نہیں ؟"

"جی ہاں ٹھیک ہے"۔

"اسی طرح پیاس اور دوسری خواہشیں کبھی ہمارے لیے مضر ہوتی ہیں کبھی مفید اور کبھی نہ مضر نہ مفید ؟"

"بے شک"۔

"لیکن کیا وجہ ہے کہ اگر بدی معلوم ہو جائے تو وہ چیز بھی جو بد نہیں ہے اس کے ساتھ معدوم ہو جائے ؟"

"کوئی وجہ نہیں"۔

"لہٰذا اگر بدی معدوم بھی ہو جائے تو وہ خواہشیں جو نیک ہیں اور نہ بد باقی رہیں گی؟"

"ظاہر ہے"۔

"اور کیا انسان کو جس چیز کی خواہش ہو اس سے محبت نہیں ہوتی ؟"

"ضرور ہوتی ہے"۔

"تو بدی کے معدوم ہونے کے بعد بھی کسی نہ کسی حد تک محبت یا دوستی باقی رہے گی ؟"

"جی ہاں"۔

"لیکن اگر دوستی بدی کی وجہ سے ہوتی ہے تو کیسے باقی رہے گی؟ اس صورت میں تو بدی کے معدوم ہو جانے کے بعد کوئی چیز بھی کسی دوسری چیز کی دوست نہیں ہو گی کیونکہ جب علت ہی نہ رہے تو معلول کیونکر باقی رہ سکتا ہے ؟"

"ٹھیک ہے"۔

"اور کیا ہم یہ اعتراف نہیں کر چکے ہیں کہ دوست کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے کسی وجہ سے ہوتی ہے ؟ اور اعتراف کرتے وقت ہماری رائے یہ نہیں تھی کہ وہ چیز

جو نہ اچھی ہے نہ بُری نیکی سے محبت رکھتی ہے بدی کی وجہ سے؟"

"بالکل ٹھیک ہے"۔

"لیکن اب ہماری رائے بدل گئی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دوستی کی کوئی اور وجہ ہونی چاہیے؟"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے"۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ حقیقت وہی ہے جو ہم ابھی کہہ رہے تھے کہ دوستی کی وجہ خواہش ہے اس لیے کہ خواہش کرنے والا اس چیز سے جس کی وہ خواہش کرتا ہے خواہش کرتے وقت محبت رکھتا ہے؟ ایسا تو نہیں کہ وہ نظریہ جو ہم نے ابھی بیان کیا محض ایک بے سروپا داستان ہو؟"

"ہو تو سکتا ہے"۔

"لیکن خواہش کرنے والا یقیناً اُس چیز کی خواہش کرتا ہے جس کی اس میں کمی ہے"

"جی ہاں"۔

"اور جس چیز کی اس میں کمی ہے وہ اسے عزیز ہوتی ہے؟"

"ٹھیک ہے"۔

اور اس میں کمی اس چیز کی ہوتی ہے جو اس سے چھین لی جائے؟"

"یقیناً"۔

"تو معلوم ہوتا ہے محبت، خواہش اور دوستی اسی چیز کی ہوتی ہے جو طبیعت یا فطرت سے مناسبت رکھتی ہو۔ یہ نتیجہ ہے لائیسس اور مینیکسینس ہماری بحث کا"

انھوں نے اس سے اتفاق کیا

"اس لیے اگر تم میں دوستی ہے تو تمھاری طبیعتوں میں مناسبت ہونی چاہیے"

دونوں نے کہا "یقیناً"۔

"اور دیکھو، پیارے لڑکو، کوئی شخص جو دوسرے کی محبت یا خواہش رکھتا ہے کبھی اس سے محبت نہ رکھتا اور اس کی خواہش نہ کرتا اگر ایک کو دوسرے سے کسی قسم کی مناسبت نہ ہوتی خواہ وہ روح میں ہو یا سیرت میں یا طور طریقے میں یا صورت میں"۔

مینکسینس بولا "جی بے شک" مگر لائسیس خاموش رہا۔

میں نے کہا "لہٰذا نتیجہ یہ نکلا جو ہم طبع ہو اس سے محبت ہونی ضروری ہے"۔

اس نے کہا "ہاں یہی نکلا"۔

"تو پھر اس عاشق سے جو سچا ہو جھوٹا نہ ہو معشوق کو ضرور محبت ہوگی"۔

لائسیس اور مینکسینس نے دبی زبان سے اتفاق کیا اور ہپوتھالیس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ یہاں میں نے ساری بحث پر دوبارہ نظر ڈالتے ہوئے کہا "کیا ہم طبع اور مثل میں کوئی فرق ثابت کیا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو سکے تو لائسیس اور مینکسینس، ہم نے دوستی کے متعلق جو بحث کی ہے اس کے کچھ معنی بھی ہوں گے لیکن اگر ہم طبع اور مثل ایک ہی ہوں تو تم اس دلیل سے کیونکر پیچھا چھڑاؤ گے کہ مثال بہ حیثیت امثال کے ایک دوسرے کے لیے بے کار ہیں؟ اس لیے کہ یہ کہنا کہ جو چیز بے کار ہے وہ عزیز ہوتی ہے بالکل مہمل بات ہوگی۔ لہٰذا فرض کرو کہ ہم بحث کے جوش میں مثل اور ہم طبع میں فرق مان لیں۔ شاید یہ تو جائز ہوگا؟"

"جی ہاں"۔

"اس کے بعد کیا ہم یہ کہیں کہ اچھا سب کا ہم طبع اور برا سب سے خلاف طبع ہوتا ہے یا یہ کہ برا برے کا ہم طبع ہے، اچھا اچھے کا اور اچھا نہ برا اچھے نہ برے کا؟"

انھوں نے دوسری صورت سے اتفاق کیا۔

"پھر تو پیارے لڑکو، ہم اس پرانی غلطی میں مبتلا ہو جائیں گے جس سے وہ کر چکے ہیں

اس لیے کہ جیسے اچھا اچھے کا دوست ہوگا اسی طرح ظالم ظالم کا اور برا برے کا"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے"۔

"اور اگر ہم یہ کہیں کہ صرف اچھا اچھے کا ہم طبع ہوتا ہے تو اس صورت میں صرف اچھا ہی اچھے کا دوست ہوگا"۔

"یہ ٹھیک ہے"۔

"مگر تمھیں یاد ہوگا یہ تو ہمارا وہ قول ہے جس کی ہم نے خود ہی تردید کردی تھی"۔

"ہاں یاد ہے"۔

"تو اب کیا کریں؟ کریں تو جب کہ کچھ کرنے کا موقع ہو۔ سوا اس کے کہ میں ان دانشمندوں کی طرح جو عدالت میں بحث کیا کرتے ہیں ساری بحث کا خلاصہ بیان کردوں :۔ اگر نہ عاشق دوست ہے نہ معشوق، نہ مثل، نہ ضد، نہ اچھا نہ ہم طبع نہ اور کوئی جس کا ہم نے ذکر کیا ——— کیونکہ اتنی بہت سی چیزوں کا ذکر آیا تھا کہ مجھے تو سب یاد بھی نہیں رہیں ——— تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اب باقی کیا رہا"۔

یہاں میں بعض بڑی عمر کے لوگوں سے رائے لینے والا تھا کہ یکایک لائیسس اور مینکسینس کے اتالیقوں نے آکر ہماری صحبت میں خلل ڈال دیا۔ وہ ان کے بھائیوں کو لیے بھوت کی طرح آکھڑے ہوئے اور کہا کہ گھر چلو دیر ہو رہی ہے۔ پہلے تو ہم نے اور تماشائیوں نے ان کو بھگا دیا مگر اس کے بعد جب دیکھا کہ وہ کسی طرح نہیں مانتے، اپنی زبان میں نہ جانے کیا کیا بک رہے ہیں اور غصے میں آکر لڑکوں کو پکارے چلے جاتے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ ہر مایا میں کچھ زیادہ پی گئے ہیں اسی لیے اس قدر منہ زوری

کر رہے ہیں۔ تو ہم کو دبنا پڑا اور وہ صحبت منتشر ہو گئی۔

پھر بھی میں نے رخصت ہوتے وقت لڑکوں سے کہا" لائسس اور مینکسینس کیسی مضحک بات ہے کہ تم دونوں لڑکے اور میں بوڑھا ٹیل جو بینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونا چاہتا ہوں ہم سب دوستی کا دعوے کرتے ہیں اور ابھی تک یہ بھی معلوم نہ کر سکے کہ دوست کہتے کس کو ہیں۔ یہ سب تماشائی جا کر یہی کہیں گے۔"

یوتھائفرو

اشخاص

سقراط
یوتھائفرو

مقام

شاہ آرکن کی ڈیوڑھی

یوتھائفرو۔ سقراط تم لیسیم سے کیوں چلے آئے اور یہاں شاہ آرکن کی ڈیوڑھی میں کیا کر رہے ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری طرح تم بھی کسی مقدمے میں اُلجھے ہوئے ہو؟

سقراط۔ مقدمہ نہیں، یوتھائفرو، ایتھنس والے اس کے لیے استغاثے کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

یوتھائفرو۔ ہائیں! شاید کسی شخص نے تم پر نالش کی ہوگی ورنہ یہ تو مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے کسی پر نالش کی ہو۔

سقراط۔ بے شک میں نے تو نہیں کی۔

یوتھائفرو۔ تو پھر تم پر کسی اور نے نالش دائر کر رکھی ہے؟

سقراط۔ ہاں۔

یوتھائفرو۔ آخر وہ کون شخص ہے؟

سقراط۔ ایک غیر معروف نوجوان ہے یوتھائفرو، میں خود اس سے اچھی طرح واقف نہیں میلیٹس نام ہے اور قصبہ پتھس کا رہنے والا ہے۔ شاید تمہیں اس کی شکل یاد ہو۔

یوتھائفرو۔ مجھے تو یاد نہیں سقراط۔ مگر اس نے تم پر الزام کیا لگایا ہے؟

سقراط۔ الزام؟ بھئی الزام تو بہت سخت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نوجوان بڑی مضبوط طبیعت رکھتا ہے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کو حقیر سمجھا جائے۔ اُسے یہ جاننے کا دعوےٰ ہے کہ نوجوان کیونکر بگاڑے جاتے ہیں اور ان کے بگاڑنے والے کون ہیں۔ میرے خیال میں وہ ایک دانشمند حکیم ہے اور چونکہ میں بالکل اس کے برعکس ہوں اس نے میری ساری حقیقت معلوم کر لی ہے اور مجھ پر یہ الزام لگا رہا ہے کہ میں اس کے نوجوان دوستوں کو بگاڑتا ہوں۔ ہماری مادر مہربان ریاست کو اس کا فیصلہ کرنا ہے۔ جتنے سیاسی آدمی ہمارے یہاں ہیں ان میں وہی ایک شخص ہے جو میرے خیال میں اپنی زندگی کی ابتدا صحیح طریقے سے کر رہا ہے اور نو عمری میں نیکی کی سعی کرتا ہے۔ اچھے کاشتکار کی طرح اسے سب سے زیادہ ننھی کونپلوں کی فکر ہے اور وہ ہم جیسوں کو جو انھیں نقصان پہنچاتے ہیں، نکال کر پھینک دیتا ہے۔ ابھی تو یہ پہلا قدم ہے آگے چل کر وہ بڑی شاخوں کی طرف توجہ کرے گا اور اگر یہی رفتار رہی تو ایک دن ملک و قوم کا بہت بڑا محسن ہو گا۔

یوتھائفرو۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ مگر مجھے تو یہ ڈر ہے سقراط، کہ کہیں معاملہ اس کا اُلٹا نہ ہو۔ میرے خیال میں اس کا تم پر حملہ کرنا گویا ریاست کی جڑ کھودنا ہے۔ آخر وہ کیا کہتا ہے کہ تم نوجوانوں کو کیوں کر بگاڑتے ہو؟

سقراط۔ اس نے مجھ پر عجیب و غریب الزام لگایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں دیوتاؤں کا

شاعر یعنی خیالی دیوتا گھڑنے والا ہوں، نئے دیوتا ایجاد کرتا ہوں اور پرانوں کے وجود کا منکر ہوں۔ یہ ہی اس کے استغاثے کی بنا۔

یوتھائفرو۔ میں سمجھ گیا، سقراط۔ وہ تم پر اسی پُرانے اشارۂ غیبی کے متعلق الزام لگانا چاہتا ہی جو بقول تمھارے کبھی کبھی تمھیں نظر آتا ہی۔ اس کے نزدیک تم بدعتی ہو اسی لیے وہ تمھیں عدالت میں کھینچ لایا ہی۔ اُسے معلوم ہی کہ اس قسم کے الزام کو دنیا فوراً مان لیتی ہی۔ میں خوب جانتا ہوں اس لیے کہ جب کبھی مجلس عام میں دیوتاؤں کے متعلق گفتگو اور آیندہ واقعات کی پیش گوئی کرتا ہوں لوگ مجھ پر ہنستے ہیں اور مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں حالانکہ ہر لفظ جو میری زبان سے نکلتا ہی سچ ہی۔ بات یہ ہی کہ وہ ہم پر حسد کرتے ہیں مگر ہمیں ہمت سے کام لے کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

سقراط۔ میرے دوست یوتھائفرو ان کی ہنسی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ یوں چاہے کوئی شخص حکیم سمجھا جائے لیکن ایتھنس والے اس وقت تک اس کی پروا نہیں کرتے جب تک وہ اپنی حکمت دوسروں کو نہ سکھانے لگے۔ اور جب یہ نوبت آجائے تو خدا جانے کیوں، شاید بقول تمھارے حسد کی وجہ سے وہ خفا ہو جاتے ہیں۔

یوتھائفرو۔ میں غالباً کبھی اس طرح خفا ہونے کا موقع نہیں دوں گا۔

سقراط۔ تم تو غالباً اس کا موقع نہیں دوگے اس لیے کہ اپنے طرز عمل میں نہایت محتاط ہو اور بہت کم اپنی حکمت دوسروں کو سکھاتے ہو مگر میری تو یہ نیک عادت ہی کہ ہر ایک سے کھُل کر باتیں کرتا ہوں بلکہ اپنی گرہ سے کچھ خرچ کرنے کو تیار ہوں کہ کوئی سننے والا مل جائے اور مجھ کو یہ ڈر ہی کہ ایتھنس والے مجھے بہت باتونی سمجھتے ہوں گے۔ بہرحال جیسے میں نے ابھی کہا اگر وہ صرف مجھ پر ہنسیں جس طرح بہ قول تمھارے تم پر ہنستے ہیں تو عدالت میں ہنسی خوشی وقت کٹ جائے لیکن

شاید وہ سچ مچ خفا ہوں۔ ایسی صورت میں کیا انجام ہوگا۔ یہ تو تم جیسے کاہن ہی بتا سکتے ہیں۔

یوتھائفرو۔ غالباً اس معاملے میں کچھ بھی نہیں ہوگا سقراط۔ تم مقدمہ جیت جاؤ گے۔ اور میرا خیال ہے کہ میں بھی اپنے مقدمے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

سقراط۔ اور تمھارا مقدمہ کیا ہے؟ تم کسی کا پیچھا کر رہے ہو یا اپنے بچانے کی فکر ہے؟

یوتھائفرو۔ میں پیچھا کر رہا ہوں۔

سقراط۔ کس کا؟

یوتھائفرو۔ میں بتاؤں گا تو مجھے پاگل سمجھو گے۔

سقراط۔ کیوں کیا مفرور کے پر ہیں؟

یوتھائفرو۔ نہیں تو اس عمر میں وہ کچھ ایسا سریع السیر نہیں۔

سقراط۔ آخر وہ ہے کون؟

یوتھائفرو۔ میرے والد۔

سقراط۔ تمھارے والد! کیا کہ رہے ہو بھلے آدمی؟

یوتھائفرو۔ جی ہاں۔

سقراط۔ اور ان پر الزام کیا ہے؟

یوتھائفرو۔ قتل کا، سقراط!

سقراط۔ قسم ہے دیوتاؤں کی، یوتھائفرو! بیچارے عام لوگ کیا جانیں کہ حق اور انصاف کیا چیز ہے جب تک کوئی غیر معمولی آدمی نہ ہو جو حکمت میں بہت کچھ ترقی کر چکا ہے، انھیں کبھی یہ بات نہیں سوجھے گی کہ ایسا مقدمہ چلائیں۔

یوتھائفرو۔ بے شک، سقراط!

سقراط۔ شاید وہ شخص جسے تمھارے باپ نے قتل کیا تھا تمھارا رشتہ دار ہوگا۔

یقیناً یہی بات ہے اس لیے کہ اگر کوئی اجنبی ہوتا تو تمھیں مقدمہ چلانے کا خیال بھی نہ آتا۔

یوتھافرو۔ مجھے حیرت ہے سقراط، کہ تم رشتہ دار اور غیر رشتہ دار میں فرق کرتے ہو۔ اس لیے کہ دونوں صورتوں میں یکساں آلودگی ہے اگر ہم جان بوجھ کر قاتل کی صحبت میں رہیں جب کہ ہمارا فرض یہ ہے کہ اس پر مقدمہ چلا کر اپنے آپ کو اور اس کو اس آلودگی سے پاک کریں۔ اصل سوال یہ ہے کہ مقتول کا قتل جائز ہے یا نہیں۔ اگر جائز ہے تو انسان کا فرض ہے کہ اس معاملے میں دخل نہ دے لیکن اگر ناجائز ہے تو خواہ قاتل اس کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا کھاتا پیتا ہو اس پر ضرور مقدمہ چلائے۔ اب سنو یہ شخص جو مر گیا ایک غریب متوسل تھا اور ہمارے ناکسس کے فارم میں مزدوری کرتا تھا۔ ایک دن نشے کی جھانجھ میں ہمارے ایک خدمت گار سے لڑ بیٹھا اور اُسے قتل کر دیا، میرے والد نے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر ایک خندق میں ڈال دیا اور کسی کو ایتھنس بھیج کر ایک کاہن سے پچھوایا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔ اس اثنا میں انھوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اس کی کوئی خبر نہیں لی کیونکہ وہ سمجھتے تھے یہ قاتل ہے اگر مر بھی گیا تو کیا حرج ہے۔ آخر یہی ہوا، اس لیے کہ وہ سردی، بھوک اور بیڑیوں کی تکلیف سے مر گیا قبل اس کے کہ قاصد کاہن کے یہاں سے واپس آئے۔ میرے والد اور سارا خاندان مجھ سے خفا ہے کہ میں ایک قاتل کی حمایت میں اپنے والد پر مقدمہ چلا رہا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ اول تو انھوں نے اسے مارا نہیں اور مارا بھی ہو تو وہ محض ایک قاتل تھا تمھیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے اس لیے کہ جو بیٹا اپنے باپ پر مقدمہ چلائے وہ بے دین ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے سقراط کہ ان لوگوں کو کچھ خبر نہیں کہ دیوتاؤں کا بے دینی اور دینداری کے بارے میں کیا خیال ہے۔

سقراط۔ غضب خدا کا، یوتھائفرو! کیا تم مذہب کی حقیقت کا اور بے دینی اور دینداری کی باتوں کا اس قدر صحیح علم رکھتے ہو کہ فرض کیا واقعات وہی ہیں جو تم نے بیان کیے، تمھیں یہ خوف نہیں کہ کہیں اپنے والد پر مقدمہ چلا کر تم گناہ کے مرتکب نہ ہو رہے ہو؟

یوتھائفرو۔ یہی تو یوتھائفرو کی سب سے بڑی صفت ہے جو اسے اور لوگوں سے ممتاز کرتی ہے، سقراط، کہ وہ ان مسائل کا صحیح علم رکھتا ہے۔ اس کے بغیر میں کس کام کا ہوتا؟

سقراط۔ میرے نادر دوست! میں سمجھتا ہوں میرے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ میں تمھارا مرید ہو جاؤں تب میلیٹس والا مقدمہ شروع ہونے سے پہلے میں اُسے ٹوکوں گا اور کہوں گا کہ مجھے ہمیشہ سے مذہبی مسائل سے بڑی دلچسپی ہے اور اب چونکہ وہ مجھ پر لاطائل تخیلات اور بدعات کا الزام لگاتا ہے اس لیے میں تمھارا مرید ہو گیا ہوں، میں اُس سے کہوں گا "میلیٹس تم یوتھائفرو کو جید عالم دین اور اس کے عقائد کو صحیح اور معقول مانتے ہو۔ اگر تم اس سے راضی ہو تو تمھیں مجھ سے راضی ہونا چاہیے اور مجھے کچہری میں نہیں گھسیٹنا چاہیے۔ لیکن اگر تم راضی نہیں ہو تو تمھیں پہلے اس شخص پر الزام لگانا چاہیے جو میرا مرشد ہے اور جو جوانوں کو نہیں بلکہ بوڑھوں کو تباہ کر ڈالے گا، یعنی مجھے اپنی تعلیم سے اور اپنے بوڑھے باپ کو تنبیہ اور تعزیر سے۔" اور اگر میلیٹس میری بات پر کان نہ دھرے مقدمے کی کارروائی جاری رکھے، اور الزام مجھ سے ہٹا کر تمھاری طرف منتقل نہ کرے تو پھر بہتر یہی ہے کہ میں اسی بات کو عدالت کے سامنے دہراؤں۔

یوتھائفرو۔ ضرور، سقراط۔ اور اگر اس نے مجھ پر الزام لگانا چاہا تو جہاں تک میرا خیال ہے دین کے عقیدے میں خلل ثابت کر دوں گا اور عدالت مجھ سے زیادہ

اُس کی خبر لے گی۔

سقراط۔ اور میں عزیز دوست، یہی سمجھ کر تمہارا مرید ہونا چاہتا ہوں کیونکہ میں دیکھتا ہوں تم پر کسی کی یہاں تک کہ اس شخص میلیٹس کی بھی نظر نہیں پڑتی۔ مگر مجھے اس کی تیز نگاہوں نے بھانپ لیا ہی اور مجھ پر اس نے بے دینی کا الزام لگایا ہی۔ اس لیے میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے دینداری اور بے دینی کی حقیقت بتاؤ جس کے متعلق تم نے کہا تھا کہ تم اچھی طرح جانتے ہو، اسی طرح قتل اور دوسرے گناہوں کی بھی۔ یہ سب چیزیں کیا ہیں؟ کیا دین داری ہمیشہ ہر فعل میں ایک ہی نہیں ہوتی؟ اور بے دینی؟ ——— کیا وہ دین داری کی ضد اور خود ہر صورت میں یکساں یعنی ایک کُلّی تصور نہیں ہی جس میں ہر بے دینی کی بات شامل ہی؟

یوتھائفرو۔ یقیناً سقراط۔

سقراط۔ اور دین داری اور بے دینی کیا چیز ہی؟

یوتھائفرو۔ دین داری ایسے کام کو کہتے ہیں جیسا میں کر رہا ہوں یعنی ہر اُس شخص کے خلاف کارروائی کرنا جو قتل، دیوتاؤں کی بے حرمتی اور اسی قسم کے جرائم کا مجرم ہو۔ خواہ وہ باپ ہو یا ماں ہو، کوئی بھی ہو، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ——— اور ایسے لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنا بے دینی ہی۔ اور مہربانی کرکے ذرا سوچو تو سقراط کہ میں تمھیں اپنے قول کی صداقت کا کیسا عمدہ ثبوت دیتا ہوں جو میں اوروں کو بھی دے چکا ہوں ——— یعنی اس اصول کا کہ گنہ گار کو خواہ وہ کوئی بھی ہو بے سزا دیے نہ چھوڑنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہر چند زیُس کو لوگ دیوتاؤں میں سب سے اچھا اور نیک سمجھتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ اس نے اپنے باپ (کرونوس) کو قید کر دیا تھا اس جرم میں کہ وہ اپنے بیٹوں کو کھا گیا تھا اور خود اس نے بھی اپنے باپ (یورانس) کو اسی بنا پر ایسی سزا دی تھی جو ناقابل بیان ہی لیکن جب میں اپنے باپ کے

خلاف قانونی کارروائی کر رہا ہوں تو وہ مجھ سے خفا ہیں کس قدر بے اصولی ہی کہ دیوتاؤں کے معاملے میں تو کچھ اور کہتے ہیں اور میرے معاملے میں کچھ اور۔

سقراط۔ یوتھائفرو، کہیں مجھ پر بے دینی کا الزام لگانے کی یہی وجہ تو نہیں کہ میں دیوتاؤں کے متعلق اس قسم کی کہانیوں کو نہیں مانتا؟ شاید اسی وجہ سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں غلطی پر ہوں، لیکن تم جو ان سے خوب واقف ہو انھیں پسند کرتے ہو، میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ تمھارے برتر علم و حکمت کے آگے سر جھکا دوں۔ اور میں کہہ ہی کیا سکتا ہوں جب کہ مجھے یہ اعتراف ہی کہ میں ان کے متعلق کچھ نہیں جانتا؟ زیس کے واسطے مجھے بتاؤ کہ کیا تم انھیں صحیح سمجھتے ہو؟

یوتھائفرو۔ ہاں سقراط اور جیسا کہ میں کہہ رہا تھا تم چاہو تو میں تمھیں دیوتاؤں کے متعلق اور بہت سی باتیں بتا سکتا ہوں جنھیں سن کر تم حیرت میں رہ جاؤ گے۔

سقراط۔ اس میں کیا شک ہی اور کسی وقت جب مجھے فرصت ہوگی ضرور سنوں گا۔ مگر اس وقت تو میں اپنے اس سوال کا کہ "دین داری کیا چیز ہی" ٹھیک ٹھیک جواب چاہتا ہوں، اور وہ میرے دوست، تم نے اب تک نہیں دیا۔ جب تم سے پوچھا تو تم نے یہی کہا کہ وہ کام جو تم کر رہے ہو یعنی اپنے باپ کو قتل کا ملزم ٹھہرانا۔

یوتھائفرو۔ اور جو کچھ میں نے کہا وہ سچ ہی سقراط۔

سقراط۔ بے شک، یوتھائفرو۔ مگر یہ تو تم تسلیم کرو گے کہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دین داری کے کام ہیں۔

یوتھائفرو۔ ہاں اور بھی ہیں۔

سقراط۔ یاد رکھو میری فرمایش تم سے یہ نہیں ہی کہ دین داری کی دو تین مثالیں دو بلکہ اس عام تصور کو سمجھاؤ جس کی وجہ سے ہر دین داری کے عمل میں دین داری پائی جاتی ہی۔

یوتھائفرو۔ یاد ہی۔

سقراط۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس تصور کی نوعیت کیا ہی تب میرے پاس ایک معیار ہو گا جسے میں سامنے رکھوں گا۔ اور جس پر میں ہر عمل کو جانچوں گا خواہ تمھارا ہو خواہ کسی اور کا۔ اس وقت میں یہ کہہ سکوں گا کہ فلاں فعل دین داری کا ہی اور فلاں بے دینی کا۔

یوتھائفرو۔ تم چاہتے ہو تو میں تمھیں بتاؤں گا۔

سقراط۔ میں تو بہت چاہتا ہوں۔

یوتھائفرو۔ اچھا تو دین داری وہ ہی جو دیوتاؤں میں مقبول ہی اور بے دینی وہ ہی جو ان میں نامقبول ہی۔

سقراط۔ بہت خوب، یوتھائفرو۔ اب تم نے مجھے ویسا جواب دیا ہی جیسا میں چاہتا تھا۔ مگر ابھی میں یہ نہیں بتا سکتا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ صحیح ہی یا نہیں گو مجھے یقین ہی کہ تم اپنے قول کی صحت کو ثابت کر دو گے۔

یوتھائفرو۔ ظاہر ہی۔

سقراط۔ اچھا آؤ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس پر غور کریں دین داری اس شخص یا چیز کی صفت ہی جو دیوتاؤں میں مقبول ہی اور بے دینی اس شخص یا چیز کی جو ان میں نامقبول ہی اور یہ دونوں بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں، تم نے یہی تو کہا تھا نہ؟

یوتھائفرو۔ یہی کہا تھا۔

سقراط۔ اور ٹھیک کہا تھا؟

یوتھائفرو۔ ہاں سقراط میرا تو یہی خیال ہی۔ یقیناً ٹھیک کہا تھا۔

سقراط۔ اس کے علاوہ یوتھائفرو ہم اس کا بھی اعتراف کر چکے ہیں کہ دیوتاؤں میں باہم دشمنی اور منافرت اور مخالفت بھی ہوتی ہی؟

یوتھائفرو۔ ہاں یہ بھی کرچکے ہیں۔

سقراط۔اور وہ کس قسم کا اختلاف ہے جس سے دشمنی اور غصہ پیدا ہوتا ہے؟ فرض کرو میرے اچھے دوست، کہ مجھ میں اور تم میں کسی عدد کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیا اس قسم کے اختلاف سے ہم میں دشمنی ہوجاتی ہے؟ کیا ہم فوراً علم حساب سے مدد نہیں لیتے سوال کو حل کر کے ان اختلاف کا خاتمہ نہیں کر دیتے؟

یوتھائفرو۔ ٹھیک ہے۔

سقراط۔ اور فرض کرو ہمارا اختلاف عرض و طول کے بارے میں ہو تو کیا ہم فوراً پیمایش کے ذریعے سے اس مسئلے کو طے نہیں کر دیتے؟

یوتھائفرو۔ بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط۔اور ہلکے بھاری کی بحث کا فیصلہ ہم کانٹے کی مدد سے کر دیتے ہیں۔

یوتھائفرو۔ بے شک۔

سقراط۔ مگر وہ اختلافات کیا ہیں جن کا فیصلہ اس طرح نہیں ہو سکتا اس لیے ہمیں غصہ آجاتا ہے اور ہم ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں؟ غالباً اس سوال کا جواب اس وقت تمھارے ذہن میں نہیں آتا؟ لہذا میں بتاتا ہوں کہ یہ عداوتیں تب پیدا ہوتی ہیں جب بنائے اختلاف، انصاف اور بے انصافی، نیکی اور بدی، عزت اور ذلت ہو۔ کیا یہی وہ مسائل نہیں ہیں جن کے بارے میں انسانوں میں اختلاف ہوتا ہے، اور جب کبھی ہم آپس میں لڑتے ہیں تو کیا انھیں چیزوں پر نہیں لڑتے اس لیے کہ ہم اپنے اختلافات کا کوئی قابل اطمینان فیصلہ نہیں کر پاتے؟

یوتھائفرو۔ ہاں سقراط، جن اختلافات پر ہم لڑتے ہیں ان کی نوعیت وہی ہے جو تم نے بیان کی۔

سقراط۔ اور دیوتاؤں کے جھگڑے بھی، میرے معزز یوتھائفرو جب کبھی

ہوتے ہیں تو اسی قسم کے ہوتے ہیں ؟

یوتھائفرو ۔ یقیناً اسی قسم کے ہوتے ہیں ۔

سقراط ۔ بہ قول تمھارے یہ رائے کے اختلافات ہیں انصاف اور بے انصافی، نیکی اور بدی، عزت اور ذلت کے بارے میں ۔ اگر اس قسم کے اختلافات نہ ہوتے تو کوئی لڑائی جھگڑا بھی نہ ہوتا ۔ ہے کہ نہیں ؟

یوتھائفرو ۔ بہت ٹھیک کہتے ہو ۔

سقراط ۔ کیا ہر شخص اس چیز سے جس میں اس کے برعکس صفات ہوں نفرت نہیں کرتا ؟

یوتھائفرو ۔ سچ ہے ۔

سقراط ۔ لیکن جیسا کہ تم نے کہا انھیں چیزوں کو بعض لوگ انصاف اور بعض بے انصافی کہتے ہیں اور اسی پر ان میں نزاع ہوتی ہے ۔ اس طرح لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے ۔

یوتھائفرو ۔ بالکل سچ ہے ۔

سقراط ۔ تو انھیں چیزوں سے دیوتاؤں کو محبت بھی ہوتی ہے اور نفرت بھی ۔ وہی چیزیں ان کے ہاں مقبول بھی ہیں اور نامقبول بھی !

یوتھائفرو ۔ ٹھیک ہے ۔

سقراط ۔ تو اس خیال کے مطابق یوتھائفرو، ایک ہی چیز میں دین داری بھی موجود ہے اور بے دینی بھی ۔

یوتھائفرو ۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے ۔

سقراط ۔ تب تو میرے دوست، مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہے کہ تم نے اس سوال کا جواب نہیں دیا جو میں نے کیا تھا یہ تو میں نے ہرگز نہیں کہا تھا کہ مجھے ایسے کام

بتاؤ جو دین داری کے بھی ہوں اور بے دینی کے بھی - خیر، مگر تمھارے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ دیوتاؤں کو ایک ہی چیز سے محبت بھی ہوتی ہو اور نفرت بھی - اس لیے یوتھائفرو، تم جو اپنے باپ کو سزا دے رہے ہو تو بہت ممکن کہ یہ کام زیس کو پسند ہو مگر کرونوس یا یورینس کو ناپسند ہو اور ہفیسٹس کے ہاں مقبول ہو لیکن ہیری کے ہاں نہ ہو اور دیوتاؤں میں بھی اسی قسم کا اختلاف رائے ہو سکتا ہو۔

یوتھائفرو - مگر میرے خیال میں سقراط - سب دیوتا اس بات پر متفق ہوں گے کہ قاتل کو سزا دینا مناسب ہو - اس معاملے میں ان میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہوگا -

سقراط - لیکن اگر انسانوں کا ذکر ہو یوتھائفرو؟ کبھی تم نے کسی کو بحث کرتے ہوئے سنا ہو کہ قاتل یا اور کسی قسم کا مجرم چھوڑ دیا جائے -

یوتھائفرو - واہ، انھیں سوالوں پر تو اُن میں ہمیشہ بحث ہوا کرتی ہو خصوصاً عدالتوں کے اندر - وہ ہر قسم کے جرم کرتے ہیں اور پھر اپنی صفائی میں سب کچھ کہنے اور کرنے کو تیار ہیں -

سقراط - لیکن کیا وہ اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہیں اور پھر بھی یہ کہتے ہیں کہ انھیں سزا نہیں ملنی چاہیے -

یوتھائفرو - نہیں ایسا تو نہیں کرتے -

سقراط - تو پھر بعض چیزیں ایسی بھی جن کے کہنے یا کرنے کی انھیں جرأت نہیں ہوتی - اس لیے کہ انھیں یہ بحث کرنے کی جرأت نہیں کہ مجرموں کو سزا نہ ملنی چاہیے بلکہ وہ اپنے جرم سے انکار کرتے ہیں - ہو کہ نہیں؟

یوتھائفرو - ہاں -

سقراط - تو وہ اس پر بحث نہیں کرتے کہ مجرم کو سزا نہ دی جائے بلکہ اس

واقعے پر کہ مجرم کون ہی، اس نے کیا کیا اور کب کیا ؟

یوتھائفرو۔ ٹھیک ہی۔

سقراط۔ اور دیوتاؤں کا بھی یہی حال ہوگا اگر بہ قول تمھارے ان میں انصاف اور بے انصافی کے بارے میں جھگڑا ہوا کرتا ہی ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں بے انصافی ہوتی ہی اور بعض اس سے انکار کرتے ہیں اس لیے کہ یہ کہنے کی جرأت تو یقیناً نہ کسی دیوتا کو ہو سکتی ہی اور نہ کسی انسان کو کہ بے انصافی کرنے والے کو سزا نہ دی جائے ؟

یوتھائفرو۔ یہ بات تو ٹھیک ہی سقراط۔

سقراط۔ مگر ان میں اختلاف جزئیات کے بارے میں ہوتا ہی۔ دیوتاؤں میں بھی اور انسانوں میں بھی۔ اگر ان میں جھگڑا ہوتا ہی تو کسی ایسے فعل کے بارے میں ہوتا ہی جس میں شبہہ ہو جو بعض کے نزدیک انصاف ہو اور بعض کے نزدیک بے انصافی۔ ٹھیک ہی نہ ؟

یوتھائفرو۔ بالکل ٹھیک ہی۔

سقراط۔ تو پھر میرے پیارے دوست یوتھائفرو، خدا کے لیے میری اطلاع اور ہدایت کے لیے بتاؤ تمھارے پاس کیا ثبوت ہی کہ اگر ایک نوکر کو جو قتل کا مجرم ہی مقتول کا آقا زنجیروں میں جکڑ دے اور وہ اس کی وجہ سے مر جائے، قبل اس کے کہ قید کرنے والے کو کاہنوں سے یہ فتوے ملنے پائے کہ اسے اس قیدی کے ساتھ کیا کرنا چاہیے، تو سب دیوتاؤں کی رائے میں اس کی موت بے انصافی کی موت ہوئی اور اس شخص کی طرف سے بیٹے کو اپنے باپ کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے اور اُسے قتل کا ملزم ٹھہرانا چاہیے ؟ تم یہ کس طرح ثابت کر سکتے ہو کہ سب دیوتا اس فعل کو پسند کرنے پر متفق ہیں ؟ اگر تم اسے ثابت کر دو تو میں

جب تک زندہ ہوں تمھاری دانشمندی کی تعریف کروں گا۔

یوتھائفرو۔ ہے تو مشکل کام مگر پھر بھی میں یہ بات تمھیں بہت اچھی طرح سمجھا سکتا ہوں۔

سقراط۔ اچھا تو تمھارا یہ مطلب ہے کہ میرا ذہن اتنا تیز نہیں ہے جتنا ججوں کا۔ اس لیے کہ ان کے سامنے تو یقیناً تم یہ ثابت کرو گے کہ یہ فعل بے انصافی کا ہے اور دیوتاؤں کے نزدیک قابلِ نفرت ہے؟

یوتھائفرو۔ یقیناً سقراط۔ اگر انھوں نے میری سُنی۔

سقراط۔ یقیناً سُنیں گے جب انھیں یہ معلوم ہو گا کہ تم بہت اچھے مقرر ہو۔ ابھی تم جب باتیں کر رہے تھے تو ایک بات میرے دھیان میں آئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا "اچھا اگر یوتھائفرو نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ سب دیوتا مزدور کی موت کو بے انصافی سمجھتے ہیں تو اس سے مجھے دین داری اور بے دینی کی حقیقت کیونکر معلوم ہو گی؟ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ فعل دیوتاؤں کے نزدیک قابلِ نفرت ہے تو تب بھی یہ فرق دین داری اور بے دینی کی تعریف کے لیے کافی نہیں کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جو چیز دیوتاؤں کے نزدیک قابلِ نفرت ہوتی ہے وہی محبوب اور مقبول بھی ہوتی ہے۔" اس لیے یوتھائفرو، میں تم سے اس کے ثبوت کا مطالبہ نہیں کرتا تمھاری خاطر سے یہ فرض کیے لیتا ہوں کہ سب دیوتا اس فعل کو بُرا سمجھتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں لیکن میں اس تعریف میں جو تم نے کی تھی تھوڑی سی ترمیم کر کے یہ کہتا ہوں کہ جس سے سب دیوتاؤں کو نفرت ہو وہ بے دینی اور جس سے سب کو محبّت ہو وہ دین داری ہے اور جس سے بعض کو محبت اور بعض کو نفرت ہو وہ یا تو دونوں ہیں۔ یا دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔ کیا ہم دین داری بے دینی اور دین داری کی یہ تعریف قرار دیں؟

یوتھائفرو۔ کیوں نہیں سقراط!

سقراط۔ بے شک، کیوں نہیں! مجھے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں یوتھائفرو، اب رہی یہ بات کہ اس کے مان لینے سے، تمھیں میری ہدایت کرنے میں، جس کا تم نے وعدہ کیا تھا، کچھ زیادہ مدد ملے گی اس کو سوچنا تمھارا کام ہے۔

یوتھائفرو۔ بے شک میرے خیال میں تو جس سے سب دیوتاؤں کو محبت ہو وہ دین داری اور جس سے سب کو نفرت ہو وہ بے دینی ہے۔

سقراط۔ کیا ہم اس قول کی صداقت کی جانچ کریں یوتھائفرو، یا محض اپنی اور دوسروں کی سند پر بے سوچے سمجھے مان لیں۔ تمھاری کیا رائے ہے؟

یوتھائفرو۔ ضرور جانچ کرنی چاہیے۔ میرے خیال میں یہ تعریف جانچ میں پوری اترے گی۔

سقراط۔ ابھی معلوم ہوا جاتا ہے، میرے اچھے دوست، پہلی بات جو میں سمجھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آیا دین داری یا تقدس کو دیوتا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ مقدس ہے یا وہ مقدس اس وجہ سے ہے کہ انھیں پسند ہے؟

یوتھائفرو۔ میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا، سقراط۔

سقراط۔ میں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ دیکھو ایک تو ہوتا ہے اٹھانا، ایک اُٹھایا جانا، ایک چلانا ایک چلایا جانا، ایک دیکھنا ایک دکھایا جانا تم جانتے ہو کہ ان دونوں چیزوں میں فرق ہے اور یہ بھی جانتے ہو کہ کیا فرق ہے؟

یوتھائفرو۔ میرا خیال ہے کہ یہ تو میں سمجھتا ہوں۔

سقراط۔ اور جو چیز پسند کی جائے اس میں اور پسند کرنے والے میں فرق ہے یا نہیں؟

یوتھائفرو۔ ضرور ہے۔

سقراط۔ اچھا اب مجھے یہ بتاؤ کہ جو چیز اٹھائی جا رہی ہو وہ اٹھائے جانے کی حالت میں اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ کوئی اسے اٹھا رہا ہے یا کسی اور وجہ سے؟

یوتھائفرو۔ اسی وجہ سے۔

سقراط۔ اور یہی بات اُس چیز پر بھی صادق آتی ہے جسے کوئی چلا رہا ہو یا دیکھ رہا ہو؟

یوتھائفرو۔ ٹھیک ہے۔

سقراط۔ اور کوئی چیز دیکھی اس لیے نہیں جاتی ہے کہ وہ دیکھے جانے کی حالت میں ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اس حالت میں اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ دیکھی جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی چیز چلائی اس لیے نہیں جاتی کہ وہ چلائی جانے کی حالت میں ہوتی ہے اور اٹھائی اس لیے نہیں جاتی کہ وہ اٹھائی جانے کی حالت میں ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس۔ اب میرے خیال میں یوتھائفرو میرا مطلب صاف ہو گیا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ کسی فعل یا انفعال کی کوئی خاص حالت کسی سابقہ فعل یا انفعال پر دلالت کرتی ہے۔ کوئی چیز واقع اس لیے نہیں ہوئی کہ حالت وقوع میں ہے بلکہ حالت وقوع میں اس لیے ہے کہ واقع ہوتی ہے اور اس پر کوئی فعل اس لیے نہیں گزرتا کہ وہ حالت انفعال میں ہے بلکہ حالت انفعال میں اسی لیے ہے کہ اس پر کوئی فعل گزرتا ہے۔ تمھیں اس سے اتفاق ہے؟

یوتھائفرو۔ ہاں۔

سقراط۔ اور جو چیز پسند کی جائے وہ کسی نہ کسی حالت میں ہوگی یا حالت وقوع میں یا حالت انفعال میں، ہے کہ نہیں؟

یوتھائفرو۔ ٹھیک ہے۔

سقراط۔ اور یہی بات سابقہ مثالوں پر صادق آتی ہے۔ پسندیدگی کی حالت پسند کیے جانے کے فعل کے بعد واقع ہوتی ہے نہ کہ یہ فعل اس حالت کے بعد؟

یوتھائفرو۔ بے شک۔

سقراط۔ اچھا تو تم دین داری کے بارے میں کیا کہتے ہو کیا تمھاری تعریف کی رُو سے سب دیوتا اسے پسند نہیں کرتے۔

یوتھائفرو۔ ضرور پسند کرتے ہیں۔

سقراط۔ اسی لیے کہ اس میں دین داری اور تقدس کی صفت ہے یا کسی اور وجہ سے؟

یوتھائفرو۔ اسی وجہ سے۔

سقراط۔ وہ پسند اس لیے کی جاتی ہے کہ مقدس ہے۔ مقدس اس لیے نہیں کہ پسند کی جاتی ہے؟

یوتھائفرو۔ ہاں۔

سقراط۔ اور جو چیز دیوتاؤں کے ہاں مقبول ہے اُسے وہ پسند کرتے ہیں اور وہ پسندیدگی کی حالت میں اس لیے ہے کہ پسند کی جاتی ہے؟

یوتھائفرو۔ یقیناً۔

سقراط۔ تو پھر یوتھائفرو نہ وہ چیز جو دیوتاؤں کے ہاں مقبول ہے مقدس ہے اور نہ بہ قول تمھارے جو چیز مقدس ہے وہ ان کے ہاں مقبول ہے بلکہ یہ دونوں بالکل الگ الگ چیزیں ہیں۔

یوتھائفرو۔ یہ کیسے سقراط۔

سقراط۔ میرا مطلب یہ ہے۔ ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ مقدس چیز دیوتاؤں کو اس لیے پسند ہے کہ وہ مقدس ہے وہ مقدس اس لیے نہیں کہ انھیں پسند ہے۔

یوتھائفرو۔ ہاں۔

سقراط۔ لیکن جو چیز دیوتاؤں میں مقبول ہے اس کے مقبول ہونے کی وجہ

یہی ہی کہ وہ اسے پسند کرتے ہیں اس کے پسند کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان میں مقبول ہی۔
یوتھائفرو۔ ٹھیک ہی۔
سقراط۔ مگر میرے دوست، یوتھائفرو، اگر وہی چیز جو مقدس ہی مقبول الٰہی ہی اور اپنے مقدس ہونے کی وجہ سے خدا کو پسند آئی ہی تو یہ نتیجہ نکلنا چاہیے کہ جو چیز مقبول الٰہی ہی وہ مقبول الٰہی ہونے کی وجہ سے پسند آئی لیکن اگر وہ چیز مقبول الٰہی ہی محض اس لیے کہ خدا کو پسند آگئی تو نتیجہ یہ نکلتا ہی کہ جو چیز مقدس ہی وہ دیوتاؤں کو پسند ہونے کی وجہ سے مقدس ہی۔ مگر تم دیکھتے ہو کہ معاملہ اس کے برعکس ہی اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لیے کہ ایک چیز تو پسند کیے جانے کی وجہ سے پسندیدہ ہی اور دوسری پسندیدہ ہونے کی وجہ سے پسند کی جاتی ہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہی یوتھائفرو کہ میں تو تم سے تقدس یا دین داری کی ماہیت پوچھتا ہوں اور تم ماہیت کی بجائے محض ایک صفت بتا رہے ہو یعنی سب دیوتاؤں کا اسے پسند کرنا۔ گویا تم اس کی نوعیت بتانے سے اب تک انکار کر رہے ہو۔ لہٰذا میری التجا ہی کہ خدا کے لیے اپنی دولت کو نہ چھپاؤ اور مجھے پھر سے بتاؤ کہ درحقیقت تقدس یا دین داری کیا ہی قطع نظر اس کے کہ وہ دیوتاؤں میں مقبول ہی یا نہیں (یہ ایسا معاملہ ہی جس پر ہمیں جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں)، اور بے دینی کیا ہی؟
یوتھائفرو۔ بھئی میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا سقراط، کہ اپنا مطلب کس طرح سمجھاؤں۔ نہ جانے کیا بات ہی کہ خواہ ہم اپنی دلیلوں کی بنیاد کسی چیز پر بھی رکھیں وہ ہم سے منہ موڑ کر چلتی پھرتی نظر آتی ہی۔
سقراط۔ تمھارے الفاظ کا وہی حال ہی، یوتھائفرو جو میرے بزرگ ڈیڈلس کی بنائی ہوئی چیزوں کا اگر ان کا کہنے والا میں ہوتا تو تم کہہ سکتے تھے کہ

میری دلیلیں اسی لیے بھاگ جاتی ہیں اور اپنے مقام پر نہیں ٹھیرتیں کہ میں اس کی اولاد سے ہوں۔ لیکن چونکہ یہ خیالات تمھارے ہیں اس لیے تمھیں کوئی اور پھبتی سوچنی چاہیے اس لیے کہ یہ تو تم خود ہی تسلیم کرتے ہو کہ ان میں حرکت کا رجحان موجود ہے۔

یوتھائفرو۔ نہیں سقراط، میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ تمھیں اپنے وقت کے ڈیڈلیس ہو جو ان دلیلوں کو حرکت دیتے ہو ان کو چکر دینا میری نہیں بلکہ یقیناً تمھاری کارگزاری ہے۔ میری طرف سے تو یہ ہلنے بھی نہ پاتیں۔

سقراط۔ پھر تو میں ڈیڈلیس سے بڑھ کر ہوں اس لیے کہ وہ تو صرف اپنی ہی بنائی ہوئی چیزوں کو حرکت دے سکتا تھا مگر میں دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں کو بھی متحرک کر سکتا ہوں اور پھر لطف یہ کہ یہ میں اپنی خوشی سے نہیں کرتا میں تو ڈیڈلیس کی حکمت اور ٹینٹلس کی دولت دینے کو تیار ہوں کہ انھیں ایک جگہ پر قائم رکھوں۔ خیر اس قصّے کو چھوڑو۔ چونکہ میں دیکھتا ہوں کہ تم سستی کر رہے ہو اس لیے میں خود ہی تمھیں یہ بتانے کی کوشش کرتا ہوں کہ تم مجھے دین داری کی ماہیت کیوں کر سمجھاؤ۔ امید ہے کہ تم اتنی زحمت گوارا کر لوگے۔ اچھا یہ بتاؤ جس میں دین داری ہو اس میں لازمی طور پر عدل بھی ہوتا ہے۔

یوتھائفرو۔ ہوتا ہے۔

سقراط۔ تو کل عدل دین داری ہے یا کل دین داری عدل ہے لیکن عدل کا صرف ایک جز دین داری ہے؟

یوتھائفرو۔ میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا سقراط۔

سقراط۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جتنے تم مجھ سے عمر میں چھوٹے ہو اتنے ہی عقل میں بڑے ہو۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ رہا تھا میرے محترم دوست حکمت کی

کثرت نے تمھیں کاہل بنا دیا ہے۔ خدا کے لیے ایک ذرا سی کوشش کر ڈالو میرا مطلب سمجھنے میں دراصل کوئی دقت نہیں۔ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں اسے سمجھانے کے لیے اس بات کی مثال دیتا ہوں جو میں نہیں کہنا چاہتا۔ شاعر اسٹاسینس اس طرح نغمہ سنج ہے:-

"اے زئیس جوان سب موجودات کا صانع اور خالق ہے تو میں یہ نہیں بتانا چاہتا۔ اس لیے کہ جہاں خوف ہوگا وہاں احترام بھی ہوتا ہے۔"

مجھے اس شاعر سے اختلاف ہے۔ تمھیں بتاؤں، کس بات میں؟

یوتھائفرو۔ ضرور۔

سقراط۔ میرے خیال میں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جہاں خوف ہو وہاں احترام بھی ہوتا ہے اس لیے کہ یقیناً بہت سے لوگ افلاس، بیماری وغیرہ سے ڈرتے ہیں لیکن مجھے تو یہ نظر نہیں آتا کہ جن چیزوں سے وہ ڈرتے ہیں ان کا احترام بھی کرتے ہوں۔

یوتھائفرو۔ بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط۔ البتہ جہاں احترام ہو وہاں خوف بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جس شخص کو کسی کام کرنے سے احترام اور شرم مانع ہو اُسے بدنامی کا خوف بھی ضرور ہوگا۔

تو پھر ہمارا یہ کہنا غلط ہے کہ جہاں خوف ہو وہاں احترام بھی ہوتا ہے بلکہ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ جہاں احترام ہو وہاں خوف بھی ہوتا ہے۔ خوف کے ساتھ احترام کا ہونا لازمی نہیں اس لیے کہ خوف زیادہ وسیع تصور ہے اور احترام کا ایک جز ہے جس طرح طاق کا عدد جُز ہے اور عدد طاق سے زیادہ وسیع تصور ہے۔ شاید

اب تو تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟

یوتھائفرو۔ اچھی طرح سے۔

سقراط۔ اسی قسم کا سوال میں اٹھانا چاہتا تھا جب میں نے یہ پوچھا کہ آیا عدل ہر صورت میں دین داری اور دین داری ہر صورت میں عدل ہے ایسا تو نہیں کہ عدل وہاں بھی ہوتا ہے جہاں دین داری نہ ہو یعنی عدل زیادہ وسیع تصور ہے اور دین داری اس کا صرف ایک جز ہے؟ کیا تمہیں اس سے اختلاف ہے؟

یوتھائفرو۔ نہیں میرے خیال میں تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔

سقراط۔ لہذا اگر دین داری عدل کا ایک جز ہے تو میرے خیال میں اب ہمیں یہ پوچھنا چاہیے کہ کون سا جز؟ اگر تم سابقہ مثالوں میں مزید تحقیق سے کام لیتے مثلاً مجھ سے یہ پوچھتے کہ جفت عدد کیا ہوتا ہے اور عدد کے کون سے جز کو جفت کہتے ہیں تو میں بغیر کسی دقّت کے جواب دے سکتا تھا وہ عدد جو مساوی ضلعوں کی شکل کو ظاہر کرتا ہے۔ تم اس سے متفق ہو؟

یوتھائفرو۔ بالکل متفق ہوں۔

سقراط۔ اسی طرح میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے بتاؤ دین داری یا تقدس عدل کا کون سا جز ہے تاکہ میں میلیٹس سے یہ کہہ سکوں کہ وہ میرے ساتھ بے انصافی نہ کرے اور مجھ پر بے دینی کا الزام نہ لگائے اس لیے کہ تم نے مجھے تقدس یا دین داری اور اس کی ضد کی حقیقت اچھی طرح سمجھا دی ہے۔

یوتھائفرو۔ تقدس یا دین داری، سقراط میرے خیال میں عدل کا وہ جز ہے جس میں دیوتاؤں کا خیال رکھا جاتا ہے اس لیے کہ عدل کا ایک دوسرا جز بھی ہوتا ہے جس میں ہم انسانوں کا خیال رکھتے ہیں۔

سقراط۔ خوب بات کہی یوتھائفرو، مگر ذرا سی بات میں اور پوچھنا

چاہتا ہوں "خیال رکھنے" سے کیا مراد ہے؟ اس لیے کہ "خیال رکھنے" کا لفظ دیوتاؤں کے لیے اس معنی میں تو نہیں آسکتا جس معنی میں انسانوں کے لیے آتا ہے۔ مثلاً گھوڑوں کو اس کی ضرورت ہے کہ ان کا خیال رکھا جائے اور ہر شخص اس کا اہل نہیں سوا اس کے جو چابک سواری میں ماہر ہو۔ ہے کہ نہیں؟

یوتھائفرو۔ بے شک۔

سقراط۔ تو یوں کہنا چاہیے اس فن کو جو گھوڑوں کا خیال رکھنا سکھاتا ہے چابک سواری کہتے ہیں۔

یوتھائفرو۔ ہاں۔

سقراط۔ اسی طرح کتوں کے خیال رکھنے کا ہر شخص اہل نہیں ہوتا بلکہ صرف شکاری؟

یوتھائفرو۔ ٹھیک ہے۔

سقراط۔ گویا شکاری کا فن کتوں کا خیال رکھنا سکھاتا ہے؟

یوتھائفرو۔ ہاں۔

سقراط۔ اور چرواہے کا فن بیلوں کا خیال رکھنا؟

یوتھائفرو۔ بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط۔ اسی طرح تقدس یا دین داری کا فن دیوتاؤں کا خیال رکھنا سکھاتا ہے؟ —— یہی مطلب ہے نہ تمھارا یوتھائفرو؟

یوتھائفرو۔ ہاں۔

سقراط۔ کیا خیال رکھنے کا ہمیشہ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جس کا خیال رکھتے ہیں اس کو فائدہ پہنچے؟ مثلاً گھوڑوں کے معاملے میں تم نے دیکھا ہوگا کہ چابک سوار کے خیال رکھنے سے انھیں فائدہ پہنچتا ہے۔ ہے کہ نہیں؟

یوتھائفرو۔ ٹھیک ہے۔

سقراط - اسی طرح جیسے کتوں کو شکاری کے فن سے فائدہ پہنچتا ہے اور بیلوں کو چرواہے کے فن سے ۔ غرض سبھی چیزوں کا خیال اسی لیے رکھا جاتا ہے کہ انھیں فائدہ پہنچے نہ کہ نقصان ۔

یوتھائفرو - بے شک اس لیے نہیں کہ انھیں نقصان پہنچے ۔

سقراط - بلکہ اس لیے کہ انھیں فائدہ پہنچے ؟

یوتھائفرو - یقیناً

سقراط - اور اس تقدس یا دین داری سے جس کی تعریف یہ کی گئی ہے: "وہ فن جو دیوتاؤں کا خیال رکھنا سکھاتا ہے" انھیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے ؟ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب تم کوئی دین داری کا کام کرتے ہو تو اس سے کسی دیوتا کی حالت کچھ بہتر ہو جاتی ہے ؟

یوتھائفرو - نہیں نہیں میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ۔

سقراط - میں بھی نہیں سمجھتا کہ تمھارا یہ مطلب ہے یوتھائفرو، اسی لیے تو میں نے تم سے پوچھا تھا کہ خیال رکھنے کے کیا معنی ہیں ۔

یوتھائفرو - تمھاری بڑی عنایت ہے سقراط ۔ خیال رکھنا میں نے اس معنی میں نہیں استعمال کیا تھا ۔

سقراط - ٹھیک ہے مگر میں یہ پوچھوں گا کہ یہ دیوتاؤں کا خیال رکھنا جو دین داری کہلاتا ہے کیا چیز ہے ؟

یوتھائفرو - اس قسم کا خیال جیسے نوکر اپنے آقاؤں کو رکھتے ہیں ۔

سقراط - اچھا میں سمجھا ——— گویا دیوتاؤں کی ایک قسم کی خدمت ۔

یوتھائفرو - بالکل ٹھیک ہے ۔

سقراط - طب بھی ایک قسم کی خدمت ہے جس کا ایک خاص مقصد ہے

اس کو صحت ہی کہو گے نا؟

یوتھائفرو۔ اور کیا۔

سقراط۔ ایک اور فن بھی تو ہے نہ جو جہاز بنانے والے کی خدمت کرتا ہے اور اس کی ایک خاص غرض ہے!

یوتھائفرو۔ ہاں سقراط، اس کی غرض ہی جہاز بنانا۔

سقراط۔ ایک اور فن ہے جو مکان بنانے والے کی خدمت کرتا ہے اور اس کی خدمت ہے مکان بنانا؟

یوتھائفرو۔ ہاں۔

سقراط۔ اب مجھے بتاؤ، میرے اچھے دوست، کہ یہ فن جو دیوتاؤں کی خدمت کرتا ہے کس چیز میں کام آتا ہے؟ تمھیں تو یقیناً معلوم ہونا چاہیے۔ اگر، جیسا کہ تم نے کہا تھا تم سب لوگوں سے زیادہ مذہبی معلومات رکھتے ہو۔

یوتھائفرو۔ میں نے سچ کہا تھا سقراط۔

سقراط۔ تو پھر خدا کے لیے یہ بتاؤ کہ وہ کون سا شاندار کام ہے جو دیوتا ہماری خدمات کی بدولت انجام دیتے ہیں۔

یوتھائفرو۔ ایک نہیں بہت سے شاندار کام سقراط۔

سقراط۔ ایک سپہ سالار بھی بہت سے شاندار کام انجام دیتا ہے میرے دوست مگر ہم آسانی سے بتا سکتے ہیں کہ ان میں سب سے بڑا کام کون سا ہے۔ لڑائی میں فتح پانا ہے کہ نہیں؟

یوتھائفرو۔ یقیناً۔

سقراط۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ایک کاشتکار بھی بہت سے شاندار کام کرتا ہے مگر ان میں سب سے بڑا یہ ہے کہ وہ زمین سے کھانے کی چیزیں اگاتا ہے۔

یوتھائفرو۔ بالکل ٹھیک۔

سقراط۔ تو پھر ان بہت سے شاندار کاموں میں جو دیوتا انجام دیتے ہیں سب سے بڑا کون سا ہی؟

یوتھائفرو۔ سقراط میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ان سب چیزوں کی تفصیل بہت دقت طلب ہی۔ بس اتنا کافی ہی کہ دین داری یا تقدس یہ سیکھنے کا نام ہی کہ دیوتاؤں کو قول اور فعل سے، دعاؤں اور قربانیوں سے، کیونکر خوش کرنا چاہیے۔ یہ دین داری خاندانوں اور ریاستوں کے لیے باعث نجات ہی۔ اسی طرح جیسے بے دینی جس سے دیوتا خفا ہو جاتے ہیں، ان کے لیے باعث ہلاکت ہی۔

سقراط۔ میں سمجھتا ہوں یوتھائفرو کہ اگر تم چاہتے تو میرے اصلی سوال کا جواب اس سے کہیں زیادہ اختصار کے ساتھ دے سکتے تھے مگر صاف معلوم ہوتا ہی کہ مجھ کو سکھانا تمھیں منظور نہیں ورنہ تم مطلب کی بات پر پہنچ کر کیوں پلٹ جاتے ہو اگر تم میرے سوالوں کا ٹھیک جواب دیتے تو اب تک میں تم سے معلوم کر لیتا کہ دین داری کیا چیز ہی لیکن چونکہ سوال کرنے والا جواب دینے والے کا پابند ہی اس لیے مجھے تمھارے پیچھے پیچھے چلنا پڑتا ہی۔ میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں کہ تم سے دوبارہ پوچھوں۔ دین داری کیا چیز ہی؟ کیا تمھارا یہ مطلب ہی کہ یہ ایک قسم کا دعاؤں اور قربانیوں کا علم ہی۔

یوتھائفرو۔ ہاں یہی مطلب ہی۔

سقراط۔ تو پھر گویا دین داری ایک لین دین کا علم ہوا۔

یوتھائفرو۔ تم میرا مطلب خوب سمجھے سقراط۔

سقراط۔ ہاں میرے دوست بات یہ ہی کہ میں تمھارے علم کا معتقد ہوں اور دل لگا کر سنتا ہوں اس لیے کوئی لفظ جو تمھارے منہ سے نکلے گا ضائع نہیں جائے گا۔

اچھا یہ بتاؤ کہ دیوتاؤں کی یہ خدمت کس قسم کی ہے؟ کیا تمھارا یہ مطلب ہے کہ ہم ان سے مرادیں مانگیں اور انھیں نذریں دیں؟

یوتھائفرو۔ ہاں یہی مطلب ہے۔

سقراط۔ اور مانگنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ جو چیز ہم چاہتے ہیں وہ مانگیں؟

یوتھائفرو۔ بے شک۔

سقراط۔ اور دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو وہ ہم سے چاہتے ہیں وہ ہم ان کو دیں؟ اس لیے کہ وہ فن کس کام کا جو کسی شخص کو ایسی چیز دے جس کی اسے خواہش نہ ہو۔

یوتھائفرو۔ بالکل ٹھیک ہے سقراط۔

سقراط۔ تو دین داری وہ فرض ہے یوتھائفرو جس کے ذریعے سے انسان اور دیوتا آپس میں لین دین کرتے ہیں۔

یوتھائفرو۔ تم پسند کرو تو یہی لفظ استعمال کر سکتے ہو۔

سقراط۔ میں تو سوا سچائی کے کوئی چیز پسند نہیں کرتا۔ البتہ میں تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ دیوتاؤں کو ہماری نذروں سے کیا فائدہ پہنچتا ہے جو کچھ وہ ہم کو دیتے ہیں اس کے متعلق تو کوئی شبہ نہیں۔ دنیا کی کوئی بھی اچھی چیز نہیں جو ہمیں ان سے نہ ملتی ہو۔ لیکن یہ بات صاف نہیں کہ ہم اس کے بدلے میں انھیں کوئی اچھی چیز کیسے دے سکتے ہیں۔ اگر وہ بہت کچھ دیتے ہیں اور ہم کچھ نہیں دیتے تو یہ ایسا سودا ہوا جس میں ہم ان سے بہت اچھے رہتے ہیں۔

یوتھائفرو۔ تو کیا تم یہ سمجھتے ہو سقراط کہ ہماری نذروں سے دیوتاؤں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے؟

سقراط۔ لیکن اگر نہیں پہنچتا یوتھائفرو تو پھر دیوتاؤں کے سامنے یہ نذریں پیش کرنے کے کیا معنی؟

یوتھائفرو۔ یہ تو محض عزت و احترام کی نشانی ہے اور جیسا کہ میں کہہ رہا تھا وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

سقراط۔ تو دین داری سے دیوتا خوش ہوتے ہیں لیکن نہ یہ ان کے لیے مفید ہے اور نہ ان کے ہاں مقبول۔

یوتھائفرو۔ میرے خیال میں تو اس سے زیادہ مقبول کوئی چیز نہیں۔

سقراط۔ تو پھر وہی بات آگئی کہ دین داری دیوتاؤں کے ہاں مقبول ہے۔

یوتھائفرو۔ بے شک۔

سقراط۔ جب تم ایسا کہتے ہو تو پھر کیا تعجب ہے کہ تمھارے الفاظ ایک مقام پر نہیں ٹھیرتے بلکہ بھاگے بھاگے پھرتے ہیں؟ کیا اب بھی تم مجھ پر یہ الزام لگاؤ گے کہ میں ڈیڈیلس کی طرح انھیں حرکت دیتا ہوں اور یہ نہ دیکھو گے کہ ایک ڈیڈیلس سے بڑا استاد موجود ہے جو انھیں چکر پر چکر دیتا ہے، اور وہ تم خود ہو؟ تم نے غور کیا ہوگا ہم گھوم پھر کر اسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔ کیا ہم نے یہ نہیں کہا تھا کہ تقدس یا دین داری اور دیوتاؤں کے ہاں مقبول ہونا ایک چیز نہیں۔ کیا تم بھول گئے ہو؟

یوتھائفرو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

سقراط۔ اور اب تم یہ نہیں کہہ رہے ہو کہ جس چیز کو دیوتا پسند کرتے ہیں وہ دین داری ہے؟ اس کے تو یہی معنی ہوئے کہ وہ چیز جو ان کے ہاں مقبول ہے؟ کیوں؟

یوتھائفرو۔ ٹھیک ہے۔

سقراط۔ تو پھر یا تو ہمارا پہلا قول غلط تھا اور اگر وہ صحیح تھا تو پھر یہ غلط ہے۔

یوتھائفرو۔ ہاں دونوں میں سے ایک ہی صحیح ہو سکتا ہے

سقراط۔ تو پھر ہمیں نئے سرے سے شروع کرنا چاہیے اور یہ پوچھنا چاہیے کہ دین داری کیا چیز ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی تحقیق سے میں اپنے امکان بھر

کبھی باز نہ آؤں گا اور میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے جھڑکو نہیں بلکہ اس سوال پر پوری طرح غور کر کے مجھے سچی بات بتا دو۔ اس لیے کہ اگر کوئی شخص جاننے والا ہے تو وہ تمھیں ہو۔ لہٰذا میں پروٹیس کی طرح تمھیں اس وقت تک نہیں جانے دوں گا جب تک تم مجھے یہ نہ بتاؤ گے۔ اگر تمھیں دین داری اور بے دینی کی حقیقت پورے طور پر معلوم نہ ہوتی تو تم ہرگز ایک مزدور کی حمایت میں اپنے بوڑھے باپ پر قتل کا الزام نہ لگاتے۔ تم اس خطرے میں نہ پڑتے کہ دیوتاؤں کی نظر میں گنہ گار ٹھیرو اور اس کا خیال کرتے کہ دنیا کیا کہے گی۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ تم دین داری اور بے دینی کی حقیقت سے واقف ہو۔ تو پھر بولو پیارے یوتھائفرو اور اپنا علم پوشیدہ نہ رکھو۔

یوتھائفرو۔ پھر کبھی سقراط۔ اب تو میں جلدی میں ہوں ٹھیر نہیں سکتا۔

سقراط۔ افسوس میرے رفیق تم مجھے اس مایوسی کی حالت میں چھوڑ جاؤ گے مجھے یہ امید تھی کہ تم مجھ کو دین داری اور بے دینی کی حقیقت بتا دو گے اور اگر ایسا ہوتا تو میں میلیٹس کے مقابلے میں اپنی صفائی پیش کر سکتا۔ میں اس سے کہتا کہ یوتھائفرو نے مجھے ہدایت کی راہ دکھا دی ہے اور میں نے ان ناعاقبت اندیشانہ بدعات اور توہمات سے توبہ کر لی ہے جن میں محض جہالت کی وجہ سے مبتلا ہو گیا تھا۔ اب میں ایک بہتر زندگی شروع کرنے والا ہوں۔

صفائی کا بیان

معلوم نہیں اے اہل ایتھنس ان مدعیوں کی تقریر کا تم پر کیا اثر ہوا۔ البتہ اپنے متعلق میں جانتا ہوں کہ میں تو قریب قریب یہی بھول گیا کہ میں کون ہوں۔ اس قدر موثر ان کی تقریر تھی مگر اس کے باوجود اس کا ایک لفظ بھی سچ نہیں۔ یوں تو انھوں نے بہت سی جھوٹی باتیں کہیں مگر ایک بات ایسی تھی کہ میں حیرت میں رہ گیا یعنی جب انھوں نے یہ کہا کہ تمھیں ہوشیار رہنا چاہیے اور میری خطابت کے زور سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ ان کی یہ بات اس حالت میں جب کہ انھیں یقین تھا کہ جیسے ہی میں بولنا شروع کردوں گا ان کا جھوٹ کھل جائے گا اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ میں ہرگز اچھا مقرر نہیں ہوں مجھے بڑی شرمناک معلوم ہوئی۔ ہاں اگر خطابت کے زور سے وہ حق کی قوت مراد لیتے ہوں تو اور بات ہی۔ اگر ان کا مطلب یہ ہی تو مجھے اعتراف ہی کہ میں خطیب ہوں۔ لیکن میری اور ان کی خطابت میں زمین آسمان کا فرق ہی۔ خیر جیسا کہ میں کہہ رہا تھا، انھوں نے کوئی بات بھی سچی نہیں کہی۔ لیکن میں تمھارے سامنے سارا معاملہ سچ سچ بیان کردوں گا۔ اگرچہ میں ان کی طرح کوئی پہلے سے تیار کی ہوئی مرصع تقریر نہیں کروں گا۔ نہیں خدا کی قسم، میں تو صرف وہی الفاظ اور دلیلیں استعمال کروں گا جو مجھے وقت کے وقت سوجھیں گی۔ اس لیے کہ مجھے اپنے معاملے کی سچائی پر بھروسا ہی۔ اے اہل ایتھنس اس عمر میں مجھے یہ بات زیب نہیں دیتی کہ ایک نوجوان خطیب کے انداز میں تمھارے سامنے آؤں۔ کوئی مجھ سے اس کی توقع نہ رکھے اور مجھے تم سے ایک درخواست کرنی ہی، اگر میں اپنی صفائی اسی انداز میں پیش کروں جس کا میں عادی ہوں اور تم میری زبان سے وہی الفاظ سنو جو ہیں بازار میں، صرافوں کی دکانوں پر، یا کسی اور

جگہ استعمال کرتا ہوں تو مہربانی کرکے اس پر تعجب نہ کرنا اور میری بات نہ کاٹنا۔ میری عمر ستر برس سے اوپر ہو چکی ہے اور زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں عدالت کے سامنے آیا ہوں۔ اس لیے اس زبان سے جو یہاں بولی جاتی ہے بالکل ناواقف ہوں۔ مجھے سچ مچ ایک اجنبی سمجھو جسے تم اپنی زبان میں اپنے دیس کے طریقے کے مطابق گفتگو کرنے کی اجازت دے رہے ہو ـــ کیا میری یہ درخواست بیجا ہے؟ میرا طرزِ بیان اچھا ہو یا برا تم صرف میرے الفاظ کی سچائی کی طرف دھیان دو۔ کہنے والے کا کام ہے کہ سچی بات کہہ دے اور جج کا یہ کام ہے کہ انصاف سے فیصلہ کرے۔

سب سے پہلے مجھے پرانے الزاموں کا جواب دینا ہے جو پرانے مدعیوں کی طرف سے لگائے گئے ہیں۔ پھر بعد کے الزاموں کی طرف رجوع کروں گا۔ بہت سے لوگ ایک مدت سے میرے مدعی ہیں اور برسوں تک تمھارے سامنے مجھ پر جھوٹے الزام لگاتے رہے ہیں۔ میں ان سے زیادہ ڈرتا ہوں بہ نسبت اناٹیٹس اور اس کے ساتھیوں کے اگرچہ وہ بھی اپنی جگہ خطرناک ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ خطرناک یہ دوسرے لوگ ہیں جنھوں نے اس وقت سے الزام لگانا شروع کیے جب تم بچے تھے اور تمھارے دل میں یہ جھوٹی باتیں بٹھا دیں کہ سقراط ایک حکیم ہے، جو اوپر آسمانوں تک اور نیچے زمینوں تک خیال دوڑایا کرتا ہے اور غلط بات کو صحیح کر دکھاتا ہے۔ اس افواہ کے پھیلانے والے وہ مدعی ہیں جن سے میں ڈرتا ہوں، اس لیے کہ جو لوگ ان کی باتوں کو سنتے ہیں وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس طرح کی چھان بین کرنے والے دیوتاؤں کے وجود کے قائل نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت بڑی ہے، جو الزام انھوں نے مجھ پر لگائے ہیں وہ بہت قدیم ہیں اور اس وقت لگائے تھے جب تمھارے ذہن اب سے زیادہ اثر پذیر تھے۔ بچپن میں یا شاید نوجوانی میں۔ اور مقدمہ عدم پیروی میں فیصل ہو گیا تھا اس لیے کہ کوئی جواب دینے والا نہ تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے

کہ میں ان مدعیوں کے نام بھی تو نہیں جانتا بجز ایک فرحیہ نگار کے نام کے جو اتفاقاً معلوم ہو گیا۔ وہ سب لوگ جنھوں نے بغض و حسد کی وجہ سے تمھیں یہ باتیں یقین دلائی ہیں۔ اور ان میں سے بعض نے پہلے خود یقین کرلی ہیں۔ ان سے نبٹنا بہت مشکل ہے اس لیے کہ میں نہ انھیں یہاں بلوا سکتا ہوں اور نہ ان پر جرح کر سکتا ہوں۔ لہذا مجھے اپنی صفائی کے لیے خیالی دشمنوں سے لڑنا پڑے گا اور اس حالت میں بحث کرنی پڑے گی کہ کوئی جواب دینے والا نہیں۔ غرض آپ یہ بات مان لیجیے کہ جیسا میں کہہ رہا تھا میرے حریف دو قسم کے ہیں۔ ایک نئے اور دوسرے پرانے اور غالباً آپ بھی اس بات کو مناسب سمجھیں گے کہ پہلے میں پرانے حریفوں کا جواب دوں اس لیے کہ ان کے الزامات تم لوگوں نے بہت پہلے سے سنے ہیں اور بار بار سنے ہیں۔

اچھا تو اب مجھے اپنی صفائی پیش کرنی ہے اور یہ کوشش کرنی ہے کہ جو بدنامی بہت دن سے چلی آتی ہے اُسے تھوڑی سی دیر میں دور کر دوں۔ خدا مجھے کامیاب کرے بشرطیکہ یہ کامیابی میرے اور تمھارے لیے مفید ہو یا مجھے اس سے اپنے مقصد میں مدد ملے۔ یہ کام کچھ آسان نہیں ہے۔ میں اس کی نوعیت کو اچھی طرح جانتا ہوں اس لیے انجام کو خدا پر چھوڑ کر قانون کے حکم کے مطابق میں اپنی صفائی پیش کرتا ہوں۔

میں بالکل ابتدا سے شروع کروں گا اور سب سے پہلے یہ پوچھوں گا کہ وہ کون سا الزام ہے جس کی وجہ سے میری اتنی بدنامی ہوئی ہے اور جس نے میلیٹس کو مجھ پر یہ مقدمہ چلانے کی ہمت دلائی ہے؟ ہاں تو یہ بدنام کرنے والے کیا کہتے ہیں؟ ان لوگوں کو مستغیث مان کر میں ان کی گفتگو کا خلاصہ ایک حلفیہ بیان کی شکل میں پیش کرتا ہوں۔ "یہ سقراط بڑا پاپی ہے اور عجیب و غریب آدمی ہے۔ وہ زمین و آسمان کی ہر چیز کا کھوج لگانا چاہتا ہے، غلط بات کو صحیح کر دکھاتا ہے اور دوسروں کو بھی انھی

خیالات کی تعلیم دیتا ہی"۔ یہ ہی ان کا الزام - یہ وہی بات ہی جو تم نے خود ارسٹوفینیس کے فرحیہ ناٹک میں دیکھی ہوگی - اس نے ایک شخص سقراط کا ذکر کیا ہی جو یہ دعویٰ کرتا پھرتا ہی کہ وہ ہوا پر چل سکتا ہی اور ان مسائل کے متعلق بہت کچھ بکواس کرتا ہی جن میں مجھے کبھی دخل نہیں - اگرچہ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں فلسفۂ طبعی کے جاننے والوں کو حقیر سمجھتا ہوں۔ اگر میلیٹس مجھ پر یہ الزام لگائے تو مجھے سخت افسوس ہوگا مگر یہ بالکل سچی بات ہی اے اہل ایتھنس، کہ مجھے مسائل سے کوئی سروکار نہیں جو لوگ یہاں موجود ہیں ان میں سے اکثر اس کی تصدیق کر سکتے ہیں اور ان سے میں اس کی التجا کرتا ہوں۔ وہ لوگ جنھیں میری گفتگو سننے کا اتفاق ہوا ہی اپنے قریب کے لوگوں کو یہ بتائیں کہ کیا انھوں نے کبھی مجھے ان مسائل پر بالاجمال یا بالتفصیل تقریر کرتے سنا ہی۔ تم نے ان کا جواب سن لیا اور جو کچھ وہ الزام کے اس حصّے کے متعلق کہہ رہے ہیں اس سے تمھیں بقیہ حصوں کی حقیقت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

اس افواہ کی بھی کوئی اصلیت نہیں کہ میں معلم ہوں اور روپیہ لے کر پڑھاتا ہوں۔ یہ الزام بھی پہلے الزام کی طرح غلط ہی۔ حالانکہ اگر کوئی شخص واقعی ان انسانوں کو تعلیم دے سکے تو میرے خیال میں تعلیم کے بدلے روپیہ لینا اس کے لیے باعث فخر ہی۔ دیکھو نہ یہ گورگیاس لیونتیمی، پروڈیکس کیوسی، اور ہپیاس ایلیسی شہر شہر پھرتے ہیں اور انھوں نے نوجوانوں پر ایسا اثر ڈالا ہی کہ وہ اپنے شہر والوں کو چھوڑ کر جو انھیں مفت پڑھا دیتے، ان لوگوں کے پاس آتے ہیں اور نہ صرف انھیں روپیہ دیتے ہیں بلکہ ان کے شکر گزار ہوتے ہیں کہ انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ آج کل ایک پیریائی فلسفی ایتھنس میں ٹھہرا ہوا ہی جس کا ذکر میرے کانوں تک پہنچا اور وہ اس طرح کہ مجھے ایک شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا جس نے سوفسطائیوں پر بے شمار روپیہ خرچ کیا ہی یعنی ہپانکس کا بیٹا کیلیاس۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے دو بیٹے ہیں اس لیے

میں نے اُس سے پوچھا "کیلیاس اگر تمھارے دونوں بیٹے بچھڑے یا بچھیڑے ہوتے تو ان کی نگرانی کے لیے کسی شخص کو ڈھونڈنا مشکل نہ تھا۔ غالباً ہم کسی چابک سوار کو یا کسان کو رکھ لیتے جو ان کی تربیت کرتا اور انھیں ان کا مخصوص ہنر سکھاتا۔ لیکن وہ تو انسان کے بچے ہیں اس لیے یہ بتاؤ کہ تم کس کو ان کا نگراں مقرر کرو گے؟ کوئی ایسا آدمی ہے جو انسانی ہنر اور سیاسی ہنر سے واقف ہو؟ تم نے تو اس معاملے پر غور کیا ہوگا اس لیے کہ تم بیٹوں والے ہو۔ کیا کوئی ایسا آدمی موجود ہے؟" اس نے جواب دیا۔ "ہاں ہے"۔ میں نے پوچھا "وہ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ کیا فیس لیتا ہے؟" اس نے کہا "وہ شخص ایوینس پیریائی ہے اور اس کی فیس پانچ مینے ہے۔" میں نے اپنے دل میں سوچا کہ مبارک ہے یہ ایوینس اگر واقعی اس قدر عالم فاضل ہے اور اتنی کم فیس پر پڑھاتا ہے۔ اگر مجھ میں یہ قابلیت ہوتی تو مجھے اس پر بڑا گھمنڈ ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس قسم کے علم سے بالکل کورا ہوں۔

شاید اے اہل ایتھنس تم میں سے کوئی یہ جواب دے "یہ تو ٹھیک ہے سقراط مگر تم پر جو الزام لگائے جاتے ہیں آخر ان کی وجہ کیا ہے۔ کوئی تو انوکھی حرکت ہوگی جو تم نے کی ہوگی؟ تمھارے بارے میں یہ افواہیں کبھی مشہور نہ ہوتیں اگر تم اوروں کی طرح ہوتے۔ ہمیں بتاؤ کہ ان کا کیا سبب ہے اس لیے کہ اگر ہم نے تمھارے معاملے کا فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام لیا تو ہمیں بہت افسوس ہوگا۔" میرے خیال میں یہ ایک معقول سوال ہے اور میں تمھیں یہ سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ میرے حکیم کہلانے کی اور اس قدر بدنام ہوجانے کی کیا وجہ ہے۔ مہربانی کرکے غور سے سنو۔ شاید تم میں سے بعض یہ سمجھیں کہ میں مذاق کر رہا ہوں لیکن میں ایمان سے کہتا ہوں کہ جو کچھ میں تمھارے سامنے بیان کروں گا وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔ اے اہل ایتھنس! میری اس شہرت کی بنیاد ایک قسم کی حکمت ہے جو واقعی مجھ میں موجود ہے۔ اگر تم مجھ سے

پوچھو کہ کس قسم کی حکمت، تو میں جواب دوں گا کہ وہ حکمت جس کا حاصل کرنا شاید انسانوں کے امکان میں ہے اور اس حد تک میں اپنے آپ کو حکیم سمجھتا ہوں۔ لیکن جن لوگوں کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ایک فوق انسانی حکمت کے مالک ہیں جسے میں شاید بیان بھی نہ کر سکوں اس لیے کہ مجھ میں وہ موجود ہی نہیں اور جو شخص کہتا ہے کہ ہے وہ جھوٹ بولتا ہے اور مجھے بدنام کرتا ہے۔ یہاں اہلِ ایتھنس مجھے تم سے یہ درخواست کرنی ہے کہ مہربانی کر کے میری بات نہ کاٹنا چاہے میرے الفاظ تمھیں کتنے ہی مبالغہ آمیز معلوم ہوں۔ اس لیے کہ جو کچھ میں کہوں گا وہ میرا قول نہیں ہے میں ایک ایسے گواہ کا حوالہ دوں گا جو یقیناً قابلِ اعتبار ہے۔۔ یہ گواہ ڈیلفی کا دیوتا ہے وہ تمھیں بتائے گا کہ مجھ میں حکمت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس قسم کی۔ تم شیریفون کو تو جانتے ہو گے۔ وہ میرا بھی دوست تھا اور تمھارا بھی، اس لیے کہ جو لوگ حال میں جلاوطن کیے گئے تھے ان میں وہ بھی شامل تھا اور تمھارے ساتھ ہی واپس آیا تھا۔ تمھیں معلوم ہے کہ یہ شیریفون جو کام کرتا تھا بے دھڑک کر گزرتا تھا۔ ایک بار وہ ڈیلفی گیا اور اس نے پیش گوئی کرنے والے دیوتا سے بڑی بیباکی سے پوچھا ـــــ جیسا میں کہہ چکا ہوں مہربانی کر کے میری بات نہ کاٹنا ـــــ اس نے دیوتا سے پوچھا کہ کیا کوئی شخص سقراط سے زیادہ دانشمند ہے اور پتھیا کی دیوی نے جواب دیا کہ نہیں کوئی اس سے زیادہ دانشمند نہیں۔ شیریفون خود تو مر چکا ہے مگر اس کا بھائی عدالت میں موجود ہے اور وہ میرے قول کی تصدیق کرے گا۔

تم پوچھتے ہو کہ میں نے اس بات کا ذکر کیوں کیا؟ اس لیے کہ میں تمھیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ میرے اس قدر بدنام ہونے کی وجہ کیا ہے۔ میں نے جب یہ جواب سنا تو اپنے دل میں کہا کہ آخر دیوتا کا مطلب کیا ہے اور یہ معما کیا ہے؟ اس لیے کہ مجھے تو معلوم ہے کہ مجھ میں دانش و حکمت تھوڑی نہ بہت سرے سے ہے ہی نہیں پھر

آخر اس کے اس قول کے کیا معنی ہیں کہ میں سب انسانوں سے زیادہ دانشمند ہوں؟ بہرحال وہ دیوتا ہے جھوٹ تو بول نہیں سکتا۔ یہ تو اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد اس بات کو آزمانے کا ایک طریقہ سمجھ میں آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر مجھے کوئی اپنے سے زیادہ دانشمند آدمی مل جائے تو اس قول کے خلاف ایک دلیل ہاتھ آجائے گی اور میں اسے لے کر دیوتا کے سامنے جا سکوں گا۔ میں اس سے کہوں گا "دیکھو یہ شخص مجھ سے زیادہ دانشمند ہے تم نے تو کہا تھا کہ میں سب سے زیادہ دانشمند ہوں۔" چنانچہ میں ایک شخص کے پاس گیا جو دانشمند مشہور تھا اور اسے ٹٹولا ـــــ اس کا نام بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک سیاسی لیڈر تھا جسے میں نے امتحان کے لیے چنا تھا ـــــ تو یہ نتیجہ نکلا: اس سے باتیں کرنے کے بعد مجھے یہ رائے قائم کرنی پڑی کہ حقیقت میں وہ دانشمند نہیں ہے اگرچہ بہت سے لوگ اُسے دانشمند سمجھتے ہیں اور سب سے زیادہ وہ خود اپنے کو سمجھتا ہے۔ میں نے اُسے یہ سمجھانا چاہا کہ وہ اپنے کو دانشمند سمجھتا ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا اور کئی اور آدمی بھی جو وہاں موجود تھے اور میری باتیں سُن رہے تھے میرے دُشمن ہو گئے۔ اس لیے میں اپنے دل میں یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا: یوں تو غالباً ہم دونوں میں سے ایک کو بھی کسی اچھی اور معقول چیز کا علم حاصل نہیں ہے مگر اس سے میں پھر بھی بہتر ہوں۔ اس لیے کہ وہ کچھ نہیں جانتا مگر سمجھتا یہ ہے کہ جانتا ہے اور میں نہ کچھ جانتا ہوں اور نہ یہ سمجھتا ہوں کہ کچھ جانتا ہوں۔ گویا اس اعتبار سے میں اُس کے مقابلے میں کسی قدر فائدے میں ہوں۔ اس کے بعد میں ایک اور شخص کے پاس گیا جسے اس سے بھی بڑھ کر دانشمندی کا دعویٰ تھا اور پھر اسی نتیجے پر پہنچا۔ اس طرح وہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے لوگ میرے دُشمن ہو گئے۔

اسی طرح ایک ایک کرکے میں لوگوں کے پاس جاتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میرے دشمن بڑھتے جاتے ہیں، اور یہ میرے لیے بہت افسوس اور اندیشے کی بات تھی، لیکن میں بالکل مجبور تھا —— دیوتا کے قول کا لحاظ سب چیزوں پر مقدم تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا مجھے بہرحال ان سب لوگوں کے پاس جو بظاہر علم رکھتے ہیں جانا ہے اور دیوتا کے قول کے معنی سمجھنا ہے اور میں قسمیہ کہتا ہوں اے اہل ایتھنس! مقدس کتے کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے تمھارے سامنے سچی بات کہنا چاہیے — کہ اس چھان بین کا نتیجہ یہ نکلا: میں نے دیکھا کہ جن لوگوں کی سب سے زیادہ شہرت ہے وہی سب سے زیادہ بے وقوف ہیں اور جو لوگ معزز نہیں ہیں وہ حقیقت میں ان سے بہتر اور زیادہ دانشمند ہیں۔ میں تمھیں اپنی تگ و دو کا، جسے میں ہرکولیس کی ہفتخواں کہہ سکتا ہوں، قصہ سناتا ہوں۔ ان مصیبتوں کے برداشت کرنے کے بعد آخر یہی معلوم ہوا کہ دیوتا کا قول ناقابل تردید ہے۔ سیاسی لیڈروں کے بعد میں شاعروں کے پاس گیا، جن میں المیہ، ہجویہ اور ہر قسم کے شاعر شامل تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے اپنے دل میں کہا، اب تو فوراً پکڑا جائے گا، اب تجھے پتا چل جائے گا کہ تو ان سے زیادہ جاہل ہے۔ غرض میں نے ان کے کلام کے کچھ ٹکڑے جو سب سے زیادہ دقیق تھے، لے کر ان سے پوچھا کہ ان کے کیا معنی ہیں —— اس امید میں کہ میں ان سے کچھ حاصل کروں گا۔ یقین مانو، مجھے یہ کہتے ہوئے شرم سی آتی ہے، مگر مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں ان میں سے ہر شخص ان کی شاعری کے متعلق اس سے بہتر گفتگو کرتا ہے جیسی کہ انھوں نے خود کی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ شاعر حکمت کے ذریعے سے شعر نہیں کہتے بلکہ ایک طرح کے الہام کے ذریعے سے۔ ان کا حال کاہنوں کا سا ہے جو بہت سی اچھی باتیں کہتے ہیں لیکن ان کا مطلب نہیں سمجھتے۔ شاعروں کی بھی مجھے کچھ یہی صورت نظر آئی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ دیکھا کہ اپنی شاعری کے بل پر

وہ اپنے آپ کو دوسری چیزوں میں بھی دانشمند سمجھتے ہیں جن میں انھیں کوئی دخل نہیں۔ اس لیے میں ان سے رخصت ہوگیا اور میں نے یہ سمجھ لیا کہ جس وجہ سے میں سیاسی لیڈروں سے افضل ہوں اسی وجہ سے ان سے بھی افضل ہوں۔

آخر میں صناعوں کے پاس گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ان کے سامنے گویا بالکل ہی کورا ہوں اور یہ یقین تھا کہ انھیں بہت سے ہنر آتے ہیں۔ اور اس معاملے میں میری رائے غلط نہ تھی۔ اس لیے کہ وہ واقعی بہت کچھ جانتے تھے جو میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ صناع بھی اسی غلطی میں مبتلا ہیں جس میں شاعر مبتلا ہیں۔ چونکہ وہ اچھے کاریگر تھے اس لیے یہ سمجھتے تھے کہ وہ ہر قسم کے اہم مسائل کا علم رکھتے ہیں۔ ان کے اس نقص نے ان کی ساری دانشمندی کو چوپٹ کر دیا تھا اس لیے میں نے پیش گوئی کرنے والے دیوتا کی طرف سے اپنے آپ سے یہ سوال کیا کہ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ جیسا اب ہے ویسا ہی رہے یعنی ان کے علم اور ان کے جہل دونوں سے محروم رہے یا یہ چاہتا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں ان کی طرح ہو جائے۔ اور میں نے اپنے آپ کو اور دیوتا کو یہ جواب دیا کہ میں جیسا ہوں ویسا ہی اچھا ہوں۔

اس احتساب کی وجہ سے میرے بہت سے سخت اور خطرناک دشمن پیدا ہو گئے ہیں اور مجھ پر طرح طرح کی تہمتیں لگائی جاتی ہیں۔ میں حکیم کہلاتا ہوں اس لیے کہ جو لوگ میری گفتگو سنتے ہیں وہ اپنے دل میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جس حکمت کی کمی میں دوسروں میں پاتا ہوں وہ خود مجھ میں موجود ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے اے اہل ایتھنس! کہ خدا کے سوا اور کوئی حکیم نہیں اور اپنے جواب میں اُسے یہ دکھانا منظور ہے کہ انسانوں کی حکمت کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی اصل میں وہ سقراط کا ذکر نہیں کرتا ہے بلکہ میرے نام کو محض مثال کے طور پر استعمال کرتا ہے گویا یہ کہتا ہے کہ اے انسانو تم میں سب سے زیادہ دانشمند وہ شخص ہے جو سقراط کی طرح یہ جانتا ہے کہ اس کی حکمت در اصل کوئی قیمت

نہیں رکھتی۔ لہٰذا میں دیوتا کے حکم کی تعمیل میں دنیا بھر میں مارا مارا پھرتا ہوں اور جو شخص خواہ وہ شہر کا ہو یا باہر کا، دیکھنے میں دانشمند معلوم ہوتا ہے اس کی دانشمندی کی چھان بین کرتا ہوں اور اگر وہ دانشمند نہ ہو تو دیوتا کے قول کو صحیح ثابت کرنے کے لیے میں اس پر یہ ثابت کر دیتا ہوں کہ وہ دانشمند نہیں ہے۔ میں ہر وقت اپنی دھن میں لگا رہتا ہوں اور مجھے نہ ملکی معاملات کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہے نہ ذاتی کاروبار کی طرف، بلکہ دیوتا کی اطاعت میں مصروف رہنے کی وجہ سے میں بالکل مفلس ہو گیا ہوں۔

ایک اور بات بھی ہے۔ دولت مند طبقے کے نوجوان جنھیں کچھ زیادہ کام نہیں ہے خود بخود میرے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کو شوق ہے کہ جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کی جانچ ہوتے ہوئے دیکھیں۔ کبھی کبھی وہ میری نقل کرتے ہیں اور خود بھی دوسروں کی جانچ کرنے لگتے ہیں۔ انھیں بہت جلد یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ بہت کثرت سے ایسے لوگ موجود ہیں جن کو یہ زعم ہے کہ وہ کچھ جانتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اور وہ لوگ جن کی اس طرح جانچ کی جاتی ہے، ان نوجوانوں سے خفا ہونے کے بجائے مجھ سے خفا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ کمبخت سقراط، یہ نوجوانوں کو بہکانے والا مفسد! اور اگر کوئی ان سے پوچھے کہ کیوں وہ کون سی بری بات کرتا ہے یا سکھاتا ہے تو وہ کچھ جواب نہیں دے سکتے لیکن اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لیے وہ ان ترشے ترشائے الزاموں کو دہرا دیتے ہیں جو سب فلسفیوں پر لگائے جاتے ہیں۔ مثلاً آسمان کے اوپر اور زمین کے نیچے کی چیزوں کے متعلق درس دینا، دیوتاؤں پر عقیدہ نہ رکھنا اور غلط بات کو صحیح کر دکھانا۔ اس لیے کہ وہ اس بات کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے کہ ان کے دعوائے علم کی قلعی کھل گئی ہے —— جو اصل وجہ ہے۔ چونکہ یہ لوگ تعداد میں بہت ہیں، منچلے اور مستعد ہیں، پرا باندھے لڑائی کے لیے تیار ہیں اور پھر موثر طرز بیان رکھتے ہیں، اس لیے انھوں نے شور مچا کر اور سخت سے سخت تہمتیں تراش کر تمھارے

کان میری طرف سے بھر دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے تینوں مدعی میلیٹس، اناٹیس اور لائکن مجھ پر حملہ کر رہے ہیں: میلیٹس شاعروں کی طرف سے لڑ رہا ہے۔ اناٹیس صناعوں اور سیاسی لیڈروں کی طرف سے اور لائکن فن خطابت کے ماہروں کی طرف سے اور جیسا کہ میں نے شروع میں کہہ دیا تھا مجھے امید نہیں رکھنی چاہیے کہ میں تہمتوں کے اس انبار کو دم بھر میں رد کر دوں گا۔ یہ ہے اے اہل ایتھنس! سچی بات اور پوری بات۔ نہ میں نے کوئی بات چھپائی ہے اور نہ اپنی طرف سے گھڑی ہے۔ پھر بھی میں یہ جانتا ہوں کہ وہ میری صاف گوئی کی وجہ سے مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو ان کی نفرت اس بات کا ثبوت ہے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اسی لیے میرے خلاف یہ تعصب پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے سوا کوئی وجہ نہیں جیسا کہ تمھیں اس تحقیقات سے یا اور کسی تحقیقات سے جو آیندہ کی جائے گی، معلوم ہو جائے گا۔

پہلی قسم کے مدعیوں کا میں کافی جواب دے چکا اب دوسری قسم والوں کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ ان کا سرگروہ میلیٹس ہے جو اپنے آپ کو ملک کا سچا دوست کہتا ہے۔ ان کے مقابلے میں بھی مجھے اپنی صفائی پیش کرنی ہے۔ آؤ اب ان کا حلفی بیان پڑھیں۔ اس کا مضمون کچھ اس قسم کا ہے: سقراط برے کام کرتا ہے، نوجوانوں کو بگاڑتا ہے، ریاست کے دیوتاؤں کو نہیں مانتا بلکہ الگ دیوتا رکھتا ہے۔ یہ ہے وہ الزام۔ اب ہم اس کی ہر مد پر الگ الگ غور کریں گے۔ وہ کہتا ہے کہ میں برے کام کرتا ہوں، نوجوانوں کو بگاڑتا ہوں مگر میرا یہ دعویٰ ہے اے اہل ایتھنس! کہ خود میلیٹس بہت برا کام کرتا ہے۔ اس معنی میں کہ وہ اس قدر سنجیدہ بنتا ہے حالانکہ محض مذاق کر رہا ہے اور جن چیزوں سے دراصل اسے کبھی سروکار نہ تھا ان میں جھوٹ موٹ جوش اور دلچسپی کا اظہار کرنے کے لیے لوگوں پر مقدمہ چلاتا ہے۔ اور اس دعوے کا ثبوت میں تمھارے آگے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

میلیٹس، تم ادھر آؤ تاکہ میں تم سے سوال پوچھوں۔ تم تو نوجوانوں کی اصلاح کے مسئلے پر بہت غور کیا کرتے ہو نہ؟

"ہاں کیا کرتا ہوں۔"

"تو ذرا ججوں کو یہ بتاؤ کہ ان کی اصلاح کرنے والا کون ہی؟ تمھیں تو یہ بات معلوم ہونی چاہیے اس لیے کہ ان کے بگاڑنے والے کا تم نے بڑی محنت سے پتا چلایا ہی اور میرے نوں کو نقل کرکے مجھے ججوں کے سامنے ملزم ٹھہرا رہے ہو تو پھر لو دتم ججوں کو یہ بتا دو کہ ان کی اصلاح کرنے والا کون ہی۔ اب تم خود ہی دیکھو میلیٹس کہ تم خاموش ہو اور تمھارے پاس کوئی جواب نہیں ہی۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں ہی اور اس سے میرے اس دعوے کا کافی ثبوت نہیں ملتا کہ تمھیں اس معاملے سے کوئی دل چسپی نہیں ہی؟ بولو میرے دوست ان کی اصلاح کرنے والا کون ہی۔"

"قوانین"۔

"مگر میرا یہ مطلب نہیں ہی مہربان، میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ شخص کون ہی جو ان قوانین کو جانتا ہی۔"

"یہ جج صاحبان، سقراط، جو عدالت میں تشریف رکھتے ہیں۔"

"کیا تمھارا یہ مطلب ہی میلیٹس کہ یہ لوگ نوجوانوں کی تربیت اور اصلاح کر سکتے ہیں۔"

"یقیناً کر سکتے ہیں۔"

یہ سب کے سب یا صرف ان میں سے چند؟

"سب کے سب۔"

"ہیری دیوی کی قسم، یہ تو بڑی اچھی بات ہی! ان کی اصلاح کرنے والے اس قدر کثرت سے ہیں اور حاضرین عدالت کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ کیا یہ بھی ان کی اصلاح کرتے ہیں؟"

"ہاں وہ بھی کرتے ہیں"

"اور مجلسِ واضعِ قوانین کے ارکین؟"

"وہ بھی۔"

"لیکن اسمبلی کے ممبر تو شاید انھیں بگاڑتے ہوں گے؟ — یا وہ بھی اصلاح کرتے ہیں؟"

"وہ بھی ان کی اصلاح کرتے ہیں"

"تو ایتھنس کا ہر باشندہ ان کی اصلاح کرتا ہے اور ان کی سیرت کو بلند کرتا ہے۔ بجز میرے۔ صرف میں ہی ان کا بگاڑنے والا ہوں؟ تم یہی کہتے ہو نہ؟"

"ہاں کہتا ہوں اور بہت زور کے ساتھ کہتا ہوں"

"اگر تمھارا کہنا ٹھیک ہے تو میں بہت ہی بدبخت آدمی ہوں۔ مگر میں تم سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ گھوڑوں کی بابت کیا کہتے ہو؟ کیا ایک شخص انھیں نقصان پہنچاتا ہے اور ساری دنیا انھیں فائدہ پہنچاتی ہے؟ کیا حقیقت اس کے بالکل برعکس نہیں ہے؟ اصل میں صرف ایک ہی شخص انھیں فائدہ پہنچا سکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ چند آدمی —— بس ایک چابک سوار تو انھیں فائدہ پہنچاتا ہے باقی اور سب لوگ جن سے انھیں سابقہ پڑتا ہے کسی قدر نقصان ہی پہنچاتے ہیں۔ کیا یہ بات گھوڑوں پر بلکہ ہر قسم کے جانوروں پر صادق نہیں آتی؟ یقیناً صادق آتی ہے چاہے تم اور اناٹیٹس اسے مانو یا نہ مانو۔ اب رہے نوجوان، تو اگر صرف ایک شخص ان کا بگاڑنے والا اور ساری دنیا ان کی اصلاح کرنے والی ہوتی تو ان کی خوش قسمتی کا کیا ٹھکانا تھا۔ مگر میلیٹس تم نے اس بات کا کافی ثبوت دے دیا ہے کہ تم نے نوجوانوں کے بارے میں ذرا سا بھی غور نہیں کیا۔ تمھاری بے پروائی اسی سے ظاہر ہوتی ہے کہ جن باتوں کا تم مجھ پر الزام لگاتے ہو ان کو سمجھنے کی بھی زحمت نہیں اٹھاتے۔

اور اب میلیٹس، میں تم سے ایک اور سوال پوچھوں گا ـــــ ذلیں کی قسم ضرور پوچھوں گا۔ کیا چیز اچھی ہے، بُرے شہریوں کے درمیان رہنا یا اچھے شہریوں کے درمیان؟ جواب دو میرے دوست، یہ تو ایسا سوال ہے جس کا جواب آسانی سے دیا جا سکتا ہے۔ کیا اچھے آدمی اپنے ہمسایوں کو فائدہ اور بُرے آدمی نقصان نہیں پہنچاتے؟"

"یقیناً"۔

اور کیا کوئی ایسا شخص ہے جو یہ چاہتا ہو کہ اس کے ساتھ رہنے والے اُسے فائدہ نہیں بلکہ نقصان پہنچائیں؟ جواب دو میرے اچھے دوست، قانون تمھیں جواب دینے پر مجبور کرتا ہے ـــــ کیا کوئی شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اُسے نقصان پہنچے؟"

"ہرگز نہیں"۔

"اور جب تم مجھ پر نوجوانوں کو بگاڑنے اور برباد کرنے کا الزام لگاتے ہو تو تم میرے اس فعل کو بالارادہ قرار دیتے ہو یا بلا ارادہ؟"

"بالارادہ"۔

مگر تم ابھی ابھی تسلیم کر چکے ہو کہ اچھے آدمی اپنے ہمسایوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور بُرے آدمی نقصان پہنچاتے ہیں۔ تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اس حقیقت کو تمھاری برتر عقل نے تو اس کمسنی میں معلوم کر لیا اور میں اس بڑھاپے میں اس قدر جاہل ہوں کہ اتنا بھی نہیں جانتا اگر میں ایک شخص کو جس کے ساتھ مجھے زندگی بسر کرنا چاہیے بگاڑوں گا تو بہت ممکن ہے کہ مجھے اس سے نقصان پہنچے۔ اس کے باوجود میں اسے بگاڑتا ہوں اور وہ بھی بالارادہ ـــــ یہ تمھارا قول ہے مگر نہ تم مجھے اس کا یقین دلا سکتے ہو اور نہ کسی اور شخص کو۔ ظاہر ہے کہ یا تو میں نوجوانوں کو بگاڑتا نہیں یا بگاڑتا بھی ہوں تو بلا ارادہ، اور دونوں صورتوں میں تمھارا قول غلط ہے۔ اگر میرا جرم بلا ارادہ ہے تو ایسے جرائم قانون کی حدِ سماعت میں نہیں آتے۔ تمھیں چاہیے تھا کہ تم مجھے

علیحدہ سمجھاتے اور تنبیہ کرتے اگر مجھے بہتر مشورہ ملتا تو جو کام محض بلا ارادہ کر رہا تھا اسے ترک کر دیتا ــــ یقیناً کر دیتا لیکن تم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا اور مجھے ہدایت کرنے میں بخل سے کام لیا۔ اور اب تم مجھے عدالت میں کھینچ لائے ہو، جو ہدایت کی جگہ نہیں بلکہ سزا کی جگہ ہے۔

اے اہل ایتھنس! تم پر یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ جیسا میں نے کہا تھا میلیٹس کو اس معاملے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ پھر بھی میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں میلیٹس کہ میں نوجوانوں کو کس طرح بگاڑتا ہوں۔ جہاں تک تمہارے استغاثے سے معلوم ہوتا ہے، شاید تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں انھیں یہ تعلیم دیتا ہوں کہ ان دیوتاؤں کو جنھیں ریاست مانتی ہے، نہ مانیں، بلکہ ان کی جگہ نئے دیوتاؤں یا نئی روحانی قوتوں کی پرستش کریں۔ اسی تعلیم کے ذریعے سے میں نوجوانوں کو بگاڑتا ہوں تم یہی کہتے ہو نہ؟

"ہاں کہتا ہوں اور بہت زور کے ساتھ کہتا ہوں"

تو تمھیں ان دیوتاؤں کی قسم میلیٹس جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں مجھے اور عدالت کو اپنا مطلب زیادہ صاف لفظوں میں سمجھا دو۔ کیونکہ میں اچھی طرح نہیں سمجھا کہ تمہارا کیا دعویٰ ہے۔ کیا تم یہ کہتے ہو کہ میں دوسروں کو بعض خاص دیوتاؤں کے ماننے کی تعلیم دیتا ہوں لہٰذا کچھ دیوتاؤں کا قائل تو ہوں، بالکل ملحد نہیں ہوں ــــ یہ الزام تم مجھ پر نہیں لگاتے۔ البتہ میرے دیوتا وہ دیوتا نہیں ہیں جنھیں ریاست تسلیم کرتی ہے ــــ یہی اصل الزام ہے۔ یا تمہارا یہ مطلب ہے کہ میں محض ملحد ہوں اور الحاد کی تعلیم دیتا ہوں؟"

"میرا یہی مطلب ہے۔ تم بالکل ملحد ہو۔"

"یہ تو تم نے عجیب و غریب بات کہی۔ آخر تم یہ کیوں سمجھتے ہو میلیٹس، کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ میں سورج اور چاند کو دیوتا نہیں مانتا جیسا کہ اور سب مانتے ہیں؟"

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں جج صاحبان کہ یہ شخص ان کو نہیں مانتا یہ کہتا ہے کہ سورج پتھر ہے اور چاند مٹی۔"

"میرے دوست میلیٹس، تم اپنے خیال میں انکساگورس کے خلاف دعویٰ دائر کر رہے ہو۔ تمھاری رائے ججوں کے متعلق بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہے اگر تم انھیں اتنا جاہل سمجھتے ہو کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ نظریات انکساگورس کلازومینی کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں بلکہ وہ ان سے بھری پڑی ہیں —— یہ خوب بات ہے کہ نوجوانوں کو اس قسم کی باتیں سکھانے کا الزام سقراط پر لگایا جاتا ہے حالانکہ یہ بہت کثرت سے تھیٹر میں دکھائی جاتی ہیں جس کا ٹکٹ زیادہ سے زیادہ ایک درم ہوتا ہے، یہ لوگ تھوڑے سے پیسے دے کر وہاں جا سکتے ہیں اور اگر سقراط دعویٰ کرے کہ یہ عجیب و غریب خیالات اس کے ہیں تو یہ اس کی ہنسی اڑائیں گے۔ تو میلیٹس تمھارا سچ مچ یہ خیال ہے کہ میں کسی دیوتا کو نہیں مانتا؟"

"میں زیوس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم کسی ایک کو بھی نہیں مانتے۔"

"کسی کو تمھارا کہنا یقین نہیں آئے گا، میلیٹس، اور غالباً تمھیں خود بھی یقین نہیں ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے اے اہل ایتھنس، کہ میلیٹس غیر ذمہ دار اور بے باک آدمی ہے اور اس نے جو کچھ اپنے استغاثے میں لکھا ہے محض لاابالی پن کے رنگ میں اور نوجوانوں کی طرح بہادری جتانے کے شوق میں۔ کہیں وہ مجھے آزمانے کے لیے پہیلی تو نہیں بجھا رہا ہے؟ اس نے اپنے دل میں کہا ہوگا: ذرا دیکھوں تو کہ دانشمند سقراط کو، اس مضحک تناقض کا، جو میرے بیان میں موجود ہے پتا چلتا ہے یا نہیں اور میں اس کو اور دوسروں کو دھوکا دے سکتا ہوں یا نہیں۔ کیونکہ میرے خیال میں تو اس کے استغاثے میں اس حد تک تناقض ہے گویا وہ یہ کہتا ہے کہ سقراط کا یہ قصور ہے کہ وہ دیوتاؤں کو نہیں مانتا اور پھر مانتا بھی ہے —— بھلا ایسی بات

کوئی سنجیدہ آدمی کہے گا۔

اے اہل ایتھنس، آؤ ہم سب مل کر اس چیز پر غور کریں جسے میں اس کے کلام کا تناقض سمجھتا ہوں، اور تم میلیٹس۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے جاؤ۔ اور میں حاضرین کو اپنی درخواست پھر یاد دلاتا ہوں کہ اگر میں اس طریقے سے گفتگو کروں جس کا میں عادی ہوں تو وہ مجھے نہ ٹوکیں۔

کیا کبھی ایسا ہوا ہے میلیٹس، کہ کوئی شخص انسانی چیزوں کو مانتا ہو اور انسانوں کے وجود کا قائل نہ ہو؟ . . . . میں یہ چاہتا ہوں اے اہل ایتھنس کہ وہ میرے سوالوں کا جواب دے اور بار بار میری تقریر میں خلل انداز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی شخص شہ سواری کا قائل ہو اور گھوڑوں کے وجود کا قائل نہ ہو یا بانسری بجانے کا قائل اور بانسری بجانے والوں کا منکر ہو۔ اچھا میرے دوست، تم جواب نہیں دیتے تو میں خود تمہارے سامنے جواب دیتا ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا، مگر اب مہربانی کر کے دوسرے سوال کا جواب دو کیا یہ ممکن ہے کہ انسان روحانی اور الٰہی قوتوں کا قائل ہو مگر روحوں کو یا دیوتاؤں کو نہ مانتا ہو؟

"نہیں یہ ناممکن ہے"۔

میں کیسا خوش قسمت ہوں کہ میں نے عدالت کی مدد سے تم سے یہ جواب لے ہی لیا مگر تم نے اپنے استغاثے میں حلفیہ بیان کیا ہے کہ میں الٰہی یا روحانی قوتوں پر (اس سے بحث نہیں کہ نئی یا پرانی) عقیدہ رکھتا ہوں اور اس کی تعلیم دیتا ہوں۔ تو بہر حال میں روحانی قوتوں کا قائل ہوں —— یہ تم اپنے حلفیہ بیان میں کہہ چکے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر میں روحانی اور الٰہی قوتوں کو مانتا ہوں تو کیا یہ لازم نہیں آتا کہ روحوں یا دیوتاروں کو بھی مانتا ہوں؟ یقیناً لازم آتا ہے۔

لہذا میں یہ فرض کیے لیتا ہوں کہ تمھاری خاموشی ــــ رضامندی ظاہر کرتی ہے۔

"اچھا تو یہ روحیں یا دیونار کیا ہیں؟ ظاہر ہے یا تو دیوتا یا دیوتاؤں کے بیٹے، ہے کہ نہیں؟"

"یقیناً"۔

اسی کو تو میں مضحکہ پہیلی کہتا ہوں جو تم نے گھڑی ہے۔ دیونار یا روحیں دیوتا ہیں اور تم پہلے تو یہ کہتے ہو کہ میں دیوتاؤں کو نہیں مانتا اور پھر یہ کہتے ہو کہ دیوتاؤں کو مانتا ہوں یعنی دیوتاروں کو۔ اس لیے کہ اگر دیونار دیوتاؤں کی ناجائز اولاد ہیں خواہ جل پریوں سے یا دوسری ماؤں سے ـــ تو دنیا میں کون شخص یہ کہے گا کہ دیوتاؤں کا تو کہیں وجود نہیں مگر یہ دیوتاؤں کے بیٹے موجود ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے تم خچروں کا وجود تسلیم کرو مگر گھوڑوں اور گدھوں کے وجود سے انکار کرو۔ ایسی مہمل بات میلیٹس تم نے یقیناً مجھے آزمانے کے لیے کہی ہوگی۔ اسے استغاثے میں داخل کرنے کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ تمھیں کوئی سچ مچ کا الزام مجھ پر لگانے کے لیے نہیں ملتا تھا۔ مگر تم کسی شخص کو جو ذرا سی بھی سمجھ رکھتا ہو، یہ یقین نہیں دلا سکتے کہ وہی لوگ جو الٰہی اور فوق انسانی چیزوں کے قائل ہیں دیوتاؤں اور دیوناروں یا سورماؤں کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔

میں نے میلیٹس کے الزام کے جواب میں جو کچھ کہا وہ بہت کافی ہے۔ صفائی پیش کرنے میں اس سے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں نے اپنے بہت سے دشمن پیدا کر لیے ہیں اور اگر میں تباہ ہوا تو میری تباہی کا باعث یہی ہوگا ـــ نہ تو میلیٹس اور اناٹیس بلکہ دنیا والوں کا حسد اور بدگوئی، جس کی وجہ سے بہت سے نیک آدمی مارے گئے اور ابھی اور بہت سے مارے جائیں گے۔ اس کا کوئی اندیشہ نہیں کہ یہ سلسلہ مجھ پر ختم ہو جائے گا۔

شاید کوئی شخص یہ کہے کہ سقراط تمھیں ایسی زندگی سے شرم نہیں آتی جس سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں تمھارا قبل از وقت خاتمہ نہ ہو جائے۔ اس کو میں بجا طور پر جواب دے سکتا ہوں، بھئی یہ تو تمھاری غلطی ہے، اگر انسان کسی کام کا ہے تو اسے مرنے جینے کی فکر نہیں کرنی چاہیے اُسے تو صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط ــــ اچھے آدمی کا کام ہے یا بُرے آدمی کا۔ تمھارے خیال میں تو وہ سورما جو لڑائی میں مارے گئے بالکل نکمّے تھے۔ خصوصاً تھیٹس کا بیٹا جو ذلّت کے خطرے کے آگے ہر خطرے کو ہیچ سمجھتا تھا اور جب ہیکٹر کو قتل کرنا چاہتا تھا تو اس کی ماں نے جو دیوی تھی، اس سے کہا کہ اگر اس نے اپنے رفیق پٹراکلس کا بدلہ لینے کے لیے ہیکٹر کو قتل کر دیا تو خود بھی مر جائے گا" تقدیر ہیکٹر کے ساتھ ہی تمھاری بھی منتظر ہے" یہ یا اسی قسم کے الفاظ اس نے کہے تھے۔ مگر اس کے بیٹے نے اس تنبیہ کے باوجود خطرے اور موت کو بالکل ہیچ سمجھا۔ وہ ان سے نہیں ڈرتا تھا مگر ذلّت کی زندگی بسر کرنے سے اور اپنے دوست کا بدلہ نہ لینے سے ڈرتا تھا۔ اس نے جواب دیا " مجھے اپنے دشمن سے بدلہ لے کر فوراً مر جانے دو۔ یہ اس سے اچھا ہے کہ میں ان چونچ دار جہازوں کے پاس بیٹھا رہوں، لوگوں کے تمسخر کا نشانہ اور زمین کا بوجھ بن جاؤں"۔ اچیلیس کو موت اور خطرے کی ذرا بھی پروانہ تھی اس لیے کہ جہاں انسان کی جگہ ہو، خواہ وہ اپنی خوشی سے وہاں کھڑا ہو یا کسی سردار نے کھڑا کیا ہو، وہیں اسے خطرے کے وقت قدم گاڑ دینے چاہئیں۔ اسے نہ موت کا خیال کرنا چاہیے نہ اور کسی چیز کا بلکہ صرف ذلّت سے بچنے کا۔ اس قول کو اے اہلِ ایتھنس، حرف بہ حرف سمجھو۔

اے اہلِ ایتھنس! جب ان سپہ سالاروں نے جنھیں تم نے پوٹیڈایا اور ایفی پولیس اور ڈیلیم میں میرا سردار مقرر کیا تھا مجھے حکم دیا تو میں اور لوگوں کی طرح

اپنی جگہ پر قدم جمائے موت کے مقابلے پر ڈٹا رہا کتنے تعجب کی بات ہوگی اگر اب جب کہ میرے خیال میں خدا مجھے یہ حکم دیتا ہے کہ میں ایک فلسفی کا فرض یعنی اپنے آپ کو اور دوسروں کو ٹٹولنے کا کام انجام دوں، موت کے یا کسی اور چیز کے ڈر سے میں اپنی جگہ کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں حقیقت میں یہ نہایت عجیب بات ہوگی اور مجھ پر عدالت میں یہ الزام بجا طور پر لگایا جا سکے گا کہ میں دیوتاؤں کے وجود کا منکر ہوں اگر میں نے موت کے خوف سے پیش گوئی کرنے والے دیوتا کے حکم سے سرتابی کی یہ سمجھ کر کہ میں دانشمند ہوں حالانکہ نہیں ہوں۔ کیونکہ موت سے ڈرنا محض نمایشی دانشمندی ہے حقیقی حکمت نہیں، گویا انسان ایک نامعلوم چیز کے معلوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے حالانکہ کوئی نہیں جانتا کہ موت جسے لوگ خوف کی حالت میں بدترین چیز سمجھتے ہیں کہیں بہترین چیز نہ ہو۔ کیا یہ جہالت کی شرمناک قسم نہیں ہے کہ جس چیز کو انسان نہیں جانتا اسے یہ سمجھتا ہے کہ میں جانتا ہوں؟ صرف اسی اعتبار سے میں اپنے آپ کو عام آدمیوں سے مختلف سمجھتا ہوں اور شاید ان سے زیادہ دانشمند ہونے کا دعوے بھی کر سکتا ہوں کہ گو میں دنیا کے متعلق بہت کم جانتا ہوں مگر مجھے یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ میں جانتا ہوں۔ پھر بھی اتنا مجھے معلوم ہے کہ جو اپنے سے بہتر ہو، خواہ وہ دیوتا ہو یا انسان، اس کی نافرمانی کرنا بری اور شرمناک بات ہے اور میں کبھی اس چیز سے خوف اور گریز نہیں کروں گا جس کے اچھے ہونے کا امکان ہے اس چیز کے مقابلے میں جس کے برے ہونے کا یقین ہے اس لیے اگر تم مجھے چھوڑ دو اور انائیٹس کی بات نہ مانو جس نے یہ کہا تھا کہ جب ایک بار سقراط پر مقدمہ چلایا گیا ہے تو اسے مار ڈالنا بہتر ہے (ورنہ پھر مقدمہ ہی نہ چلانا چاہیے تھا) اور اگر اب یہ بچ گیا تو تمہارے لڑکے اس کی باتیں سن کر بالکل بگڑ جائیں گے ـــــ اگر تم مجھ سے کہو کہ سقراط اب کی بار ہم انائیٹس کا کہنا نہیں سنتے اور تمہیں چھوڑے دیتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ آیندہ سے

تم اس طرح کا غور وفکر اور چھان بین نہ کرو اور اگر تم پھر یہ کرتے ہوئے پکڑے گئے تو قتل کر دیے جاؤ گے ـــــ اگر اس شرط پر تم مجھے چھوڑ دو تو میں یہ جواب دوں گا۔" اے اہل ایتھنس! میں تمھاری عزت اور تم سے محبت کرتا ہوں مگر میں تمھارے مقابلے میں خدا کے حکم کی تعمیل کروں گا اور جب تک میری جان میں جان اور بدن میں طاقت ہے فلسفے پر عمل کرنا اور اس کی تعلیم دینا نہیں چھوڑوں گا بلکہ جس سے ملوں گا اس سے اپنے انداز میں یہی کہوں گا۔ اے میرے دوست! جو اس عظیم الشان اور حکمت نشان شہر ایتھنس کے رہنے والے ہو تم کو شرم نہیں آتی کہ تم اس قدر دولت اور شہرت اور عزت حاصل کر رہے ہو مگر تمھیں حکمت اور حق کی مطلق فکر نہیں اور روحانی ترقی کا ذرا بھی خیال نہیں! لیکن اگر میرا مخاطب یہ کہے کہ مجھے تو ضرور خیال ہے تو یہ نہیں کہ میں فوراً اس کا پیچھا چھوڑ دوں بلکہ اس سے فوراً سوال کرنا اور جرح کرنا شروع کر دیتا ہوں اور اگر میں نے دیکھا کہ اس میں ذرا بھی نیکی نہیں ہے بلکہ صرف زبانی دعوے کرتا ہے تو میں اس کو برا کہتا ہوں کہ وہ بڑی چیز کی کم اور چھوٹی چیز کی زیادہ قدر کرتا ہے۔ اور جو کوئی مجھ سے ملے گا اس کے سامنے میں یہی الفاظ دہراؤں گا خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا شہر کا ہو یا باہر کا خصوصاً اپنے شہر والوں سے اس لیے کہ میرے بھائی ہیں، کیونکہ تم یہ جان لو کہ یہ خدا کا حکم ہے اور میرے خیال میں میں نے خدا کی جو خدمت کی ہے اس سے زیادہ مفید کوئی چیز ریاست کے لیے نہیں ہے۔ میرا تو بس یہی کام ہے کہ میں تم سب کو خواہ جوان ہوں یا بوڑھے، اس پر آمادہ کروں کہ تم اپنے جان و مال کی پروا نہ کرو بلکہ اپنی روحانی ترقی کو اس سے مقدم سمجھو۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ نیکی روپے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ نیکی سے روپیہ اور ہر وہ چیز جو انسان کے لیے اچھی ہے خواہ وہ ذاتی ہو یا عمومی، حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہے میری تعلیم۔ اگر یہی اصول نوجوانوں کو بگاڑتا ہے تو واقعی میں فتنہ پرداز آدمی ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہتا ہو کہ میری تعلیم اس کے سوا

کچھ اور ہے تو وہ بالکل غلط کہتا ہے اسی لیے اے اہل ایتھنس! میں تمھیں یہ جتائے دیتا ہوں کہ خواہ تم اناٹیٹس کے کہنے پر عمل کرو یا نہ کرو اور مجھے رہا کرو یا نہ کرو دونوں صورتوں میں یہ جان لو کہ میں اپنا طریقہ کبھی نہیں بدلوں گا خواہ مجھے ایک بار نہیں سو بار جان دینی پڑے۔

اے اہل ایتھنس! میری بات نہ کاٹو بلکہ جو کچھ میں کہتا ہوں اس کو سنو۔ ہمارے آپس میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ تم میری تقریر آخر تک سنو گے۔ مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے جسے سن کر شاید تم چیخ اٹھو۔ لیکن میرے خیال میں میری بات سننا تمھارے لیے اچھا ہوگا، اس لیے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ شور نہ مچانا۔ میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تم مجھ جیسے شخص کو مار ڈالو گے تو تمھیں اس سے زیادہ نقصان پہنچے گا جتنا کہ مجھے پہنچے گا۔ مجھے کسی سے بھی نقصان نہ پہنچے گا نہ میلیٹس سے اور نہ اناٹیٹس سے۔ ——— یہ بات ان کے امکان ہی میں نہیں۔ اس لیے کہ برا آدمی اپنے سے اچھے آدمی کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ ممکن ہے اناٹیٹس اس شخص کو قتل کر ڈالے یا جلاوطن کر دے یا شہری حقوق سے محروم کر دے اور وہ اپنے دل میں یہ سمجھے یا دوسرے یہ سمجھیں کہ وہ اسے سخت نقصان پہنچا رہا ہے مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں اس لیے کہ جو برا کام وہ کر رہا ہے یعنی دوسرے کی جان لینا ——— خود اس کے لیے اس سے کہیں زیادہ برا ہے۔

اے اہل ایتھنس! میں یہ بحث اپنے لیے نہیں کر رہا ہوں، جیسا کہ تم سمجھتے ہو بلکہ تمھاری خاطر، تاکہ تم مجھ کو، جسے خدا نے تمھیں دیا ہے، سزا دے کر گنہ گار نہ بنو کیونکہ اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو تمھیں میرا کوئی جانشین آسانی سے نہ ملے گا۔ اگر میں ایک مضحک تشبیہ استعمال کروں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک طرح کا ڈانس ہوں جو خدا نے ریاست کے لیے بھیجا ہے۔ اور ریاست ایک بہت بڑا اور شریف گھوڑا ہے جو بھاری پن

کی وجہ سے بہت سست ہی اور جسے اس کی ضرورت ہی کہ کوئی اسے ڈنک مار کر حرکت میں لائے۔ میں وہ ڈانس ہوں جسے خدا نے ریاست پر مسلط کر دیا ہی اور جو ہر وقت اور ہر جگہ تم کو ستاتا اور اکساتا، سمجھاتا اور تنبیہ کرتا رہتا ہی۔ تمھیں میرا جیسا آدمی آسانی سے نہ ملے گا۔ اسی لیے میں تمھیں یہ صلاح دیتا ہوں کہ مجھے چھوڑ دو۔ شاید تم جھلائے ہوئے ہو (اس شخص کی طرح جسے کوئی دفعتاً سوتے سے جگا دے) اور یہ سمجھتے ہو کہ تم اناٹیس کے مشورے کے مطابق مجھے آسانی سے قتل کر سکتے ہو اور اس کے بعد عمر بھر آرام سے سوتے رہو گے، بجز اس کے کہ خدا تمھارے بھلے کے لیے کوئی اور ڈانس بھیج دے۔ میں جو یہ کہتا ہوں کہ مجھے خدا نے تمھارے پاس بھیجا ہی تو میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہی اور وہ یہ ہی:- اگر میں اور لوگوں کی طرح ہوتا تو یہ نہ کرتا کہ برسوں تک اپنے کاروبار کی طرف سے غفلت برتوں، اسے تباہ ہوتے ہوئے دیکھوں اور تمھارا کام کرتا رہوں یعنی تم میں سے ہر ایک کے پاس باپ یا بڑے بھائی کی طرح، جا کر نیکی کی تلقین کروں۔ ایسا کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہوتا۔ اگر مجھے اس سے کوئی فائدہ ہوتا یا اس نصیحت کی کچھ فیس ملتی تو ایک بات بھی تھی۔ لیکن تم دیکھتے ہو کہ میرے مدعیوں کو بھی باوجود اپنی بے باکی کے یہ کہنے کی جرأت نہیں کہ میں نے کبھی کسی شخص سے فیس لی ہی یا مانگی ہو۔ اس کی ان کے پاس کوئی شہادت نہیں اور میرے پاس اپنے قول کی سچائی کی کافی شہادت ہی یعنی میرا افلاس۔

ممکن ہی کسی شخص کو تعجب ہو کہ یہ کیا بات ہی کہ میں ذاتی طور پر لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں اور ان کے معاملات میں دخل دیتا ہوں لیکن اس کی جرأت نہیں کرتا کہ سیاسی زندگی میں داخل ہو کر ریاست کو مشورہ دوں۔ میں تمھیں اس کی وجہ بتاتا ہوں۔ تم نے مختلف اوقات میں اور مختلف مقامات پر مجھے ایک الہام یا غیبی اشارے کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہی جو مجھ پر ظاہر ہوا کرتا ہی۔ یہی وہ دیوتا ہی

جس کا میلیٹس نے اپنے استغاثے میں مضحکہ اڑایا ہے۔ یہ اشارہ جو ایک قسم کی آواز ہے مجھے اس وقت سے محسوس ہونا شروع ہوا جب میں بچہ تھا۔ یہ ہمیشہ مجھے کسی بات سے منع کرتا ہے مگر کبھی کسی کام کے کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ یہی چیز مجھے سیاسیات میں داخل ہونے سے روکتی ہے اور میرے خیال میں اس کا روکنا بالکل بجا ہے۔ اس لیے کہ مجھے یقین ہے اے اہل ایتھنس! کہ اگر میں سیاسی کام کرتا تو کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا اور نہ تم کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا نہ اپنے آپ کو۔ اگر میں سچی بات کہوں تو خفا نہ ہونا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص جو تمھاری طرف سے یا کسی اور جماعت کی طرف سے جنگ کرے اور ان بے شمار خلاف قانون اور خلاف انصاف باتوں کی مخالفت کرے جو ریاست کی طرف سے ہوتی ہیں وہ سلامت نہیں رہ سکتا۔ جو شخص حق کی حمایت میں لڑنا چاہتا ہے اور تھوڑے دن زندہ بھی رہنا چاہتا ہے تو اسے سیاسی زندگی سے الگ ہی رہنا چاہیے۔

میں جو کچھ کہتا ہوں اس کا قطعی ثبوت دے سکتا ہوں صرف الفاظ ہی سے نہیں بلکہ اس چیز سے جس کی تم کہیں زیادہ قدر کرتے ہو یعنی عمل سے۔ میں تمھیں اپنی زندگی کا ایک واقعہ سناؤں گا جس سے تم پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ میں ہرگز موت کے خوف سے بے انصافی کے آگے سر نہ جھکاتا اور سر جھکانے سے انکار کرتا تو فوراً مار ڈالا جاتا۔ یہ عدالت کا قصہ جو میں تمھیں سناتا ہوں، کچھ ایسا دلچسپ تو نہیں مگر ہے بالکل سچا۔ اے اہل ایتھنس! مجھے عمر بھر میں صرف ایک بار سرکاری عہدہ نصیب ہوا یعنی سینٹ کی ممبری۔ انیٹوکی قبیلے کو جس سے مجھے تعلق ہے ان فوجی سرداروں کے مقدمے کی سماعت کرنی تھی جنھوں نے آرگینوسائی کی جنگ کے بعد لاشیں نہیں اٹھوائی تھیں۔ تم لوگوں کی یہ تجویز تھی کہ سب کے مقدمے کی سماعت ایک ساتھ کی جائے اور یہ بات بالکل خلاف قانون تھی جیسا تمھیں بعد میں معلوم ہوا۔ لیکن

اس وقت سینٹ کے ممبروں میں اکیلا میں ہی تھا جس نے اس خلاف قانون کارروائی کی مخالفت کی اور تمھارے خلاف ووٹ دیا۔ جب مقرروں نے دھمکایا کہ مجھے گرفتار کرکے مجھ پر مقدمہ چلائیں گے تو میں نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ چونکہ قانون اور انصاف میری طرف ہے اس لیے میں اس خطرے کا مقابلہ کروں گا بجائے اس کے کہ قید اور قتل کے خوف سے تمھاری بے انصافی میں شرکت کروں۔
یہ جمہوریت کے زمانے کا واقعہ ہے۔ لیکن جب تیس عمائد کی حکومت کا دور آیا تو انھوں نے مجھے اور چار اور شخصوں کو گول گھر بلوا کر لیون سالامی کو سلامس سے لانے کا حکم دیا اس لیے کہ وہ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ یہ ایک نمونہ تھا ان احکام کا جو وہ دیا کرتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو اپنے جرائم میں شریک کرلیں۔
تب میں نے نہ صرف قول سے بلکہ عمل سے ثابت کر دیا کہ مجھے موت کی ذرہ برابر پروا نہیں بلکہ صرف ایک بات کی فکر اور بہت بڑی فکر ہے کہ مجھ سے کوئی بُرا اور ناپاک فعل سرزد نہ ہونے پائے کیونکہ میں نے اس ظالم حکومت کی زبردست قوت سے ڈر کر ناجائز کام نہیں کیا۔ جب ہم لوگ گھر سے نکلے تو وہ چاروں آدمی تو سلامس جاکر لیون کو لائے مگر میں چپ چاپ اپنے گھر چلا آیا۔ ممکن تھا کہ اس کی وجہ سے میں قتل کر دیا جاتا اگر تھوڑے ہی دن بعد تیس عمائد کی حکومت کا خاتمہ نہ ہو گیا ہوتا۔ بہت سے لوگ میرے قول کی تصدیق کریں گے۔

اب یہ بتاؤ کہ تمھارے خیال میں میں اتنے دن زندہ رہ سکتا تھا اگر میں نے سیاسی زندگی اختیار کی ہوتی اور ایک نیک آدمی کی طرح حق پر قائم رہتا اور انصاف کو سب چیزوں سے مقدم سمجھتا؟ نہیں اے اہل ایتھنس! میرے لیے بلکہ ہر شخص کے لیے یہ بات ناممکن تھی۔ لیکن میں اپنے ہر فعل میں خواہ وہ عمومی ہو یا ذاتی ہمیشہ ایک ہی اصول پر قائم رہا اور نہ میں نے ان لوگوں کی خاطر جنھیں

لوگ، مجھ کو بدنام کرنے کے لیے، میرا پیرو کہتے ہیں نہ کسی اور کی خاطر اپنے اصول سے ہٹنے کی ذلت گوارا کی۔ دراصل میرے کوئی باقاعدہ پیرو نہیں ہیں۔ لیکن جب میں اس کام کو جس پر میں مامور ہوں انجام دے رہا ہوں اور کوئی شخص خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا، اگر میری گفتگو سننا چاہے تو میں اسے نہیں روکتا۔ یہ بھی نہیں کہ میں اُن لوگوں سے باتیں کرتا ہوں جو مجھے فیس دیتے ہیں بلکہ ہر شخص چاہے امیر ہو یا غریب، مجھ سے سوال جواب کر سکتا ہے اور میری بات چیت سن سکتا ہے اور وہ اچھا آدمی ثابت ہو یا بُرا دونوں میں سے کوئی چیز بھی انصافاً میری طرف منسوب نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ میں نے نہ کبھی کسی کو کچھ سکھایا اور نہ سکھانے کا دعوےٰ کیا۔ اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس نے کبھی مجھ سے کوئی ایسی بات سیکھی یا سنی ہے جو اور سب نے نہیں سنی تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔

مگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے گا آخر لوگ تم سے ہمیشہ اس قدر شوق سے باتیں کیوں کیا کرتے ہیں؟ اس کی ساری حقیقت اے اہل ایتھنس، میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ وہ مدعیان حکمت پر جرح ہوتے سننا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی دل لگی کی چیز ہے۔ لوگوں پر جرح کرنے کا فرض خدا کی طرف سے مجھ پر عائد ہوا ہے اور پیش گوئی، رویا، اور ہر اس طریقے سے جس سے کہ خدا کی مرضی انسانوں کو بتائی جاتی ہے مجھے اس کی خبر دی گئی ہے۔ یہ سچی بات ہے اے اہل ایتھنس، اور اگر سچی نہیں ہے تو اس کی تردید آسانی سے ہو سکتی ہے۔ اگر میں نوجوانوں کو بگاڑ رہا ہوں تو جو لوگ ان میں سے بالغ ہو چکے ہیں، اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی نوجوانی کے زمانے میں، میں نے انھیں غلط مشورہ دیا تھا، انھیں اب مستغیث کی حیثیت سے سامنے آنا چاہیے اور مجھ سے بدلہ لینا چاہیے، یا اگر وہ خود نہیں آنا چاہتے تو ان کے عزیز، باپ، بھائی وغیرہ کوئی یہ بتائیں کہ ان کے خاندان کو میرے ہاتھ سے کیا نقصان پہنچا ہے۔

یہ اُن لوگوں کے لیے بہت اچھا موقع ہے۔ اُن میں سے بہت سے مجھے یہاں عدالت میں نظر آرہے ہیں۔ میرا ہم وطن اور ہم عمر کریٹو بھی ہے اور اس کے بیٹے کریٹوبولس کو بھی دیکھ رہا ہوں اسفیٹس کا باپ لائیسینیاس اینٹیفی بھی موجود ہے اور ایپجینیس کا باپ انٹیفن سیفیسی بھی۔ ان کے علاوہ کئی شخص ان لوگوں کے جو میری صحبت میں رہا کرتے تھے، بھائی ہیں۔ مثلاً تھیوسڈوٹیڈیس کا بیٹا نکوسٹریٹس تھیوڈوٹس کا بھائی ہے (خود تھیوڈوٹس تو دنیا سے رخصت ہو چکا ہے اس لیے کم سے کم وہ تو اپنے بھائی کو روکنے کا نہیں) ڈیموڈوکس کا بیٹا پرلیس تھیاگس کا بھائی اور ارسٹن کا بیٹا اڈایمنٹس اور اس کا بھائی اپولوڈورس بھی نظر آرہا ہے۔ میں اور بہت سے لوگوں کا نام لے سکتا ہوں اور میلیٹس کو چاہیے تھا کہ اپنی تقریر کے ضمن میں ان میں سے بعض کو گواہوں کے طور پر پیش کرتا اور اگر اس وقت بھول گیا تھا تو اب بھی ـــــ میں اس کے لیے جگہ خالی کرنے کو تیار رہوں۔ اس سے پوچھو کہ اس قسم کی کوئی شہادت پیش کرسکتا ہے؟ نہیں اے اہل ایتھنس معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے یہ سب لوگ تو اس خاکسار کی طرف سے جو بقول میلیٹس اور انائیٹس کے، ان کا بگاڑنے والا اور ان کے عزیزوں کو نقصان پہنچانے والا ہے، شہادت دینے کو تیار ہیں۔ صرف بگڑے ہوئے نوجوان ہی نہیں ـــــ ان کی شہادت میں تو کوئی غرض بھی ہوسکتی ہے ـــــ بلکہ ان کے بن بگڑے بزرگ بھی۔ آخر وہ کس وجہ سے میری طرف سے شہادت دے رہے ہیں؟ ظاہر ہے محض حق اور انصاف کی خاطر وہ جانتے ہیں کہ میں سچ کہہ رہا ہوں اور میلیٹس جھوٹا ہے۔

میں تو اے اہل ایتھنس بالعموم اسی قسم کی صفائی پیش کرسکتا ہوں۔ ہاں ایک بات اور سن لو، شاید کوئی شخص مجھ سے اس وجہ سے خفا ہو کہ اسے یاد آرہا ہو کہ خود اس نے ایسی ہی یا اس سے کم اہم موقع پر رو رو کر ججوں کی منتیں کی تھیں،

اپنے بچوں کو عدالت میں پیش کیا تھا، جو کہ ایک دردناک منظر تھا اور بہت سے عزیزوں اور دوستوں کو سفارش کے لیے لایا تھا۔ مگر میں جس کی جان خطرے میں ہے اس قسم کی کوئی بات نہیں کر رہا ہوں۔ شاید اس فرق کا خیال کر کے وہ میرا دشمن ہو جائے اور غصّے میں میرے خلاف رائے دے دے۔ اگر تم میں کوئی ایسا شخص ہو ——— یاد رکھو میں نے یہ نہیں کہا کہ ہے ——— تو اسے میں بجا طور پر یہ جواب دے سکتا ہوں میرے دوست میں بھی انسان ہوں اور دوسرے انسانوں کی طرح گوشت اور خون کا بنا ہوا ہوں نہ کہ "پتھر اور لکڑی کا" جیسا ہومر نے کہا ہے میں بھی صاحب اولاد ہوں، اے اہل ایتھنس میرے تین بیٹے ہیں۔ ایک نوجوان ہے اور دو ابھی چھوٹے ہیں مگر میں ان میں سے کسی کو یہاں نہیں لاؤں گا کہ تم سے میری رہائی کی التجا کرے۔ جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ نہیں کہ مجھے اپنے اوپر گھمنڈ ہے یا تمھاری عزت میرے دل میں نہیں۔ میں موت سے ڈرتا ہوں یا نہیں یہ ایک جداگانہ سوال ہے جسے میں اس وقت نہیں چھیڑنا چاہتا، لیکن عام رائے کا لحاظ کرتے ہوئے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس قسم کی حرکت میرے لیے، تمھارے لیے اور ساری ریاست کے لیے باعث شرم ہوگی۔ جو شخص میری طرح بوڑھا ہو اور دانشمند مشہور ہو اُسے ایسی ذلت نہیں گوارا کرنی چاہیے خواہ میں اس بات کا مستحق ہوں یا نہ ہوں بہرحال ساری دنیا کی یہ رائے ہے کہ سقراط بعض باتوں کے لحاظ سے دوسروں سے افضل ہے اور اگر تم میں سے وہ لوگ جو حکمت، شجاعت یا کسی اور صفت میں دوسروں سے افضل سمجھے جاتے ہیں اپنے آپ کو اس طرح ذلیل کریں تو کس قدر شرمناک حرکت ہوگی۔ میں نے بڑے بڑے مشہور لوگوں کو دیکھا ہے کہ سزا کا حکم سننے کے بعد ان کا کچھ عجیب حال ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ مریں گے تو ان پر بڑی سخت مصیبت گزر جائے گی اور اگر تم نے ان کی جان

بخش دی تو ابد الآباد تک زندہ رہیں گے۔ میرے خیال میں ایسے لوگ خود ریاست کے لیے باعث ذلت ہیں۔ اگر کوئی شخص باہر سے آئے تو وہ ان کے متعلق یہی کہے گا کہ ایتھنس کے سر برآوردہ لوگ جنھیں خود اہل ایتھنس نے عزت اور حکومت دی ہے کسی طرح عورتوں سے بہتر نہیں ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ہم میں سے جو لوگ اچھی شہرت رکھتے ہیں انھیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہییں اور اگر وہ کرنا بھی چاہیں تو تم انھیں نہ کرنے دو۔ تم یہ ثابت کر دو کہ تم اس شخص کو سزا دینے پر زیادہ آمادہ ہو جو اس قسم کا دردناک سوانگ پیش کر کے شہر کو ہنسوائے بہ نسبت اس شخص کے جو خاموش رہے۔

لیکن عام رائے سے قطع نظر کر کے دیکھیے تب بھی یہ اچھا نہیں کہ ہم جج کی منتیں کر کے رہائی حاصل کر لیں بجائے اس کے کہ اسے واقعات بتائیں اور قائل کریں۔ اس کا کام انصاف کو تحفے کے طور پر بانٹنا نہیں، بلکہ فیصلہ کرنا ہے اور اس نے یہ حلف اٹھایا ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ قانون کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ ہمارے لیے تم کو اس دروغ حلفی پر آمادہ کرنا اور تمھارے لیے آمادہ ہونا ہرگز مناسب نہیں ہے اور اس کو دین داری نہیں کہا جا سکتا لہٰذا مجھ سے وہ کام کرنے کے لیے نہ کہو جسے میں ذلیل، ناپاک اور برا سمجھتا ہوں۔ خصوصاً اس وقت جب کہ میلیٹس کے استغاثے کی بنا پر مجھ پر بے دینی کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے اس لیے کہ اے اہل ایتھنس، اگر میں سمجھا بجھا کر اور منت سماجت کر کے تم کو اپنے حلف کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کر دوں تو گویا تمھیں اس عقیدے کی تلقین کروں گا کہ دیوتاؤں کا وجود نہیں ہے اور صفائی پیش کرنے کی کوشش میں اپنے اوپر یہ جرم ثابت کر لوں گا کہ میں ان کا قائل نہیں ہوں۔

لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے اس لیے کہ میں دیوتاؤں کو مانتا ہوں

اور اس سے برتر اور بلند تر معنی میں جس میں میرے مدعی مانتے ہیں، میں اپنا مقدمہ خدا پر اور تم لوگوں پر چھوڑتا ہوں تم جیسا اپنے لیے اور میرے لیے بہتر سمجھو ویسا فیصلہ کرو۔

اے اہل ایتھنس! کئی وجوہ سے مجھے اس کا رنج نہیں کہ تم نے کثرت رائے سے مجھے مجرم قرار دیا۔ مجھے پہلے ہی اس کی توقع تھی بلکہ اس بات پر تعجب ہے کہ رائیں قریب قریب برابر رہیں کیونکہ میرا خیال تھا کہ میرے خلاف بہت بڑی اکثریت ہوگی۔ مگر یہاں یہ صورت ہے کہ اگر تیس رائیں اِدھر کی اُدھر ہوگئی ہوتیں تو میں چھوڑ دیا جاتا۔ اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میلیٹس کے مقابلے میں تو میں بری ہو ہی گیا اس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ بغیر انائیٹس اور لائکن کی مدد کے اسے کل رائوں کا پانچواں حصہ بھی نہ ملتا جسے قانون نے ضروری قرار دیا ہے اور اس صورت میں وہ ہزار درہم جرمانے کا مستوجب ہوتا۔

اچھا تو وہ موت کی سزا تجویز کرتا ہے۔ اب یہ سوال ہے اے اہل ایتھنس! کہ میں اپنی طرف سے کیا تجویز کروں! ظاہر ہے وہی جس کا میں مستحق ہوں۔ کیا سلوک کیا جائے اس شخص سے جسے عمر بھر اتنی عقل نہ آئی کہ بیکار رہے اور کبھی اس نے ان چیزوں کی فکر نہ کی جن کی دوسروں کو فکر رہا کرتی ہے —— دولت اور خاندانی مفاد اور فوجی منصب اور جلسۂ عام میں تقریریں اور مجسٹریٹی اور سازشیں اور پارٹیاں۔ یہ سوچ کر کہ درحقیقت میں اتنا دیانت دار ہوں کہ اگر میں سیاسی آدمی بننا چاہوں تو لوگ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے میں نے وہ راہ اختیار نہیں کی جس میں اپنے آپ کو اور تم کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتا تھا بلکہ وہ جس میں شخصی طور پر تم میں سے ہر ایک کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کا امکان تھا میں نے

تم میں سے ہر شخص کو سمجھایا کہ ذاتی مفاد کی فکر کرنے سے پہلے اپنی ذات کی حقیقت پر غور کرو اور نیک و بد کو پہچانو، ریاست کے مفاد کی فکر کرنے سے پہلے ریاست کی ماہیت کو سمجھو، اور یہی ترتیب اپنے سب کاموں میں مدنظر رکھو۔ ایسے آدمی کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے؟ یقیناً کوئی اچھا سلوک، اے اہل ایتھنس اگر اسے صلہ دینا ہے تو وہ ایسا ہونا چاہیے جو اس کے لیے موزوں ہو۔

کون سا صلہ موزوں ہوگا ایک غریب آدمی کے لیے جو تمھارا محسن ہے اور جو اتنی فرصت چاہتا ہے کہ تمھیں ہدایت کر سکے؟ اے اہل ایتھنس! سب سے زیادہ مناسب صلہ یہ ہے کہ میں ریاست کے خرچ پر دیوان عام میں رکھا جاؤں۔ میں اس صلے کا کہیں زیادہ مستحق ہوں بہ نسبت اس شخص کے جس نے اولمپیا میں گھڑدوڑ یا رتھوں کی دوڑ میں (چاہے دو گھوڑوں کی رتھیں ہوں یا زیادہ کی) انعام حاصل کیا ہو۔ اس لیے کہ میں محتاج ہوں اور وہ آسودہ حال ہے، اور اس سے تمھیں محض نمائشی مسرت حاصل ہوتی ہے اور مجھ سے حقیقی مسرت۔ اگر مجھے انصاف کے ساتھ اپنی سزا تجویز کرنی ہے تو یہی کہنا چاہیے کہ ریاست کے خرچ پر دیوان عام میں رکھا جانا عین انصاف ہوگا۔

شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ جو کچھ میں اب کہہ رہا ہوں اور جو کچھ میں نے پہلے رونے اور گڑگڑانے کے بارے میں کہا تھا، وہ تمھارے ساتھ گستاخی ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ میں تو یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے یقین ہے میں نے کبھی کسی کے ساتھ جان بوجھ کر برائی نہیں کی، اگرچہ میں تمھیں یقین نہیں دلا سکا کیونکہ مجھے وقت بہت کم ملا۔ اگر ایتھنس میں یہ قانون ہوتا، جیسا دوسرے شہروں میں ہے کہ کسی سنگین مقدمے کا فیصلہ ایک دن میں نہیں ہونا چاہیے تو غالباً میں تمھیں یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر میں اتنے بڑے بڑے الزاموں کو دم بھر میں

رد نہیں کر سکتا۔ البتہ چونکہ مجھے یقین ہے کہ میں نے کسی اور کے ساتھ برائی نہیں کی اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ میں اپنے ساتھ برائی کروں۔ میں یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ میں کسی بُرے سلوک کا مستحق ہوں اور اپنے لیے کوئی سزا تجویز نہیں کروں گا۔ آخر کیوں کروں؟ اس لیے کہ میں سزائے موت سے جو میلیٹس نے تجویز کی ہے، ڈرتا ہوں؟ جب مجھے یہ نہیں معلوم کہ موت اچھی چیز ہے یا بُری تو میں کوئی ایسی سزا کیوں تجویز کروں جو یقیناً بُری ہو؟ کیا میں قید پسند کروں؟ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں جیل میں رہوں اور اس سال کے مجسٹریٹ کی ——— گیارہ حاکموں کی ——— غلامی پسند کروں؟ یا جرمانہ اور قید تا ادائگی جرمانہ کی سزا ہونی چاہیے؟ اس پر بھی وہی اعتراض ہے مجھے جیل میں سڑنا پڑے گا اس لیے کہ روپیہ تو میرے پاس ہے نہیں کہ جرمانہ ادا کروں۔ اور اگر میں جلاوطنی تجویز کروں (ممکن ہے تم یہی سزا مقرر کرو) تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ مجھے زندگی کی محبت نے اندھا کر دیا ہے اور میں اس قدر بے عقل ہوں کہ جب تم لوگ، جو میرے ہم وطن ہو، میری گفتگو کو برداشت نہیں کر سکتے اور سخت مضر اور قابل نفرت سمجھ کر مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو تو میں یہ توقع کروں کہ دوسرے میری باتوں کو برداشت کر لیں گے۔ نہیں اے اہل ایتھنس! یہ تو کچھ زیادہ قرین قیاس نہیں، اور وہ بھی کیا زندگی ہوگی کہ میں اس بڑھاپے میں شہر شہر مارا پھروں کبھی یہاں جاؤں کبھی وہاں، اور جہاں جاؤں وہاں سے نکالا جاؤں! اس لیے کہ مجھے پوری طرح یقین ہے کہ میں جس جگہ بھی جاؤں گا وہاں نوجوان میرے گرد جمع ہو جائیں گے جیسے یہاں جمع ہوتے ہیں اور اگر میں انھیں اپنے پاس نہ آنے دوں تو وہ اپنے بزرگوں سے کہہ کر مجھے نکلوا دیں گے اور اگر آنے دوں تو ان کے باپ اور دوست خود ہی نکال دیں گے۔

شاید کوئی شخص کہے، یہ تو ٹھیک ہی سقراط، مگر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم اپنی زبان بند رکھو؟ تب تو تم کسی باہر کے شہر میں جا سکتے ہو اور کوئی تمھیں نہیں ستائے گا۔ اس سوال کا جواب تم لوگوں کو سمجھانا بہت مشکل ہی۔ اگر میں کہوں کہ تمھارا کہا ماننا خدا کی نافرمانی ہوگی اس لیے میں اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتا تو تمھیں یقین نہیں آئے گا کہ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں، اور پھر اگر یہ کہوں کہ نیکی اور دوسرے مسائل پر جن میں تم مجھے اپنا اور دوسروں کا امتحان لیتے سنا کرتے ہو، روزمرہ گفتگو کرنا انسان کے لیے بہترین چیز ہی اور بے امتحان زندگی کسی کام کی نہیں تو اور بھی کم امید ہی کہ تمھیں یقین آئے۔ مگر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سچ ہی اگرچہ ایسی بات ہی جس کا تمھیں یقین دلانا مشکل ہی۔ اور اس کا میں عادی نہیں ہوں کہ اپنے آپ کو سزا کا مستحق سمجھوں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو جتنا جرمانہ ادا کر سکتا اس نسبت سے اپنا جرم تسلیم کر لیتا اور میرا کچھ نہ بگڑتا۔ مگر چونکہ میرے پاس کچھ نہیں ہی اس لیے تم سے التجا کرتا ہوں کہ جرمانہ میری حیثیت کے مطابق کرو۔ میرے ہاں شاید پچاس رُپے کی گنجایش نکل آئے اس لیے یہی جرمانہ تجویز کرتا ہوں۔ یہ میرے دوست، افلاطون، کریٹو، کریٹو بولس اور اپولو ڈورس مجھ سے کہتے ہیں کہ تم پندرہ سو روپیہ کہہ دو ہم لوگ اس کے ضامن ہو جائیں گے اس لیے پندرہ سو جرمانہ کر دیا جائے جس کے لیے ان لوگوں کی ضمانت بہت کافی ہی۔

تمھیں کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوگا اے اہل ایتھنس! اس رسوائی کے مقابلے میں جو تم کو شہر کے مخالفوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑے گی۔ وہ کہیں گے کہ تم نے سقراط جیسے دانشمند کو مار ڈالا۔ تمھیں الزام دینے کے لیے وہ مجھے

دانشمند ہی کہیں گے اگرچہ میں دانشمند نہیں ہوں۔ اگر تم تھوڑے دن صبر کرتے تو تمھاری خواہش قدرتی طریقے سے پوری ہو جاتی اس لیے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں جیسا کہ تم خود دیکھتے ہو اور میری موت کا دن دور نہیں ہے۔ میرا خطاب تم سب سے نہیں ہے بلکہ صرف ان لوگوں سے جنھوں نے میرے لیے سزائے موت تجویز کی ہے اور مجھے ان سے ایک بات اور کہنی ہے۔ تم سمجھتے ہو مجھے اس لیے سزا ہوئی کہ مجھے ایسے الفاظ کہنے نہیں آتے جن کی بدولت میں رہا ہو جاتا اگر مجھے کسی چیز کے کہنے یا کرنے میں باک نہ ہوتی۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ وہ کمی، جو میری سزا کا باعث ہوئی، الفاظ کی کمی نہ تھی —— ہرگز نہیں —— البتہ نہ مجھ میں اتنی جرأت اور بے باکی تھی اور نہ میری یہ خواہش تھی کہ تم سے اُس طرح خطاب کروں جس طرح تم پسند کرتے ہو یعنی تمھارے آگے روؤں اور گڑگڑاؤں اور وہ باتیں کہوں جو تم دوسروں سے سننے کے عادی ہو اور جو میرے خیال میں میری شان کے خلاف ہیں۔ اس وقت بھی میرا یہ خیال تھا کہ مجھے خطرے کی حالت میں کوئی ہلکی یا ذلیل حرکت نہیں کرنی چاہیے اور اب بھی میں اس پر پشیمان نہیں ہوں کہ میں نے جواب دہی کا یہ انداز اختیار کیا۔ تمھارے انداز میں تقریر کر کے زندہ رہنے سے تو میں یہ اچھا سمجھتا ہوں کہ اپنے انداز میں تقریر کروں اور مار ڈالا جاؤں۔ اس لیے کہ نہ تو میدان جنگ میں اور نہ عدالت میں میرے یا کسی اور شخص کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ موت سے بچنے کے لیے بلا امتیاز ہر طریقہ اختیار کرے۔ اکثر لڑائی میں یہ بات یقینی ہوتی ہے کہ اگر انسان ہتھیار ڈال دے اور جو لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہوں ان کے آگے گھٹنوں کے بل جھک جائے تو وہ موت سے بچ جائے گا۔ دوسرے خطروں میں جان بچانے کے دوسرے طریقے ہیں اگر انسان کو کسی بات کے

کہنے یا کرنے میں باک نہ ہو۔

دشواری میرے دوستو! موت سے بچنے میں نہیں بلکہ بدی سے بچنے میں ہی اس لیے کہ اس کی رفتار موت سے زیادہ تیز ہی۔ میں بوڑھا اور سست قدم ہوں اور مجھے آہستہ چلنے والی چیز یعنی موت نے پکڑ لیا ہی اور میرے مدعی تیز اور سست ہیں اور انھیں تیز رو چیز یعنی بدی نے پکڑ لیا ہی۔ اب میں تو تمھاری عدالت میں مجرم بن کر موت کی سزا پانے جا رہا ہوں۔ اور یہ حق کی عدالت سے مجرم بن کر مفسدانہ اور ظالمانہ زندگی کی سزا کاٹنے اپنی راہ جا رہے ہیں۔ میں اپنی سزا بھگت لوں گا۔ یہ اپنی بھگت لیں۔ شاید یہ تقدیر کے احکام ہیں —— اور میرے خیال میں بہت مناسب ہیں۔

اور اب اے مجھے سزا دینے والو! میں ایک پیش گوئی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں مرنے کو ہوں اور مرتے وقت انسان میں پیش گوئی کی قوت پیدا ہو جاتی ہی۔ میری پیش گوئی اپنے قاتلوں سے یہ ہی کہ دنیا سے رخصت ہوتے ہی تمھیں اس سے کہیں زیادہ سخت سزا بھگتنی پڑے گی جو تم نے مجھے دی ہی۔ مجھے تم نے اس لیے مارا ہی کہ تم اپنے نکتہ چینوں سے بچ جاؤ اور تمھیں اپنی زندگی کا حساب نہ دینا پڑے۔ لیکن جو تم سمجھتے ہو وہ نہیں ہوگا بلکہ کچھ اور ہی ہونے والا ہی۔ میں کہے دیتا ہوں کہ تمھارے نکتہ چیں اب سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ وہ نکتہ چیں جنھیں میں نے اب تک روک رکھا تھا۔ یہ لوگ اور کم عمر ہیں، تمھارے ساتھ اور زیادہ سختی سے پیش آئیں گے اور تم ان سے اور زیادہ خفا ہوگے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ لوگوں کو مار ڈالنے سے تم کسی شخص کو اپنی بری زندگی کی تنقید سے روک سکتے ہو تو تم غلطی پر ہو۔ یہ طریقہ بچنے کا نہ تو ممکن ہی اور نہ باعزت۔ سب سے آسان اور برتر طریقہ دوسروں کی زبان بندی نہیں ہی بلکہ اپنی اصلاح۔ یہ پیش گوئی ہی جو میں جانے سے پہلے اپنے ججوں کو سنانا

چاہتا تھا۔

اے میرے دوستو! جو مجھے رہا کرنے کے حق میں تھے، جتنی دیر مجسٹریٹ اپنے کام میں مصروف ہیں قبل اس کے کہ میں اس جگہ جاؤں جہاں مجھے مرنا ہے، تم سے بھی اس معاملے کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ذرا سی دیر ٹھہر جاؤ تاکہ ہم اس فرصت میں کچھ باتیں ہی کر لیں۔ تم میرے دوست ہو اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ مجھ پر گزرا ہے اس کے معنی تمھیں سمجھا دوں۔ میرے منصفو! —— اس لیے کہ تم حقیقت میں منصف کہلانے کے مستحق ہو۔ میں تم سے ایک عجیب واقعے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اب تک اس ربانی قوت کا، جس کی بنیاد اندرونی الہام پر ہے، یہ قاعدہ رہا ہے کہ وہ مجھے چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی منع کر دیتی تھی اگر مجھ سے کسی معاملے میں کوئی غلطی یا لغزش ہونے والی ہو۔ لیکن اب تم دیکھتے ہو کہ مجھ پر وہ مصیبت آئی ہے جو آخری اور بدترین مصیبت سمجھی جا سکتی ہے اور عموماً سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس ربانی قوت نے نہ تو مجھے عدالت آتے وقت منع کیا اور نہ تقریر کرتے وقت کسی بات کے کہنے سے روکا۔ پہلے اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں تقریر کے دوران میں روک دیا گیا ہوں۔ لیکن اب اس معاملے کے متعلق الہام ربانی کسی بات کے کہنے یا کرنے میں حائل نہیں ہوا۔ تم پوچھو گے کہ میں اس خاموشی کے کیا معنی لیتا ہوں؟ میں ابھی بتاتا ہوں۔ یہ اس کی علامت ہے کہ جو کچھ مجھ پر گزرا اچھا ہے اور ہم میں سے جو لوگ موت کو بُرا سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اس لیے کہ اگر میں کوئی اچھا کام نہیں بلکہ بُرا کام کرنے والا ہوتا تو مقررہ اشارہ یقیناً مجھے روک دیتا۔

ہم ایک اور پہلو سے اس مسئلے پر غور کریں تو ظاہر ہو جائے گا کہ اس کے قوی وجوہ موجود ہیں کہ ہم موت کو اچھی چیز سمجھیں۔ اس لیے کہ دو باتوں میں سے

ایک ہی ہے ——— یا تو موت محض عدم اور لاشعور کی حالت ہے یا جیسا کہ لوگ کہتے ہیں روح میں تغیّر واقع ہوتا ہے اور وہ اس دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ اب اگر تم یہ سمجھو کہ مرنے کے بعد کسی قسم کا شعور باقی نہیں رہتا بلکہ ایک گہری نیند ہوتی ہے جس میں خواب تک خلل انداز نہیں ہوتا، تو پھر موت کا کیا کہنا۔ اس لیے کہ اگر کوئی شخص ایک ایسی رات کا جس میں اس کی نیند میں کوئی خواب تک خلل انداز نہ ہوا ہو، اپنی زندگی کے دوسرے دنوں اور راتوں سے مقابلہ کرے اور پھر ہمیں یہ بتائے کہ کتنے دن اور رات اس سے بہتر گزرے تو میرے خیال میں صرف معمولی آدمی ہی نہیں بلکہ بہت بڑے بادشاہ تک کو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ ایسے شب و روز کم ہی نصیب ہوئے۔ اگر موت ایسی چیز ہے تو میں کہتا ہوں کہ مرنے میں سراسر فائدہ ہے اس لیے کہ پھر تو ازل سے ابد تک صرف ایک ہی رات ہے۔ لیکن اگر موت کسی دوسری جگہ کا سفر ہے جہاں لوگوں کے قول کے مطابق سب گزری ہوئی روحیں رہتی ہیں تو اے میرے دوستو اور منصفو! اس سے اچھی اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ اگر واقعی مسافر عالم اسفل میں پہنچ کر اس دنیا کے مدعیان انصاف کے پنجے سے چھوٹ جاتا ہے اور ان سچے منصفوں کو پا لیتا ہے جو وہاں دادرسی کرتے ہیں، یعنی مینوس اور رہیڈامینتھس اور ایکس اور ٹرپٹولیمس اور دوسرے دیوتاؤں کے بیٹے جو اپنی زندگی میں نیک اور پرہیزگار تھے تو ایسا سفر واقعی کرنے کے لائق ہے۔ کون شخص دل سے نہ چاہتا ہو گا کہ اسے آرفیس اور میوزئیس اور ہیسیڈ اور ہومر سے باتیں کرنے کا موقع ملے؟ اگر یہ سچ ہے تو میں ایک بار نہیں ہزار بار مرنے کو تیار ہوں۔ مجھے تو پیلیمیڈیس اور ٹیلامن کے بیٹے اجیکس اور دوسرے سورماؤں سے جو غیر منصفانہ فیصلوں کی بنا پر مارے گئے، ملنے اور باتیں کرنے

سے انتہائی دل چسپی ہوگی اور اپنی تکلیف کا ان کی تکلیف سے مقابلہ کرنے میں بہت لطف آئے گا۔ سب سے بڑھ کر یہ ہی کہ میں صحیح اور غلط علم کی تحقیق اس دنیا کی طرح اُس دنیا میں بھی کرتا رہوں گا اور مجھے یہ پتا چل جائے گا کہ کون شخص دانشمند ہی اور کون دانشمند بنتا ہی مگر حقیقت میں نہیں ہی۔ اے منصفو! کسی شخص کے لیے اس سے بڑھ کر کیا بات ہوسکتی ہی کہ وہ ٹرائے کی عظیم الشان مہم کے رہنما یا اودیسیس یا سیسفس اور بے شمار دوسرے مردوں اور عورتوں کا امتحان لے۔ کیا ٹھکانا ہی اُس خوشی کا جو ان سے گفتگو کرنے اور سوالات پوچھنے سے حاصل ہوگی، دوسری دنیا میں لوگ کسی شخص کو سوالات پوچھنے کے جرم میں قتل نہیں کرتے ہوں گے۔ ہرگز نہیں کرتے ہوں گے کیونکہ وہ نہ صرف ہم سے زیادہ خوش دل بلکہ لافانی بھی ہوں گے۔ اگر لوگوں کا کہنا سچ ہی۔

اس لیے اے منصفو! موت سے نہ گھبراؤ اور یقین جانو کہ نیک آدمی پر کوئی مصیبت نہیں آسکتی ——— نہ زندگی میں نہ مرنے کے بعد۔ اُسے اور اس کے بال بچوں کو دیوتا کبھی نہیں بھولتے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میری آنے والی موت محض اتفاقی چیز ہی۔ مجھے صاف نظر آرہا ہی کہ وہ وقت آگیا تھا جب میرے لیے یہی بہتر تھا کہ مرکر دنیا کے جھگڑوں سے چھوٹ جاؤں۔ اسی وجہ سے الہام ربانی نے کوئی اشارہ نہیں کیا اور اسی وجہ سے میں ان لوگوں سے جنھوں نے میرے لیے سزا تجویز کی یا ان سے جنھوں نے میرے خلاف استغاثہ کیا خفا نہیں ہوں۔ ان سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا اگرچہ وہ اپنی طرف سے یہی چاہتے تھے اور اس کی مجھے کسی قدر شکایت بھی ہی۔

پھر بھی میں ان سے ایک عنایت کا خواستگار ہوں۔ جب میرے لڑکے بڑے ہو جائیں تو اے دوستو! انھیں سزا دینا اور اسی طرح ستانا چاہیے میں نے تمھیں ستایا اگر وہ دولت یا کسی اور چیز کو نیکی سے بڑھ کر سمجھیں ـــــ انھیں جھڑکنا چاہیے کہ میں نے تمھیں جھڑکا کہ وہ اس چیز کی پروا نہیں کرتے جس کی پروا کرنی چاہیے اور اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم بھی کچھ ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں۔ اگر تم یہ کروگے تو میرے اور میرے بیٹوں کے ساتھ عین انصاف ہوگا۔

رخصت کا وقت آگیا ہے اور اب ہم اپنی اپنی راہ جاتے ہیں ـــــ میں مرنے کے لیے اور تم جینے کے لیے۔ دونوں میں کیا چیز بہتر ہے یہ خدا ہی جانتا ہے۔

کریٹو

اشخاص مکالمہ

سقراط کریٹو

مقام؛ سقراط کا قید خانہ

سقراط۔ تم اس وقت کیوں آئے، کریٹو؟ ابھی تو بہت سویرا ہو گا؟

کریٹو۔ ہاں، بے شک۔

سقراط۔ ٹھیک وقت کیا ہے؟

کریٹو۔ پو پھٹ رہی ہے۔

سقراط۔ تعجب ہے کہ قید خانے کے محافظ نے تمھیں آنے دیا۔

کریٹو۔ وہ مجھے جانتا ہے کیونکہ میں اکثر آتا رہتا ہوں سقراط۔ اس کے علاوہ میں نے اس کے ساتھ کچھ سلوک بھی کیا ہے۔

سقراط۔ کیا تم ابھی پہنچے ہو۔

کریٹو۔ نہیں، مجھے آئے تھوڑی دیر ہوئی۔

سقراط۔ تو پھر تم چپ کیوں بیٹھے رہے۔ فوراً جگا دیا ہوتا۔

کریٹو۔ سقراط۔ مجھ سے تمھاری طرح یہ تکلیف اور پریشانی نہ اُٹھائی جاتی ہرگز نہ اُٹھائی جاتی۔ میں تمھاری پُرسکون نیند کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسی وجہ سے نہیں جگایا کہ میں چاہتا تھا جہاں تک ہو سکے تمھاری

تکلیف میں کمی ہو۔ یوں تو میں تمھیں ہمیشہ سے خوش مزاج سمجھتا تھا مگر جس اطمینان سے تم یہ مصیبت برداشت کر رہے ہو اس کی مثال میری نظر سے آج تک نہیں گزری۔

سقراط۔ بھئی کریٹو، جب انسان میری عمر کو پہنچ جائے تو اسے اس خیال سے کڑھنا نہیں چاہیے کہ موت قریب آرہی ہے۔

کریٹو۔ مگر اور بوڑھے بھی تو ہیں جو اسی قسم کی مصیبت میں گرفتار ہیں ان کا بڑھاپا انھیں کڑھنے سے نہیں روکتا۔

سقراط۔ یہ سچ ہے مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ اتنے سویرے کیوں آئے ہو۔

کریٹو۔ میں تمھارے پاس ایک پیام لے کر آیا ہوں جو افسوسناک اور تکلیف دہ ہے۔ غالباً تمھارے لیے تو نہیں مگر تمھارے دوستوں کے لیے خصوصاً میرے لیے نہایت افسوسناک ہے۔

سقراط۔ ہائیں؟ کیا وہ جہاز ڈیلوس سے آگیا جس کی واپسی پر میں مارا جاؤں گا۔

کریٹو۔ نہیں ابھی آیا تو نہیں مگر غالباً آج آجائے گا۔ جو لوگ سونیم سے آئے ہیں ان کا بیان ہے کہ انھوں نے اُسے وہاں چھوڑا تھا۔ لہذا سقراط کل تمھاری زندگی کا آخری دن ہے۔

سقراط۔ اچھا کریٹو اگر خدا کی مرضی یہی ہے تو میں بھی راضی ہوں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک دن کی دیر ہو جائے گی۔

کریٹو۔ تم یہ کیوں سمجھتے ہو؟

سقراط۔ میں بتاتا ہوں۔ مجھے جہاز کے پہنچنے کے دوسرے دن مرنا ہے نہ؟

کریٹو۔ ہاں حکام یہی کہتے ہیں۔

سقراط - مگر میرے خیال میں جہاز کل سے پہلے یہاں نہیں پہنچے گا۔ یہ مجھے ایک خواب سے معلوم ہوا جو میں نے کل رات کو بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ابھی سویرے دیکھا تھا جب کہ خوش قسمتی سے تم نے مجھے سونے دیا۔

کریٹو - اور یہ خواب تھا کیا؟

سقراط - مجھے ایک حسین وجمیل عورت کی صورت زرق برق لباس میں نظر آئی جس نے مخاطب کرکے کہا، سُن اے سقراط!

"آج سے تیسرے دن تو افتھیا کے زرخیز خطے کو جائے گا"

کریٹو - کیا عجیب خواب ہے سقراط۔

سقراط - میرے خیال میں کریٹو، اس کی تعبیر کے بارے میں تو شبہ کی گنجایش ہی نہیں۔

کریٹو - ہاں افسوس، تعبیر تو بالکل صاف ہے۔ مگر میرے پیارے سقراط، میں ایک بار پھر التجا کرتا ہوں کہ میری بات مانو اور یہاں سے نکل بھاگو۔ اگر تم مرگئے تو صرف یہی نہیں کہ میرا ایک دوست جاتا رہے گا جس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا بلکہ ایک اور خرابی ہے۔ جو لوگ تم کو اور مجھ کو نہیں جانتے وہ سمجھیں گے کہ اگر میں روپیہ خرچ کرنے پر تیار ہوتا تو تمھیں بھی بچا سکتا تھا مگر میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ اب بتاؤ اس سے بڑھ کر کوئی ذلت ہوسکتی ہے ——— کہ میرے متعلق یہ سمجھا جائے کہ میں رُپے کو ایک دوست کی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں؟ لوگ تو یہ کبھی نہیں مانیں گے کہ میں چاہتا تھا تم بھاگ جاؤ مگر تم نے انکار کردیا۔

سقراط - مگر پیارے کریٹو، ہم عام لوگوں کی رائے کی پروا ہی کیوں کریں؟ ہمیں تو صرف اچھے آدمیوں کا لحاظ رکھنا چاہیے اور یہ ان معاملات کو

اسی طرح دیکھیں جس طرح حقیقت میں پیش آئے۔

کریٹو۔ مگر، سقراط عوام کی رائے کا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے اس لیے کہ جو کچھ آج کل ہو رہا ہے اس سے ظاہر ہے یہ لوگ جس شخص سے بدظن ہو جائیں اُسے انتہائی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

سقراط۔ کاش ایسا ہوتا، کریٹو، کہ عوام انتہائی نقصان پہنچا سکتے، کیونکہ اس صورت میں وہ انتہائی فائدہ پہنچانے کے قابل بھی ہوتے ——— اور اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی تھی! لیکن حقیقت میں وہ دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں کر سکتے اس لیے کہ وہ کسی شخص کو دانش مند بنا سکتے ہیں اور نہ بے وقوف۔ ان کے سارے کام محض اتفاقی ہوتے ہیں۔

کریٹو۔ خیر میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ مگر یہ تو کہو سقراط، کہیں تم میرے اور اپنے دوسرے دوستوں کے خیال سے تو ایسا نہیں کر رہے ہو؟ تمھیں یہ خوف نہیں کہ اگر تم قید خانے سے بھاگ گئے تو جاسوس ہمیں دق کریں گے کہ ہم تمھیں اڑا لے گئے اور ہماری ساری املاک یا اس کا کچھ حصہ چھن جائے گا یا اس سے بھی بُرا انجام ہوگا۔ اگر تم ہماری وجہ سے ڈرتے ہو تو اس خیال کو دل سے نکال دو کیونکہ تمھیں بچانے کے لیے ہمیں یقیناً یہ اور اس سے بڑھ کر خطرہ برداشت کرنا چاہیے۔ تو پھر مان جاؤ اور جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔

سقراط۔ ہاں، کریٹو، ایک خوف یہ بھی ہے جس کا تم نے ذکر کیا مگر صرف یہی نہیں ہے۔

کریٹو۔ تم اطمینان رکھو ——— ایسے لوگ موجود ہیں جو بہت کم خرچ پر تمھیں قیدخانے سے نکال لے جانے کو تیار ہیں۔ اب رہے جاسوس تو ان کا مطالبہ بھی کچھ زیادہ نہیں ——— تھوڑی سی رقم میں خوش ہو جائیں گے۔ میری

دولت، جو حقیقت میں بہت ہی تھوڑی ہے، تمھارے لیے حاضر ہے اور اگر تمھیں میری ساری پونجی صرف کرنے میں تامل ہو تو بعض اجنبی اپنا سرمایہ پیش کرتے ہیں کہ تم اسے کام میں لاؤ۔ ان میں سے ایک، سیمیاس تھیبی خاص اسی غرض سے ایک بہت بڑی رقم اپنے ساتھ لایا ہے اور کیبیس وغیرہ بہت سے لوگ تمھیں بھاگنے میں مدد دینے کے لیے اپنا روپیہ خرچ کرنے کو تیار ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ تم ہمارے خیال سے تامل نہ کرو اور وہ بات نہ کہو جو تم نے عدالت میں کہی تھی کہ دوسری جگہ جا کر میری سمجھ ہی میں نہ آئے گا کہ کیا شغل اختیار کروں۔ تم جہاں کہیں جاؤ گے لوگ تمھیں عزیز رکھیں گے کچھ ایتھنس پر موقوف نہیں۔ تھسلی میں میرے دوست موجود ہیں۔ اگر تم ان کے پاس جانا چاہو تو تمھاری قدر اور حفاظت کریں گے اور کوئی تھسلی والا تمھیں نہیں ستائے گا اور میں نہیں سمجھتا سقراط تمھارے لیے یہ جائز ہے کہ جب تمھاری جان بچ سکتی ہے تو تم خود اُسے ہلاکت میں ڈالو۔ تم تو اپنے دشمنوں کا مقصد پورا کر رہے ہو، جو تمھیں جلد سے جلد برباد کرنا چاہتے ہیں، اور پھر میں یہ بھی کہہ دوں کہ تم اپنے بچوں سے بے وفائی کر رہے ہو، بجائے اس کے کہ تم ان کی پرورش کرتے اور انھیں تعلیم دلاتے، انھیں چھوڑ کر جا رہے ہو۔ اب انھیں خود ہی قسمت آزمائی کرنی پڑے گی، اگر وہ اس انجام سے بچ گئے جو عموماً یتیموں کا ہوا کرتا ہے تو اس میں تمھاری کوئی کارگزاری نہیں ہوگی۔ ایسے شخص کو دنیا میں بچے پیدا ہی نہیں کرنے چاہییں جو آخر تک ان کی پرورش اور تعلیم کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہ ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے تم وہ راہ اختیار کر رہے ہو جس میں زیادہ آسانی ہے، وہ نہیں جس میں زیادہ خوبی اور مردانگی ہے اور جو تم جیسے شخص کے لیے مناسب ہے جسے یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر بات میں نیکی کا لحاظ رکھتا ہے۔ مجھے سچ مچ شرم آتی ہے

نہ صرف تم پر بلکہ ہم سب پر جو تمہارے دوست کہلاتے ہیں، جب میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ سارا قصہ محض ہماری کم ہمتی سے منسوب کیا جائے گا۔ ہمیں چاہیے تھا کہ اس مقدمے کو دائر ہی نہ ہونے دیتے یا کچھ اور انتظام کرتے۔ پھر یہ آخری حرکت یہ انتہائی حماقت تو سراسر ہم لوگوں کی غفلت اور بزدلی کا نتیجہ سمجھی جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ اگر ہم کسی کام کے ہوتے تو تمہیں بچا لیتے اور تم خود بھی بچ سکتے تھے اس لیے کہ کوئی مشکل ہی نہ تھی۔ دیکھو سقراط اس کے نتائج ہمارے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی کس قدر افسوسناک اور شرمناک ہیں یا تو پھر فیصلہ کر ڈالو بلکہ یہ سمجھو کہ پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہو اس لیے کہ سوچنے کا وقت گزر گیا۔ اب صرف ایک ہی بات ہو سکتی ہے اور وہ آج رات کو ہونی چاہیے۔ اگر ذرا بھی دیر ہوئی تو اس کی کوئی صورت یا امکان نہیں رہے گا۔ اس لیے میری التجا ہے سقراط کہ تم راضی ہو جاؤ اور جو میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔

سقراط۔ پیارے کریٹو، تمہارا یہ جوش اگر صحیح ہو تو نہایت قابل قدر ہے لیکن اگر غلط ہو تو جتنا زیادہ شدید ہوگا اتنا ہی زیادہ خطرناک ہوگا۔ لہذا ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ میں تمہارے کہنے پر عمل کروں یا نہ کروں۔ اس لیے کہ میری طبیعت ہمیشہ سے عقل کی راہ پر چلتی ہے جو غور کرنے کے بعد مجھے سب سے بہتر معلوم ہو۔ اس مصیبت کے پیش آنے کی وجہ سے یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ میں اپنے قول سے پھر جاؤں اور ان اصولوں سے جن اصولوں کی میں اب تک قدر اور عزت کرتا رہا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں اور بجز اس صورت کے کہ ہمیں فوراً کوئی دوسرے ان سے بہتر اصول ہاتھ آ جائیں مجھے ہرگز تمہارے ساتھ اتفاق نہیں ہو سکتا چاہے جمہور کی طاقت مجھے کتنی ہی بار قید، ضبط املاک اور موت کی سزا دے جس طرح بچوں کو ہوّے سے ڈراتے ہیں۔ اس مسئلے پر غور کرنے کا سب سے معقول طریقہ

کیا ہو سکتا ہے؟ کیا میں پھر لوگوں کی رائے کے بارے میں تمھاری پرانی بحث کی طرف رجوع کروں؟ ہم یہ کہ رہے تھے کہ بعض کی رائے کا لحاظ کرنا چاہیے اور بعض کا نہ کرنا چاہیے۔ اب بتاؤ کہ یہ بات جو میری سزا کا حکم سنائے جانے سے پہلے کہی گئی تھی، ٹھیک ہے یا نہیں؟ کیا وہ بحث جو پہلے معقول تھی اب محض بکواس ثابت ہوئی ــــ محض بچوں کی سی مہمل گفتگو؟ یہ وہ سوال ہے کریٹو، جس پر میں تمھاری مدد سے غور کرنا چاہتا ہوں:۔ آیا موجودہ حالات میں ہمیں اپنا استدلال کچھ مختلف نظر آتا ہے یا نہیں اور میں اسے تسلیم کروں یا نہ کروں؟ اس کا خلاصہ جس پر میرے خیال میں بہت سے مستند اشخاص متفق ہیں یہ تھا کہ جیسا میں ابھی کہ رہا تھا بعض لوگوں کی رائے کا لحاظ کیا جائے اور بعض کی رائے کا نہ کیا جائے۔ اب سوچو کریٹو کہ تمھیں تو کل مرنا نہیں ــــ کم سے کم انسانی عقل کو اس کا کوئی احتمال نظر نہیں آتا ــــ لہٰذا تمھاری رائے بے لوث ہوگی اور تم گرد و پیش کے حالات سے دھوکا نہیں کھاؤ گے۔ تمھیں بتاؤ میری یہ بات صحیح ہے یا نہیں کہ بعض رائیں اور صرف بعض اشخاص کی رائیں قابل قدر ہیں اور باقی رائیں اور باقی لوگوں کی رائیں قابل قدر نہیں ہیں میں تم سے پوچھتا ہوں کہ میرا یہ دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟

کریٹو۔ یقیناً۔

سقراط۔ اچھوں کا لحاظ کرنا چاہیے بروں کا نہیں کرنا چاہیے؟

کریٹو۔ اور کیا۔

سقراط۔ اور دانشمندوں کی رائے اچھی اور بے وقوفوں کی رائے بری ہوتی ہے۔

کریٹو۔ یقیناً۔

سقراط۔ اچھا ایک اور مسئلے میں ہم لوگوں نے کیا کہا تھا؟ کیا وہ شخص جو ورزش کا شغل اختیار کرتا ہے ہر ایک کی تعریف اور مذمت اور رائے کی پروا کرتا ہے یا صرف ایک شخص کی خواہ وہ اس کا معالج ہو یا اُستاد۔

کریٹو۔ صرف ایک شخص کی۔

سقراط۔ اور اسے بہت سے لوگوں کی نہیں بلکہ صرف ایک شخص کی مذمت سے ڈرنا چاہیے اور تعریف سے خوش ہونا چاہیے؟

کریٹو۔ ظاہر ہے۔

سقراط۔ اور اسے اس طریقے سے کام کرنا، ورزش کرنا، کھانا پینا چاہیے جسے ایک فرد واحد یعنی اس کا استاد جو صاحب فہم ہے مناسب سمجھتا ہے نہ کہ اور سب لوگوں کی رائے کے مطابق۔

کریٹو۔ سچ ہے۔

سقراط۔ اگر وہ ایک شخص کی رائے کو نظر انداز کر کے اس کی خلاف ورزی کرے اور اُن بہت سے لوگوں کی رائے مان لے جو بالکل نافہم ہیں تو نقصان اُٹھائے گا یا نہیں؟

کریٹو۔ یقیناً نقصان اُٹھائے گا۔

سقراط۔ اور وہ نقصان کیا ہوگا، کس طرف رُخ کرے گا اور خلاف ورزی کرنے والے کی کس چیز پر اثر ڈالے گا؟

کریٹو۔ ظاہر ہے کہ اس کے جسم پر اثر ڈالے گا۔ یہی چیز ہے جسے یہ نقصان برباد کر دیتا ہے۔

سقراط۔ بہت ٹھیک۔ اب بتاؤ کریٹو، کیا یہ بات دوسری چیزوں پر صادق نہیں آتی جنھیں ایک ایک کر کے گنوانے کی ضرورت نہیں؟ کیا عدل ظلم،

حسن و قبح، نیک و بد کے مسائل ہیں جن پر ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں ہمیں بہت سے لوگوں کی رائے پر عمل کرنا اور ان سے ڈرنا چاہیے یا ایک شخص کی رائے پر جو صاحب فہم ہی؟ کیا ہمارا یہ فرض نہیں کہ تمام دنیا سے زیادہ اس سے ڈریں اور اس کا احترام کریں ؟ اور اگر ہم اس کا ساتھ چھوڑ دیں تو کیا اپنے نفس کے اس جوہر کو برباد نہ کر دیں گے جو عدل سے بنتا اور ظلم سے بگڑتا ہی؟ آخر یہ جوہر وجود رکھتا ہی یا نہیں ؟

کریٹو۔ یقیناً سقراط۔

سقراط۔ایسی ایک اور مثال لے لو:۔اگر ہم نافہم لوگوں کے مشورے پر عمل کر کے اس چیز کو برباد کر دیں جو تندرستی سے بنتی اور بیماری سے بگڑتی ہی تو زندگی کا لطف باقی رہے گا؟ اور یہ چیز جو برباد ہوتی ہی جسم ہی ہی نہ ؟

کریٹو۔ ہاں ۔

سقراط۔ اگر ہمارا جسم خراب اور فاسد ہو تو ہم زندہ رہ سکتے ہیں ؟

کریٹو۔ ہرگز نہیں۔

سقراط۔اور کیا اس صورت میں زندگی کا لطف باقی رہے گا اگر انسان کا وہ اعلیٰ جوہر برباد ہو جائے جو عدل سے بنتا اور ظلم سے بگڑتا ہی ؟ کیا ہم انسان کے اس جوہر کو، خواہ وہ کچھ بھی ہو جس کا تعلق عدل اور ظلم سے ہی جسم سے کمتر سمجھتے ہیں ؟

کریٹو۔ ہرگز نہیں۔

سقراط ۔پھر کیا اسے جسم سے برتر سمجھتے ہیں ؟

کریٹو ۔ بدرجہا برتر۔

سقراط ۔ تو میرے دوست، ہمیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ

عام لوگ ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں بلکہ یہ سوچنا چاہیے کہ وہ ایک شخص جو عدل اور ظلم کی ماہیت کو سمجھتا ہی۔ کیا کہے گا اور حق کیا کہے گا۔ اس لیے جب تم نے یہ مشورہ دیا کہ ہمیں عدل وظلم، بد و نیک، عزت و ذلت کے بارے میں عام لوگوں کی رائے کا لحاظ رکھنا چاہیے تو گویا بسم اللہ ہی غلط کر دی ـــــ مگر ممکن ہی کوئی شخص یہ کہے کہ عام لوگ ہمیں قتل جو کر دیں گے۔

کریٹو۔ ہاں سقراط، ظاہر ہی کہ یہی جواب دیا جائے گا۔

سقراط۔ اور یہ ٹھیک ہے پھر بھی مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہی کہ ہمارا پرانا دعویٰ بدستور اپنی جگہ پر قائم ہی۔ مگر کیا میں ایک اور دعوے کے متعلق بھی یہی بات کہہ سکتا ہوں ـــــ کہ اصل میں زندگی کی نہیں بلکہ اچھی زندگی کی قدر کرنی چاہیے۔

کریٹو۔ ہاں یہ بھی اپنی جگہ پر قائم ہی۔

سقراط۔ اچھی زندگی باعدل اور باعزت زندگی کا نام ہی، یہ دعویٰ بھی صحیح ہی؟

کریٹو۔ ہاں صحیح ہی۔

سقراط۔ ان مقدمات کی بنا پر میں اس مسئلے پر بحث کروں گا کہ مجھے بغیر اہل ایتھنس کی اجازت کے قید خانے سے نکل بھاگنا چاہیے یا نہیں۔ اگر میرے لیے بھاگنا صریحاً جائز ہی تو میں اس کی کوشش کروں گا ورنہ نہیں۔ اور چیزیں جن کا تم ذکر کرتے ہو یعنی روپے کا سوال، بے عزتی کا ڈر اور بچوں کی تعلیم کا خیال، میرے خیال میں محض عوام کے نظریات ہیں۔ نہ تو، اگر ان کے امکان میں ہو، لوگوں کو زندہ کرنے پر اسی طرح مستعد ہو جائیں جس طرح قتل کرنے پر مستعد رہتے ہیں ـــــ بغیر کسی معقول وجہ کے۔ اب چونکہ یہاں تک ہمارا سارا استدلال تسلیم کیا جا چکا ہی اس کے بعد صرف ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہی۔

آیا ہمارے لیے جائز ہی کہ ہم بھاگیں یا دوسروں سے اپنے بھاگنے میں مدد لیں، اور انھیں رُپے کی یا شکریے کی شکل میں اس کا معاوضہ دیں یا در اصل یہ ناجائز ہی۔

اگر دوسری صورت ہی تو موت یا کسی اور مصیبت کو جو میرے نہ بھاگنے سے واقع ہوگی بحث میں لانا ہی نہ چاہیے۔

کریٹو۔ میرے خیال میں تم ٹھیک کہتے ہو سقراط. تو ہم کس طرح آگے بڑھیں؟

سقراط۔ آؤ ہم دونوں مل کر اس پر غور کریں ممکن ہو تو تم میرے دعوے کو غلط ثابت کر دو، میں قائل ہو جاؤں گا۔ ورنہ میرے پیارے دوست، اب مجھ سے یہ نہ کہنا کہ مجھے اہل ایتھنس کی مرضی کے خلاف بھاگ جانا چاہیے۔ تم جو مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہو اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں لیکن اتنی بہتر رائے کے مقابلے میں تمھاری بات نہیں مان سکتا تو اب مہربانی کر کے میرے پہلے دعوے پر غور کرو اور جس طرح مناسب سمجھو جواب دو۔

کریٹو۔ اچھی بات ہی۔

سقراط۔ کیا ہم یہ کہیں کہ ہمیں کبھی جان بوجھ کر بے انصافی نہیں کرنی چاہیے یا یہ کہ ایک طرح سے بے انصافی کرنا جائز ہی اور دوسری طرح سے ناجائز ہی یا بے انصافی کرنا ہر حالت میں بُرا اور باعث ذلت ہی جیسا میں نے ابھی کہا تھا اور تم نے مان لیا تھا؟ کیا ان سب باتوں کو جو ہم پچھلے چند روز میں تسلیم کر چکے ہیں رد کر دیں؟ کیا اس عمر میں، زندگی بھر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کے بعد، ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ ہم میں اور بچوں میں کوئی فرق نہیں؟ یا عام لوگوں کی رائے کے باوجود چاہے نتیجہ اچھا ہو یا بُرا ہم اس پر زور دیں کہ جو ہم نے اس وقت کہا تھا

نہ سچ تھا یعنی ظلم یا بے انصافی کا کام کرنے والے کے لیے بُرا اور باعث ذلت ہو؟ ہم یہ کہیں یا نہ کہیں ؟

کریٹو۔ ضرور کہیں ؟

سقراط۔ تو ہمیں کبھی بے انصافی نہیں کرنی چاہیے۔

کریٹو۔ کبھی نہیں۔

سقراط۔ اور جب ہمیں کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے بدلے اسے نقصان نہ پہنچائیں جیسا کہ عوام کا خیال ہے۔ اس لیے کہ نقصان ۔کسی کو پہنچانا ہی نہ چاہیے ؟

کریٹو۔ظاہر ہے۔

سقراط۔ اور کریٹو، کیا ہم کسی کے ساتھ بُرائی بھی نہ کریں ؟

کریٹو۔ ہرگز نہیں۔

سقراط ۔اور برائی کے بدلے بُرائی کرنا جو عوام کا اخلاقی اصول ہے یہ انصاف ہے یا بے انصافی ؟

کریٹو ۔بے انصافی ۔

سقراط۔ اس لیے کہ کسی کے ساتھ برائی کرنا اور اُسے نقصان پہنچانا ایک ہی بات ہے؟

کریٹو۔ بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط ۔ تو پھر ہمیں انتقام نہیں لینا چاہیے یعنی کسی کے ساتھ برائی کے بدلے برائی نہیں کرنی چاہیے خواہ اس نے ہمارے ساتھ کتنی ہی بدسلوکی کی ہو۔ مگر ذرا سوچ لو، کریٹو، کیا تمھارا واقعی وہی خیال ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ اس لیے کہ یہ رائے زیادہ آدمیوں کی نہ کبھی تھی اور نہ ہوگی اور اس کے مخالفوں اور

موافقوں میں کوئی بنائے اشتراک نہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں کس قدر شدید اختلاف ہے تو لامحالہ ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں۔ تو اب بتاؤ کیا تم میرے پہلے اصول سے متفق ہو اور اسے تسلیم کرتے ہو کہ نقصان پہنچانا، یا انتقام لینا یا برائی کو برائی سے روکنا کسی صورت میں جائز نہیں؟ کیا ہم اسے اپنے استدلال کا مقدمہ قرار دیں؟ یا تمھیں اس سے اختلاف ہے؟ میں تو ہمیشہ یہی سمجھتا رہا اور اب بھی سمجھتا ہوں لیکن اگر تمھاری کچھ اور رائے ہو گئی ہو تو بتاؤ۔ اور جو تم اسی پہلے خیال پر قائم ہو تو میں ایک قدم آگے بڑھوں۔

کریٹو۔ تم شوق سے آگے بڑھو اس لیے کہ میں نے اپنی رائے نہیں بدلی ہے۔

سقراط۔ تو پھر میں اگلی بات کو لیتا ہوں جو ایک سوال کی شکل میں ظاہر کی جا سکتی ہے ـــــ کیا انسان کو وہی کرنا چاہیے جسے وہ حق مانتا ہے یا حق کو چھوڑ دینا چاہیے؟

کریٹو۔ اسے وہی کرنا چاہیے جسے وہ حق سمجھتا ہے۔

سقراط۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کا عملی نتیجہ کیا ہے؟ میں اہل ایتھنس کی مرضی کے خلاف قید خانے سے چلا جاؤں تو کسی کے ساتھ بے انصافی ہوگی یا نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان لوگوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی یا نہیں جن کے ساتھ مجھے خاص طور پر اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ کیا یہ ان اصولوں سے غداری نہیں ہے جنھیں ہم قرین انصاف تسلیم کر چکے ہیں ـــــ بتاؤ کیا کہتے ہو؟

کریٹو۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا، سقراط اس لیے کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

سقراط۔ تو پھر مسئلے پر اس پہلو سے غور کرو:۔ فرض کرو کہ میں فرار ہونے پر تیار ہوں (تمھیں اختیار ہے اس عمل کو جو چاہو کہو) اور قوانین اور حکومت اگر مجھ سے باز پرس کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: "بتاؤ سقراط یہ تم کیا غضب کرتے ہو؟

کیا تم اپنے ایک فعل سے ہم سب کو تباہ نہیں کر رہے ہو۔ کل قوانین کو اور ساری ریاست کو۔ جہاں تک تمھارے اختیار میں ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ ریاست قائم رہے گی اور برباد نہ ہو جائے گی جس میں قانون کے فیصلے کوئی قوت نہیں رکھتے اور افراد انھیں پیروں تلے روند ڈالتے ہیں؟" ہم کیا جواب دیں گے کریٹو، اس بات کا یا اسی قسم کی اور باتوں کا؟ ہر شخص خصوصاً وہ جو فن خطابت میں ماہر ہو، تعزیری قانون کی حمایت میں بہت کچھ کہہ ڈالے گا۔ وہ ثابت کرے گا کہ اس قانون کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ کیا ہم یہ جواب دیں: "یہ تو ٹھیک ہے لیکن ریاست نے ہمارے ساتھ بدسلوکی کی ہے اور خلاف انصاف سزا دی ہے؟"

کریٹو۔ بہت مناسب ہے، سقراط۔

سقراط۔ اب پر قانون پوچھے گا "کیا ہمارا تمھارا یہی معاہدہ تھا یا تم اس کے پابند تھے کہ ریاست جو سزا دے گی اسے برداشت کرو گے؟ اور اگر میں نے الفاظ کو سن کر حیرت کا اظہار کیا تو غالباً قانون یہ کہے گا "سقراط، آنکھیں پھیلا کر نہ رہ جاؤ، بلکہ جواب دو۔ تمھیں تو سوال کرنے اور جواب دینے کی عادت ہے بتاؤ تم کو ہم سے کون سی شکایت ہے جس کی وجہ سے تمھیں یہ حق حاصل ہو گیا کہ ہمیں اور ریاست کو تباہ کرنے کی کوشش کرو؟ کیا ہم تمھارے وجود میں آنے کا باعث نہیں ہوئے؟ تمھارے باپ نے ہماری مدد سے تمھاری ماں سے شادی کی اور اس طرح تم پیدا ہوئے۔ کیا تمھیں ہم میں سے ان قوانین پر اعتراض ہے جو شادی سے متعلق ہیں؟" مجھے جواب دینا پڑے گا کہ نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" یا ان قوانین پر جو بچوں کے پیدا ہونے کے بعد ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہیں جو تم نے بھی حاصل کی ہے؟ کیا تعلیم کے قوانین نے تمھارے والد کو جو حکم دیا کہ تمھیں علوم موسیقی اور ورزش سکھائے جائیں وہ

بیجا تھا؟" میں جواب دوں گا بالکل بجا تھا۔ تو پھر جب ہم تمھیں وجود میں لائے اور ہمیں نے تمھاری پرورش کی، تمھیں تعلیم و تربیت دی تو کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ تم ہمارے بچّے اور ہمارے غلام ہو جیسے کہ تم سے پہلے تمھارے آبا و اجداد تھے؟ اور اگر یہ سچ ہی تو تم ہمارے برابر کے نہیں ہو اور تمھیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ تمھیں ہمارے ساتھ ویسا ہی برتاو کرنے کا حق ہی جیسا ہم تمھارے ساتھ کر رہے ہیں۔ اگر تمھارا استاد یا باپ ہوتا اور وہ تمھیں مارتا یا بُرا بھلا کہتا یا تمھارے ساتھ کسی قسم کی بد سلوکی کرتا تو کیا تمھیں یہ حق تھا کہ تم بھی اُسے مارو یا برا بھلا کہو یا اس کے ساتھ اور کسی قسم کی بد سلوکی کرو؟ ظاہر ہی کہ تم یہ کبھی نہیں کہو گے۔ کیا اس وجہ سے کہ ہم تمھیں ہلاک کرنا مناسب سمجھتے ہیں، تمھیں اپنے خیال میں یہ حق حاصل ہی کہ تم اس کے بدلے ہمیں اور اپنے ملک کو برباد کر دو جہاں تک تمھارے امکان میں ہی؟ اے حقیقی نیکی کا دعویٰ کرنے والے کیا تم بناوٹ سے یہ کہو گے کہ تمھارا یہ فعل جائز ہی؟ کیا تم جیسے فلسفی کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارا ملک ماں باپ اور سب بزرگوں سے زیادہ قابل قدر ہی، ان سے زیادہ مقدس اور محترم اور دیوتاؤں اور ذی فہم انسانوں کی نظر میں زیادہ عزیز ہی۔ اور ہمیں چاہیے کہ جب وہ خفا ہو تو اس کے غصّے کو ٹھنڈا کریں، اس کی منتیں کریں اس سے بھی زیادہ نرمی اور ادب سے جیسے اپنے باپ کی کرتے ہیں، اسے سمجھا بجھا کر قائل کریں یا اگر وہ قائل نہ ہو تو اس کے حکم کی تعمیل کریں۔ جب وہ ہمیں قید یا تازیانے کی سزا دے تو اسے چپ چاپ برداشت کریں، اگر وہ ہمیں میدان جنگ میں زخم کھانے یا جان دینے کے لیے بھیجے تو ہم وہاں چلے جائیں جیسا کہ ہمارا فرض ہی۔ کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہی کہ دشمن کے آگے سر جھکا دے یا پیچھے ہٹ جائے یا اپنی صف کو چھوڑ دے۔

بلکہ، خواہ میدان جنگ ہو عدالت یا کوئی اور جگہ اس پر لازم ہے کہ وہی کرے جو اس کے ملک یا شہر کا حکم ہے، ورنہ پھر نیکی کے بارے میں ان کا جو نظریہ ہے اسے بدل دے۔ اگر اُسے اپنے باپ یا ماں کے ساتھ زیادتی نہیں کرنی چاہیے تو اپنے ملک کے ساتھ تو اور بھی نہیں کرنی چاہیے۔" ہم اس کا کیا جواب دیں کریٹو قوانین کا قول سچ ہے یا نہیں؟

کریٹو۔ میرے خیال میں سچ ہے۔

سقراط۔ پھر یہ قوانین کہیں گے "ذرا سوچو تو سقراط کیا ہمارا کہنا ٹھیک نہیں کہ جو کوشش تم کر رہے ہو اس سے ہمیں نقصان پہنچے گا۔ اس لیے کہ جب ہم تمھیں دنیا میں لاکر تعلیم و تربیت دے چکے اور تم کو اور دوسرے شہریوں کو ہر اچھی چیز جو ہمارے اختیار میں تھی تقسیم کر چکے، اس کے بعد اس آزادی کی صورت میں جو ہم نے ہر باشندۂ ایتھنس کو دے رکھی ہے یہ اعلان بھی کر دیا کہ اگر سن بلوغ کو پہنچنے، شہر کے طور طریق کو دیکھنے اور ہم سے واقف ہونے کے بعد وہ ہمیں پسند نہ کرے تو اسے اختیار ہے کہ جہاں جی چاہے چلا جائے اور اپنی املاک ساتھ لے جائے۔ ہم میں سے کوئی قانون نہ اسے منع کرے گا اور نہ اس کی راہ میں حائل ہوگا۔ ہر وہ شخص جو ہمیں اور ہمارے شہر کو پسند نہیں کرتا اور کسی اور شہر یا نوآبادی میں جاکر رہنا چاہتا ہے اسے اس کی اجازت ہے اور وہ اپنی املاک پر بدستور قابض رہے گا۔ لیکن جس شخص کو اس کا تجربہ ہے کہ ہم کس طرح عدالت اور ملک کا انتظام کرتے ہیں اور پھر بھی وہ ہماری ریاست میں رہتا ہے اس نے گویا ہم سے بالکنایہ یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ جو کچھ ہم کہیں گے وہ کرے گا، اور جو ہماری نافرمانی کرے وہ تہرے جرم کا مرتکب ہوتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ ہماری نافرمانی گویا والدین کی نافرمانی ہے، دوسرے اس لیے

کہ ہم اس کے مربی ہیں، تیسرے اس لیے کہ اس نے ہم سے معاہدہ کیا ہی کہ ہمارے احکام کی تعمیل کرے گا۔ نہ تو وہ ہمارے احکام کی تعمیل کرتا ہی اور نہ ہمیں قائل کرتا ہی کہ یہ احکام خلاف انصاف ہیں۔ ہم اس پر زبردستی نہیں کرتے بلکہ یہ اختیار دیتے ہیں کہ یا تو ہمارا حکم مانے ورنہ ہمیں قائل کردے ——— ——— ہماری طرف سے یہ موقع دیا جاتا ہی مگر وہ دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں کرتا۔

اس طرح کے الزام تم پر لگائے جائیں گے سقراط، جیسا کہ ہم نے کہا ہی، اگر تم اپنے ارادے کو عمل میں لائے۔ تم ایتھنس کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں اور بھی زیادہ موردِ الزام قرار پاؤ گے۔" اب فرض کرو میں ان سے پوچھوں کہ آخر میں اوروں سے زیادہ موردِ الزام کیوں ٹھیروں گا تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ تم نے اوروں سے زیادہ اس معاہدے کو تسلیم کیا ہی۔ وہ کہیں گے" اس بات کا صریحی ثبوت موجود ہی، سقراط، کہ تم ہم کو اور شہر کو ناپسند نہیں کرتے۔ ایتھنس کے باشندوں میں تم سب سے زیادہ شہر میں رہے ہو اور چونکہ تم یہاں سے کبھی باہر نہیں جاتے اس لیے یہ سمجھا جا سکتا ہی کہ تمھیں اس سے محبت ہی۔ نہ تم ایک بار کے سوا کبھی کھیل دیکھنے استھمس گئے اور نہ کہیں اور بجز ان موقعوں کے جب فوجی خدمت انجام دے رہے تھے۔ تم دوسرے لوگوں کی طرح سفر نہیں کرتے۔ تمھیں دوسری ریاستوں اور ان کے قوانین کو دیکھنے کا شوق نہیں۔ تمھاری محبت کا دائرہ تو بس ہم تک اور ہماری ریاست تک محدود رہی۔ تم ہمیں خاص طور پر عزیز رکھتے تھے ہماری حکومت سے راضی تھے۔ اسی شہر میں تم نے بچے پیدا کیے جو اس بات کا ثبوت ہی کہ تم اس سے مطمئن تھے۔ اس کے علاوہ وہ مقدمے کے دوران میں تم چاہتے تو

اپنے لیے جلاوطنی کی سزا تجویز کر دیتے۔ ریاست اب تمھیں جانے کی اجازت نہیں دیتی مگر اس وقت دے دیتی لیکن تم نے یہ ظاہر کیا کہ تم موت کو جلاوطنی پر ترجیح دیتے ہو اور مرنے کے لیے تیار ہو۔ اب تم ان سب اعلیٰ جذبات کو بھول گئے اور قوانین کا ادب کرنے کے بجائے ہمیں مٹانے کے درپے ہو اور وہ حرکت کر رہے ہو جو صرف ایک ادنیٰ غلام ہی کر سکتا ہے یعنی بھاگ کر جا رہے ہو اور ان سب معاہدوں سے پھرے جاتے ہو جو تم نے شہری کی حیثیت سے کیے تھے سب سے پہلے تو اسی سوال کا جواب دو: کیا ہمارا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ تم نے نہ صرف قول سے بلکہ فعل سے ہمارے زیرِ حکومت رہنے کا معاہدہ کیا تھا؟ بتاؤ یہ بات سچ ہے یا نہیں؟" ہم اس کا کیا جواب دیں کریٹو؟ کیا ہم اس پر مجبور نہیں کہ اس کی تصدیق کریں؟

کریٹو۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں سقراط۔

سقراط۔ تو پھر کیا وہ یہ نہیں کہیں گے "سقراط تم ان معاہدوں کو توڑ رہے ہو جو تم نے فرصت سے سمجھ بوجھ کر کیے تھے، عجلت یا جبر یا فریب کی حالت میں نہیں بلکہ ستر سال تک غور کرنے کے بعد۔ اس اثنا میں تمھیں یہ آزادی تھی کہ اگر تم ہمیں پسند نہیں کرتے یا ہمارے معاہدوں کو خلاف انصاف سمجھتے ہو تو شہر کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ تمھیں انتخاب کا موقع حاصل تھا خواہ لکیڈیمون چلے جاتے یا کریٹ جن دونوں ریاستوں کے نظمِ حکومت کی تم نے اکثر تعریف کی ہے یا کسی اور یونانی یا غیر ملکی ریاست میں۔ مگر تم اور سب اہلِ ایتھنس سے زیادہ ریاست سے، یا دوسرے الفاظ میں ان کے قوانین سے (اس لیے کہ بغیر قوانین کے ریاست کو کون پوچھتا ہے)، اتنے خوش معلوم ہوتے تھے کہ تم نے اس کی حد سے باہر قدم نہیں رکھا۔ لولے لنگڑے اور اندھے بھی اس طرح جم کر ایک جگہ نہ رہتے ہوں گے

جیسے تم رہے ۔ اور اب تم بھاگنے پر آمادہ ہو اور اپنے معاہدے سے پھرے جاتے ہو۔ ہماری بات مانو تو یہ ہرگز نہ کرو، سقراط۔ کیوں شہر سے فرار ہو کر اپنے کو ہنسواتے ہو؟

" ذرا سوچو تو کہ اگر تم اس طرح کی غلطی کرو گے تو تمھارا یا تمھارے دوستوں کا اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ یہ بات کہ تمھارے دوست جلاوطن کر دیے جائیں گے اور حق شہریت سے محروم ہو جائیں گے یا اپنی املاک کھو بیٹھیں گے قریب قریب یقینی ہے۔ اور خود تم سقراط، کسی ہمسایہ ریاست مثلاً تھیبس یا میگارا میں چلے جاؤ گے جن دونوں کا نظم حکومت بہت اچھا ہے، دشمن کی حیثیت سے وہاں پہنچو گے، ان کی حکومت تمھارے خلاف ہوگی اور سب وطن دوست شہری تمھیں قانون کی جڑ کھودنے والا سمجھ کر بُری نظر سے دیکھیں گے اور ججوں کے دل میں اس خیال کی تصدیق ہو جائے گی کہ ان کا تمھیں سزا دینا بالکل بجا ہے۔ اس لیے کہ جو شخص قوانین کو بگاڑنے والا ہے اغلب ہے کہ وہ انسانوں کے نوجوان اور ناسمجھ طبقے کا بگاڑنے والا بھی ہوگا تو پھر کیا تم خوش آئین شہروں سے اور خوش خصلت انسانوں سے دور رہو گے؟ کیا ان شرائط پر زندگی قابل قبول ہوگی؟ یا تم ان کے پاس جا کر بے باکی سے گفتگو کرو گے؟ مگر تم ان سے کہو گے کیا؟ وہی جو تم یہاں کہا کرتے ہو کہ نیکی اور عدل اور رسوم و قوانین انسانوں میں بہترین چیزیں ہیں؟ کیا یہ بات مناسب ہوگی؟ ہرگز نہیں لیکن اگر تم خوش آئین ریاستوں کو چھوڑ کر کریٹو کے دوستوں کے پاس تھسلی چلے گئے جہاں بدنظمی اور بے اصولی کا دور دورہ ہے تو وہ لوگ تمھارے قید خانے سے فرار ہونے کا قصہ سُن کر بہت محظوظ ہوں گے اور اس میں زیب داستان کے لیے بہت سی مضحک باتوں کا اضافہ کر دیں گے کہ تم نے کس طرح بکری کی کھال اوڑھ رکھی تھی یا کوئی اور بہروپ اختیار کر رکھا تھا جیسا کہ مفرور شکل

بدلنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی شخص یہ پوچھنے والا نہ ہوگا کہ تھوڑے دن اور زندہ رہنے کی حقیر خواہش کی بنا پر تمھیں اس بڑھاپے میں مقدس ترین قوانین کو توڑتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ شاید کوئی نہ پوچھے اگر تم نے ان سب کو خوش رکھا۔ لیکن اگر کبھی وہ خفا ہوگئے تو تمھیں بہت سی ذلت آمیز باتیں سننی پڑیں گی۔ تم زندہ تو رہو گے مگر کس حالت میں؟ ——سب لوگوں کے خوشامدی اور خدمت گار بن کر، اور تمھارا شغل کیا ہوگا؟—— تھسلی میں رہنا اور کھانا پینا گویا تم نے محض پیٹ بھرنے کی خاطر پردیس کا سفر اختیار کیا۔ اور یہ تمھارے عدل وخیر کے اعلیٰ خیالات کہاں چلے جائیں گے؟ اگر تم یہ کہو کہ میں اپنے بچوں کی خاطر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔— ان کی تعلیم وتربیت کرنا چاہتا ہوں —— کیا تم انھیں اپنے ساتھ تھسلی لے جاؤ گے اور ایتھنس کی شہریت سے محروم کردو گے؟ یہی وہ احسان ہے جو تم ان پر کرو گے؟ یا تم اس خیال میں ہو کہ اگر تم زندہ رہے خواہ ان سے دور ہی کیوں نہ ہو تو ان کی تعلیم وتربیت بہتر ہوگی اس لیے کہ تمھارے دوست ان کی خبرگیری کریں گے؟ تم سمجھتے ہو کہ اگر تم تھسلی کے باشندے ہوگئے تو وہ تمھارے بچوں کی خبر لیں گے اور اگر دوسری دنیا کے باشندے ہوگئے تو وہ ان کی خبر نہیں لیں گے؟ حالانکہ اگر وہ لوگ جو اپنے آپ کو تمھارا دوست کہتے ہیں کسی کام کے ہیں تو وہ ان کی مدد کریں گے —— یقیناً کریں گے۔

"لہٰذا سقراط، ہم جنھوں نے تمھاری پرورش کی ہے جو کچھ کہتے ہیں کان دھر کر سنو۔ زندگی اور بچوں کو مقدم اور عدل کو موخر نہ سمجھو بلکہ عدل کو سب سے مقدم سمجھو تاکہ عالم زیریں کے حاکموں کی نظر میں تمھارا عمل صحیح ٹھہرے۔ اس لیے اگر تم نے کریٹو کی بات مان لی تو نہ تم کو اور تمھارے متعلقین کو اس دنیا میں زیادہ خوشی اور پاکی اور نیکی میسر ہوگی اور نہ دوسری دنیا میں زیادہ سعادت حاصل ہوگی۔ اب تم بے گناہ دنیا سے

جارہے ہو مظلوم کی حیثیت سے نہ کہ ظالم کی، تمھیں انسانوں نے سزا دی ہی نہ کہ قوانین نے۔ لیکن اگر تم بدی کے عوض بدی کرو اور نقصان کے بدلے نقصان پہنچاؤ، ان معاہدوں کو جو ہم سے کیے ہیں توڑ دو اور ان لوگوں کے ساتھ بُرا سلوک کرو جن سے تمھیں خاص طور پر اچھا سلوک کرنا چاہیے یعنی اپنے اپنے دوستوں کے، اپنے ملک کے اور ہمارے ساتھ، تو جب تک تم زندہ ہو ہم تم سے بیزار رہیں گے اور ہمارے بھائی یعنی عالم زیریں کے قوانین تمھیں دشمن سمجھیں گے اس لیے کہ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے ہمیں برباد کرنے کی پوری کوشش کی ہی اس لیے تم ہماری بات مانو اور کریٹو کی نہ مانو۔"

یہ ہی پیارے کریٹو، وہ آواز جو میرے کانوں میں آرہی ہی جس طرح نَے کی آواز صوفی کے کانوں میں آتی ہی۔ سچ پوچھو تو یہ صدا میرے کان میں اس طرح گونج رہی ہی کہ میں اور کوئی صدا سن ہی نہیں سکتا اور میں جانتا ہوں کہ اگر تم اور کچھ کہوگے تو بالکل بیکار ہوگا۔ پھر بھی اگر کچھ کہنا ہو تو کہو۔

کریٹو۔ مجھے کچھ نہیں کہنا ہی سقراط۔

سقراط۔ تو پھر مجھے چھوڑ دو، کریٹو کہ میں خدا کی مشیت کو پورا کروں اور جدھر وہ لے جائے چلا جاؤں۔

فیڈو

اشخاص مکالمہ

فیڈو (جو اس مکالمے کو ایشیکراٹیس فیلسی سے بیان کر رہا ہے)	اپولوڈورس
سقراط	سیمیاس
قید خانے کا ملازم	سیبیس
	کریٹو

مقام مکالمہ — سقراط کا قید خانہ

مقام نقل مکالمہ — فیلس

ایشیکراٹیس ۔ فیڈو کیا تم اس روز قید خانے میں سقراط کے ساتھ تھے جس دن اس نے زہر پیا ہے ۔

فیڈو ۔ ہاں ایشیکراٹیس میں وہیں موجود تھا ۔

ایشیکراٹیس ۔ میں اس کی موت کے حالات سننا چاہتا ہوں ۔ اس نے اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں میں کیا باتیں کیں ؟ ہم نے صرف اتنا سنا تھا کہ وہ زہر پی کر مر گیا اور اس سے زیادہ کسی شخص کو معلوم نہ تھا کیونکہ اب کوئی فیلسی ایتھنس نہیں جاتا اور مدت سے ایتھنس سے بھی کوئی ادھر نہیں آیا چنانچہ ہمیں مفصل روئیداد نہیں معلوم ہوئی ۔

فیڈو ۔ کیا تم نے مقدمے کی کارروائی بھی نہیں سنی ؟

ایشیکراٹیس۔ مقدمے کا حال تو کسی نے سُنایا تھا اور ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ سزا سنانے کے بعد کیوں وہ اسی وقت نہیں مارا گیا بلکہ ایک عرصے کے بعد۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟

فیڈو۔ یہ محض اتفاق تھا ایشیکراٹیس۔ جس دن سقراط کا مقدمہ پیش ہوا اس سے ایک دن پہلے وہ جہاز سجایا گیا تھا جو اہل ایتھنس ڈیلوس بھیجا کرتے ہیں۔

ایشیکراٹیس۔ یہ کون جہاز ہے؟

فیڈو۔ یہ وہ جہاز ہے جس میں اہل ایتھنس کی روایت کے بموجب تھیسیس کریٹ گیا تھا جب وہ چودہ نوجوانوں کو ساتھ لے گیا اور اپنی اور ان کی جان بچا لایا۔ مشہور ہے کہ انھوں نے اپالو کی درگاہ میں نذر مانی تھی کہ اگر وہ سلامت رہے تو ہر سال ایک ہم ڈیلوس بھیجا کریں گے۔ یہ رسم اب تک جاری ہے اور وہ سارا زمانہ جو ڈیلوس آنے جانے میں صرف ہوتا ہے، اس وقت سے جب اپالو کا پجاری دنبالہ جہاز کو سجاتا ہے، مقدس سمجھا جاتا ہے اس اثنا میں شہر کو مجرموں کے قصاص سے ناپاک نہیں ہونے دیتے اور جب جہاز مخالف ہواؤں کی وجہ سے رُک جاتا ہے تو آنے جانے میں بہت دن لگ جاتے ہیں۔ تو جیسا کہ میں کہہ رہا تھا جہاز سقراط کے مقدمے سے ایک روز پہلے سجایا گیا تھا اسی وجہ سے سقراط قید میں پڑا رہا اور سزا سنانے کے بہت دن بعد تک نہیں مارا گیا۔

ایشیکراٹیس۔ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی فیڈو؟ کیا کیا کہا گیا؟ اس کے دوستوں میں سے کون کون اس کے ساتھ تھا؟ یا حکّام نے انھیں وہاں رہنے کی ممانعت کر دی تھی اور مرتے وقت کوئی دوست اس کے پاس نہ تھا؟

فیڈو۔ نہیں کئی ایک تھے۔

ایشیکراٹیس۔ اگر تمھیں اور کوئی کام نہ ہو تو میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے یہ روداد جہاں تک ہو سکے صحت کے ساتھ سنا دو۔

فیڈو۔ مجھے کوئی کام نہیں اور میں تمھاری خواہش پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ سقراط کے ذکر سے مجھے ہمیشہ نہایت خوشی ہوتی ہے خواہ میں خود اس کے حالات بیان کروں یا دوسرے سے سنوں۔

ایشیکراٹیس۔ جو لوگ تمھاری گفتگو سنیں گے وہ بھی تمھارے ہم خیال ہیں اور مجھے امید ہے کہ تم حتی الامکان پوری صحت کے ساتھ سارا واقعہ سناؤ گے۔

فیڈو۔ جب میں اس کے ساتھ تھا تو میرے دل میں کچھ عجیب احساس تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں اپنے دوست کی موت کا منظر دیکھ رہا ہوں اس لیے مجھے کوئی افسوس نہ تھا۔ اس نے بے جگری سے جان دی اور اس کے الفاظ اور تیور اس قدر شاندار تھے کہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر خدا کی برکت نازل ہو رہی ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ دوسری دنیا میں یقیناً خدا کا بلایا ہوا جا رہا ہے اور وہاں پہنچ کر اگر کسی انسان کو راحت و مسرت حاصل ہوتی ہے تو اسے ضرور حاصل ہوگی۔ اس لیے مجھے اس کی حالت پر افسوس نہیں ہوا جیسا کہ بظاہر ایسے وقت میں قدرتی طور پر ہونا چاہیے تھا۔ پھر بھی مجھے فلسفیانہ بحث میں (اس لیے کہ فلسفہ ہی ہماری گفتگو کا موضوع تھا) وہ لطف محسوس نہیں ہوا جو عموماً ہوا کرتا ہے میں خوش تو ضرور تھا لیکن اس خوشی میں رنج کی کچھ عجیب آمیزش تھی کیونکہ میرے ذہن سے یہ خیال کسی طرح نہیں نکلتا تھا کہ وہ عنقریب مرنے والا ہے اور یہ دہرا احساس ہم سب میں مشترک تھا، ہم کبھی ہنستے تھے اور کبھی روتے تھے خصوصاً اپولوڈورس جو بہت جلد جوش میں آجاتا ہے ——— تم تو اس طبیعت کے لوگوں کو جانتے ہو نہ؟

ایشیکراٹیس ۔ ہاں جانتا ہوں ۔

فیڈو ۔ وہ بالکل اپنے قابو میں نہ تھا اور ہم سب بہت متاثر تھے ۔

ایشیکراٹیس ۔ اور کون کون لوگ موجود تھے ؟

فیڈو ۔ خاص ایتھنس کے باشندوں میں اپولوڈورس، کریٹو، بوٹس اور اس کے باپ کریٹو کے علاوہ ہرموگنیس، اپی گنیس، ایشینس، ایتھقیس موجود تھے۔ اور کٹیپس پینیائی مینکسینس وغیرہ بھی تھے ۔ افلاطون جہاں تک مجھے معلوم ہے بیمار تھا ۔

ایشیکراٹیس ۔ کچھ باہر کے لوگ بھی تھے ؟

فیڈو ۔ تھے کیوں نہیں ۔ سیمیاس تھیبی، سیبیس اور فیڈونڈیس اقلیدس اور ٹرپسون جو مگارا سے آئے تھے ۔

ایشیکراٹیس ۔ اور ارسٹپس اور کلیومبروٹس ؟

فیڈو ۔ نہیں ان کے متعلق یہ سنا تھا کہ وہ ایگینا گئے ہوئے ہیں ۔

ایشیکراٹیس ۔ اور کوئی ؟

فیڈو ۔ میرے خیال میں بس اتنے ہی تھے ۔

ایشیکراٹیس ۔ اچھا تو تم لوگ کیا کیا باتیں کرتے رہے ؟

فیڈو ۔ میں شروع سے چلتا ہوں اور ساری گفتگو کو دہرانے کی کوشش کرتا ہوں ۔ پچھلے چند روز سے ہم لوگ صبح تڑکے اس چوک میں جہاں مقدمہ پیش ہوا تھا جمع ہو جایا کرتے تھے ۔ یہ جگہ قید خانے کے قریب ہی ہے ۔ ہم یہاں کھڑے آپس میں باتیں کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ پھاٹک کھل جائے (اس لیے کہ پھاٹک بہت سویرے نہیں کھلتا تھا) پھر اندر چلے جاتے تھے اور عموماً دن بھر سقراط کے ساتھ رہتے تھے ۔ آخری صبح کو ہم معمول سے کچھ پہلے وہاں

جمع ہو گئے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے روز جب ہم شام کو قید خانے سے رخصت ہو رہے تھے تو ہم نے یہ سنا کہ مقدس جہاز ڈیلوس سے واپس آگیا ہے اور آپس میں طے کر لیا کہ کل بہت سویرے مقررہ مقام پر جمع ہو جائیں گے۔ جب ہم پہنچے تو جیلر، جس نے ہماری دستک کا جواب دیا، ہمیں اندر لے جانے کی بجائے خود باہر آگیا اور کہا "جب تک میں نہ بلاؤں تم یہیں ٹھیرو اس لیے کہ اس وقت حضرات یازدہ[1] سقراط کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ وہ اس کی بیڑیاں اتروا رہے ہیں اور یہ احکام جاری کر رہے ہیں کہ آج اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔" تھوڑی دیر میں وہ واپس آیا اور اس نے کہا کہ اب تم لوگ آسکتے ہو۔ اندر جا کر ہم نے دیکھا کہ ابھی ابھی سقراط کی بیڑیاں اتاری گئی ہیں اور زانتھیپ جسے تم جانتے ہو اس کے بچے کو گود میں لیے اس کے قریب بیٹھی ہے۔ ہمیں دیکھ کر وہ جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہے گریہ و زاری کرنے لگی اور اس نے کہا "ہائے سقراط، یہ آخری موقع ہے تمھیں اپنے دوستوں سے اور انھیں تم سے باتیں کرنے کا۔" سقراط نے کریٹو سے مخاطب ہو کر کہا "کوئی شخص جا کر اسے گھر پہنچا دے۔" چنانچہ کریٹو کے آدمیوں میں سے چند اسے وہاں سے لے گئے اور وہ روتی پیٹتی رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد سقراط اٹھ کر کوچ پر بیٹھ گیا وہ جھک کر اپنی ٹانگ سہلاتا جاتا تھا اور یہ کہتا جاتا تھا: یہ راحت بھی عجیب چیز ہے اور الم سے جو اس کی ضد سمجھا جاتا ہے اس کو کچھ عجیب قسم کا تعلق ہے۔ یہ دونوں ایک ہی لمحے میں کسی انسان کے اندر موجود نہیں ہوتے لیکن جو شخص ان میں سے ایک کو چاہتا ہے اسے عموماً دوسرے کو بھی قبول کرنا پڑتا ہے، اس کے جسم دو ہیں مگر ایک ہی سر میں جڑے ہوئے ہیں مجھے یقین ہے کہ اگر ایسپ کو

---

[1] گیارہ شہریوں کی ایک کمیٹی جو قید خانوں کی نگرانی کرتی تھی۔

ان کا خیال آتا تو وہ ایک حکایت تصنیف کر دیتا کہ خدا نے ان میں میل کرانے کی کوشش کی اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو ان کے سرے کر آپس میں جوڑ دیئے۔ اسی لیے جہاں ان میں سے ایک پہنچا دوسرا بھی اس کے پیچھے پیچھے پہنچتا ہے جیسا کہ مجھے اس وقت تجربہ ہو رہا ہے۔ بیڑیوں کی وجہ سے جو درد ہو رہا تھا اس کے بجائے اب ایک راحت محسوس ہو رہی ہے۔

اس پر سیبیس بولا "اچھا ہوا سقراط کہ تم نے ایسپ کا نام لیا۔ اس پر مجھے ایک سوال یاد آ گیا جو بہت سے لوگ کیا کرتے ہیں اور ابھی پرسوں ہی شاعر ایوینس نے مجھ سے کہا تھا۔ یقیناً وہ مجھ سے پھر پوچھے گا اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ میرے پاس اس کا جواب تیار رہے تو مجھے بتاؤ کہ میں اس سے کیا کہوں۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ کیا بات ہے کہ پہلے تو تم نے ایک مصرع بھی موزوں نہیں کیا تھا اور اب تم قید خانے میں ایسپ کی حکایت کو نظم کر رہے ہو اور اپولو کی شان میں مناجات بھی کہہ رہے ہو۔

اس نے جواب دیا سیبیس اسے اصل واقعہ بتا دو۔ میرے ذہن میں یہ خیال تک نہ تھا کہ اس کا یا اس کے کلام کا مقابلہ کروں۔ میں جانتا تھا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں مگر مجھے یہ فکر تھی کہ بعض خوابوں کی تعبیر کے بارے میں میرے دل میں جو ایک کانٹا کھٹک رہا ہے وہ نکل جائے۔ اپنی زندگی میں مجھے اکثر خواب میں یہ خبر دی گئی ہے کہ "میں تصنیف کروں گا"۔ وہی ایک خواب مجھے کبھی کسی شکل میں دکھائی دیتا تھا کبھی کسی شکل میں، مگر اسی میں ہمیشہ یہ یا ان سے ملتے جلتے الفاظ کہے جاتے تھے "موسیقی حاصل کرو اور تصنیف کرو"۔ اب تک میں سمجھتا تھا کہ اس کا منشا صرف یہ ہے کہ مجھے فلسفے کے مطالعے کی تاکید کی جائے جو میرا عمر بھر کا مشغلہ ہے اور موسیقی کی سب سے بہتر اور برتر شکل ہے۔ خواب میں

مجھے اس کام کے کرنے کا حکم دیا جا رہا تھا جو میں پہلے سے کر رہا تھا اسی طرح جیسے دوڑ میں مقابلہ کرنے والے کو تماشائی دوڑنے کی تاکید کرتے ہیں حالانکہ وہ پہلے ہی سے دوڑ رہا ہے۔ مگر مجھے اس بات کا پوری طرح یقین نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ خواب میں موسیقی کے عام معنی مراد لیے گئے ہوں۔ اب چونکہ مجھے موت کی سزا سنائی گئی ہے اور بیچ میں تہوار پڑ جانے سے تھوڑی سی مہلت مل گئی ہے۔ میں نے سوچا کہ احتیاطاً اس خلش کو دور کر دوں اور خواب کے حکم کے مطابق چند شعر کہہ ڈالوں۔ سب سے پہلے میں نے اس تہوار کے دیوتا کی شان میں ایک مناجات لکھی۔ پھر اس خیال سے کہ شاعر کو، اگر وہ سچ مچ شاعر ہے، محض تک بندی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنی طرف سے قصّہ بھی گھڑنا چاہیے اور مجھ میں یہ مادہ نہیں ہے، میں نے ایسپ کی چند حکایات کو جو میرے پاس موجود تھیں اور جن سے میں اچھی طرح واقف تھا (یہ وہ تھیں جو مجھے سب سے پہلے پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا) نظم کر دیا۔ یہ بات ایوینس کو بتا دینا سیبیس اور تاکید کر دینا کہ دل کو مضبوط رکھے۔ میری طرف سے یہ بھی کہہ دینا کہ اگر وہ دانشمند ہے تو میرے پیچھے پیچھے چلا آئے، دیر نہ لگائے میں تو غالباً آج جا رہا ہوں اس لیے کہ اہل ایتھنس کا حکم ہے۔

سیمیاس نے کہا: یہ پیام اور ایسے آدمی کے لیے! میرا اس کا بہت ساتھ رہا ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ تمھارے مشورے پر ہرگز عمل نہیں کرے گا جب تک مجبور نہ ہو جائے۔

سقراط نے کہا: کیوں، کیا وہ فلسفی نہیں ہے؟

سیمیاس بولا: ہے تو فلسفی۔

سقراط نے کہا: تو وہ یا کوئی شخص بھی جس میں فلسفے کی روح ہے، خوشی سے مرنے کو تیار ہو جائے گا۔ مگر وہ خودکشی نہیں کرے گا اس لیے کہ یہ حرام موت سمجھی

جاتی ہے"۔ اب اس نے پہلو بدلا اور اپنی ٹانگیں کوچ سے ہٹا کر زمین پر رکھ دیں بقیہ گفتگو کے دوران میں وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

سیبیس نے پوچھا: تم یہ کیوں کہتے ہو کہ انسان کو خودکشی نہیں کرنی چاہیے مگر فلسفی مرنے والے کی تقلید کو تیار ہو جائے گا؟

سقراط بولا: سیبیس اور سیمیاس، تم تو فلولاس کے شاگرد ہو تم نے کبھی اس کو اس کا ذکر کرتے نہیں سنا؟

"سنا تو ہے مگر اس کے الفاظ کچھ مبہم سے تھے، سقراط"!

"میرے الفاظ کو بھی محض صدائے بازگشت سمجھو۔ مگر اس میں کیا حرج ہے کہ میں نے جو کچھ سُنا ہے اُسے دُہرا دوں۔ سچ پوچھو تو جب میں دوسری جگہ جا رہا ہوں تو میرے لیے بہت مناسب ہے کہ جو سفر مجھے درپیش ہے اس کی حقیقت پر غور و فکر اور گفتگو کروں۔ اب سے غروب آفتاب تک جتنا وقفہ ہے اس میں اس سے بہتر اور کیا شغل ہو سکتا ہے؟"

"تو پھر مجھے یہ بتاؤ، سقراط کہ خودکُشی ناجائز کیوں سمجھی جاتی ہے؟ جیسا کہ میں نے فلولاس کو جس کے متعلق تم ابھی پوچھ رہے تھے کہتے سُنا ہے جب وہ تھیبیس میں ہمارے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو یہی کہتے ہیں اگرچہ میں کبھی نہ سمجھ سکا کہ ان کے اس اصول کے معنی کیا ہیں"۔

سقراط نے جواب دیا۔ ہمت نہ ہارو۔ ممکن ہے ایک دن ایسا آئے کہ اس کے معنی تمھاری سمجھ میں آ جائیں۔ شاید تمھیں اس بات پر حیرت ہے کہ جب اور بُری چیزیں بعض اوقات اور بعض اشخاص کے لیے اچھی بھی ہو سکتی ہیں تو ایک موت ہی اس سے مستثنیٰ کیوں ہے اور کیا وجہ ہے جب انسان کے لیے مرجانا اچھا ہو تو اسے خود اپنی مشکل آسان کرنے کی اجازت نہیں بلکہ اسے دوسرے کا انتظار کرنا

پڑتا ہی۔

سیبیس نے آہستہ سے ہنس کر اپنی دیسی بویوشی بولی میں کہا: "بالکل ٹھیک ہی"

"میں مانتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس میں بظاہر تضاد نظر آتا ہی مگر ممکن ہی حقیقت میں تضاد نہ ہو۔ ایک نظریہ ہی جو چپکے سے کان میں پھونک دیا جاتا ہی کہ انسان ایک قیدی ہی جسے یہ حق نہیں کہ قید خانے کا دروازہ کھول کر بھاگ جلئے یہ ایک راز ہی جسے میں اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ لیکن میرا ابھی یہی خیال ہی کہ دیوتا ہمارے مالک ہیں اور ہم انسان ان کی ملک ہیں۔ کیا تم اس سے متفق نہیں؟"

سیبیس نے کہا: "میں بالکل متفق ہوں۔"

"اگر تمھاری املاک میں سے کوئی بیل یا گدھا دنیا سے کھسک جانے کی جرأت کرے جب کہ تم نے یہ عندیہ ظاہر نہ کیا ہو کہ وہ مرجائے تو تمھیں غصہ نہیں آئے گا اور تم اُسے سزا نہیں دوگے اگر تمھارے اختیار میں ہو؟"

سیبیس نے جواب دیا: "یقیناً"۔

"تو اگر ہم مسئلے کو اس نظر سے دیکھیں تو شاید یہ بات معقول معلوم ہو کہ انسان کو خودکشی نہیں کرنی چاہیے مگر جب خدا کے ہاں سے طلبی آئے جیسے میری طلبی آئی ہی۔"

سیبیس نے کہا: "ہاں سقراط یہ بات تو صحیح معلوم ہوتی ہی۔ لیکن تم اس عقیدے کو جو بظاہر صحیح ہی کہ خدا ہمارا مالک ہی اور ہم اس کی ملک ہیں اس سے کیونکر مطابقت دوگے کہ انسان کو خوشی سے مرنے پر آمادہ رہنا چاہیے جو تم ابھی فلسفیوں کی طرف منسوب کر رہے تھے؟ یہ کہنا تو کچھ معقول نہیں کہ دانشمند ترین انسانوں کو خوشی سے وہ خدمت ترک کرنے پر آمادہ رہنا چاہیے

جس میں بہترین حاکموں یعنی دیوتاؤں کی اطاعت ہو اس لیے کہ یقیناً کوئی دانشمند یہ نہیں سمجھتا کہ آزاد ہونے کے بعد وہ خود اپنی خبر گیری اس سے بہتر کر سکتا ہی جیسی دیوتا اس کی کرتے ہیں۔ ہاں ایک احمق کا شاید یہ خیال ہو۔ وہ دل میں کہے کہ مالک کے گھر سے بھاگ جاؤں تو اچھا ہی اور یہ نہ سوچے کہ اس کا فرض یہی ہی کہ نیکوں سے نہ بھاگے بلکہ آخر تک ان کے ساتھ رہے اور بھاگنا بالکل بے معنی حرکت ہی۔ دانشمند آدمی تو ہمیشہ اس کے ساتھ رہنا پسند کرے گا جسے وہ اپنے سے بہتر سمجھتا ہی۔ یہ بات تو سقراط، اس کے بالکل برعکس ہی جو تم نے ابھی کہی تھی۔ اس خیال کے مطابق تو اس دنیا سے گزرتے وقت دانشمند آدمی کو افسوس کرنا چاہیے اور احمق کو خوش ہونا چاہیے"۔

سیبیس کی سنجیدگی سقراط کو پسند آئی۔ اس نے ہماری طرف مخاطب ہو کر کہا: دیکھو یہ شخص ہمیشہ تحقیق سے کام لیتا ہی یہ نہیں کہ جو کسی سے سُنی فوراً مان لی۔

سیمیاس بولا: اور جو اعتراض یہ کر رہا ہی سقراط، وہ یقیناً کچھ وزن رکھتا ہی آخر اس کے کیا معنی ہیں کہ ایک حقیقی دانشمند شخص اس مالک کے پاس سے جو اس سے بہتر ہی بھاگنا چاہے اور ذرا سی بات میں اسے چھوڑ دے، اور مجھے تو یہ خیال ہوتا ہی کہ سیبیس کا اشارہ تمھاری طرف ہی وہ سمجھتا ہی کہ تم بہت شوق سے ہم لوگوں کو اور ان دیوتاؤں کو جنھیں تم اچھے مالک مانتے ہو چھوڑ کر چلے جانے پر آمادہ ہو۔

سقراط نے کہا: ہاں تمھارا کہنا ایک حد تک ٹھیک ہی اچھا تو تمھارے خیال میں مجھے تمھارے الزام کا جواب اس طرح دینا چاہیے گویا میں عدالت میں ہوں؟

سیمیاس بولا: ہم چاہتے تو یہی ہیں۔

تو پھر مجھے یہ کوشش کرنا چاہیے کہ تمھارے سامنے اس سے زیادہ کامیاب صفائی پیش کروں جیسی ججوں کے سامنے کی تھی۔ میں یہ ماننے کو تیار ہوں سیمیاس اور سیبیس کہ مجھے اپنی موت کا رنج ہونا چاہیے تھا، اگر مجھے دو باتوں کا یقین نہ ہوتا ایک یہ کہ میں نئے دیوتاؤں کے پاس جا رہا ہوں جو دانشمند اور نیک ہیں (اس کا مجھے پورا یقین ہی جہاں تک ان معاملات میں ہو سکتا ہی) دوسرے (گو مجھے اس کا یقین نہیں) مرحوم بزرگوں کے پاس جوان لوگوں سے بہتر ہیں جنھیں میں چھوڑ رہا ہوں۔ اب مجھے وہ رنج نہیں جو اس صورت میں ہوتا میرا دل کہتا ہی کہ مرنے کے بعد بھی انسان کے لیے کوئی چیز باقی ضرور رہتی ہی اور وہ چیز نیکوں کے لیے اس سے کہیں اچھی ہی جیسی بدوں کے لیے ہی۔

سیمیاس نے کہا: مگر سقراط کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے خیالات اپنے ساتھ لے جاؤ؟ کیا ہمیں ان سے مستفید نہ کروگے؟ آخر اس نعمت میں ہمارا بھی تو حصہ ہی اس کے علاوہ اگر تم نے ہمیں قائل کر دیا تو جو الزام تم پر لگایا گیا اس کی تردید بھی ہو جائے گی۔

سقراط نے جواب دیا: میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ مگر پہلے مجھے یہ سن لینے دو کہ کریٹو کیا چاہتا ہی۔ وہ بہت دیر سے مجھ سے کہنے کا ارادہ کر رہا ہی۔

کریٹو بولا: صرف اتنی بات سقراط، وہ ملازم جو تمھیں زہر دے گا مجھ سے کئی بار کہہ چکا ہی اور چاہتا ہی کہ میں تم سے بھی کہہ دوں کہ تمھیں زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہیے اس کا قول ہی کہ باتیں کرنے سے جسم میں حرارت بڑھ جاتی ہی اور اس سے زہر کے عمل میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہی۔ جن لوگوں کو جوش آجائے انھیں بعض اوقات دوسرا بلکہ تیسرا پیالہ بھی پینا پڑتا ہے۔

سقراط نے کہا: تو اس سے کہو کہ اپنے کام سے کام رکھے اور اس کے لیے تیار رہے کہ اگر ضرورت ہو تو دو بار بلکہ تین بار زہر بلائے۔ چلو قصہ ختم۔

کریٹو نے کہا: مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ تم کیا کہو گے۔ مگر مجھے اسی کا اطمینان کرنا تھا۔

اس نے کہا: خیر کوئی حرج نہیں۔

"اور اب، اے میرے جج! میں تمھارے سامنے یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ حقیقی فلسفی کو چاہیے کہ موت کے وقت خوش ہو اور یہ امید رکھے کہ دوسری دُنیا میں اس کے لیے ہر طرح کی بھلائی ہے۔ اس کی وجہ سیمیاس اور سیبیس میں تمھیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ غالباً فلسفے کے سچے پرستار کی طرف سے لوگوں کو غلط فہمی رہے گی۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ شخص ہمیشہ موت کی تلاش میں ہے اور مرتا رہتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور وہ عمر بھر موت کا خواہشمند رہا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ جب اس کا وقت آجائے تو وہ اس چیز سے رنجیدہ ہو جس کی اسے ہمیشہ خواہش اور تلاش رہی ہے۔"

سیمیاس نے ہنس کر کہا "اگرچہ اس وقت طبیعت ہنسنے کے لیے موزوں نہ تھی مگر تم نے مجھے ہنسا دیا، مجھے بے اختیار خیال آتا ہے کہ عام لوگ تمھاری بات سُن کر کہیں گے کہ تم نے فلسفیوں کی کیا اچھی تعریف کی ہے اسی طرح ہمارے ہم وطن کہیں گے کہ جو زندگی فلسفی چاہتے ہیں وہ حقیقت میں موت ہے اور اب ہمیں معلوم ہو گیا کہ وہ موت کے، جس کی انھیں خواہش ہے ہر طرح مستحق ہیں۔"

"اور ان کا یہ خیال صحیح ہو گا، بجز ان الفاظ کے، کہ ہمیں معلوم ہو گیا، اس لیے کہ نہ تو انھیں اس موت کی حقیقت معلوم ہے جس کی فلسفی کی خواہش ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کیوں موت کا خواہش مند یا مستحق ہے۔ مگر ان کا ذکر چھوڑو ـــــ

- ـــــ ہمیں خود ہی اس مسئلے پر بحث کرنے دو۔ کیا ہم یہ مانتے ہیں کہ موت کوئی چیز ہی؟"

سیمیاس نے جواب دیا: "بے شک"۔

"کیا وہ جسم و روح کی جدائی نہیں ہی؟ اسی کی تکمیل کو مرجانا کہتے ہیں۔ جب روح الگ وجود رکھتی ہو اور جسم سے چھوٹ جائے اور جسم روح سے چھوٹ جائے تو وہ موت نہیں تو اور کیا ہی؟"

"بالکل ٹھیک ہی"۔

ایک اور سوال ہی جس سے غالباً اس مسئلے پر جس کی ہم اس وقت تحقیق کر رہے ہیں کچھ روشنی پڑے گی اگر تم میں اور مجھ میں اتفاق ہو جائے: کیا فلسفی کو کھانے اور پینے کی لذتوں کی ـــــ اگر انھیں لذت کہا جائے، پروا کرنی چاہیے۔

"ہرگز نہیں"۔

"اور عشق و محبّت کی لذتیں۔ کیا اِن کی اُسے پروا ہونی چاہیے؟"

"بالکل نہیں"۔

"اور کیا وہ تن آسانی کی دوسری صورتوں کی طرف کچھ زیادہ توجہ کرے گا مثلاً قیمتی پوشاک یا کھڑاویں یا اور آرایش کا سامان مہیا کرنا؟ کیا اس کے برخلاف وہ قدرتی ضرورت کے علاوہ اور سب چیزوں کو حقیر نہیں سمجھتا؟ تمھارا کیا خیال ہی؟"

"میرے خیال میں وہ انھیں حقیر سمجھتا ہی"۔

"کیا تم یہ نہ کہو گے کہ اسے تمام تر روح سے سروکار ہی۔ جسم سے کوئی واسطہ نہیں؟ جہاں تک ممکن ہی وہ جسم سے قطع نظر کر کے روح کی طرف متوجہ ہوتا ہی؟"

"بالکل ٹھیک ہی"۔

اس قسم کے معاملات میں ہم فلسفیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ سب لوگوں سے زیادہ

روح کو جسم کے تعلق سے علاحدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"بہت ٹھیک ہے۔"

"بہ خلاف اس کے سیمیاس اور ساری دنیا کی یہ رائے ہے کہ جو شخص لذّت کا ذوق نہ رکھتا ہو اور جسمانی لذات سے محظوظ نہ ہوتا ہو اس کی زندگی ہیچ ہے جسے ان چیزوں سے دل چسپی نہ ہو وہ مُردے سے بدتر ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"اور علم و معرفت کے حصول کے بارے میں ہم کیا کہیں گے؟ اگر جسم کو اس قسم کی تحقیقات میں شریک کیا جائے تو وہ کچھ مدد دے گا یا اور رُکاوٹ ڈالے گا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ باصرہ اور سامعہ سے حقیقی علم حاصل ہوتا ہے؟ کیا یہ دونوں، جیسا کہ ہمارے شاعر کہتے آئے ہیں جھوٹے گواہ نہیں ہیں؟ اور جب ان دونوں قوتوں کی شہادت غلط اور مبہم ہے تو پھر اور حواس کو کیا کہا جائے؟ کیونکہ یہ تو تم تسلیم کرو گے کہ یہی سب میں بہتر ہیں؟"

"یقیناً۔"

"تو پھر روح حقیقت کی معرفت کب حاصل کرتی ہے؟ اس لیے کہ جب وہ جسم کے ساتھ مل کر کسی مسئلے پر غور کرنا چاہتی ہے تو صریحاً دھوکا کھاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو لازمی طور پر حقیقت کا علم اُسے اگر ہوتا ہے تو خیال کے ذریعے سے ہوتا ہے۔"

"اور کیا۔"

اور خیال کی بہترین صورت وہی ہوتی ہے جب وہ یکسوئی سے خود اپنے مرکز پر جمع ہو اور ان چیزوں میں سے کوئی اس کام میں خلل انداز نہ ہو —— نہ صدائیں نہ مناظر نہ راحت نہ الم —— جب وہ جسم سے رخصت ہو جائے

اور حتی الامکان اس سے سروکار نہ رکھے، جب وہ جسمانی حسیات اور خواہشات سے پاک اور طلب حقیقت میں مصروف ہو؟"

"اور اس لحاظ سے فلسفی جسم کو ذلیل کرتا ہے، اس کی روح جسم سے بھاگتی ہے ور تنہا رہنا چاہتی ہے؟"

"یہ تو ٹھیک ہے"۔

"مگر ایک اور بات ہے، سمیاس کیا عدل مطلق وجود رکھتا ہے؟"

"ضرور"۔

"اور حسن مطلق اور خیر مطلق؟"

"یقیناً"۔

"مگر کیا تم نے ان میں کسی کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے؟"

"ہرگز نہیں"۔

"یا کسی اور جسمانی قوت کو حس کے ذریعے سے ان کا ادراک حاصل کیا ہے؟ —— اور میں صرف انھی کو نہیں پوچھتا بلکہ عظمت مطلق، صحت مطلق، قوت مطلق غرض ہر چیز کی حقیقت اور ماہیت کو۔ کیا تم نے ان کے وجود کا ادراک کبھی جسمانی حواس سے کیا ہے؟ کیا اس کے برخلاف ایک چیز کی حقیقت سے سب سے زیادہ قریب وہ شخص نہیں پہنچتا جو اپنی ذہنی قوت مشاہدہ سے اس طرح کام لیتا ہو کہ جس چیز پر غور کرے اس کی ماہیت کا نہایت صحیح تصور حاصل کرلے؟"

"یقیناً"۔

"اور وہی شخص ان کا خالص ترین علم حاصل کرسکتا ہے جو ان میں سے ہر ایک کا صرف اپنے ذہن کے ذریعے سے ادراک کرے اور خیال کے عمل میں حس بصر یا کسی اور حس کو عقل کے ساتھ شریک نہ کرے بلکہ خود ذہن کی صاف روشنی میں ہر چیز کی

حقیقت کو تلاش کرے، جو شخص تا حدِ امکان آنکھ، کان، غرض سارے جسم سے آزاد ہو جائے، ان چیزوں کو انتشار خیال کا باعث سمجھتا ہے، جو روح کو آلودہ کریں۔ اس لیے کہ وہ اسے علم و حقیقت حاصل کرنے سے روکتی ہیں ——— اگر وہ وجود حقیقی کی معرفت نہ حاصل کرے گا تو اور کون کرے گا؟"

سیمیاس نے جواب دیا، "جو کچھ تم نے کہا اس میں عجیب و غریب حقیقت نظر آتی ہے، سقراط"۔

"اور جب فلسفی ان سب باتوں پر غور کریں گے تو کیا ان کے ذہن میں ایک خیال پیدا نہ ہوگا۔ جسے وہ کچھ اس قسم کے لفظوں میں ظاہر کریں گے؟ ———

ہمیں غور و فکر کی ایک راہ مل گئی ہے جو ہماری بحث کو اختتام تک پہنچا دیتی ہے کہ جب تک روح جسم کے اندر ہے اور اس کی برائیوں سے آلودہ ہے ہماری آرزو پوری نہیں ہوگی۔ اور وہ آرزو کیا ہے؟ ——— تلاش حق۔ اس لیے کہ محض ایک غذا کی ضرورت ہمارے جسم کو ہمارے لیے طرح طرح کے مصیبتوں کا باعث بنا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ جسم امراض کی زد میں ہے جو ہم پر حملہ کرتے ہیں طلب اور حقیقت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ وہ ہم کو محبت، خواہش نفس اور خوف کے جذبات سے، طرح طرح کے اوہام سے اور انتہائی حماقت سے معمور اور بہ قول شخصے سوچنے کی قوت سے محروم کر دیتا ہے۔ آخر یہ لڑائی جھگڑے، جتھے بندیاں کہاں سے پیدا ہوتی ہیں بجز جسم اور جسمانی خواہشات کے؟ جنگ و جدل کی جڑ روپے کی ہوس ہے اور روپیہ محض جسم کی خاطر اور اس کی خدمت کے لیے درکار ہے۔ ان سب رکاوٹوں کی وجہ سے ہمیں فلسفے کے مطالعے کا وقت نہیں ملتا اور اگر کچھ فرصت مل بھی جائے اور ہم غور و فکر کی طرف متوجہ ہوں تو جسم بار بار اس میں خلل انداز ہوتا ہے، ہماری تحقیق میں ابتری اور الجھن پیدا کرتا ہے اور ہمیں ایسا چکر میں

ڈال دیتا ہے کہ ہم حقیقت کا مشاہدہ نہیں کر پاتے۔ یہ بات ہم پر تجربے سے ثابت ہو چکی ہے کہ اگر ہمیں کسی چیز کا خالص علم حاصل کرنا ہے تو ہمیں جسم سے آزاد ہونا چاہیے —— روح کو بجائے خود اشیائے حقیقی کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔ تبھی ہمیں وہ حکمت حاصل ہو گی جس کی ہمیں خواہش ہے اور جس کی محبت کا ہم دعویٰ کرتے ہیں، زندگی میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد۔ اس لیے کہ اگر روح جب تک وہ جسم کے ساتھ ہے خالص علم نہیں حاصل کر سکتی تو دو باتوں میں سے ایک بات لازمی ہے یا تو علم سرے سے حاصل ہی نہیں ہو سکتا یا اگر ہو سکتا ہے تو مرنے کے بعد۔ اس لیے کہ صرف اسی وقت روح جسم سے جدا ہو کر اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے۔ موجودہ زندگی میں بھی میرے خیال میں ہم علم سے سب سے زیادہ قریب اسی صورت میں ہوتے ہیں جب ہمیں جسم سے کم سے کم تعلق یا واسطہ ہوتا ہے اور ہم جسمانیت میں ڈوبے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ اپنے آپ کو اس سے پاک رکھتے ہیں یہاں تک کہ مشیت الٰہی ہمیں جسم کی قید سے نجات دے دے۔ اسی طرح جسم کی حماقت سے نجات پا کر ہم پاک ہو جائیں گے اور پاکوں سے ہمارے راز و نیاز ہونے لگیں گے اور ہمیں خود بخود وہ نور مبین ہر جگہ پھیلا ہوا نظر آنے لگا جو حق کا نور ہے"۔ اس لیے کہ ناپاکوں کو پاکوں کے قریب آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کے الفاظ ہیں سیمیاس، جو علم کے سچے شیدائی لازمی طور پر ایک دوسرے سے کہتے ہیں اور دل میں سوچتے ہیں۔ تمھیں اس سے اتفاق ہے یا نہیں؟

"بلاشبہہ۔ سقراط؟"

مگر اے میرے دوست! اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ امید کرنے کی بہت بڑی وجہ ہے کہ جہاں میں جا رہا ہوں وہاں پہنچ کر وہ چیز حاصل کر لوں گا جس کی مجھے عمر بھر تلاش رہی ہے اس لیے میں خوش خوش روانہ ہو رہا ہوں اور ایک میں نہیں

بلکہ ہر شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ اس کا ذہن نئی زندگی کے لیے تیار ہے اور وہ کسی طرح آلودگیوں سے پاک ہو چکا ہے۔"

"یقیناً"۔

"اور پاک ہونا کیا ہے؟ یہی روح اور جسم کی جدائی جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، وجود روحانی کا اپنے آپ کو ہر طرف سے سمیٹ کر جسم سے الگ کر لینا اور موجودہ زندگی میں بھی جہاں تک ہو سکے اسی طرح اپنے دائرے کے اندر تنہا رہنا جس طرح آیندہ زندگی میں یعنی روح کا جسم کی قید سے رہا ہو جانا"۔

"بہت ٹھیک ہے"۔

"اور یہ روح کی جسم سے جدائی یا رہائی موت کہلاتی ہے؟"

"اور کیا"۔

"سچے فلسفی روح کی رہائی کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے سوا کوئی نہیں کرتا کیا روح کی جسم سے جدائی اور رہائی ان کی زندگی کا خاص مقصد نہیں ہے؟"

"بے شک"۔

"اور جیسا کہ میں پہلے کہہ رہا تھا یہ ایک نہایت مضحک اور بے جوڑ بات ہوگی کہ یوں تو لوگ جہاں تک ان سے ممکن ہے اپنی زندگی کو موت سے قریب تر کرنے کی کوشش کریں اور جب موت آ پہنچے تو افسوس کرنے لگیں"۔

"ظاہر ہے"۔

"اور سچے فلسفی، سیمیاس، ہمیشہ مرنے کے شغل میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی لیے انھیں اور سب لوگوں کے مقابلے میں موت کم خوفناک معلوم ہوتی ہے، تم اس مسئلے پر اس پہلو سے غور کرو:- اگر وہ ہر طرح سے جسم کے دشمن رہتے ہیں اور روح کے ساتھ خلوت چاہتے ہیں تو کس قدر بے تکی بات ہوگی کہ جب ان کی

یہ آرزو پوری ہو، وہ کانپنے اور رونے لگیں بجائے خوش ہونے کے کہ وہ ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں پہنچ کر انھیں وہ چیز حاصل ہو جائے گی جس کی زندگی بھر خواہش کرتے رہے ـــــ یعنی حکمت۔ اور اسی کے ساتھ اپنے دشمن کی صحبت سے نجات مل جائے گی۔ بہت سے لوگ اس امید پر عالم زیریں میں جانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ انھیں اپنے دنیاوی معشوق یا بیوی بیٹے سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملے گا۔ تو کیا وہ شخص جو حکمت کا سچا شیدا ہے اس یقین کے باوجود کہ اس کا کما حقہٗ لطف صرف عالم زیریں میں حاصل ہو سکتا ہے، موت کا رنج کرے گا؟ کیا وہ خوشی کے ساتھ جانے پر تیار نہ ہو جائے گا؟ یقیناً ہو جائے گا، میرے دوست، اگر وہ سچا فلسفی ہے۔ اس لیے کہ اسے یقین واثق ہوگا کہ صرف وہیں وہ حکمت کو خالص شکل میں پا سکتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو جیسا کہ میں نے کہا، اس کا موت سے ڈرنا نہایت ہی مہمل بات ہوگی۔"

"بے شک ہوگی۔"

"اور اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ موت کے سر پر آ پہنچنے سے رنجیدہ ہے تو کیا اس کی یہ بددلی اس بات کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ وہ حکمت کا شیدائی نہیں بلکہ اپنے جسم کا بندہ ہے اور غالباً اسی کے ساتھ دولت یا اقتدار یا ان دونوں چیزوں کی ہوس بھی رکھتا ہے؟"

"ضرور۔"

"اور سیمیاس، کیا شجاعت فلسفی کی خصوصیات میں داخل نہیں ہے؟"

"یقیناً ہے۔"

"پھر عفت جس کے متعلق عوام تک جانتے ہیں کہ وہ اس پر مشتمل ہے کہ آدمی جذبات پر ضبط اور قابو رکھے اور اپنے آپ کو ان سے بالاتر سمجھے ـــــ کیا

عفت صرف ان لوگوں کی مخصوص صفت نہیں ہے جو جسم کو حقیر سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی فلسفے کے مطالعے میں صرف کرتے ہیں؟"

"بے شک"۔

"اس لیے کہ اوروں کی شجاعت اور عفت اگر تم غور سے دیکھو، حقیقت میں ایک متناقض چیز ہے"۔

"وہ کیسے؟"

سقراط نے کہا "تم جانتے ہو کہ موت کو عام لوگ بہت بری چیز سمجھتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے"۔

"اور بہادر لوگ موت کا مقابلہ اسی لیے کرتے ہیں کہ انھیں اس سے بھی بدتر چیزوں کا خوف ہوتا ہے"۔

"بہت ٹھیک ہے"۔

"تو سوا فلسفیوں کے اور سب لوگ صرف خوف اور بزدلی کی وجہ سے بہادر ہوتے ہیں مگر ہے یہ عجیب وغریب بات کہ انسان خوف اور بزدلی کی وجہ سے بہادر بن جائے"۔

"بے شک"۔

اور باعفت لوگوں کا بھی یہی حال ہے ــــــ ان کے اعتدال کا باعث ان کی بے اعتدالی ہے۔ یہ بظاہر ایک متناقض بات معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں اس قسم کی غیر دانشمندانہ عفت میں ہوتا یہی ہے۔ لوگوں کو بعض لذتوں سے محروم ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے اور اس خیال سے کہ یہ ہاتھ سے نہ جانے پائیں وہ ان لذتوں سے مغلوب ہو کر بعض اور لذتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور اگرچہ لذتوں سے مغلوب ہو جانا بے اعتدالی کہلاتا ہے لیکن یہ لوگ مغلوب ہو جانے کو

غالب آجانا سمجھتے ہیں۔ میں اسی معنی میں یہ کہتا ہوں کہ گویا وہ بے اعتدالی کے ذریعے سے معتدل بن جاتے ہیں۔"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے۔"

"مگر ایک خوف یا لذت یا الم کا کسی اور خوف یا لذت یا الم سے، اور بڑی چیز کا چھوٹی چیز سے اس طرح مبادلہ کرنا گویا یہ بازاری سکے ہیں، اخلاقی مبادلہ نہیں ہے۔ اے میرے نیک بخت سیمیاس، دنیا میں کھرا سکہ صرف ایک ہی ہے جس سے ہر چیز کا مبادلہ کرنا چاہیے! ـــــــ یعنی حکمت۔ صرف اسی کے مبادلے میں اور اسی کے ذریعے سے حقیقت میں ہر چیز کی خرید و فروخت ہوتی ہے، خواہ وہ شجاعت ہو یا عفت یا عدل۔ حقیقی نیکی عفت کے تابع ہے خواہ اس کے ساتھ کتنا ہی خوف یا کتنی ہی لذتیں، مفید یا مضر چیزیں ملی ہوئی ہوں۔ وہ نیکی جو ان چیزوں پر مشتمل ہے، جب کہ ہم ان کا حکمت سے قطع تعلق کر کے آپس میں مبادلہ کیا کرتے ہیں اصل میں نیکی نہیں بلکہ محض اس کی پرچھائیں ہے۔ اس کے اندر آزادی یا صحت یا سچائی کا نام تک نہیں لیکن حقیقی مبادلے میں ان سب چیزوں کا تنزیہ ہو جاتا ہے اور عفت اور عدل و شجاعت اور خود حکمت بھی اسی تنزیے کا نتیجہ ہے۔ مذہبی رسوم کے بانیوں کا یہ قول کچھ معنی رکھتا تھا محض وہم بکواس نہ تھی کہ جو شخص ناپاکی اور نامحرمی کی حالت میں عالم زیریں میں جائے گا وہ ایک دلدل میں پڑا رہے گا مگر جو شخص پاک ہو کر اور محرم حقیقت بن کر آئے گا اسے دیوتاؤں کی صحبت میں رہنا نصیب ہوگا اس لیے کہ جیسا ان رسوم میں کہا جاتا ہے "باکوس کے عصا بردار تو بہت سے ہیں مگر سچے صوفی بہت کم ہیں ـــــــ اور میرے نزدیک یہاں "سچے صوفی" کے الفاظ سے مراد "سچے فلسفی" ہے۔ انھیں کے زمرے میں شامل ہونے کی میں اپنی بساط کے مطابق عمر بھر کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہ بات کہ آیا میری کوشش

صحیح تھی یا نہیں اور مجھے اس میں کامیابی ہوئی یا نہیں انشاءاللہ مجھے تھوڑی سی دیر میں معلوم ہو جائے گی جب میں دوسری دنیا میں پہنچ جاؤں گا ـــــــــ یہ میرا عقیدہ ہے اس لیے میں کہتا ہوں، سیمیاس اور سیبیس، کہ میرا تم سے اور اُن دیوتاؤں سے جو اس دنیا میں میرے مالک ہیں جدا ہونے پر رنج اور افسوس نہ کرنا بالکل بجا ہے اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ دوسری دنیا میں بھی مجھے اتنے ہی اچھے مالک اور دوست مل جائیں گے مگر بہت سے لوگ اس بات کو نہیں مانتے اگر میں اپنی صفائی کے ذریعے سے تمھیں ایتھنس کے ججوں سے زیادہ متاثر کر سکوں تو بہت اچھا ہے۔"

سیبیس نے جواب دیا "سقراط، تم نے جو کچھ کہا اس میں سے اکثر باتوں کو میں مانتا ہوں۔ لیکن روح کے معاملے میں لوگ بداعتقاد ہوا کرتے ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ ہے کہ شاید جسم سے چھوٹ کر اس کا کہیں ٹھکانا نہ رہے اور جس دن موت آئے اسی دن ختم ہو جائے ـــــــــ یعنی بدن سے جدا ہوتے ہی وہ دھوئیں یا ہوا کی طرح منتشر ہو کر نکلے اور اڑتے اڑتے معدوم ہو جائے اگر برائیوں سے پاک ہو کر جن کا تم نے ذکر کیا ہے وہ کہیں ایک جگہ جمع کی جا سکتی تو یہ امید ہوتی کہ جو کچھ تم نے کہا وہ سچ ہے۔ لیکن اس کے لیے بہت کچھ بحث اور ثبوت کی ضرورت ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد بھی روح کا وجود باقی رہتا ہے اور اس میں قوت اور عقل بھی پائی جاتی ہے۔"

سقراط نے کہا "یہ ٹھیک ہے سیبیس۔ میرے خیال میں ہمیں اس پر تھوڑی سی بحث کر لینی چاہیے کہ ان مسائل میں کون سی چیز زیادہ قرین قیاس ہے۔"

سیبیس بولا "میں دل سے چاہتا ہوں کہ ان کے متعلق تمھاری رائے

معلوم کروں "۔

سقراط نے کہا "میرے خیال میں میری اس وقت کی گفتگو سن کر کوئی شخص یہاں تک کہ میرے پرانے دشمن ہجیہ نگار شاعر بھی مجھ پر یہ الزام نہیں لگائیں گے کہ میں ان معاملات کے متعلق بے کار گفتگو کر رہا ہوں جن سے مجھے کوئی تعلق نہیں —— اچھا تو پھر ہمیں اپنی بحث شروع کر دینی چاہیے۔

"آؤ پہلے اس مسئلے پر غور کر لیں کہ آیا مرنے کے بعد انسانوں کی روحیں عالم زیریں میں جاتی ہیں یا نہیں۔ مجھے ایک پرانے نظریے کا خیال آگیا جس کی رو سے روحیں دوسری دنیا میں چلی جاتی ہیں اور وہاں سے واپس آکر پھر سے اس دنیا میں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ زندے مردوں سے پیدا ہوتے ہیں تو لازمی طور پر ہماری روحیں دوسری دنیا میں موجود ہوتی ہیں ورنہ دوبارہ کیونکر پیدا ہوتیں؟ یہ ایک قطعی نتیجہ ہوتا اگر اس کا حقیقی ثبوت مل جاتا کہ زندے مردوں ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو دوسری دلیلیں پیش کرنے کی ضرورت پڑے گی "۔

"بالکل ٹھیک ہے"۔

"تو پھر ہمیں سارے مسئلے پر صرف انسانوں ہی کے متعلق نہیں بلکہ عموماً حیوانات و نباتات اور ان سب چیزوں کے متعلق غور کرنا چاہیے جن میں تولید ہوتی ہے۔ اس سے ثبوت زیادہ آسان ہو جائے گا۔ کیا وہ سب چیزیں جن کے اضداد موجود ہیں اپنے اضداد سے پیدا نہیں ہوتیں؟ میری مراد نیک و بد انصاف اور بے انصافی سے ہے —— ان کے علاوہ اور بے شمار چیزیں ہیں جو اپنے اضداد سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ کل اضداد میں لازماً یکساں تبادل ہوا کرتا ہے یعنی مثال کے طور پر ہر چیز جو بڑی ہو جاتی ہے پہلے

چھوٹی ہوگی پھر بڑی ہوگئی ۔"

"ٹھیک ہے"۔

"اور وہ چیز جو چھوٹی ہو جاتی ہے کسی زمانے میں چھوٹی ہوگی پھر بڑی ہوگئی"۔

"ہاں"۔

اسی طرح کمزور تر مضبوط تر سے پیدا ہوتا ہے اور تیز تر سست تر سے"۔

"بہت ٹھیک"۔

"اور بدتر بہتر سے، عادل تر ظالم تر سے"۔

"ظاہر ہے"۔

"کیا یہ بات کل اضداد پر صادق آتی ہے؟ کیا ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سب اپنے اضداد سے پیدا ہوتے ہیں؟

"ہاں"۔

"کل اشیا کے اس عالمگیر تضاد میں ہمیشہ دو درمیانی عمل جو ہوتے ہیں ایک ضد سے دوسری کی طرف اور دوسری سے پہلی کی طرف ——— جاری رہتے ہیں؟ جہاں کم اور زیادہ کا فرق ہو وہاں ترقی اور تنزل کا درمیانی عمل بھی ضرور ہوگا اور کسی چیز کا بڑھنا ترقی اور اس کا گھٹنا تنزل کہلائے گا، ہے کہ نہیں؟

"ٹھیک ہے"۔

ان کے علاوہ اور بہت سے عمل ہیں مثلاً تحلیل اور ترکیب، برودت اور حرارت پیدا کرنا جن میں اسی طرح ایک چیز دوسری چیز سے دوسری چیز پہلی چیز سے بدلتی رہتی ہے اور یہ بات لازمی طور پر کل اضداد پر صادق آتی ہے خواہ بعض وقت الفاظ میں ظاہر نہ کی جاسکے ——— وہ سب ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں باہم تبادل کا عمل جاری رہتا ہے"۔

بالکل ٹھیک ہے"۔

"کیا زندگی کی کوئی ضد نہیں جس طرح خواب بیداری کی ضد ہے؟"

"ضرور ہے"۔

"اور وہ کیا چیز ہے"؟

"موت"۔

"اور اگر یہ دونوں چیزیں اضداد ہیں تو ایک دوسرے سے پیدا ہوتی ہیں اور اپنے درمیانی عمل بھی رکھتی ہیں؟"

"ظاہر ہے"۔

"اب اضداد کے اس جوڑے میں سے جس کا میں نے ابھی نام لیا ہے، ایک کی مع اس کے درمیانی اعمال کے میں تحلیل کروں گا اور دوسرے کی تم کرنا۔ ایک کو میں خواب کہتا ہوں دوسرے کو بیداری۔ حالت بیداری حالت خواب کی ضد ہے اور خواب سے بیداری اور بیداری سے خواب پیدا ہوتا ہے عمل پیدائش پہلی صورت میں سو جانا اور دوسری میں جاگ اٹھنا ہے۔ تمھیں اس سے اتفاق ہے؟"

"بالکل اتفاق ہے"۔

"تو اب تم اسی طرح زندگی اور موت کی تحلیل کر کے مجھے بتاؤ۔ کیا موت زندگی کی ضد نہیں ہے؟"

"ہے"۔

"اور یہ دونوں ایک دوسرے سے پیدا ہوتی ہیں؟"

"ہاں"۔

"زندوں سے کیا پیدا ہوتا ہے؟"

"مُردے"۔

"اور مُردوں سے"؟

"زندے۔ اس کے سوا اور کیا جواب ہو سکتا ہے"۔

"تو زندے، بیبیں، خواہ وہ اشخاص ہوں یا اشیا مُردوں سے پیدا ہوتے ہیں؟"

"ظاہر ہے"۔

"پھر تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری روحیں عالم زیریں میں وجود رکھتی ہیں؟"

"ٹھیک ہے"۔

"اور پیدایش کے دونوں اعمال میں سے ہمیں ایک دکھائی دیتا ہے —— کیونکہ مرنے کے فعل کو تو ہم یقیناً دیکھ سکتے ہیں؟"

"یقیناً"۔

"تو پھر اب کیا کریں۔ کیا اس کے برعکس عمل کو بحث سے خارج کر دیں اور یہ فرض کر لیں کہ فطرت ایک ہی پیر سے چلتی ہے؟ یا اس کے مقابلے میں موت کی طرف بھی کسی قسم کا عمل پیدایش منسوب کرنا پڑے گا؟"

"ضرور کرنا پڑے گا"۔

"اور وہ کون سا عمل ہے"؟

"دوبارہ زندہ ہونا"۔

"اور دوبارہ زندہ ہونا اگر کوئی چیز ہے تو یہی کہ مردے زندوں کی دُنیا میں پیدا ہوں"۔

"بالکل ٹھیک ہے"۔

"تو پھر ایک نئی راہ سے ہم اسی نتیجے پر پہنچ گئے کہ جس طرح زندوں سے مُردے

پیدا ہوتے ہیں اسی طرح مردوں سے زندے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ اگر سچ ہے تو اس کا قطعی ثبوت ہے کہ مردوں کی روحیں کسی جگہ موجود ہوتی ہیں جہاں سے وہ لوٹ کر دنیا میں آتی ہیں۔"

"ہاں سقراط، یہ نتیجہ ان باتوں سے جنھیں ہم پہلے تسلیم کر چکے ہیں، لازمی طور پر نکلتا ہے۔"

"اور ان باتوں کا جنھیں تسلیم کر چکے ہیں درست ہونا میرے خیال میں اس طرح ثابت ہو سکتا ہے: اگر پیدائش کا سلسلہ ایک خط مستقیم ہوتا اور فطرت میں توازن یا دَور یعنی اشیا کا اضداد میں تبدیل ہو جانا نہ پایا جاتا تو تم سمجھ سکتے ہو کہ بالآخر سب اشیا کی ایک ہی صورت اور ایک ہی حالت ہو جاتی اور ان کی پیدائش رُک جاتی؟"

"میں سمجھا نہیں تمھارا کیا مطلب ہے۔"

"بالکل سیدھی سی بات ہے جسے میں نیند کی مثال دے کر سمجھاؤں گا۔ تم جانتے ہو کہ اگر خواب اور بیداری کا تبادل نہ ہوتا تو خوابیدہ انڈیمین کی حکایت آخر میں بالکل بے معنی ہو جاتی اس لیے کہ اور سب چیزیں بھی سو جاتیں اور اس میں اور ان میں تمیز ہی نہ ہو سکتی۔ اور اگر جوہروں میں صرف ترکیب ہی ہوتی اور تحلیل نہ ہوتی تو وہ فساد جس کا ذکر انکساگورس نے کیا ہے کائنات میں پھر نمودار ہو جاتا۔ اسی طرح پیارے سیبیس، اگر سب چیزیں جو جان رکھتی ہیں مر جائیں اور اس کے بعد ہمیشہ موت کی حالت میں رہیں پھر کبھی زندہ نہ ہوں تو ایک روز سب کچھ مر چکا ہوگا کچھ بھی باقی نہ رہے گا ـــــــ اس کے سوا اور کیا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ اس لیے کہ اگر زندے کچھ اور چیزوں سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ بھی مر جاتی ہیں تو آخر کار ایک روز موت بھی چیزوں کو ختم کر دے گی؟"

"یہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں، سقراط۔ اور مجھے تو تمھارا استدلال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں سیبیس، میرے خیال میں یہی بات ہے اور یہی ہونی چاہیے۔ ان باتوں کو تسلیم کرنے میں ہم نے دھوکا نہیں کھایا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ دوبارہ زندہ ہونا ایک حقیقت ہے، زندے مُردوں سے پیدا ہوتے ہیں، مُردوں کی روحیں وجود رکھتی ہیں اور اچھی روحوں کا حال بُری روحوں سے بہتر ہوتا ہے۔"

"اس پر سیبیس نے کہا" سقراط، اگر تمھارے اس مرغوب نظریے کو کہ علم محض تذکر ہے، صحیح مان لیا جائے تو وہ بھی ایک سابقہ زمانے پر دلالت کرتا ہے جس میں ہم نے وہ باتیں سیکھی ہیں جو اب ہمیں یاد آتی ہیں۔ مگر یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہماری روح انسانی شکل میں آنے سے پہلے کسی اور جگہ موجود رہی ہو۔ یہ ایک اور ثبوت ہے بقائے روح کا۔"

سیمیاس بیچ میں بول اُٹھا، مگر سیبیس، یہ تو بتاؤ کہ اس نظریۂ تذکر کی تائید میں کون سی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ مجھے اس وقت کچھ اچھی طرح یاد نہیں پڑتیں۔"

سیبیس نے جواب دیا " اس کا ایک نہایت عمدہ ثبوت سوالات سے ملتا ہے، اگر تم کسی شخص سے صحیح طریقے سے سوال کرو تو وہ معقول جواب دیتا ہے۔ ——— لیکن وہ یہ کیسے کر سکتا تھا اگر اسے پہلے سے علم اور صحیح فہم حاصل نہ ہوتا؟ یہ بات بہت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے اگر اُسے کوئی شکل وغیرہ دکھا کر اس کے متعلق سوال کیے جائیں۔"

سقراط نے کہا" لیکن تمھیں اب تک یقین نہ ہو سیمیاس، تو میں تم سے یہ پوچھوں گا کہ اگر اس مسئلے پر ایک اور پہلو سے نظر ڈالی جائے تو تمھیں میری رائے سے

اتفاق ہی یا نہیں بہ شرطیکہ اب بھی اس میں شبہہ ہو کہ علم تذکر کا نام ہی۔

سمیاس نے جواب دیا "شبہہ تو مجھے نہیں لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ یہ نظریۂ تذکر خود میرے حافظے میں تازہ ہو جائے۔ سیبیس کی گفتگو سے مجھے کچھ یاد آچلا ہی مگر جو کچھ تم کہنے والے تھے وہ بھی سُن لوں تو اچھا ہی۔"

میں یہ کہنا چاہتا تھا: "اگر میرا خیال صحیح ہی تو ہم اس پر متفق ہیں کہ اگر انسان کو کوئی بات یاد آئے تو اسے سابقہ زمانے میں اس کا علم ہوا ہوگا۔"

"بالکل ٹھیک ہی"۔

"اور اس علم یا تذکر کی نوعیت کیا ہی؟ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر ایک شخص ایک چیز کو دیکھنے یا سننے یا کسی اور طریقے سے ادراک کرنے کے بعد نہ صرف اس چیز کو جانتا ہو بلکہ ایک دوسری چیز کا بھی تصور رکھتا ہو جو کسی اور قسم کے علم کی موضوع ہی تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کا وہ تصور کرتا ہی وہ اُسے یاد ہی؟"

"تمھارا مطلب کیا ہی؟"

"میں اپنے مطلب کو ذیل کی مثال سے سمجھاتا ہوں: ایک بربط کا علم اور ہی انسان کا علم اور ہی؟"

"ٹھیک ہی"۔

لیکن عاشقوں کو کیا احساس ہوتا ہی جب وہ ایک بربط یا پوشاک یا کسی اور چیز کو جو محبوب کے استعمال میں رہی ہی، دیکھ کر پہچان لیتے ہیں؟ کیا بربط کے علم کی مدد سے ان کی چشمِ تصور میں اس نوجوان کی تصویر نہیں پھر جاتی جو اس بربط کا مالک ہی؟ یہی تذکر کہلاتا ہی اسی طرح جو شخص سمیاس کو دیکھے اسے سیبیس یاد آجائے گا۔ اس کی اور بھی مثالیں ہیں جو شمار سے باہر ہیں۔"

"واقعی شمار سے باہر ہیں"۔

"اور تذکر عموماً اس چیز کو یاد کرنے کا عمل ہی جو امتداد زمانہ اور عدم توجہ سے فراموش ہوگئی ہو"۔

"بہت ٹھیک ہی"۔

"اچھا کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک گھوڑے یا بربط کی تصویر دیکھ کر انسان یاد آجائے اور سیمیاس کی تصویر سے سیبیس کا دھیان آجائے؟"

"ضرور ہو سکتا ہی"۔

"یا خود سیمیاس کا دھیان آجائے؟"

"یقیناً"۔

"اور ان سب صورتوں میں تذکر، مشابہ چیزوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہی اور غیر مشابہ سے بھی؟"

"ہاں ہو سکتا ہی"۔

"اور جب تذکر مشابہ چیز سے حاصل ہو تو ایک سوال پیدا ہوتا ہی کہ آیا شبیہ اس چیز کے مقابلے میں جو اسے دیکھ کر یاد آتی ہی ناقص ہی یا نہیں؟"

"بہت ٹھیک ہی"۔

"کیا ہم ایک قدم آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ مساوات نہ صرف ایک لکڑی کی دوسری لکڑی سے اور ایک پتھر کی دوسرے پتھر سے ہوتی ہی بلکہ اس کے علاوہ مطلق مساوات بھی ہوتی ہی"۔

"کہو اور پورے وثوق سے کہو"۔

"کیا ہم اس عین مساوات کی ماہیت سے واقف ہیں؟"

"یقیناً"۔

"اور ہمیں یہ علم حاصل کہاں سے ہوا؟ کیا ہم نے مادی چیزوں شلاً لکڑیوں اور پتھروں کی مساواتوں کو دیکھ کر اس مساوات کا عین تصور نہیں کیا جو ان سے مختلف ہے؟ کیونکہ یہ تو تسلیم کروگے کہ ان میں فرق ہے۔ یا اس مسئلے پر ایک اور پہلو سے نظر ڈالو:۔ کیا ایک ہی لکڑی یا پتھر کبھی مساوی اور کبھی غیر مساوی نظر نہیں آتا؟"

"بے شک"۔

"لیکن کیا جو چیزیں حقیقتاً مساوی ہوں وہ کبھی غیر مساوی بھی ہوتی ہیں؟ یا مساوات کا عین وہی ہے جو عدم مساوات کا؟"

"ہرگز نہیں"۔

"تو یہ چیزیں جو مساوی کہلاتی ہیں عین مساوات سے مختلف ہیں؟"

"ظاہر ہے، سقراط"۔

"پھر بھی انھی مساوی چیزوں سے، گو وہ عین مساوات سے مختلف ہیں تم اس عین تک پہنچے تھے؟"

"بہت ٹھیک ہے"۔

"جو اس سے مشابہ بھی ہو سکتا ہے اور غیر مشابہ بھی؟"

"ہاں"۔

"مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب ایک چیز کو دیکھ کر دوسری چیز کا خیال آئے خواہ وہ مشابہ ہو یا غیر مشابہ تو یقیناً تذکر کا عمل واقع ہوتا ہے؟"

"بہت ٹھیک ہے"۔

"مگر مساوی لکڑیوں یا پتھروں یا دوسری مساوی مادی چیزوں کے بارے میں

کیا کہتے ہو؟ انھیں دیکھ کر ہم کیا رائے قائم کرتے ہیں؟ کیا ان میں اسی معنی میں مساوات پائی جاتی ہے جس معنی میں مساوات مطلق میں؟ یا یہ کامل مساوات کے مقابلے میں کسی قدر ناقص ہیں؟"

"ناقص اور بدرجہا ناقص ہیں"۔

"کیا ہمیں یہ تسلیم نہ کرنا پڑے گا کہ جب میں یا کوئی اور شخص خیال کرے کہ جو چیز اسے نظر آتی ہے وہ کسی اور چیز کی برابری کرنا چاہتی ہے مگر اس کو نہیں پہنچتی بلکہ اس سے کم تر ہے تو خیال کرنے والے کو اس چیز کا پہلے سے علم حاصل ہے جس سے یہ دوسری چیز ایک حد تک مشابہ ہونے کے باوجود کم تر ہے؟"

"یقیناً"۔

"کیا یہی صورت خود ہم کو معمولی مساواتوں اور عین مساوات کے معاملے میں پیش نہیں آتی؟"

"بالکل یہی صورت"۔

"تو ہم مساوات سے اس سے قبل سے واقف ہوں گے جب ہم نے پہلی بار مادی مساوی چیزیں دیکھیں اور یہ سوچا کہ یہ سب ڈھیری مساواتیں مساوات مطلق بننا چاہتی ہیں مگر اس کو نہیں پہنچتیں؟"

"بہت ٹھیک ہے"۔

"ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اس مساوات مطلق کا علم صرف بصارت یا لمس یا حواس خمسہ میں سے کسی تیسری حس سے حاصل ہوا ہے اور صرف اسی طرح ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے سب حواس برابر ہیں؟"

"ہاں سقراط، جہاں تک ہماری بحث کا تعلق ہے یہ سب برابر ہیں"۔

"تو یہ علم حواس سے حاصل ہوتا ہے کہ کل محسوس چیزیں مساوات مطلق حاصل

کرنا چاہتی ہیں جو انھیں حاصل نہیں ہیں؟"

"ہاں"۔

"اور قبل اس کے کہ ہم نے دیکھنا سننا یا کسی اور طریقے سے ادراک کرنا شروع کیا ہمیں مساوات مطلق کا علم رہا ہوگا ورنہ ہم دوسری مساواتوں کو جو حواس سے ادراک کی جاتی ہیں اس معیار پر کیونکر پرکھتے؟ کیونکہ سب اس سطح پر آنا چاہتی ہیں مگر اس سے پیچھے رہ جاتی ہیں"۔

"جو کچھ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس سے لازمی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے"۔

"کیا ہم نے پیدا ہوتے ہی دیکھنا، سننا اور دوسرے حواس سے کام لینا شروع نہیں کر دیا تھا؟"

"یقیناً"۔

"تو ہم نے مساوات (مطلق) کا علم کسی سابقہ زمانے میں حاصل کیا ہوگا؟"

"اور کیا"۔

"یعنی اپنی پیدائش سے پہلے"۔

"ٹھیک ہے"۔

"اور اگر ہم نے یہ علم اپنی پیدائش سے پہلے حاصل کیا ہے اور پیدا ہوتے ہی اسے استعمال کرنے لگے تو ہمیں پیدائش سے پہلے اور پیدائش کے وقت نہ صرف مساوی یا بزرگ تر اور خرد تر کا بلکہ کل اعیان کا علم حاصل رہا ہوگا۔ اس لیے کہ ہم صرف مساوات ہی کا ذکر نہیں کر رہے تھے بلکہ حسن، خیر، عدل، تقدس اور ان سب چیزوں کا جنھیں ہم علم کلام میں، جب ہم سوالات کرتے ہیں یا دوسروں کے سوالات کا جواب دیتے ہیں، عین کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں کے متعلق ہم یقیناً یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ان کا علم پیدائش سے پہلے حاصل کیا ہوگا؟"

"ہاں کہہ سکتے ہیں"۔

"لیکن اگر ان چیزوں کا علم کو حاصل کرنے کے بعد ہم بھولے نہیں ہیں تو زندگی میں قدم رکھتے وقت ہم انھیں جانتے ہوں گے اور جب تک زندگی باقی ہے برابر جانتے رہیں گے ——— اس لیے کہ جاننا علم کے حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کو کہتے ہیں نہ کہ بھول جانے کو۔ بھولنا تو یہی ہے نہ سیمیاس کہ علم جاتا رہے"۔

"بالکل ٹھیک ہے سقراط"۔

"لیکن اگر وہ علم جو ہم نے پیدائش سے پہلے حاصل کیا تھا پیدائش کے وقت جاتا رہا ہو اور آگے چل کر حواس کے استعمال سے ہم اسے دوبارہ حاصل کریں تو کیا سیکھنے کا عمل حقیقت میں اس علم کا جو ہماری فطرت میں داخل ہے دوبارہ حاصل کرنا نہیں ہے اور کیا اسے تذکر کہنا صحیح نہ ہوگا"۔

"یقیناً"۔

"اتنی بات تو صاف ہوگئی ——— جب ہم کسی چیز کا ادراک بصر یا سمع یا کسی اور حس کے ذریعے سے کرتے ہیں اور اس ادراک سے ہمیں کسی اور مشابہ یا غیر مشابہ چیز کا تصور حاصل ہوتا ہے جو پہلی چیز سے تلازم رکھتی ہے مگر فراموش ہوگئی ہے ——— تو یا تو ہمارے ذہن میں یہ علم پیدائش کے وقت موجود تھا اور ساری عمر موجود رہا یا پیدائش کے بعد جو لوگ کوئی چیز سیکھتے ہیں وہ دراصل بھولی ہوئی چیز کو یاد کرتے ہیں اور تحصیل علم محض تذکر ہے"۔

"ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے سقراط"۔

"اور سیمیاس، تم ان دونوں باتوں میں سے کسے ترجیح دیتے ہو؟ ہمیں علم پیدائش کے وقت حاصل تھا یا وہ باتیں جو ہم پیدائش سے پہلے جانتے تھے رفتہ رفتہ یاد آگئیں؟"

"میں تو اس وقت کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا"۔

"کم سے کم اس کا فیصلہ تو کر سکتے ہو کہ جو شخص علم رکھتا ہے وہ اس قابل ہوگا یا نہیں کہ اپنے علم کی تشریح کر سکے؟ کیا رائے ہے؟"

"یقیناً ہوگا"۔

"مگر کیا تمھارے خیال میں ہر شخص ان مسائل کی تشریح کر سکتا ہے جن کا تم ذکر کر رہے تھے؟"

"کاش ایسا ہوتا مگر مجھے یہ ڈر ہے کہ کل اس وقت زندوں میں ایک شخص بھی نہ ہوگا جو ان کی تشریح، جیسی چاہیے کر سکے"۔

"تو تم یہ نہیں سمجھتے، سیمیاس کہ سب لوگ ان باتوں کو جانتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں"۔

"وہ اس علم کو جو انھوں نے پہلے سیکھا تھا یاد کرنے کی حالت میں ہیں؟"

"یقیناً"۔

"اور ہماری روحوں نے یہ علم کب حاصل کیا تھا؟ —— جب سے ہم انسان کے قالب میں پیدا ہوئے اس کے بعد تو کیا نہیں"۔

"بے شک"۔

"لہذا اس سے پہلے حاصل کیا ہوگا؟"

"اور کیا"۔

"تو پھر سیمیاس، لازمی طور پر ہماری روحیں بھی انسانی قالب میں آنے سے پہلے عقل رکھتی ہوں گی"۔

"اِلاّ یہ کہ سقراط، یہ تصورات ہمیں عین پیدائش کے وقت حاصل ہوئے ہوں یہی ایک وقت باقی رہ جاتا ہے"۔

"ہاں میرے دوست، لیکن اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم نے انھیں کھویا کب؟ اس لیے کہ پیدایش کے بعد تو وہ ہمارے ذہن میں تھے نہیں ——— یہ ہم تسلیم کر چکے ہیں۔ کیا جس دم ہم انھیں پاتے ہیں اسی دم کھو دیتے ہیں؟ اگر یہ نہیں تو پھر کس وقت؟"

"نہیں سقراط، میں دیکھتا ہوں کہ میں نادانستہ بالکل مہمل بات کہہ رہا تھا۔"

"تو پھر ہم یوں کہہ سکتے ہیں سیمیاس، کہ اگر جیسا کہ ہم بار بار دہرایا کرتے ہیں، حُسن مطلق، خیر مطلق اور ہر شئی کا ایک عین مطلق وجود رکھتا ہو اور ہم ان اعیان کی طرف جو اس نظریے کے مطابق ہماری پہلی زندگی میں وجود رکھتے تھے اپنے تصورات کو منسوب کریں اور ان سے مقابلہ کر کے دیکھیں کہ یہ ہماری پیدایش سے پہلے موجود اور ہمیں خلقی طور پر معلوم تھے ——— تب تو یہ کہنا صحیح ہے کہ ہماری روحیں پہلے سے وجود رکھتی ہیں ورنہ اس دعوے میں کوئی زور نہیں۔ جو ثبوت اس بات کا ہے کہ ہماری روحیں ہماری پیدایش سے پہلے موجود تھیں وہی اس کا بھی ہے کہ یہ اعیان ہماری پیدایش سے پہلے موجود تھے۔ اگر اعیان نہ تھے تو روحیں بھی نہ تھیں۔"

"ہاں سقراط، میں اس کا قائل ہو گیا کہ دونوں باتیں یکساں ضروری ہیں اور ہمارا استدلال ہمیں اس مقام پر پہنچانے میں کامیاب ہو گیا کہ روح کا پیدایش سے پہلے موجود ہونا ان اعیان کے وجود سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جن کا تم ذکر کر رہے تھے۔ میرے خیال میں یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ حُسن، خیر اور دوسرے تصورات جن کا تم ذکر کر رہے ہو حقیقی اور مطلق وجود رکھتے ہیں اور میں تمھارے دلائل سے مطمئن ہوں۔"

"اچھا، لیکن، سیبیس بھی مطمئن ہوا۔ اُسے بھی تو قائل کرنا ہے۔"

سیمیاس نے کہا "میرے خیال میں تو سیبیس بھی مطمئن ہے۔ اگرچہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ بداعتقاد شخص ہے لیکن غالباً اس کا وہ اچھی طرح قائل ہو گیا کہ روح ولادت سے پہلے وجود رکھتی تھی۔ البتہ یہ مسئلہ کہ موت کے بعد روح کا وجود باقی رہے گا ابھی ثابت نہیں کیا گیا اور اس بارے میں خود میرا بھی اطمینان نہیں ہوا۔ میرے دل سے عام لوگوں کا یہ خیال نہیں نکلتا جس کی طرف سیبیس نے اشارہ کیا تھا — کہ انسان کے مرنے کے بعد روح منتشر ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ اس طرح معدوم ہو جائے۔ مانا کہ روح ایک دوسرے عالم میں پیدا ہوئی، دوسرے عناصر سے بنی، اور جسم انسانی میں داخل ہونے سے پہلے موجود تھی لیکن کیا وجہ ہے کہ جب وہ جسم میں رہ کر نکلے تو برباد اور معدوم نہ ہو جائے؟"

سیبیس نے کہا "بہت ٹھیک سیمیاس، آدھی بات تو ثابت ہو گئی کہ ہماری روحیں ہماری ولادت سے پہلے موجود تھیں — اب رہی آدھی کہ جس طرح روح ولادت سے پہلے موجود تھی موت کے بعد بھی موجود رہے گی اس کا ثبوت پیش ہونے کو باقی ہے۔ جب یہ دے دیا جائے گا تو استدلال مکمل ہو جائے گا۔"

سقراط بولا "مگر سیمیاس اور سیبیس، ثبوت تو پہلے ہی دیا جا چکا بہ شرطیکہ دونوں بحثوں کو ملا کر دیکھو — ایک یہ اور دوسری اس سے پہلے والی جس میں ہم نے یہ تسلیم کیا تھا کہ ہر زندہ چیز مردوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر روح ہماری ولادت سے پہلے موجود ہوتی ہے اور جب ولادت کے ذریعے اس دنیا میں آتی ہے تو صرف مردوں اور مرنے والی چیزوں ہی سے پیدا ہو سکتی ہے تو یہ لازم ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی موجود رہے کیونکہ اسے دوبارہ پیدا ہونا ہے — ظاہر ہے کہ جو ثبوت چاہتے ہو وہ دیا جا چکا ہے۔ پھر بھی میرے خیال میں تمہاری اور سیمیاس کی خوشی یہ ہے کہ اس استدلال کی اور زیادہ چھان بین کی جائے۔ بچوں کی طرح

تمھارے دل میں یہ خوف بیٹھا ہوا ہی کہ جب روح جسم سے جدا ہو تو کہیں ہوا سچ مچ اُسے اُڑا کر منتشر نہ کردے، خصوصاً اگر آدمی ایسے وقت مرے کہ ہَوا ساکن نہ ہو بلکہ آندھی چل رہی ہو۔"

سیبیس نے مسکرا کر جواب دیا" تو پھر سقراط تمھیں چاہیے کہ اپنی دلیلوں سے ہمارے خوف کو دور کر دو ——— اور سچ پوچھو تو یہ ہمارا خوف نہیں ہی بلکہ ہمارے اندر ایک بچہ ہی جس کے نزدیک موت ایک طرح کا ہوّا ہی۔ اسے بھی سمجھانا ہی کہ جب اندھیرے میں اکیلا ہو تو ڈر نہ جائے۔"

"سقراط نے کہا" اسے روز کسی سیانے کی آواز سناؤ یہاں تک کہ ڈر کا بھوت بھاگ جائے"۔

"ہمیں اپنے ڈر کو بھگانے کے لیے ایسا اچھا سیانا کہاں ملے گا سقراط، جب تم دنیا سے اٹھ جاؤ گے؟"

"یونان بہت بڑی جگہ ہی، سیبیس، اور یہاں ایک سے ایک اچھا آدمی موجود ہی۔ پھر پردیس میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ اُسے ان سب میں دور دور تلاش کرو۔ چاہے جتنی تکلیف اٹھانی پڑے اور جتنا روپیہ خرچ ہو۔ اس لیے کہ تمھاری دولت کا اس سے اچھا اور کوئی مصرف نہیں۔ اور تمھیں اپنے گروہ میں بھی تلاش کرنا چاہیے۔ تم سے بہتر ڈھونڈنے والے کہیں نہ ملیں گے"۔

سیبیس نے کہا" ہم ضرور تلاش کریں گے۔ اب مہربانی کرکے ہمیں اس نقطے کی طرف لوٹنے دو جہاں ہم اصل بحث سے ہٹ گئے تھے"۔

سقراط نے جواب دیا" ضرور۔ اس سے زیادہ مناسب اور کیا بات ہوسکتی ہی"۔

"بہت خوب"۔

تو ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ وہ کیا چیز ہی جو ہمارے خیال میں

منتشر ہو جاتی ہے اور جس کے لیے ہم ڈرتے ہیں؟ اور وہ کیا چیز ہے جس کے لیے ہمیں کوئی ڈر نہیں؟ اس کے بعد ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ آیا وہ چیز جو منتشر ہوتی ہے روح کی خاصیت رکھتی ہے یا نہیں ——— روحوں کے متعلق ہماری امید اور خوف کا دارومدار ان سوالوں کے جوابات پر ہے۔"

"بہت ٹھیک ہے۔"

"جو چیز مخلوط یا مرکب ہے وہ قدرتی طور پر جیسے ترکیب پانے کی صلاحیت رکھتی ہے تحلیل ہونے کی بھی رکھتی ہے لیکن جو چیز بسیط ہے وہ ناقابل تحلیل ہوگی اگر کوئی شے ناقابل تحلیل ہو سکتی ہے۔"

"مجھے اس سے اتفاق ہے۔"

"اب ہم اپنی پہلی بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیا ان اعیان میں جنھیں ہم علم کلام میں وجود حقیقی کہتے ہیں خواہ وہ مساوات کا عین ہو یا حُسن کا یا کسی اور چیز کا ——— کسی حد تک تغیر ممکن ہے؟ یا ان میں سے ہر ایک ہمیشہ ایک ہی حالت پر قائم رہتا ہے اور ایک ہی بسیط، موجود بالذات، غیر متبدل صورت رکھتا ہے جس میں کسی طور پر اور کسی وقت بھی مطلق تغیر کی گنجائش نہیں؟"

"وہ ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتا ہے۔"

"اور تم حسین افراد کے بارے میں کیا کہو گے ——— خواہ وہ انسان ہوں یا گھوڑے یا کپڑے یا اور کسی قسم کی چیزیں جو ایک ہی نام سے موسوم ہیں اور متناسب یا حسین کہلاتی ہیں ——— کیا وہ غیر متبدل اور ہمیشہ یکساں رہنے والے ہیں یا اس کے برعکس؟ کیا ان کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ ہمیشہ تغیر میں رہتے ہیں کبھی ایک حالت پر نہیں ہوتے، نہ بجائے خود اور نہ ایک دوسرے کی نسبت سے؟"

"دوسری بات صحیح ہی، وہ ہمیشہ تغیر کی حالت میں رہتے ہیں۔"

"اور انھیں تم چھو سکتے ہو، دیکھ سکتے ہو، حواس سے ادراک کر سکتے ہو لیکن غیر متغیر چیزوں کا ادراک صرف ذہن ہی سے ہو سکتا ہی ——— وہ غیر مرئی ہیں، دیکھی نہیں جا سکتیں؟"

"بالکل ٹھیک ہی۔"

"تو پھر ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ وجود دو قسم کے ہوتے ہیں ——— ایک مرئی، دوسرا غیر مرئی؟"

"ہاں کر سکتے ہیں۔"

"مرئی متغیر ہوتا ہی اور غیر مرئی غیر متغیر؟"

"یہ بھی تسلیم ہی۔"

"اور کیا ہمارے وجود کا ایک حصہ جسم اور دوسرا روح نہیں ہی؟"

"یقیناً۔"

"اور جسم ان دونوں میں سے کس قسم سے مشابہ اور قریب تر ہی؟"

"ظاہر ہی وجود مرئی سے۔ اس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔"

"اور روح دیکھی جا سکتی ہی یا نہیں؟"

"نہیں دیکھی جا سکتی۔"

"تو وہ غیر مرئی ہی؟"

"ہاں۔"

"تو روح غیر مرئی سے زیادہ مشابہ ہی اور جسم مرئی ہی؟"

"یہ نتیجہ لازمی طور پر نکلتا ہی، سقراط۔"

"اور کیا ہم بہت پہلے یہ بات نہیں کہہ چکے ہیں کہ جب روح جسم کو آلۂ ادراک

کے طور پر استعمال کر رہی ہو یعنی جب حسِ بصر، یا حسِ سمع یا کسی اور حس سے کام لے رہی ہو (اس لیے کہ جسم سے ادراک کرنے کے معنی ہیں حواس سے ادراک کرنا) تو جسم روح کو بھی گھسیٹ کر عالم تغیر میں لے آتا ہے اور وہ پریشان ہو کر بھٹکتی پھرتی ہے۔ اسے تغیر کی ہوا لگتی ہے تو دنیا اس کے گرد چکر کھانے لگتی ہے اور اس کی حالت متوالے کی سی ہو جاتی ہے؟"

"بہت ٹھیک ہے۔"

لیکن جب وہ اپنے آپے میں آ کر غور کرتی ہے تو پھر دوسری دنیا میں یعنی پاکی، ازلیت و ابدیت، بقائے دوام اور عدم تغیر کے عالم میں چلی جاتی ہے۔ یہ سب چیزیں اس کی ہم جنس ہیں اور وہ ہمیشہ انھیں کے ساتھ رہتی ہے جب وہ اپنے حال پر ہو اور اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اس وقت اس کی سرگشتگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ غیر متغیر چیزوں کی صحبت میں خود بھی غیر متغیر ہو جاتی ہے اور روح کی اس حالت کو حکمت کہتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو، سقراط"۔

"تو پھر روح کس قسم کی چیزوں سے زیادہ مشابہ اور قریب تر ہے جہاں تک کہ اس بحث سے اور سابقہ بحث سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے؟"

"میری رائے میں سقراط، اور ہر اس شخص کی رائے میں جو اس بحث کو غور سے سنتا رہا ہے روح غیر متغیر سے کہیں زیادہ مشابہ ہوگی —— بے وقوف سے بے وقوف بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"اور جسم متغیر سے زیادہ مشابہ ہے؟"

"ہاں"۔

"لیکن اس مسئلے پر پھر ایک اور پہلو سے غور کر لو: جب جسم اور روح متحد

ہو جائیں تو فطرت روح کو حاکم اور مخدوم اور جسم کو محکوم اور خادم قرار دیتی ہے۔ اب بتاؤ کہ ان دونوں فرائض میں سے کس میں ربانیت کی صفت پائی جاتی ہے اور کس میں فانیت کی؟ کیا تمھارے نزدیک ربانیت کی شان اس میں نہیں جو حاکم اور مخدوم ہو اور فانیت کی اس میں جو محکوم اور خادم ہو؟"

"ٹھیک ہے"۔

"اور روح کس سے مشابہ ہے"۔

"روح ربانیت سے مشابہ ہے اور جسم فانیت سے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں سقراط"

"تو پھر غور کرو، سیبیس، کہ ہم نے جو کچھ اب تک کہا ہے کیا اس کا یہ نتیجہ نہیں نکلتا؟ ——— روح ہو بہو مشابہ ہے ربانی، لافانی، معقول، غیر متنوع، غیر متحلل، غیر متغیر وجود سے اور جسم ہو بہو مشابہ ہے انسانی فانی، غیر معقول، متنوع تحلیل پزیر اور تغیر پزیر وجود سے۔ میرے پیارے سیبیس، کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے؟"

"نہیں کیا جا سکتا"۔

"اور اگر یہ صحیح ہے تو کیا جسم جلد تحلیل ہو جانے والی چیز نہیں؟ اور روح تقریباً یا بالکل ناقابل تحلیل نہیں؟"

"بے شک"۔

"اور تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ جب انسان مر جائے تو اس کا مرئی حصہ یعنی جسم عالم مرئی میں موجود ہوتا ہے اور لاش کہلاتا ہے، جسے قدرتی طور پر گھلنا اور سڑنا اور منتشر ہو جانا چاہیے، فوراً گھلنا اور سڑنا نہیں شروع کرتا بلکہ کچھ دن تک۔ سچ پوچھیے تو بہت دن تک، اپنی اصلی حالت پر رہتا ہے اگر مرتے وقت قویٰ اچھے ہوں اور موسم سازگار ہو۔ جب لاش کو سکھا کر اور مسالا لگا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ مصر میں دستور ہے، تو وہ نامحدود مدت تک قریب قریب سالم رہ سکتی ہے اور

جب بگڑتی بھی ہے تو بعض اجزا مثلاً ہڈیاں اور رباط تقریباً محفوظ رہتے ہیں؟ تمھیں اس سے اتفاق ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا یہ قرین قیاس ہے کہ روح جو غیر مرئی ہے، جب اصلی ہیڈس کی طرف جو اُسی کی طرح غیر مرئی، پاک اور برتر ہے، یعنی خداوند کریم و حلیم کی خدمت میں جائے گی۔ جہاں میری روح بھی انشاء اللہ جلد جانے والی ہے ——— تو اس اصل و ماہیت کے باوجود بدن سے نکلتے ہی اڑ جائے گی اور برباد ہو جائے گی جیسا کہ عوام میں مشہور ہے۔ میرے پیارے سیمیاس اور سیبیس، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حقیقت میں جو روح دنیا سے رخصت ہوتے وقت پاک اور جسمانی آلودگیوں سے بری ہے، جس نے زندگی بھر اپنی خوشی سے جسم سے واسطہ نہیں رکھا، ہمیشہ اس سے دور اور خود اپنے دائرے میں محصور رہی ——— جس نے اس تجرد کو اپنا معمول بنایا ہے ——— یعنی جو فلسفے کی سچی پیرو ہے اور ہمیشہ مرنے کے عمل میں مصروف رہی، اس لیے کہ فلسفہ تو مرنے ہی کے فن کو کہتے ہیں نہ؟

"بے شک"۔

تو یہ روح جو خود غیر مرئی ہے، عالم غیر مرئی کی طرف ——— ربانی، لافانی اور معقول ہستیوں کی طرف ——— چلی جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر اسے رحمت ایزدی اپنے سایے میں لے لیتی ہے، وہ انسانوں کی خطا کاری اور حماقت سے ان کے خوف اور وحشیانہ جذبات سے اور بشریت کی دوسری برائیوں سے نجات پا جاتی ہے اور جیسا کہ عارفوں کے متعلق کہا جاتا ہے ہمیشہ دیوتاؤں کی صحبت میں رہا کرتی ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے سیبیس؟"

"بالکل صحیح ہے اس میں کوئی شبہہ نہیں"۔

لیکن جو روح آلودہ اور دنیا سے جاتے وقت ناپاک ہی، ہمیشہ جسم کی رفیق اور خادم رہی ہی، جسم پر اور اس کی خواہشوں اور لذتوں پر فدا ہی، یہاں تک کہ وہ یہ سمجھنے لگی ہی کہ حق صرف مجسم شکل میں وجود رکھتا ہی، انسان اسے چھو سکتا ہی اور دیکھ سکتا ہی اور چکھ سکتا ہی اور اپنی لذتوں کے لیے استعمال کر سکتا ہی —— یعنی وہ روح جسے جوہر معقول سے نفرت کرنے اور ڈرنے کی عادت ہی۔ وہ جوہر جو جسمانی آنکھ کے لیے تاریک اور غیر مرئی ہی اور صرف فلسفے سے پہچانا جا سکتا ہی —— کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسی روح دنیا سے جاتے وقت پاک اور آلودگی سے بری ہوگی؟"

"ہرگز نہیں"۔

"وہ جسمانیت سے جکڑی ہوئی ہی جو ہمیشہ جسم کے ساتھ رہنے اور جسم کی پرورش کرنے کی وجہ سے اس کی فطرت میں داخل ہو گئی ہی"۔

"بہت ٹھیک ہی"۔

اور یہ جسمانی عنصر، میرے دوست، بھاری اور وزنی اور خاکی ہی۔ یہ وہ عنصر ہی جسے دیکھ کر روح افسردہ ہو جاتی ہی اور پھر عالم مرئی میں کھچی چلی آتی ہی، اس لیے کہ وہ غیر مرئی عالم زیریں میں جاتے ہوئے ڈرتی ہی —— وہ قبروں اور مزاروں کے گرد منڈلاتی رہتی ہی، جہاں لوگوں کو ان روحوں کے بھوت نظر آتے ہیں جو دنیا سے رحلت کرتے وقت پاک نہ تھیں بلکہ حس بصر سے آلودہ تھیں اس لیے خود بھی مرئی ہو گئی ہیں"۔

"یہ بہت قرین قیاس ہی، سقراط"۔

"ہاں یہ بہت قرین قیاس ہی، سیبیس۔ اور لازمی بات ہی کہ یہ روحیں نیکوں کی نہیں بلکہ بدوں کی ہیں جنھیں اپنی سابقہ بری زندگی کی سزا میں ان جگہوں پر مارا مارا پھرنا پڑتا ہی اور وہ اس وقت تک بھٹکتی رہتی ہیں کہ جسمانیت کی خواہش

جو دم بھر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی، ان کو کسی اور جسم میں قید کر دے اور انھیں اپنے قید خانے اسی قسم کی طبیعتوں میں ملتے ہیں جیسی وہ سابقہ زندگی میں رکھتی تھیں۔"

"کس قسم کی طبیعتیں سقراط؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ شکم پروری، عیاشی اور شراب خوری میں مبتلا رہے ہیں، اور جنھوں نے کبھی ان سے بچنے کا خیال تک نہیں کیا وہ گدھے اور اسی قسم کے جانور بن جائیں گے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال میں تو یہ رائے بہت قرین قیاس ہے۔"

"اور جن لوگوں نے بے انصافی، ظلم اور تشدد کو اختیار کیا ہے وہ بھیڑیے، باز اور چیلیں بنیں گے ——— اور انھیں بھلا کہاں بنا ملے گی؟"

"بے شک اسی قسم کے طبائع میں۔"

"اور ان سب کے لیے ہر ایک کی طبیعت اور رجحان کے لحاظ سے مناسب مقام تجویز کرنا کچھ مشکل نہیں؟"

"کچھ مشکل نہیں۔"

ان لوگوں کی خوشی کے مختلف مدارج ہوں گے۔ سب سے زیادہ خوش، بجائے خود اور اس مقام کے لحاظ سے جہاں انھیں جانا ہے۔ وہ لوگ ہوں گے جن سے وہ مدنی اور معاشرتی نیکیاں عمل میں آئیں جو عفت اور عدل کہلاتی ہیں اور بغیر فلسفے کے محض عادت اور توجہ سے حاصل ہوتی ہیں۔"

"یہ سب سے زیادہ خوش کیوں ہوں گے؟"

"اس لیے کہ ان کے لیے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی نرم مزاج یا معاشرت پسند نوع، مثلاً شہد کی مکھیوں یا بھڑوں یا چیونٹیوں کی شکل اختیار کریں گے

یا دوبارہ انسان کا جنم لیں گے اور ان میں سے عادل اور باعفت لوگ پیدا ہوں گے۔"

"غالباً"۔

"کوئی شخص جس نے فلسفے کا مطالعہ نہ کیا ہو اور جو دنیا سے رخصت ہوتے وقت بالکل پاک نہ ہو، دیوتاؤں کی صحبت میں داخل نہیں ہونے پاتا۔ یہ شرف صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو علم کا شیدا ہو۔ یہی وجہ ہے سیمیاس اور سیبیس، کہ فلسفے کے سچے پرستار کل جسمانی لذتوں سے پرہیز کرتے ہیں، ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان سے مغلوب نہیں ہوتے، کیا اس لیے کہ وہ زر پرستوں اور عام لوگوں کی طرح افلاس سے یا اپنے خاندان کی تباہی سے ڈرتے ہیں یا جاہ پرستوں اور عزت پرستوں کی طرح اس ذلت اور رسوائی سے خائف ہیں جو بُرے کاموں سے ہوتی ہے؟"

سیبیس نے کہا "نہیں سقراط اس لیے نہیں یہ تو ان کی شان کے خلاف ہے"۔

"بے شک اس لیے نہیں غرض وہ لوگ جنھیں اپنی روحوں کی فکر ہے اور صرف جسم کی تشکیل میں محو نہیں رہتے، ان سب لذتوں کو خیرباد کہتے ہیں نہ اندھوں کی راہ پر نہیں چلنا چاہتے اور جب فلسفہ انھیں پاک کرنا اور بدی سے نجات دینا چاہتا ہے تو وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس کے اثر کو قبول کریں اور جدھر وہ لے جائے چلے جائیں۔"

"اس سے کیا مطلب ہے سقراط؟"

میں تمھیں بتاتا ہوں۔ علم کے شیدا جانتے ہیں کہ روح جسم سے جُڑی اور چپکی ہوئی تھی اور فلسفے کا اثر پڑنے سے پہلے وہ حقیقی وجود کا بلاواسطہ مشاہدہ نہیں کر سکتی تھی بلکہ صرف قید خانے کی سلاخوں سے جھانک کر دیکھتی تھی۔ وہ ہر قسم کی

جہالت کی کیچڑ میں لت پت تھی اور خواہش نفسانی کی وجہ سے خود اپنی قید کی سازش میں شریک غالب تھی۔ یہ اس کی اصلی حالت تھی۔ اس کے بعد جیسا کہ میں کہہ رہا تھا اور جیسا کہ سب علم کے شیدائی اچھی طرح جانتے ہیں، جب فلسفے نے یہ دیکھا کہ اس کی قید جس میں وہ اپنے ہاتھوں گرفتار ہے، کس قدر سخت ہے تو اس کو اپنے سایے میں لے کر نرمی سے تسلی دی اور رہا کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہ بتایا کہ آنکھ اور کان اور دوسرے حواس سراسر فریب ہیں اور سمجھایا کہ ان سے دور رہے اور ضرورت کے وقت بھی کام نہ لے بلکہ اپنی طرف متوجہ ہو جائے، صرف اپنے آپ پر اور وجود حقیقی کے خالص ادراک پر جو وہ خود کرتی ہے بھروسا کرے اور ان سب چیزوں کو ناقابل اعتبار سمجھے جو دوسرے ذرائع سے اس تک پہنچتی ہیں اور تغیر پذیر ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب چیزیں مرئی اور محسوس ہیں لیکن جن چیزوں کا وہ اپنے اندر مشاہدہ کرتی ہے وہ معقول اور غیر مرئی ہیں اور سچے فلسفی کی روح جانتی ہے کہ اس رہائی کے قبول کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے لہذا وہ ہر قسم کی لذات و خواہشات اور خوف و الم سے جہاں تک ممکن ہے، دور رہتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ جب انسان کے دل میں بہت زیادہ خوشی یا غم، خوف یا آرزو ہو تو اسے صرف وہی نقصان نہیں پہنچتا جس کی ہم توقع کر سکتے ہیں ——— مثلاً صحت اور دولت کی بربادی جن کو وہ اپنی خواہش نفسانی پر قربان کر دیتا ہے ——— بلکہ اس سے کہیں بڑا نقصان جو دنیا میں بدترین چیز ہے اور جس کا اس کو خیال تک نہیں آتا۔"

"وہ کیا ہے سقراط؟"

"وہ یہ کہ جب راحت یا الم کا احساس بہت ہی شدید ہو تو ہر انسانی روح یہ سمجھتی ہے کہ جو چیزیں اس شدید احساس کا موضوع ہیں وہ نہایت واضح اور حقیقی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ محض دیکھنے کی چیزیں ہیں۔"

"بہت ٹھیک ہے"۔

اور یہی وہ حالت ہے جس میں روح سب سے زیادہ جسم کی غلام ہوتی ہے"۔

"وہ کیسے؟"

"اس وجہ سے کہ ہر راحت و الم گویا ایک کیل ہے جو روح کو جسم میں جڑ دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بھی جسم کے مانند ہو جاتی ہے اور جس چیز کو وہ سچ کہے اسے سچ جاننے لگتی ہے۔ اور جسم کی رائے کو اپنی رائے اور اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے سمجھتے وہ اس کی عادتوں کو اپنی عادتیں اور اس کے ٹھکانوں کو اپنے ٹھکانے بنانے پر مجبور ہو جاتی ہے اور پھر کوئی امید نہیں رہتی کہ عالم زیریں کو جاتے وقت وہ پاک ہو جائے گی بلکہ ہمیشہ جسم سے آلودہ رہا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ کسی اور جسم میں پڑ جاتی ہے اور وہاں نباتات کی طرح اُگتی ہے اور بڑھتی ہے اس لیے ربانی اور پاک اور بسیط ہستیوں کی صحبت سے اسے کوئی علاقہ نہیں رہتا"۔

"بالکل درست ہے، سقراط"۔

"یہ سبب ہے جس سے، کہ علم کے سچے شیدائی عفت اور شجاعت اختیار کرتے ہیں۔ وہ وجہ نہیں جو لوگ بتاتے ہیں"!

"ہر گز نہیں"۔

"ہر گز نہیں! فلسفی کی روح کا طریقہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ فلسفے سے یہ درخواست نہیں کرتی کہ اسے رہا کر دے تاکہ وہ پھر راحت و الم کی زندگی اختیار کر لے، ایک کام سے دوسرے کام میں الجھتی رہے اور اپنی پینیلوپ کی سی بنائی کو اُدھیڑنے کی جگہ بُنتی چلی جائے، بلکہ وہ جوش جذبات کو ٹھنڈا کر کے عقل کی راہ پر چلتی ہے، اسی کے تصور میں رہتی ہے اور ربانی حقیقت کا (جو محض گمان نہیں ہے) مشاہدہ کر کے اس سے اپنی غذا حاصل کرتی ہے۔ اس طرح وہ زندگی بسر

کرنا چاہتی ہے اور مرنے کے بعد یہ امید رکھتی ہے کہ جاکر اپنے ہم جنسوں اور ہم مشربوں میں مل جائے گی اور بشریت کی خرابیوں سے نجات پا جائے گی۔ ہرگز اندیشہ نہ کرو، سیمیاس اور سیبیس، کہ جس روح نے اس طرح تربیت پائی ہے اور یہ مشاغل رکھتی ہے وہ جسم سے جدا ہوتے وقت بکھر کر ہوا میں اڑ جائے گی اور معدوم ہو جائے گی۔"

جب سقراط اپنی تقریر ختم کر چکا تو دیر تک سناٹا رہا۔ وہ خود اور ہم میں سے اکثر لوگ جو کچھ کہا گیا تھا اس پر غور کر رہے تھے۔ صرف سیبیس اور سیمیاس نے آپس میں دو ایک باتیں کیں۔ سقراط نے انھیں دیکھ کر کہا کہ تمھارا اس بحث کے متعلق کیا خیال ہے؟ اس میں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی؟ اس لیے کہ ابھی بہت سی باتوں پر شبہہ اور اعتراض ہو سکتا ہے اگر کوئی شخص مسئلے کی چھان بین کرے۔ تم کسی اور بات پر غور کر رہے ہو تو میں کچھ نہیں کہتا۔ لیکن اگر اس مسئلے میں تمھیں اب تک شبہہ ہو تو بے تکلف اپنی رائے صاف صاف ظاہر کر دو۔ اور اگر کوئی بہتر مشورہ دے سکو تو ضرور دو اور اگر تمھارے خیال میں میں کچھ مدد کر سکتا ہوں تو میں حاضر ہوں۔

سیمیاس نے کہا" میں اس اعتراف پر مجبور ہوں سقراط کہ واقعی ہم دونوں کے دل میں شبہات پیدا ہوئے تھے اور ہم ایک دوسرے کو آمادہ کر رہے تھے کہ وہ سوال پوچھے جس کا جواب ہم چاہتے تھے لیکن پوچھنے کی ہمت دونوں میں سے کسی کو بھی نہ تھی۔ اس خوف سے کہ ہماری گستاخی ایسے وقت میں تکلیف دہ نہ ثابت ہو۔"

سقراط نے مسکرا کر جواب دیا" ارے سیمیاس یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بھلا میں دوسروں کو کیسے یقین دلاؤں گا کہ میں اپنی موجودہ حالت کو مصیبت نہیں سمجھتا جب کہ میں تم تک کو یقین نہیں دلا سکتا کہ میری حالت ہرگز اس سے بدتر

نہیں جیسی میری زندگی کے اور کسی لمحے میں تھی۔ کیا تم یہ نہیں مانتے کہ مجھ میں پیش گوئی کا کم سے کم اتنا مادہ موجود ہے جتنا راج ہنسوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی موت آپہنچی ہے تو چونکہ ساری عمر گاتے رہے ہیں اس وقت اور زیادہ جوش و خروش سے گاتے ہیں اور اسی خیال سے خوش ہوتے ہیں کہ عنقریب وہ اُس دیوتا کے پاس جانے والے ہیں جس کے وہ کارکن ہیں۔ لیکن انسان، چونکہ وہ خود موت سے ڈرتے ہیں، اُن راج ہنسوں پر یہ تہمت رکھتے ہیں کہ وہ آخری وقت کا نوحہ کرتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی پرند بھی سردی یا بھوک یا درد کی حالت میں کبھی نہیں گاتا۔ نہ تو بلبل اور نہ شاما اور نہ ہوپو[1] ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ غم کے گیت گاتے ہیں۔ مگر میں نہ ان کے متعلق یہ بات مانتا ہوں نہ راج ہنسوں کے بارے میں بلکہ یہ راج ہنس اپولو سے منسوب ہونے کی وجہ سے پیش گوئی کی قوت رکھتے ہیں اور دوسری دنیا کی بھلائیوں کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہو کہ اس روز وہ ہمیشہ سے زیادہ گاتے اور خوشی مناتے ہیں۔ میں بھی چونکہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کا پرستار اور راج ہنسوں کا خواجہ تاش سمجھتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ مجھے بھی اپنے آقا سے پیش گوئی کی قوت ان سے کم نہیں ملی اس لیے یہ نہیں چاہتا کہ دنیا سے جاتے وقت راج ہنسوں سے کم خوش ہوں۔ اگر تمھیں اسی وجہ سے تامل ہے تو اس کا ذرا بھی خیال نہ کرو بلکہ جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو اور جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھو جب تک کہ ایتھنس کے گیارہ مجسٹریٹوں کی اجازت ہے۔"

---

[1] یونان اور جنوبی یورپ کے دوسرے ملکوں کا ایک پرند جس کے رنگ برنگ کے پر اور سر پر کلغی ہوتی ہے۔

یمیاس نے کہا "بہت خوب سقراط۔ تو پھر میں تم سے اپنی مشکل بیان کرتا ہوں اور سیبیس اپنی مشکل بیان کرے گا مجھے یہ احساس ہے (اور غالباً تم کو بھی ہوگا)، کہ موجودہ زندگی میں اس قسم کے مسائل کے متعلق کوئی یقینی بات معلوم کرنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ تاہم میں اُس شخص کو بزدل سمجھوں گا جو ان کے متعلق ہر قسم کے اقوال کی پوری طرح چھان بین نہ کرے یا ان پر ہر پہلو سے غور کرنے سے پہلے ہی ہمت ہار جائے۔ اسے اس وقت تک استقلال کے ساتھ کوشش کرنی چاہیے جب تک کہ دو باتوں میں سے ایک حاصل نہ ہو جائے۔ یا تو وہ اپنی تحقیق سے یا دوسروں کی تعلیم سے ان کی حقیقت دریافت کرے، یا اگر یہ ناممکن ہے تو میری رائے میں وہ اس انسانی نظریے کو جو سب سے بہتر اور ناقابل تردید ہو اختیار کرے اور اسی بیڑے میں بیٹھ کر زندگی کے سمندر کو عبور کرے ——— میں مانتا ہوں کہ یہ صورت خطرے سے خالی نہیں اگر خدا کا کلام اس کی رہنمائی اور حفاظت نہ کرے۔ اور اب تمھارے حکم کے مطابق میں تم سے سوال کرنے کی جرأت کرتا ہوں تاکہ مجھے بعد میں پچھتانا نہ پڑے کہ میں نے اس وقت اپنا خیال کیوں نہ ظاہر کر دیا۔ اس لیے کہ جب میں خواہ تنہا خواہ سیبیس کے ساتھ مل کر، اس مسئلے پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ استدلال ناکافی معلوم ہوتا ہے، سقراط"۔

سقراط نے جواب دیا "غالباً میرے دوست تمھارا کہنا صحیح ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ استدلال کس لحاظ سے ناکافی ہے؟"

"اس لحاظ سے:۔ فرض کرو کہ کوئی شخص نغمے اور بربط کے بارے میں اسی دلیل سے کام لے۔ کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ نغمہ ایک غیر مرئی، غیر مجسم، مکمل اور ربانی چیز ہے جو ایک ہم آہنگ بربط کے اندر موجود ہوتا ہے لیکن خود بربط

اور اس کے تار مادی، مرکّب، ارضی اور فانی چیزیں ہیں ؟ اور جب کوئی شخص بربط کو توڑ ڈالے یا تاروں کو کاٹ کر یا نوچ کر پھینک دے تو وہ شخص تمھاری دلیل کے قیاس پر یہ دعویٰ کر سکتا ہی کہ نغمہ باقی رہتا ہی اور معدوم نہیں ہوتا۔ ـــــــ وہ کہے گا کہ ہم ہرگز یہ تصور نہیں کر سکتے کہ بے تار کی بربط اور خود یہ ٹوٹے ہوئے تار، جو فانی ہیں موجود رہیں اور نغمہ جو آسمانی اور لافانی فطرت رکھتا ہی معدوم ہو جائے ـــــــ فانی بربط سے پہلے معدوم ہو جائے۔ یہ نغمہ ضرور کہیں نہ کہیں موجود ہو گا بلکڑی اور تار ایک دن فنا ہو جائیں گے مگر اس پر زوال نہیں آئے گا۔ خود تمھارے دل میں بھی یہ خیال آیا ہوگا، سقراط، کہ ہمارا تصور روح اسی قسم کا ہی اور جب جسم گرم و سرد، خشک و تر عناصر سے ہم آہنگ اور مربوط ہی تو روح ان کی ہم آہنگی یا امتزاج کا نام ہی۔ اگر یہ صحیح ہی تو جب کبھی جسم کے تار بیماری یا کسی اور صدمے کی وجہ سے زیادہ ڈھیلے ہو جائیں یا کس جائیں تو روح باوجود اس کے کہ وہ موسیقی کے نغموں یا فنون لطیفہ کے نمونوں کی طرح ربانیت کی شان رکھتی ہی، فوراً معدوم ہو جاتی ہی۔ اگرچہ جسم ایک مدت تک باقی رہتا ہی یہاں تک کہ وہ تحلیل ہو جائے یا جلا دیا جائے۔ تو اگر کوئی شخص یہ دعوے کرے کہ روح جو جسم کے عناصر کی ہم آہنگی ہی اس چیز سے جسے ہم موت کہتے ہیں پہلے متاثر ہوتی ہی تو ہم اسے کیا جواب دیں۔"

سقراط دیر تک ٹکٹکی باندھے ہماری طرف دیکھتا رہا اور پھر مسکرا کر بولا:

"سیمیاس حق بجانب ہی۔ آخر تم میں سے کوئی شخص جو مجھ سے زیادہ اہل ہو اُسے جواب کیوں نہیں دیتا؟ کیونکہ اس نے مجھ پر جو اعتراض کیا ہی وہ وزنی ہی۔ لیکن شاید یہ بہتر ہوگا کہ اُسے جواب دینے سے پہلے ہم بھی سن لیں کہ سیبیس کیا کہتا ہی تاکہ ہمیں سوچنے کے لیے بھی وقت مل جائے اور جب دونوں اپنی باتیں کہہ چکیں تو

اگر وہ ٹھیک ہوں تو انھیں مان لیں اور اگر غلط ہوں تو اپنی رائے پر قائم رہیں تو پھر مہربانی سے یہ بتاؤ سیبیس کہ وہ کون سی مشکل تھی جس نے تمھیں پریشان کر رکھا تھا۔"

سیبیس نے کہا "میں تمھیں بتاتا ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحث جہاں پہلے تھی وہیں اب بھی ہے اور جو اعتراضات اس پر پہلے وارد ہوتے تھے، اب بھی ہوتے ہیں۔ میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ روح کا جسم میں داخل ہونے سے پہلے وجود رکھنا نہایت قابلیت سے اور کافی طور پر ثابت کر دیا گیا ہے لیکن موت کے بعد روح کا وجود میرے نزدیک اب تک ثابت نہیں ہوا۔ مگر میرا اعتراض وہ نہیں ہے جو سیمیاس کا ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ روح جسم سے زیادہ مضبوط اور پایدار ہے اس لیے کہ میں اسے ہر اعتبار سے جسم سے برتر سمجھتا ہوں یہاں تمھارا استدلال مجھ سے یہ پوچھے گا: تو پھر تم کیوں قائل نہیں ہوتے؟ — جب تم دیکھتے ہو کہ انسان کے مرنے کے بعد وہ چیز جو کم پائیدار ہے باقی رہتی ہے تو یہ کیوں نہیں مانتے کہ زیادہ پائدار چیز اس زمانے میں ضرور باقی رہے گی؟ اب مہربانی کر کے غور کرو کہ میرا اعتراض سیمیاس کی طرح میں بھی ایک استعارے کی صورت میں بیان کروں گا کچھ وزن رکھتا ہے یا نہیں۔ جس مثال سے میں کام لوں گا وہ ایک بوڑھے جلاہے کی ہے۔ وہ مر جاتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد کوئی شخص کہتا ہے:- وہ مرا نہیں یقیناً زندہ ہے۔ دیکھو یہ کوٹ ہے جو اس نے بُنا تھا اور پہنا کرتا تھا۔ یہ بالکل محفوظ ہے، ذرا بھی نہیں بگڑا۔ پھر وہ کسی شخص سے، جسے یہ بات یقین نہیں آتی، پوچھتا ہے کہ انسان زیادہ پائدار ہے یا وہ کوٹ جسے وہ پہنتا اور برتتا ہے اور جب یہ جواب ملتا ہے کہ انسان کہیں زیادہ پائدار ہے تو سمجھتا ہے کہ اس نے انسان کا جو زیادہ پائیدار ہے موت کے بعد باقی رہنا ثابت کر دیا اس لیے

کہ کم پائدار چیز باقی رہتی ہے۔ لیکن تمھیں دیکھو، سیمیاس کہ یہ اس کی غلطی ہے یا نہیں : ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ ایک مہمل بات کہہ رہا ہے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اس جلاہے نے ایسے بہت کوٹ بن کر پہن ڈالے اور کئی ایک کے ختم ہونے کے بعد زندہ رہا۔ لیکن آخری کوٹ اس کے ختم ہونے کے بعد باقی رہا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان کوٹ سے زیادہ کمزور اور ناپائدار ہے۔ اب دیکھو کہ روح اور جسم کا تعلق بھی اسی قسم کے استعارے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے اور کہنے والا بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ اسی طرح روح زیادہ پائدار اور جسم اس کے مقابلے میں کمزور اور ناپائدار ہے اور اسی استدلال کے مطابق ہر ایک روح کئی جسموں کو پہن کر گھس ڈالتی ہے خصوصاً اگر انسان بڑی عمر پائے جب تک وہ زندہ ہے جسم گھستا پستا رہتا ہے اور روح نئی پوشاک بن کر اس نقصان کی تلافی کرتی رہتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب روح کا خاتمہ ہوتا ہے تو وہ اپنی آخری پوشاک پہنے ہوتی ہے اور یہ پوشاک اس کے بعد باقی رہتی ہے لیکن آخرکار روح کے مرنے کے بعد جسم اپنی قدرتی کمزوری دکھاتا ہے اور بہت جلد تحلیل ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ لہذا میرے خیال میں اس استدلال پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے کہ روح کے زیادہ قوی ہونے سے اس کا موت کے بعد باقی رہنا ثابت ہوتا ہے۔ غرض جس چیز کے امکان کا تم دعوی کرتے ہو اگر ہم اس سے زیادہ بھی تسلیم کر لیں اور یہ مان لیں کہ روح نہ صرف انسان کی پیدائش سے پہلے وجود رکھتی تھی بلکہ بعض آدمیوں کی روحیں مرنے کے بعد موجود رہتی ہیں اور بار بار پیدا ہوتی اور مرتی رہیں گی گویا روح میں ایک ایسی قدرتی طاقت ہے کہ وہ باقی رہے گی اور بار بار نیا جنم لے گی۔ —— اس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی وہ اس آواگون کی مشقت سے تھک جائے گی آخرکار ایک موت اسے بالکل ہلاک اور معدوم

کردے گی ممکن ہو کہ ہم میں سے ہر شخص اس موت اور ہلاکت جسمانی سے جو روح کا خاتمہ کردیتی ہو ناواقف ہو اس لیے کہ ہمیں اس کا تجربہ نہ ہوا ہو۔ ایسی صورت میں میں یہ کہوں گا کہ جو شخص موت کے بارے میں مطمئن ہو اس کا یہ اطمینان محض حماقت ہو جب تک وہ یہ ثابت نہ کردے کہ روح بالکل لافانی اور لازوال ہو۔ لیکن اگر روح کا لافانی ہونا ثابت نہ کرسکے تو اس شخص کو، جو مرنے والا ہو ہمیشہ بجا طور پر یہ اندیشہ ہوگا کہ کہیں جسم کے منتشر ہونے کے ساتھ روح بھی ختم نہ ہو جائے۔

ہم لوگوں کو جیسا کہ ہم نے بعد میں ایک دوسرے سے کہا، ان دونوں کی باتیں بہت ناگوار ہوئیں۔ ایک بار پوری طرح قایل ہو جانے کے بعد ہمارا عقیدہ پھر متزلزل ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ صرف ہماری سابقہ بحث میں الجھن اور شبہات پیدا ہو گئے بلکہ ہر آئندہ بحث کا بھی یہی انجام ہوگا۔ یا تو ہم اس قابل نہ تھے کہ کوئی فیصلہ کرسکیں یا کوئی بنیاد ہی نہ تھی جس پر عقیدہ قائم ہوسکے۔"

ایشیکراٹیس :۔ مجھے بھی یہی احساس ہو فیڈو ــــــ قسم ہو آسمانوں کی جب تم تقریر کر رہے تھے تو میں اپنے دل میں یہ سوال کر رہا تھا: آیندہ میں کسی استدلال پر کیسے بھروسا کرسکتا ہوں؟ بھلا سقراط کی دلیل سے زیادہ شافی اور کون سی دلیل ہوسکتی تھی جو اب خاک میں مل گئی؟ روح ایک ہم آہنگی ہو، یہ وہ نظریہ ہو جو میرے لیے ہمیشہ سے کشش رکھتا ہو اور جیسے ہی اس کا ذکر آیا مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ تو میرے دل کی بات ہو۔ اب مجھے نئے سرے سے اس کی دلیل تلاش کرنا پڑے گی کہ انسان کے مرنے کے بعد روح باقی رہتی ہو۔ خدا کے لیے بتاؤ کہ سقراط کا اس کے بعد کیا طرز رہا۔ کیا اس پر بھی وہی ناگواری کی کیفیت تھی جس کا تم نے ذکر کیا ہو؟ یا اس نے سکون کے ساتھ اس حملے کا مقابلہ کیا؟ اور اس کا جواب

زوردار تھا یا پھسپھسا؟ جہاں تک ہو سکے ساری روئداد ٹھیک ٹھیک بیان کرو۔"

فیڈو: "ایشیکراٹیس، مجھے اکثر سقراط کی باتوں پر حیرت ہوتی ہے مگر اس دن کی طرح کبھی نہیں ہوئی۔ اس کا جواب دینا تو کوئی بات ہی نہ تھی تعجب تو مجھے دو چیزوں پر تھا ایک یہ کہ اس نے ان نوجوانوں کی گفتگو کو نہایت نرمی اور خوش مزاجی اور پسندیدگی کے ساتھ سنا دوسرے یہ کہ اسے بہت جلد محسوس ہو گیا کہ اس بحث سے ہم سب کو تکلیف پہنچی ہے اور اس نے فوراً اس کی تلافی کر دی۔ اس کی مثال ایک سپہ سالار کی سی تھی جو اپنی شکست خوردہ اور منتشر فوج کو جمع کرتا ہے اور انھیں سمجھا بجھا کر میدان مناظرہ میں واپس لاتا ہے۔"

ایشیکراٹیس:۔ "پھر کیا ہوا؟"

فیڈو: میں تمھیں سب کچھ بتاتا ہوں۔ میں اس کے قریب ہی سیدھے ہاتھ پر ایک تپائی پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ ایک کوچ پر تھا جو خاصی اونچی تھی۔ وہ میرے ہاتھ کو سہلا رہا تھا اور میری گردن کے بالوں کو تھپک رہا تھا —— اسے میرے بالوں سے کھیلنے کی عادت تھی۔ اس نے کہا "فیڈو غالباً کل تمھاری یہ خوش نما لٹیں کٹ جائیں گی۔"

"ہاں سقراط غالباً۔"

"اگر تم میری بات مانو تو یہ نہ کرنا۔"

"تو پھر کیا کروں۔"

"اگر ہماری یہ بحث مر جائے اور ہم اسے دوبارہ زندہ نہ کر سکیں تو کل نہیں بلکہ آج ہی ہم تم دونوں اپنے بال منڈوا دیں گے۔ اگر میں تمھاری جگہ ہوتا اور بحث میرے قابو سے نکل جاتی اور میں سیمیاس اور سیبیس کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکتا تو میں خود یہ حلف اٹھاتا کہ آرگیوس کی طرح اس وقت تک

سر پر بال نہ رکھوں گا جب تک کہ دوبارہ مقابلہ کر کے انھیں شکست نہ دے لوں۔"

"ہاں لیکن کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کا مقابلہ تو خود ہراکلیس بھی نہ کر سکتا۔"

"تو پھر مجھے مدد کے لیے بلاؤ۔ میں غروب آفتاب تک تمھارے لیے آیولاس بن جاؤں گا۔"

"میں تمھیں بلاتا تو ہوں مگر اس طرح نہیں جیسے ہراکلیس نے آیولاس کو بُلایا تھا بلکہ جیسے آیولاس ہراکلیس کو بُلاتا۔"

"یہی سہی۔ لیکن پہلے اس کی احتیاط کرنی چاہیے کہ ایک خطرے سے بچے رہیں۔"

"کس قسم کا خطرہ؟"

"کہ کہیں ہم منطقی بحث سے بیزار نہ ہو جائیں۔ اس سے بڑھ کر انسان کے لیے اور کوئی بُری بات نہیں ہو سکتی جس طرح بعض لوگ مردم بیزار یعنی آدمیوں سے نفرت کرنے والے ہوتے ہیں اور دونوں کی جڑ ایک ہی ہے یعنی دنیا سے ناواقفیت۔ مردم بیزاری اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ناتجربہ کاری سے لوگوں پر حد سے زیادہ بھروسا کیا جائے:۔ ہم ایک شخص پر اعتماد کرتے ہیں اور اسے بالکل سچا اور پکّا اور وفادار سمجھتے ہیں اور کچھ دن کے بعد وہ جھوٹا اور بدمعاش نکلتا ہے اسی طرح دوسرے شخص پر اور پھر تیسرے شخص پر۔ جب کسی آدمی کو یہ صورت بار بار پیش آئے خصوصاً ان لوگوں کے ساتھ جنھیں وہ اپنا سچا اور گاڑھا دوست سمجھتا ہے اور اس کی ان سب سے لڑائی ہو جائے تو آخر میں وہ سب انسانوں سے نفرت کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کسی میں نیکی کا نام بھی نہیں۔ تم نے یہ خصلت دیکھی ہوگی؟"

"ہاں دیکھی ہے۔"

" کیا یہ احساس قابلِ افسوس نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جسے دوسروں سے سابقہ پڑتا ہے انسانی فطرت کا بالکل تجربہ نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ تجربہ اس کو اتنی بات سکھا دیتا کہ دنیا میں نیک بھی بہت کم ہوتے ہیں اور بد بھی بہت کم ہیں۔ ایسے لوگ بہت زیادہ ہیں جو دونوں کے بین بین ہیں۔"

" اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

" میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے تم بہت لمبے اور ٹھنگنے کے متعلق کہو گے ـــــ کہ بہت لمبے اور بہت ٹھنگنے آدمی بہت شاذ نظر آتے ہیں اور یہی بات ہر قسم کی انتہائی مثالوں پر صادق آتی ہے چاہے وہ بڑائی اور چھوٹائی کی ہوں، یا تیزی اور سستی کی، یا حسن و قبح کی، یا سیاہی اور سفیدی کی۔ چاہے تم آدمیوں کو لو یا کتوں یا کسی اور کو، انتہائی مثالیں بہت کم ملیں گی بلکہ بہت زیادہ افراد بین بین ہوں گے۔ کیا تم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا؟"

" ہاں کیا ہے۔"

" تو کیا تمہارے خیال میں اگر بدی میں مقابلہ کیا جائے تو بہت زیادہ برے آدمی کم ہی نکلیں گے؟"

" ہاں یہ بات تو بہت قرینِ قیاس ہے۔"

" بے شک بہت قرینِ قیاس ہے اگرچہ دلیلوں کی حالت اس معاملے میں انسانوں سے مختلف ہے۔ ارے تم نے مجھ سے وہ بات کہلوا لی جو میں نہیں کہنا چاہتا تھا لیکن مقابلہ اس بات میں تھا کہ جب کوئی سیدھا سادھا آدمی، جسے علمِ کلام میں سلیقہ نہیں ہے کسی ایک دلیل کو صحیح سمجھتا ہے اور پھر اسے غلط سمجھنے لگتا ہے خواہ وہ واقعی غلط ہو یا نہ ہو، اسی طرح پھر دوسری دلیل کو اور پھر تیسری دلیل کو تو اس کے دل سے عقیدہ بالکل جاتا رہتا ہے اور جیسا کہ تم جانتے ہو وہ لوگ جو زیادہ بحث

کرتے ہیں آخر میں اپنے آپ کو انسانوں میں سب سے زیادہ دانشمند سمجھنے لگتے ہیں اس لیے کہ صرف انھیں کو یہ حقیقت معلوم ہے کہ سب دلیلیں بلکہ دنیا کی سب چیزیں بے بنیاد اور ناقابل اعتبار ہیں اور ان موجوں کی طرح جن کا ذکر یوری پس نے کیا ہے ہمیشہ مدوجزر کی حالت میں رہا کرتی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

ہاں فیڈو، "اور اگر حق یا یقین کوئی چیز ہے اور علم کا کوئی امکان ہے تو کس قدر افسوس کی بات ہے ——— کہ انسان کو کوئی دلیل سوجھے جو پہلے صحیح معلوم ہو اور پھر غلط نکلے، تو وہ بجائے خود اپنی عقل کو الزام دینے کے غصے میں اپنا الزام کل دلیلوں کے سر منڈھ دے اور آیندہ ہمیشہ ان سے نفرت کرتا رہے اور انھیں برا کہتا رہے اور اس طرح سچائی سے اور حقیقت کے علم سے محروم ہو جائے۔"

"ہاں بے شک بہت افسوس کی بات ہے۔"

"تو پھر سب سے پہلے ہمیں اس بات میں احتیاط کرنا چاہیے کہ ہم اپنے دل میں یہ خیال نہ آنے دیں کہ دنیا میں کوئی دلیل صحیح اور معقول ہوتی ہی نہیں، اس کے بجائے یہ سمجھو کہ ابھی خود ہم میں معقولیت نہیں پیدا ہوئی اور ہمیں مردانگی کے ساتھ دماغی صحت حاصل کرنے کی اپنی سی کوشش کرنی چاہیے ——— تم کو اور دوسروں کو اپنی آیندہ زندگی کے لیے اور مجھے آنے والی موت کے لیے کیونکہ اس وقت مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک فلسفی کا سا مزاج نہیں رکھتا ہوں بلکہ عام لوگوں کی طرح متعصب آدمی ہوں۔ متعصب آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب وہ بحث کرتا ہے تو اُسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ مسئلے کی حقیقت کیا ہے بلکہ صرف یہ فکر ہوتی ہے کہ سننے والوں کو اپنی بات کا قایل کر دے۔ اُس میں اور مجھ میں اس وقت جو فرق ہے وہ صرف اتنا ہے ——— کہ وہ تو سننے والوں کو اپنی بات کا قائل کرنا چاہتا ہے اور میں

دراصل اپنے آپ کو قایل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سننے والوں کو قایل کرنا میرے لیے ایک ضمنی چیز ہی اور تم بھی دیکھو مجھے اس بحث سے ہر طرح فائدہ ہی۔ اس لیے کہ اگر میری بات صحیح ہی تو یہ بہت اچھا ہی کہ مجھے اس حقیقت کا یقین ہوجائے۔ لیکن اگر موت کے بعد کچھ نہیں ہوتا تب بھی اس تھوڑے سے وقت میں اپنے دوستوں کو نالہ و فریاد سے پریشان نہیں کروں گا اور میری جہالت زیادہ دیر تک باقی نہیں رہے گی بلکہ میرے ساتھ ختم ہوجائے گی۔ اس لیے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس ذہنی کیفیت کے ساتھ سیمیاس اور سیبیس، میں اس بحث کو شروع کرتا ہوں اور میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ سقراط کا لحاظ نہ کرو بلکہ حق کا خیال رکھو۔ اگر میں تمھارے نزدیک سچ کہتا ہوں تو مجھ سے اتفاق کرو ورنہ پوری طاقت سے میرا مقابلہ کرو تاکہ میں اپنے جوش میں تمھیں اور اپنے آپ کو گمراہ نہ کردوں اور شہد کی مکھی کی طرح مرنے سے پہلے تمھارے اندر اپنا ڈنک نہ چھوڑ جاؤں۔

"اچھا آؤ اب اپنی گفتگو کریں۔ سب سے پہلے مجھے یہ اطمینان کرلینے دو کہ تمھاری باتیں میرے ذہن میں موجود ہیں، سیمیاس کو، اگر مجھے صحیح یاد ہی، یہ خوف اور شبہہ ہی کہ کہیں روح باوجود جسم سے بہتر اور برتر ہونے کے ایک ہم آہنگ نغمے کی صورت میں ہونے کی وجہ سے جسم سے پہلے ختم نہ ہوجائے۔ بہ خلاف اس کے سیبیس نے یہ تو تسلیم کرلیا کہ روح جسم سے زیادہ پائدار ہی مگر اس کا کہنا یہ ہی کہ کسی کو کیا معلوم شاید روح بہت سے جسموں کو گھس ڈالنے کے بعد خود ختم ہوجائے اور آخری جسم کو اپنے بعد چھوڑ جائے۔ یہ وہ موت ہی جس سے جسم نہیں بلکہ روح ہلاک ہوجائے گی اس لیے کہ جسم میں ہلاکت کا عمل ہمیشہ ہی ہوتا رہتا ہی۔ کیوں سیمیاس اور سیبیس یہی وہ باتیں ہیں نہ جن پر ہمیں غور کرنا ہی؟"

اُن دونوں نے اس کی تصدیق کی۔

سقراط نے پوچھا "کیا تم ہمارے کل سابقہ استدلال کی صحت سے انکار کرتے ہو یا صرف اس کے ایک جزو سے؟"

"صرف ایک جزو سے"۔

"اور اس جزو کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے جس میں ہم نے یہ کہا تھا کہ علم تذکر کا نام ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ روح جسم میں محصور ہونے سے پہلے کہیں اور موجود رہی ہوگی؟"

سیبیس نے کہا "استدلال کے اس جزو سے میں بہت متاثر ہوا تھا اور اب بھی مضبوطی سے اسی خیال پر قائم ہوں"۔ سیمیاس نے اس کی تائید کی اور کہا "میں خود یہ تصور تک نہیں کرتا کہ میرے لیے اس خیال سے اختلاف کرنا ممکن ہے۔"

سقراط بولا "تمہیں اس سے اختلاف کرنا پڑے گا، میرے تھیبی دوست؛ اگر تم اب تک اس خیال پر قائم ہو کہ ہم آہنگی کوئی مرکب چیز ہے اور روح ایسی ہم آہنگی ہے جو جسم میں لگے ہوئے تاروں سے مل کر بنتی ہے اس لیے کہ تم یہ تو کبھی نہ کہو گے کہ ہم آہنگ نغمہ ان اجزا سے پہلے موجود ہوتا ہے جن سے وہ مل کر بنا ہے۔"

"کبھی نہیں، سقراط۔"

"مگر کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہارے الفاظ اسی پر دلالت کرتے ہیں جب تم یہ کہتے ہو کہ روح انسان کی صورت اختیار کرنے اور جسم میں داخل ہونے سے پہلے موجود تھی اور ان اجزا سے مرکب تھی جن کا اس وقت تک وجود بھی نہ تھا؟ اصل میں ہم آہنگ نغمہ روح سے مشابہت نہیں رکھتا جیسا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ اس لیے کہ پہلے بربط اور تار اور سُر غیر ہم آہنگی کی حالت میں موجود ہوتے ہیں

اور ہم آہنگی ان سب کے بعد وجود میں آتی ہے اور سب سے پہلے معدوم ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ روح کا یہ تصور اس دوسرے تصور کے کیونکر مطابق ہو سکتا ہے؟"

سمیاس نے جواب دیا "ہرگز نہیں ہو سکتا"

"حالانکہ خود اس بحث میں جس کا موضوع ہم آہنگی ہو یقیناً ہم آہنگی ہونا چاہیے؟"

"ضرور ہونا چاہیے۔"

"لیکن ان دونوں قضیوں میں کہ علم تذکر ہے، اور روح ہم آہنگی ہے مطلق ہم آہنگی نہیں۔ بتاؤ دونوں میں سے کسے چھوڑو گے اور کسے رکھو گے؟"

"میں سمجھتا ہوں سقراط کہ مجھے پہلے قضیے پر جو پوری طرح ثابت کیا جا چکا ہے کہیں زیادہ مضبوط عقیدہ ہے بہ نسبت دوسرے کے جس کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا بلکہ وہ محض ظنی اور تخمینی باتوں پر مبنی ہے اس لیے عام لوگ اسے مان لیتے ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ دلایل جو ظن و تخمین پر مبنی ہیں بڑے فریبی ہوتے ہیں اور اگر ان کے استعمال میں احتیاط نہ کی جائے تو آدمی ان سے دھوکا کھا جاتا ہے ——— ہندسے میں بھی اور دوسری چیزوں میں بھی۔ لیکن علم اور تذکر کا نظریہ معتبر دلائل سے ثابت کیا جا چکا ہے اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ روح جسم میں آنے سے پہلے موجود رہی ہوگی اس لیے کہ اس میں وہ عین موجود ہے جس کا نام ہی وجود پر دلالت کرتا ہے۔ جب میں اپنے یقین کے مطابق، بجا طور پر اور کافی دلایل کی بنا پر اس نتیجے کو تسلیم کر چکا تو میرے خیال میں مجھے یہ چاہیے کہ نہ خود کہوں اور نہ دوسروں کو کہنے دوں کہ روح ہم آہنگی ہے۔"

اب، سمیاس، میں مسئلے کو ایک اور پہلو سے تمھارے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کیا تمھارے خیال میں ایک ہم آہنگ شے یا کسی اور مرکب کی حالت ان اجزا

کی حالت سے مختلف ہو سکتی ہے جن سے وہ مل کر بنا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"یا اس کا کوئی فعل یا انفعال ان اجزا کے فعل یا انفعال سے مختلف ہو سکتا ہے؟"

"نہیں ہو سکتا۔"

"اس لیے کہ ہم آہنگ شے میں کوئی ایسی حرکت یا آواز یا صفت نہیں ہو سکتی جو اس کے اجزا سے مختلف ہو۔"

"بے شک یہ ناممکن ہے۔"

"اور کیا ہر ہم آہنگ شے کی ماہیت اس پر منحصر نہیں کہ اس کے اجزا میں کس طریقے سے ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے؟"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ہم آہنگی کے مختلف درجے ہوتے ہیں، ایک چیز زیادہ ہم آہنگ اور کامل طور پر ہم آہنگ کہلاتی ہے جب اس کے اجزا میں زیادہ حقیقی اور کامل ہم آہنگی پائی جائے، اور کم ہم آہنگ اور ناقص طور پر ہم آہنگ کہلاتی ہے جب اس کے اجزا میں کم اور ناقص ہم آہنگی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔"

"لیکن کیا روح کے بھی درجے ہو سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ روحیت کے اعتبار سے ایک روح دوسری روح سے خفیف سی بھی کم یا زیادہ ہو یا کامل تر یا ناقص تر ہو؟"

"ہرگز نہیں۔"

"مگر یہ تو کہا جاتا ہے کہ دو روحوں میں سے ایک میں عقل اور نیکی ہے اور وہ

اچھی روح ہے اور دوسری میں حماقت یا بدی ہے اور وہ بُری روح ہے؟ یہ کہنا درست ہے یا نہیں"۔

"درست ہے"۔

"لیکن وہ لوگ جو روح کو ہم آہنگی کہتے ہیں اس میں نیکی اور بدی کے موجود ہونے کے بارے میں کیا کہیں گے؟ —— کیا یہ کہیں گے یہ بھی ایک قسم کی ہم آہنگی اور غیر آہنگی ہے اور نیک روح ہم آہنگ ہے اور خود ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے اپنے اندر ایک اور ہم آہنگی رکھتی ہے اور بد روح غیر آہنگ ہے اس لیے اس کے اندر کوئی ہم آہنگی نہیں؟"

مجھے نہیں معلوم مگر قیاساً کہتا ہوں کہ شاید وہ لوگ جو روح کو ہم آہنگی کہتے ہیں اسی قسم کی کوئی بات کہیں گے"۔

"اور ہم پہلے ہی مان چکے ہیں کہ کوئی روح روحیت میں کسی دوسری روح سے کم یا زیادہ نہیں اور یہ گویا اس کا اعتراف کرنا ہے کہ کوئی ہم آہنگ شے ہم آہنگی میں کسی دوسری ہم آہنگ شے سے کم یا زیادہ یا کامل تر یا ناقص تر نہیں ہوتی؟"

"بہت ٹھیک ہے"۔

"اور جو چیز کم یا زیادہ ہم آہنگ نہ ہو اس کی ہم آہنگی میں کم یا زیادہ کا فرق نہیں ہوگا"۔

"ٹھیک ہے"۔

"اور جس کی ہم آہنگی میں کم یا زیادہ کا فرق نہ ہو اس میں یکساں ہم آہنگی پائی جائے گی؟"

"ہاں"۔

"تو چونکہ ایک روح روحیت میں دوسری روح سے کم یا زیادہ نہیں ہوتی اس لیے ہم آہنگی میں بھی کم یا زیادہ نہیں ہوتی؟"

"بالکل صحیح ہے۔"

"اس لیے نہ تو اس میں ہم آہنگی کم یا زیادہ ہوتی ہے نہ غیر آہنگی؟"

"بے شک نہیں ہوتی۔"

"اور چونکہ ایک روح میں دوسری روح سے نہ ہم آہنگی کم یا زیادہ ہوتی ہے نہ غیر آہنگی اس لیے نہ ایک روح میں دوسری روح سے نیکی زیادہ ہوگی نہ بدی اگر نیکی کو ہم آہنگی اور بدی کو غیر آہنگی کہا جائے؟"

"بالکل زیادہ نہیں ہوگی۔"

"یا زیادہ صحیح الفاظ میں، سمیاس، یوں کہنا چاہیے کہ اگر روح ہم آہنگی کا نام ہے تو اس میں بالکل بدی نہیں ہوگی اس لیے کہ ہم آہنگی مطلق ہم آہنگی ہے اور اس کا کوئی جز غیر آہنگ نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے۔"

اس لیے روح جو مطلق روح ہے اس میں بالکل بدی نہیں ہوتی؟"

"کیسے ہو سکتی ہے اگر سابقہ استدلال صحیح ہے۔"

"اس لیے اگر کُل روحیں اپنی ماہیت کے لحاظ سے یکساں ہیں تو جتنے ذی روح ہیں سب کی روحیں یکساں نیک ہوں گی۔"

"مجھے تم سے اتفاق ہے سقراط۔"

"اور کیا تمھارے خیال میں یہ سب باتیں صحیح ہو سکتی ہیں؟ یہ ہیں وہ نتائج جو روح کو ہم آہنگ ماننے سے نکلتے ہیں؟"

"نہیں یہ صحیح نہیں ہو سکتیں۔"

ایک بات اور ہی۔ طبع انسانی کے عناصر پر حکمرانی کرنے والا روح کے، خصوصاً ایک دانش مند روح کے سوا کون ہو سکتا ہی؟ کیا تمھارے علم میں کوئی ہی؟"

نہیں، کوئی نہیں"۔

"اور روح جسم کی کیفیات کی موافقت کرتی ہی یا مخالفت کرتی ہی؟ مثلاً جب جسم کو گرمی اور پیاس معلوم ہو تو کیا روح ہمیں پانی پینے سے اور جب بھوک معلوم ہو تو کھانا کھانے سے نہیں روکتی؟ یہ ہزاروں مثالوں میں سے ایک ہی روح و جسم کی مخالفت کی"۔

"بہت ٹھیک ہی"۔

"لیکن ہم پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ اگر روح ہم آہنگی ہی تو جن تاروں کے کسنے اور ڈھیلے ہونے، لرزش اور جنبش وغیرہ سے وہ وجود میں آتی ہی ان کے خلاف اس کا کوئی سُر بھی نہیں ہو سکتا وہ صرف ان کی پیروی ہی کر سکتی ہی، رہنمائی نہیں کر سکتی"۔

"یہ تو لازمی بات ہی"۔

لیکن اب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ روح اس کا بالکل الٹا ــــــ یعنی جن عناصر سے وہ بنی ہی ان کی رہنمائی کر رہی ہی، ساری عمر جب دیکھو طرح طرح سے ان کی مخالفت کرتی اور انھیں دباتی رہتی ہی۔ کبھی کبھی اس سختی سے کہ علاج اور ورزش کی تکلیفیں اس کے سامنے ہیچ ہیں اور کبھی نرمی سے۔ خواہشات، جذبات اور خوف وغیرہ کو دھمکاتی ہی، کبھی جھڑکتی ہی گویا اس کا خطاب اپنے آپ سے نہیں بلکہ کسی غیر سے ہی جیسا کہ ہومر نے اپنی اوڈیسی میں اوڈیسیس کو دکھایا ہی۔ وہ کہتا ہی:-

"اس نے اپنی چھاتی پیٹی اور اپنے دل کو جھڑکا:

اے دل اب برداشت کر، تو اس سے کہیں زیادہ برداشت کر چکا ہے"۔

کیا تمھارے خیال میں ہومر نے، یہ بیت یہ سمجھ کر کہی تھی کہ روح ایک ہم آہنگی ہے جو جسمانی کیفیات کی پیروی کرتی ہے اور وہ اس نوعیت کی نہیں کہ ان کی رہنمائی اور ان پر حکمرانی کر سکے ـــــــ اس آسمانی شان کی جو کسی ہم آہنگی کو نصیب نہیں ؟"

"ہاں، سقراط، میرے خیال میں وہ اسی شان کی ہے"۔

"تو پھر میرے دوست، ہمارا یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا کہ روح ہم آہنگی ہے ورنہ خدا رسیدہ ہومر کے کلام کی اور خود اپنے قول کی تردید ہوگی"۔

"اور کیا"۔

"یہاں تک تو تمھاری تھیبی دیوی ہارمونیا کا ذکر تھا جو از راہ عنایت ہمارے آگے جھک گئی۔ مگر اب بتاؤ سیبیس کہ میں اس کے شوہر کیڈمس سے کیا کہوں اور اس سے کیونکر صلح کروں؟"

"سیبیس نے کہا۔ میرے خیال میں تم اسے پر چانے کی بھی کوئی صورت نکال لو گے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے ہارمونیا دیوی کے ساتھ اس طرح بحث کی جس کا مجھے کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ جب سیمیاس اپنی مشکل کا ذکر کر رہا تھا تو میں بالکل یہ سمجھتا تھا کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا چنانچہ ـــ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کی دلیلیں تمھارے پہلے ہی حملے کا مقابلہ نہ کر سکیں اور غالباً اس دوسرے کا بھی جسے تم کیڈمس کہتے ہو یہی انجام ہوگا"۔

سقراط نے جواب دیا" دیکھو میرے اچھے دوست، ہمیں شیخیاں نہ بگھارنی چاہییں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نظر بد کے اثر سے وہ بات جو میں کہنے والا ہوں منہ سے نکلتے ہی بھاگ جائے۔ بہر حال یہ تو دیوتاؤں کے ہاتھ ہے۔ اب میں ہومر کے

انداز میں آگے بڑھتا ہوں اور یہ آزماتا ہوں کہ تمھارے قول میں مقابلے کی ہمت کتنی ہے ۔ مسئلہ یہ ہے :- تم اس بات کا ثبوت چاہتے ہو کہ روح لازوال اور لافانی ہے اور جو فلسفی موت کی طرف سے مطمئن ہے اس کا اطمینان تمھیں محض بے بنیاد معلوم ہوتا ہے ۔ اگر اس کا یہ عقیدہ ہو کہ اس کا انجام عالم زیریں میں ان لوگوں سے اچھا ہو گا جنھوں نے دوسری قسم کی زندگی بسر کی ہے جب تک وہ اس بات کو ثابت نہ کر دے ۔ اور تم یہ کہتے ہو کہ روح کی قوت اور ربانیت اور پیکر انسانی میں آنے سے پہلے اس کا موجود ہونا ، ان سب باتوں سے لازمی طور پر یہ نہیں ثابت ہوتا کہ وہ لافانی ہے ؛ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ روح مدت سے موجود ہے اور وہ پچھلے جنم میں بہت کچھ سیکھ چکی ہے اور کر چکی ہے تب بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ لافانی ہو ، ممکن ہے کہ اس کا پیکر انسانی میں داخل ہونا ایک قسم کی بیماری ہو جس سے ہلاکت شروع ہو جاتی ہے اور زندگی کی تکلیفیں اٹھانے کے بعد اس کا خاتمہ اس چیز پر ہو جو موت کہلاتی ہے ۔ اس بات سے کہ روح جسم میں ایک بار داخل ہوتی ہے یا کئی بار داخل ہوتی ہے ، بقول تمھارے ، لوگوں کے خوف میں کوئی فرق نہیں پڑتا ، اس لیے کہ ہر شخص کو جو عقل سے خالی نہ ہو ، ضرور خوف ہو گا ، اگر وہ کچھ علم نہ رکھتا ہو اور روح کے لافانی ہونے کی کوئی توجیہہ نہ کر سکے ۔ میں یہ سمجھتا ہوں سیبیس کہ تمھارے خیالات یہ یا اس سے ملتے جلتے ہیں اور میں خاص کر کے انھیں دہراتا ہوں تاکہ کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے اور اگر تم چاہو تو ان میں کمی بیشی کر سکو ۔"

"جہاں تک کہ فی الحال سمجھ سکتا ہوں مجھے کوئی کمی بیشی نہیں کرنی ہے ۔ میرا مطلب وہی ہے جو تم کہتے ہو ۔"

سقراط کچھ دیر خاموش رہا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی خیال میں ڈوبا ہوا ہے ۔ آخر اس نے کہا ۔

"تم بڑا زبردست سوال اٹھا رہے ہو سیبیس، جس میں کون و فساد کی حقیقت کی ساری بحث آجاتی ہے۔ اگر تم کہو تو میں تمھیں اپنا تجربہ سناؤں۔ اگر میری کسی بات سے تمھاری مشکل کے حل کرنے میں مدد مل سکے تو تم اس سے کام لے سکتے ہو۔"

"میں بہت شوق سے سننا چاہتا ہوں۔"

تو پھر میں تمھیں سناتا ہوں۔ نو عمری میں، سیبیس، مجھے فلسفے کے اس شعبے سے بے حد شوق تھا جسے تحقیقِ فطرت کہتے ہیں۔ اشیا کی علتوں کی چھان بین کرنا کہ فلاں چیز کیوں وجود رکھتی ہے، کس لیے پیدا ہوتی ہے یا فنا ہو جاتی ہے، مجھے ایک اعلیٰ درجے کا شغلہ معلوم ہوتا تھا اور میں ہمیشہ اس قسم کے سوالات کی فکر میں الجھا رہتا تھا:۔ کیا حیوانوں کی نشو و نما ایک انحطاط کا نتیجہ ہے جو سرد اور گرم عنصر میں واقع ہوتا ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے؟ کیا خون وہ عنصر ہے جس کے ذریعے سے ہم خیال کرتے ہیں یا ہوا یا آگ؟ یا یہ کچھ بھی نہیں ہے —— بلکہ دماغ ہی سامعہ اور باصرہ اور شامہ کے ادراکات کا سرچشمہ ہے اور حافظہ اور قیاس انھی سے پیدا ہوتا ہے اور علوم کی بنیاد حافظے اور قیاس پر قائم کی جاتی ہے جب وہ ایک مستقل صورت اختیار کرے۔ اس کے بعد میں فساد کے مسئلے پر اور زمین و آسمان کی سب چیزوں پر غور کرتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ میں اس قسم کی تحقیقات کے لیے قطعاً نااہل ہوں جس کا میں تمھیں کافی ثبوت دوں گا۔ ان چیزوں نے مجھے اس قدر مسحور کر دیا تھا کہ میری آنکھوں کو وہ چیزیں بھی نہیں سوجھتی تھیں جو پہلے میں مثل اور لوگوں کے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ میں ان باتوں کو بھول گیا جنھیں میں پہلے بدیہی حقائق سمجھا کرتا تھا۔ مثلاً یہ بات کہ انسان کی نشو و نما کھانے پینے کا نتیجہ ہے اس لیے کہ جب ہضم کے ذریعے سے گوشت میں گوشت اور ہڈی میں ہڈی مل جاتی ہے اور موافق عناصر جمع ہو جاتے ہیں تو کم مقدار زیادہ ہو جاتی ہے اور چھوٹا آدمی

بڑا ہو جاتا ہی۔ کیا یہ معقول خیال نہیں تھا ؟"

" ہاں میں تو سمجھتا ہوں کہ معقول تھا۔"

"اچھا اب ایک اور بات سنو۔ ایک زمانے میں میرا یہ خیال تھا کہ میں چھوٹے اور بڑے کے معنی بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اور جب کبھی میں ایک لمبے آدمی کو ایک ٹھنگنے آدمی کے پاس کھڑا دیکھتا تھا تو یہ سوچتا تھا ایک دوسرے سے بالشت بھر بڑا ہی، یا ایک گھوڑا مجھے دوسرے گھوڑے سے بڑا نظر آتا تھا اور اس سے بھی زیادہ واضح مجھے یہ بات معلوم ہوتی تھی کہ دس آٹھ سے بقدر دو کے بڑا ہی اور دو ہاتھ کا فاصلہ ایک ہاتھ سے بڑا ہی اس لیے کہ دو ایک کا دُگنا ہی۔"

"اور اب ان باتوں کے متعلق تمھارا کیا خیال ہی ؟"

" اب میں کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہیں کرتا کہ میں ان میں سے کسی بات کی علت سے واقف ہوں۔ اس لیے کہ مجھے یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ جب ایک کو ایک میں جوڑتے ہیں تو آیا وہ اکائی جس میں کہ دوسری جوڑی جاتی ہی دو ہو جاتی ہی یا دونوں اکائیاں جمع ہونے کی وجہ سے دو بن جاتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کیا بات ہی کہ جب تک یہ دونوں عدد ایک دوسرے سے الگ تھے ان میں سے ہر ایک ایک تھا نہ کہ دو اور جب کہ وہ جوڑ دیے گئے تو محض یہ اتصال ان کے دو بن جانے کا سبب ہو گیا۔ اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک کو تقسیم کرنے سے دو کیوں کر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں دو مختلف اسباب سے ایک ہی نتیجہ نکلا —— —— پہلی مثال میں ایک کا ایک کے ساتھ اتصال اور جمع ہونا دو کی علت تھا اور دوسری میں ایک کی دوسرے سے جدائی اور تفریق۔ غرض مجھے اب بالکل اطمینان نہیں رہا کہ میں اس بات کو سمجھتا ہوں نہ ایک کا عدد یا کوئی چیز بھی کس لیے پیدا ہوتی ہی یا معدوم ہو جاتی ہی یا وجود رکھتی ہی مگر میرے ذہن میں اس کے معلوم

کرنے کے ایک نئے طریقے کا دھندلا سا خیال ہے اور اس کے سوا کسی اور طریقے کو میں کسی طرح نہیں مان سکتا۔

"پھر میں نے ایک شخص کو، بقول اس کے، انکساگورس کی کتاب سے یہ پڑھتے ہوئے سنا کہ ہمارا ذہن کل چیزوں کا سبب اور علت ہے اور میں اس خیال سے جو خاصا معقول معلوم ہوتا تھا، بہت خوش ہوا اور اپنے دل میں کہا، اگر ہمارا ذہن سبب ہے تو وہ جو کچھ کرے گا بہترین طریقے سے کرے گا اور ہر چیز کو اس کی مناسب جگہ دے گا اور میں نے یہ کہا کہ اگر کسی چیز کی تخلیق یا عدم وجود کی علت تلاش کرنا ہو تو پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس چیز کے لیے وجود یا فعل یا انفعال کی کون سی حالت سب سے بہتر ہے۔ اور جب وہ حالت جو اپنے اور دوسروں کے لیے سب سے بہتر ہے معلوم ہو گئی تو سب سے بدتر حالت خود بخود معلوم ہو جائے گی اس لیے کہ دونوں ایک ہی علم کے تحت میں آتی ہیں۔ میں یہ سوچ کر بہت خوش ہوا کہ مجھے علت وجود کی تعلیم کے لیے انکساگورس، ویسا ہی استاد مل گیا جیسا کہ میں چاہتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ مجھے پہلے تو یہ بتائے گا کہ زمین چپٹی ہے یا گول ہے اور پھر ان دونوں میں سے جو بھی صحیح ہو اس کی علت اور اس کا ضروری ہونا سمجھائے گا۔ اس کے بعد وہ مجھے بہترین کے معنی سمجھائے گا اور یہ ثابت کرے گا کہ یہی صورت بہترین ہے اور میں اس کی توجیہہ سے مطمئن ہو جاؤں گا اور کسی علت کا مطالبہ نہیں کروں گا اور میں نے سوچا کہ پھر میں اس سے سورج اور چاند اور ستاروں کے متعلق سوال کروں گا اور وہ مجھے ان کی تقابلی رفتار اور ان کی رجعت اور مختلف فاعلی اور انفعالی حالتیں بتائے گا اور یہ سمجھائے گا کہ یہ سب بہترین ہیں اس لیے کہ یہ بات میرے قیاس میں نہیں آئی تھی کہ جب وہ ذہن کو ان کا سبب کہتا ہے تو ان کے وجود کو بہترین سمجھنے کے سوا کوئی اور صورت بھی ممکن ہے اور میں نے سوچا کہ

جب مجھے تفصیل کے ساتھ ہر جزو کل کی علت سمجھا چکے گا تو وہ یہ بھی بتائے گا کہ ہر جزو کل کی بہترین حالت کیا ہے۔ یہ وہ امیدیں تھیں جنھیں میں لاکھوں رُپے میں نہ بیچتا۔ غرض میں کتابوں پر ٹوٹ پڑا اور جس قدر تیزی کے ساتھ ممکن تھا ان کا مطالعہ کرنے لگا اس شوق میں کہ مجھے بہتر اور بدتر کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

"کیا کیا امیدیں میں نے باندھ رکھی تھیں اور کس قدر سخت مایوسی مجھے اٹھانی پڑی! آگے چل کر دیکھا کہ میرے فلسفی نے ذہن کو اور ہر اصول ترتیب کو چھوڑ کر ہوا، ایتھر پانی اور اسی قسم کے انوکھے تصورات سے کام لینا شروع کر دیا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص شروع میں تو یہ دعوےٰ کرے کہ سقراط کے ہر فعل کی علت ذہن ہے لیکن جب میرے افعال کی مفصل توجیہہ کرنے پر آئے تو یہ کہے کہ میں یہاں اس وجہ سے بیٹھا ہوں کہ میرا جسم ہڈی اور پٹھوں سے بنا ہے، ہڈیاں اور ان کے بیچ کے جوڑ سخت ہیں، پٹھے لچک دار ہیں اور انھوں نے ہڈیوں کو ڈھک رکھا ہے اور خود ہڈیوں کے گرد گوشت اور کھال کا غلاف لپٹا ہوا ہے۔ ہڈیاں پٹھوں کے سکڑنے اور پھیلنے سے جوڑوں پر اٹھ جاتی ہیں اور میں اپنی ٹانگوں کو جھکا سکتا ہوں چنانچہ اس طرح ٹیڑھا بیٹھا ہوا ہوں اور میں جو تم سے باتیں کر رہا ہوں اس کی بھی وہ اسی قسم کی توجیہہ کرے گا اور اُسے آواز، ہوا، قوت سامعہ غرض ہزاروں علتوں کی طرف منسوب کرے گا مگر اصل علت کو بھول جائے گا کہ اہل ایتھنس نے مناسب سمجھا کہ مجھے سزا دیں چنانچہ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ یہاں رہ کر اس سزا کو برداشت کروں۔ اس لیے کہ میرے خیال میں میری یہ ہڈیاں اور پٹھے تو کب کے میگارا یا بیوشیا پہنچ گئے ہوتے ——— قسم ہے مقدس کتے کی ضرور پہنچ گئے ہوتے ——— اگر ان کی حرکت اس پر موقوف ہوتی کہ وہ کس بات کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں اور میں فرار ہونے کے بدلے یہ بہتر اور برتر طرزِ عمل اختیار نہ کرتا کہ

ریاست کی دی ہوئی سزا کو برداشت کروں۔ یہاں علل و شرائط کچھ عجیب طریقے سے گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ بغیر ہڈیوں اور پٹھوں اور جسم کے دوسرے حصوں کے میں اپنے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ کہنا کہ میں جو کچھ کرتا ہوں انھیں کی وجہ سے کرتا ہوں اور ذہن اسی طرح کام کیا کرتا ہے نہ اس طرح کہ اپنی مرضی سے بہترین صورت اختیار کرے، بالکل فضول اور لاابالی پن کی بات ہے۔ تعجب ہے کہ یہ حضرات علت اور شرط میں فرق نہیں کر سکتے جن کے بارے میں عوام بیچارے جو اندھیرے میں ٹٹولتے ہیں، ہمیشہ غلطی کرتے ہیں اور انھیں غلط نام سے پکارتے ہیں۔ کوئی تو دنیا کو ایک گرداب قرار دیتا ہے اور زمین کو آسمان کی مدد سے استوار کرتا ہے، کوئی زمین کو ایک چوڑی ناند فرض کر کے اسے ہوا کے سہارے قائم کرتا ہے۔ اس کا انھیں خیال تک نہیں آتا کہ کوئی ایسی قوت ہے جس نے ان چیزوں کو ترتیب دیا ہے اور جو ترتیب ان کی اب ہے وہی بہترین ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ان میں ایک برتر قوت کی جھلک دیکھیں انھیں یہ توقع ہے کہ وہ کائنات کا ایک ایٹلس ثانی دریافت کر لیں گے۔ جو عین خیر سے زیادہ قوی اور لازوال اور محیط کل ہے۔ خیر کی ناگزیر اور محیط قوت کی انھیں ہوا تک نہیں لگی حالانکہ یہی چیز ہے جس کا علم حاصل کرنے کی مجھے دل سے خواہش ہے اگر کوئی سکھانے والا ہو۔ لیکن چونکہ اس خیر مطلق کی حقیقت نہ تو خود دریافت کر سکا اور نہ کسی اور سے سیکھ سکا اس لیے تم کہو تو تمھیں ان مسائل کی تحقیق کا وہ طریقہ بتا دوں جو اس کے بعد مجھے سب سے بہتر معلوم ہوا۔"

"مجھے اس کے سننے کا بہت اشتیاق ہے"۔

جب میں وجود حقیقی کی تلاش میں کامیاب نہیں ہوا تو میں نے سوچا کہ مجھے احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ کہیں میری روحانی آنکھیں نہ جاتی رہیں،

جس طرح سورج کو گہن کی حالت میں غور سے دیکھنے سے جسمانی آنکھ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، سوائے اس کے کہ لوگ احتیاط سے کام لے کر صرف اس کا عکس پانی میں یا کسی اور چیز میں دیکھیں۔ اسی طرح مجھے اپنے متعلق یہ خوف تھا کہ کہیں میری روحانی آنکھیں بالکل کور نہ ہو جائیں اگر میں اشیا کو ظاہری آنکھوں سے دیکھوں اور حواس کی مدد سے ان کا ادراک کرنے کی کوشش کروں۔ لہٰذا میں نے یہ بہتر سمجھا کہ میں وجود حقیقی کی تلاش میں روحانی عالم کی سیر کروں۔ غالباً یہ تشبیہ کامل نہیں ہے ——— اس لیے کہ میں یہ ہرگز نہیں مانتا کہ جو شخص اشیا کے وجود پر خیال کے ذریعے سے نظر ڈالتا ہے وہ دوسرے شخص کے مقابلے میں جو انھیں فعل اور عمل کی حالت میں مشاہدہ کرتا ہے زیادہ دھندلا دیکھتا ہے۔" جیسے شیشے میں سے دیکھ رہا ہو"۔ غرض میں نے یہ طریقہ اختیار کیا: سب سے پہلے ایک جوہر کو مان لیا جسے میں سب سے قوی سمجھتا تھا۔ اس کے بعد جو چیز حواس سے مطابقت رکھتی تھی اسے حق قرار دیا، خواہ وہ علت سے متعلق ہو یا کسی اور چیز سے۔ اور جو اس کے خلاف تھا اسے باطل ٹھہرایا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دوں۔ اس لیے کہ میرے خیال میں تم ابھی تک سمجھے نہیں۔"

"واقعی اچھی طرح نہیں سمجھا"۔

"جو کچھ میں تم سے کہنے والا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ وہی ہے جو پچھلی بحث میں اور دوسرے موقعوں پر میں ہر وقت اور ہر جگہ کہتا رہا ہوں۔ یعنی تمھیں علت کی حقیقت جو میرے خیال میں ہے سمجھاتا ہوں۔ یہاں میں ان جانے بوجھے لفظوں سے کام لوں گا جو ہر شخص کی زبان پر ہیں اور سب سے پہلے یہ فرض کروں گا کہ حسن مطلق، خیر مطلق اور عظمت مطلق وجود رکھتی ہے۔ اگر تم اسے تسلیم کر لو تو مجھے امید ہے کہ میں تمھارے سامنے علت کی حقیقت اور روح کا لافانی ہونا ثابت کر دوں گا۔"

"میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ تم ثبوت دینا شروع کردو"۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ دوسرے قدم پر بھی مجھ سے اتفاق ہے یا نہیں، مجھے تو بے اختیار خیال آتا ہے کہ اگر حسن مطلق کوئی چیز ہے اور اس کے علاوہ بھی کوئی حسین شے موجود ہے تو وہ صرف اسی حد تک حسین ہوگی جہاں تک کہ اس میں حسن مطلق کی جھلک موجود ہے — اور اسی طرح ہر چیز کو سمجھ لو۔ کیا تم علت کے اس تصور سے متفق ہو؟"

"ہاں میں متفق ہوں۔"

"اس کے علاوہ اور جتنی حکیمانہ علتیں بیان کی جاتی ہیں ان کا نہ مجھے علم ہے نہ میری سمجھ میں آتی ہیں۔ اور اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ رنگ روپ یا صورت یا کوئی اور چیز حسن کی علت ہے تو میں ان سب چیزوں کو چھوڑ دوں گا جن سے مجھے الجھن کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا اور چاہے یہ حماقت ہو مگر میں صرف یہی کہوں گا اور یہی میرا یقین ہے کہ کسی شے کے حسین ہونے کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ اس میں حسن مطلق کی جھلک موجود ہے خواہ وہ کسی صورت سے اور کسی طریقے سے آئی ہو۔ طریقے کے متعلق تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن یہ میرا دعویٰ ہے کہ حسن مطلق ہی سے کل حسین چیزیں حسین ہوتی ہیں۔ یہ مجھے سب سے زیادہ قابل وثوق جواب معلوم ہوتا ہے جو میں اپنے آپ کو یا دوسروں کو دے سکتا ہوں اور اسی پر میں قائم ہوں کہ یہ اصول کبھی غلط نہیں ثابت ہوگا اور اپنے آپ کو اور ہر شخص کو جو سوال کرے میں وثوق کے ساتھ جواب دے سکتا ہوں کہ صرف حسن ہی کی وجہ سے حسین چیزیں حسین ہوتی ہیں۔ کیا تم مجھ سے متفق نہیں ہو؟"

"میں متفق ہوں"۔

"اور صرف بڑائی کی وجہ سے بڑی چیزیں بڑی اور زیادہ بڑی چیزیں زیادہ بڑی ہوتی ہیں اور چھٹائی کی وجہ سے چھوٹی چیزیں چھوٹی ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو اگر کوئی شخص یہ کہے کہ الف، ب سے بڑا ہے ایک بالشت اور ب الف سے چھوٹا ہے ایک بالشت تو تم اس کے قول کو تسلیم نہیں کروگے اور بہ اصرار یہ کہوگے کہ تمہارے نزدیک بڑا صرف بڑائی سے یعنی بڑائی کی وجہ سے بڑا ہے اور چھوٹا صرف چھٹائی سے یعنی چھٹائی کی وجہ سے چھوٹا ہے اور اس طرح اس غلط نفی سے بچ جاؤگے کہ بڑے کی بڑائی اور چھوٹے کی چھٹائی ایک بالشت کے فرق پر موقوف ہے جو دونوں صورتوں میں یکساں ہے، اور اس مہمل خیال سے بھی محفوظ رہوگے کہ بڑے کی بڑائی ایک بالشت کے پیمانے کی وجہ سے ہے جو ایک چھوٹی سی چیز ہے۔ تم یہ نتیجہ نکالتے ہوئے ہچکچاؤگے، ہے کہ نہیں؟"

سیبیس نے ہنس کر کہا "بے شک"۔

"اسی طرح تم یہ کہتے ہوئے ہچکچاؤگے کہ دس آٹھ سے دو سے یا دو کی وجہ سے بڑا ہے بلکہ یہ کہوگے کہ عددیت کی وجہ سے بڑا ہے۔ اسی طرح تم یہ نہیں کہوگے کہ چار بالشت دو بالشت سے دگنا ہونے سے بڑا ہے بلکہ مقدار کی وجہ سے بڑا ہے۔ اس لیے کہ ان سب صورتوں میں اسی غلط فہمی کا امکان ہے۔"

"بہت ٹھیک ہے۔"

"اس کے علاوہ کیا تم یہ کہنے میں احتیاط نہیں کروگے کہ ایک کو ایک میں جمع کرنا یا ایک کو تقسیم کرنا دو کی علت ہے۔ یقیناً تم بآواز بلند یہ کہوگے کہ تمہارے نزدیک کسی چیز کے وجود میں آنے کی اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں کہ وہ اپنے عین کی جھلک اپنے اندر رکھتی ہو۔ اس لیے جہاں تک تمہارے علم میں ہے

دو کی علت صرف یہ ہے کہ اس میں دوئی کی جھلک موجود ہے ـــــــــ یہ طریقہ ہے دو کے پیدا ہونے کا۔ اسی طرح اکائی کی جھلک آجانے سے ایک پیدا ہوتا ہے۔ تم اپنے دل میں کہو گے کہ میں تو تقسیم و جمع کے معموں سے باز آیا۔ ان کا حل کرنا مجھ سے زیادہ دانش مند آدمیوں کا کام ہے، مجھ جیسا ناتجربہ کار حسب مثل کے مطابق اپنے سایے سے بھڑکتا ہے۔ اصول کی مستحکم بنیاد کو نہیں چھوڑ سکتا اور اگر اس میں کوئی تم پر اعتراض کرے تو تم اس کی پروا نہیں کرو گے اور اسے کوئی جواب نہیں دو گے جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ اس کے نتایج ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اور جب تم سے اس اصول کی تشریح طلب کی جائے تو تم درجہ بدرجہ بلند تر اصول فرض کرتے چلے جاؤ گے یہاں تک بلند ترین اصول کی قرارگاہ پر پہنچ جاؤ۔ مگر تم مناظرہ کرنے والوں کی طرح اپنے استدلال میں اصول اور نتایج کو گڈمڈ نہیں ہونے دو گے اگر تم وجود حقیقی کو تلاش کرنا چاہتے ہو۔ اس خلط بحث کی ان لوگوں کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں جو کبھی اس مسئلے پر غور کرنے کی پروا نہیں کرتے اس لیے کہ از راہ دانش مندی اپنے آپ سے ہمیشہ مطمئن رہتے ہیں خواہ ان کے خیالات میں کتنی ہی ابتری کیوں نہ ہو لیکن تم اگر فلسفی ہو تو یقیناً وہی کرو گے جو میں کہتا ہوں۔"

سمیاس اور سیبیس دونوں ساتھ ساتھ بول اٹھے "تم بہت ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

ایشیکراٹیس۔ کوئی تعجب نہیں فیڈو، کہ انھوں نے اس کی تائید کی۔ ہر شخص جس میں زرا سی بھی سمجھ ہو گی اس بات کو تسلیم کرے گا کہ سقراط کا استدلال نہایت واضح ہے۔

فیڈو۔ بے شک، ایشیکراٹیس، یہی اس وقت ہم سب کو محسوس ہو رہا تھا۔

ایشیکراٹیس۔ اور یہی ہم سب کو بھی محسوس ہو رہا ہے جو اس صحبت میں موجود نہ تھے اور اب تمھاری زبان سے اس کی روداد سن رہے ہیں۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا؟

فیڈو۔ جب یہ سب کچھ تسلیم کیا جا چکا اور وہ لوگ اس پر متفق ہو گئے کہ اعیان وجود رکھتے ہیں، دوسری اشیا میں ان کی جھلک پائی جاتی ہے اور وہ انھیں کے نام سے موسوم ہوتی ہیں، تو جہاں تک مجھے یاد ہے، سقراط نے کہا:

"تمھارا طرز گفتگو یہی ہونا چاہیے مگر جب تم یہ کہتے ہو کہ سیمیاس سقراط سے بڑا اور فیڈو سے چھوٹا ہے تو کیا تم سیمیاس کی طرف بڑائی اور چھٹائی دونوں منسوب نہیں کرتے؟"

"ہاں کرتا تو ہوں۔"

"پھر بھی تم یہ مانتے ہو کہ درحصل سیمیاس سقراط سے سیمیاس ہونے کی وجہ سے بڑا نہیں جیسا کہ بظاہر مذکورہ بالا الفاظ سے معلوم ہوتا ہے بلکہ اپنے قد کی وجہ سے اسی طرح سقراط سیمیاس سے سقراط ہونے کی وجہ سے چھوٹا نہیں بلکہ اس لیے کہ اس میں سیمیاس کی بڑائی کے مقابلے میں چھٹائی پائی جاتی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔"

"اور اگر فیڈو قد میں بڑا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ فیڈو ہے بلکہ اس لیے کہ وہ سیمیاس کے مقابلے میں بڑائی رکھتا ہے اور سیمیاس اس کی نسبت چھوٹا ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"چنانچہ سیمیاس بڑا بھی کہلاتا ہے اور چھوٹا بھی اس لیے کہ وہ دونوں کے بین بین ہے۔ پہلے کی چھٹائی کے مقابلے میں اپنی بڑائی کی وجہ سے بڑا ہے مگر دوسرے

کی بڑائی سے اپنی چھٹائی کی بدولت چھوٹا ہی" پھر ہنس کر بولا:
"میں تو کتاب کا سا سبق دہرانے لگا مگر غالباً بات میں صحیح کہہ رہا ہوں"۔
سیمیاس نے اس سے اتفاق کیا۔

"میں یہ باتیں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم میرے ہم خیال ہو جاؤ کہ نہ صرف مجرد اور مطلق بڑائی میں بڑائی اور چھٹائی دونوں کا موجود ہونا ناممکن ہی بلکہ مقرون بڑائی جو ہمارے اندر ہی وہ بھی جب تک موجود ہی چھٹائی کو قبول نہیں کر سکتی۔ بجائے اس کے دو باتوں میں سے ایک بات ہوگی یا تو یہ بڑائی اپنی ضد یعنی چھٹائی کے آتے ہی ہٹ جائے گی یا بالکل معدوم ہو جائے گی۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ وہ چھٹائی کو قبول کر کے خود بدل جائے جس طرح میں سیمیاس کے مقابلے میں چھٹائی قبول کرنے کے بعد بھی جو پہلے تھا وہی رہتا ہوں۔ جیسے یہ نہیں ہو سکتا کہ بڑائی کا عین کبھی چھوٹا ہو یا چھوٹا بن جائے۔ غرض یہ ناممکن ہی کہ کوئی چیز جب تک اس کا وجود باقی ہی اپنی ضد ہو یا اپنی ضد بن جائے بلکہ تغیر کی حالت میں یا تو وہ ہٹ کر کہیں اور چلی جاتی ہی یا معدوم ہو جاتی ہی!"

سیبیس نے کہا" میرا بھی بالکل یہی خیال ہی"۔

اس پر حاضرین میں سے کسی نے اگرچہ ٹھیک یاد نہیں کس نے یہ کہا:-

"خدا کے لیے ذرا سوچو تو یہ اس کے بالکل برعکس ہی جو ہم پہلے مان چکے ہیں ——— کہ بڑے سے چھوٹا اور چھوٹے سے بڑا وجود میں آتا ہی مطلب یہ کہ اشیا اپنی اضداد سے پیدا ہوتی ہیں۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس اصول سے مطلق انکار کیا جا رہا ہی"۔

سقراط اس شخص کی طرف گردن جھکا کر سنتا رہا اور پھر اس نے کہا "میں تمھاری جرأت کی داد دیتا ہوں کہ تم نے ہمیں یہ بات یاد دلائی لیکن

تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ان دونوں صورتوں میں فرق ہی۔ اس وقت ہم مقرون اضداد کا ذکر کر رہے تھے مگر اب اعیان کا ذکر ہی جن کے متعلق یہ کہا گیا ہی نہ تو وہ ہمارے اندر اور نہ عالم خارجی میں اپنے آپ سے متضاد ہو سکتے ہیں اس وقت میرے دوست، اُن اشیا کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی جن کے اندر یہ اضداد پائے جاتے ہیں اور جن کے نام سے وہ پکارے جاتے ہیں مگر اب خود ان اضداد کے متعلق گفتگو ہی جو ان اشیا کے اندر پائے جاتے ہیں اور جن کے نام سے یہ اشیا پکاری جاتی ہیں اور ہمارا دعویٰ ہی کہ یہ عینی اشیا ایک دوسرے سے پیدا نہیں ہوتی ہیں۔" اسی کے ساتھ سیبیس سے مخاطب ہو کر بولا:

"سیبیس کیا تم ہمارے دوست کے اعتراض سے گھبرا گئے؟"

سیبیس نے جواب دیا "نہیں تو، گو مجھے یہ اعتراف ہی کہ میں اکثر اعتراضات سے گھبرا جاتا ہوں۔"

سقراط نے کہا "تو پھر ہم اس پر متفق ہیں کہ کوئی عین کسی حالت میں بھی اپنی ضد نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں اس پر ہم متفق ہیں"

"لیکن اب زرا اس مسئلے پر ایک اور نقطۂ نظر سے غور کرو اور یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے متفق ہو یا نہیں۔ ایک چیز ہی جسے تم گرمی کہتے ہو اور ایک چیز اور ہی جسے سردی کہتے ہو؟"

"بے شک۔"

"کیا یہ وہی ہی جو آگ اور برف کہلاتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔"

"گرمی آگ سے اور سردی برف سے مختلف چیز ہی۔"

"ہاں"۔

"مگر یہ تو تم ضرور مانو گے کہ جب برف پر گرمی کا اثر پڑے تو وہ گرمی اور برف نہیں رہیں گے بلکہ جیسے ہی گرمی قریب آئے گی برف یا تو ہٹ جائے گا یا معدوم ہو جائے گا؟"

"بہت ٹھیک ہے"۔

"اور آگ بھی، جیسے ہی سردی اس کے قریب آئے گی یا تو ہٹ جائے گی یا معدوم ہو جائے گی یعنی جب آگ پر سردی کا اثر پڑے تو وہ آگ اور سردی نہیں رہیں گے"۔

"ٹھیک ہے"۔

"اور بعض صورتوں میں عین کا نام نہ صرف ازلی اور ابدی عین کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ ہر اور چیز جو عین نہ ہو مگر صرف عین کی صورت میں وجود رکھتی ہو اس نام سے موسوم ہو سکتی ہے۔ میں اسے ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا:۔ طاق عدد ہمیشہ طاق عدد کہلاتا ہے نہ؟"

"بے شک"۔

"مگر کیا صرف یہی ایک چیز طاق کہلاتی ہے؟ کیا اور چیزیں نہیں ہیں جو اپنے علٰحدہ نام رکھتی ہیں مگر اس کے باوجود طاق کہلاتی ہیں اس لیے کہ گو وہ عین طاق نہیں ہیں مگر کبھی طاقیت سے خالی نہیں ہوتیں ——— یہ بات ہے جو مجھے پوچھنی ہے ——— کہ کیا اعداد مثلاً تین کا عدد، طاق کے زمرے میں شامل نہیں ہیں؟ اس کی اور بھی بے شمار مثالیں ہیں۔ تو کیا تم یہ نہیں کہو گے کہ تین کو ہم اس کے مخصوص نام سے بھی پکار سکتے ہیں اور طاق بھی کہہ سکتے ہیں جو تین سے مختلف چیز ہے؟ اور یہ بات نہ صرف تین کے متعلق کہی جا سکتی ہے بلکہ پانچ کے

اور اسی طرح ایک ایک بیچ میں چھوڑ کر ہر عدد کے متعلق ـــــــ اُن میں ہر ایک عین طاق نہیں مگر طاق ہی، اسی طرح دو اور چار اور اُس پورے سلسلے کا جو ایک ایک بیچ میں چھوڑ کر بنتا ہی، ہر عدد عین جفت نہیں ہوتا مگر جفت ہی۔ تم اس سے متفق ہو؟"

"یقیناً"۔

"اچھا اب اس بات کو غور سے سنو جس کی طرف میں جانا چاہتا ہوں، نہ صرف عینی اضداد کا ایک جگہ جمع ہونا محال ہی بلکہ مقرون اشیا کا بھی جو خود اضداد نہیں مگر اپنے اندر اضداد رکھتی ہیں۔ یہ بھی جو عین اُن کے اندر ہی اس کے متضاد عین کو قبول نہیں کرتیں اور جب وہ قریب آتا ہی تو معدوم ہو جاتی ہیں یا ہٹ جاتی ہیں۔ مثلاً کیا تین کا عدد، اگر وہ تین ہی رہے جفت عدد بننے پر اسے ترجیح نہ دے گا کہ وہ معدوم ہو جائے؟"

"بہت ٹھیک ہی"۔

"حالانکہ دو کا عدد تین کے عدد کی ضد نہیں ہی"۔

"نہیں"۔

"تو نہ صرف اضداد ایک دوسرے کو دفع کرتے ہیں بلکہ بعض اور چیزیں بھی"۔

"بہت ٹھیک ہی"۔

"تو آؤ اگر ہو سکے تو ہم یہ معلوم کریں کہ وہ کون سی چیزیں ہیں"۔

"ضرور"۔

"کیا وہ چیزیں نہیں ہیں سیبیس، جو کسی چیز پر عاید ہونے کے بعد اسے نہ صرف اپنی صورت اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں بلکہ کسی دوسری چیز کی صورت اختیار کرنے پر بھی جو کسی تیسری چیز کی ضد ہی؟"

"اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"میرا مطلب یہ ہے جیسا کہ میں ابھی کہہ رہا تھا وہ چیزیں جن پر تین کا عدد عاید ہوتا ہے نہ صرف تعداد میں تین بلکہ طاق بھی ہونی چاہییں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"اور اس طاقیت میں جس کی جھلک تین کے عدد میں پائی جاتی ہے کبھی اس کا متضاد عین داخل نہیں ہو سکتا؟"

"کبھی نہیں"۔

"اور یہ جھلک اس میں طاق کے عین نے پیدا کی ہے۔"

"ہاں"۔

"اور طاق جفت کی ضد ہے۔"

"ٹھیک ہے"۔

"تو جفت کا عین کبھی تین کے عدد پر وارد نہیں ہوگا؟"

"نہیں"۔

"تو تین جفت کے دائرے میں شامل نہیں۔"

"بالکل نہیں"۔

"گویا تین کا عدد غیر جفت ہے؟"

"ٹھیک ہے"۔

"اچھا اب چیزوں پر غور کرو جن کا میں نے ذکر کیا تھا جن میں باہم تضاد نہیں مگر پھر بھی وہ بعض چیزوں کو جو بعض اور چیزوں کی ضدیں قبول نہیں کرتیں — مثلاً دی ہوئی مثال میں اگرچہ تین جفت کی ضد نہیں پھر بھی وہ جفت کو قبول نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اس کی ضد یعنی طاق کو اس کے مقابلے پر لے آتا ہے

اسی طرح دو طاق کو اور آگ سردی کو قبول نہیں کرتی ـــــ ان مثالوں سے (اور یہ بے شمار ہیں) شاید تم اس عام نتیجے پر پہنچ سکو کہ نہ صرف اضداد ایک دوسرے کو قبول نہیں کرتے بلکہ کوئی چیز جو کسی دوسری چیز کے قریب آئے اس دوسری چیز میں اپنی کسی خاصیت کی متضاد خاصیت قبول نہیں کرے گی۔ آؤ اب اس بحث کا خلاصہ پھر سے بیان کردوں اس لیے کہ دہرانے میں کوئی حرج نہیں۔ پانچ کا عدد جفت کی خاصیت کو قبول نہیں کرے گا اور نہ دس جو پانچ کا دگنا ہے طاق کی خاصیت کو۔ دگنے کی ضد ایک اور چیز ہے اور حقیقت میں دگنا طاق کا متضاد نہیں ہے پھر بھی وہ طاقیت کو قطعاً رد کر دیتا ہے۔ اسی طرح $\frac{3}{2}$ یا کوئی اور کسر جس میں $\frac{1}{2}$ یا $\frac{1}{3}$ شامل ہو، عدد سالم کی ضد نہیں مگر پھر بھی عدد سالم کے تصور کو قبول نہیں کرتی۔ تم اس سے اتفاق کرتے ہو؟"

"ہاں میں اس میں تم سے بالکل متفق ہوں اور تمھارے ساتھ ہوں"۔

"اچھا تو اب ہم پھر سے شروع کرتے ہیں۔ تم میرے سوال کا جواب انھیں الفاظ میں نہ دینا جن میں سوال کیا جائے۔ میں وہ فرسودہ یقینی جواب نہیں چاہتا جس کا میں نے پہلے ذکر کیا تھا بلکہ ایک اور قسم کا جواب جو اسی قدر یقینی ہے مگر اس کو تم نتیجے کے طور پر سابقہ قول سے اخذ کرتے ہو میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پوچھے "وہ کیا چیز ہے جس کا کسی جسم کے اندر ہونا اس کے گرم ہونے کا باعث ہے" تو تم یہ نہ کہنا کہ گرمی (اسی کو میں یقینی اور احمقانہ جواب کہتا ہوں) بلکہ آگ، یہ اس سے بہتر جواب ہے اور اب ہم اس قسم کا جواب دے سکتے ہیں۔ یا اگر کوئی شخص پوچھے کہ "جسم کس وجہ سے مریض ہے" تو یہ نہ کہنا کہ مرض کی وجہ سے بلکہ بخار کی وجہ سے۔ اور بجائے یہ کہنے کے کہ طاقیت طاق اعداد کی علت ہے یہ کہنا کہ عین طاق ان کی علت ہے۔ اسی طرح اور سب

چیزوں میں غالباً تم اچھی طرح سمجھ گئے ہوگے اور مجھے مزید مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ؟"

"ہاں میں اچھی طرح سمجھ گیا۔"

"تو پھر بتاؤ وہ کیا چیز ہے جس کا جسم کے اندر ہونا اس کے زندہ ہونے کا باعث ہے۔"

"روح۔"

"کیا ہر صورت میں؟"

"بے شک۔"

"تو جس کسی چیز میں روح داخل ہوتی ہے اپنے ساتھ زندگی لاتی ہے؟"

"یقیناً۔"

"اور زندگی کی کوئی ضد ہے۔"

"ہے۔"

"وہ کیا؟"

"موت۔"

"اور یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ روح جو چیز اپنے ساتھ لائی ہے اس کی ضد کو ہرگز قبول نہیں کرے گی؟"

"ہرگز نہیں۔"

"اور وہ کون سا عین تھا جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ جفت کو رد کرتا ہے؟"

"طاق کا۔"

"اور وہ جو موسیقیت اور بے انصافی کو رد کرتا ہے؟"

"غیر موسیقیت اور انصاف"۔

"اور وہ کون سا عین ہے جو موت کو قبول نہیں کرتا؟"

"لافانیت کا"۔

"اور روح موت کو قبول کرتی ہے؟"

"نہیں"۔

"تو روح لافانی ہے"؟

"ہاں"۔

"اور یہ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات ثابت ہو گئی؟"

"ہاں بہ خوبی ثابت ہو گئی"۔

"ٹھیک ہے"۔

"اور فرض کرو کہ طاق لازوال ہوتا تو عین کا عدد بھی ضرور لازوال ہوتا ہے کہ نہیں؟"

"بے شک"۔

"اور اگر سردی لازوال ہوتی تو اس وقت جب گرمی برف پر حملہ کرتی کیا برف ساری کی ساری بغیر پگھلے ہوئے وہاں سے ہٹ نہ جاتی --- اس لیے کہ نہ تو یہ ہو سکتا تھا کہ وہ پگھل جائے اور نہ یہ کہ وہیں رہے اور گرمی کو اپنے اندر داخل ہونے دے؟"

"ٹھیک ہے"۔

"اور اگر گرمی لازوال ہوتی تو اس وقت جب سردی آگ پر حملہ کرتی یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آگ معدوم ہو جائے یا بجھ جائے بلکہ وہ جوں کی توں وہاں سے ہٹ جاتی"۔

"یقیناً۔"

"یہی ہم لافانیت کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر لافانی اور لازوال ایک چیز ہیں تو روح موت کے حملے سے ہرگز معدوم نہیں ہو سکتی اس لیے کہ سابقہ بحث سے ثابت ہو گیا ہے کہ روح کبھی موت کو قبول نہیں کرتی جس طرح تین یا طاق کا عدد جفت کو اور آگ یا آگ کی گرمی سردی کو قبول نہیں کرتی۔ مگر ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے۔ "اگرچہ طاق جفت کے قریب آنے سے جفت نہیں بن جاتا لیکن یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ طاق معدوم ہو جائے اور جفت اس کی جگہ لے لے؟" اس معترض کو ہم یہ جواب نہیں دے سکتے کہ طاق کا عین لازوال ہے اس لیے کہ یہ ایسی چیز نہیں جو پہلے سے تسلیم کر لی گئی ہو۔ لیکن اگر یہ مسلّمہ امر ہوتا تو ہم بغیر کسی دشواری کے کہہ سکتے تھے کہ جفت کے قریب آنے سے عین طاق اور تین کا عدد معدوم نہیں ہوتا بلکہ ہٹ جاتا ہے۔ اور یہی بات آگ اور گرمی وغیرہ پر بھی صادق آتی ہے۔"

"بہت ٹھیک ہے۔"

"یہی لافانیت کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے: اگر لافانی اور لازوال ایک چیز ہیں تو روح لافانی بھی ہے اور لازوال بھی۔ البتہ اگر یہ نہ ہوتا تو اس کے لازوال ہونے کا کوئی اور ثبوت دینا پڑتا۔"

"کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں کیونکہ اگر لافانی جو ازلی اور ابدی ہے زوال پذیر ہو تو پھر کوئی چیز لازوال ہو ہی نہیں سکتی۔"

"حالانکہ سب انسان اس پر متفق ہیں کہ خدا اور جوہر اصلی اور لافانی چیزیں عموماً زوال سے بری ہیں۔"

"ہاں سب انسان ـــــ یہ بالکل ٹھیک ہے:۔ بلکہ اگر میں غلطی نہیں کرتا

تو صرف انسان ہی نہیں دیوتا بھی"۔

"چونکہ لافانی کبھی معدوم نہیں ہو سکتا اس لیے اگر روح لافانی ہی تو لازمی طور پر لازوال بھی ہی؟"

"یقیناً۔"

"تو موت جب انسان پر حملہ کرے تو اس کے فانی اجزا کے متعلق ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ مر جاتے ہیں لیکن لافانی جز موت کے آتے ہی ہٹ جاتا ہی مگر صحیح وسالم رہتا ہی"۔

"ٹھیک ہی۔"

"تو پھر سیبیس، روح بلاشبہہ لافانی اور لازوال ہی اور ہماری روحیں واقعی دوسری دنیا میں باقی رہیں گی۔"

"سیبیس نے کہا "سقراط اب میں قایل ہو گیا اور مجھے کوئی اعتراض کرنے کو نہیں رہا۔ لیکن اگر میرے دوست سیمیاس یا کسی اور شخص کو اعتراض کرنا ہی تو صاف صاف کہہ دے تکلف نہ کرے۔ اگر کچھ کہنا کہلانا ہی تو اور کون سا وقت آئے گا کہ اس کے لیے اٹھا رکھا جائے۔"

سیمیاس بولا "مجھے تو اور کچھ نہیں کہنا ہی۔ جو کچھ کہا جا چکا ہی اس کے بعد کسی شبہے کی گنجایش نہیں رہتی۔ پھر بھی جب میں اس موضوع کی عظمت اور انسان کی ہیچمدانی کا خیال کرتا ہوں تو ایک بے اطمینانی سی محسوس ہوتی ہی جسے میں کسی طرح دور نہیں کر سکتا۔"

سقراط نے جواب دیا "ہاں سیمیاس، یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں اتنا اور کہہ دوں کہ میرے بنیادی اصول خواہ کتنے ہی یقینی کیوں نہ معلوم ہوں ان پر بہت احتیاط سے غور کرنے کی ضرورت ہی اور وہ اچھی طرح سمجھ میں آجائیں

تو تم انسانی عقل پر کچھ مذبذب سا اعتماد کرتے ہوئے بحث کے سلسلے کو آگے بڑھا سکتے ہو۔ اگر اس سے صاف اور واضح نتائج حاصل ہو جائیں تو پھر مزید تحقیقات کی ضرورت نہیں۔

"بہت ٹھیک ہے۔"

"تو پھر میرے دوستو، اگر روح لافانی ہے تو پھر اس کی کس قدر حفاظت کرنی چاہیے۔ نہ صرف اس تھوڑے سے زمانے میں جو زندگی کہلاتا ہے بلکہ ابدالآباد تک۔ اس نظر سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کی طرف سے غفلت کرنا کس درجہ خطرناک ہے۔ اگر سب کا انجام موت ہوتا تو برے لوگ مرنے میں بڑے فائدے میں رہتے، اس لیے کہ نہ صرف انھیں جسم سے نجات ملتی بلکہ روح کے ساتھ اس کی برائیوں سے بھی پیچھا چھوٹ جاتا۔ مگر اب جب کہ روح صریحاً لافانی ہے تو بدی سے چھٹکارا یا نجات پانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ بہترین نیکی اور حکمت حاصل کی جائے، اس لیے کہ جب رُوح عالم زیریں کی طرف جاتی ہے تو وہ اپنے ساتھ سوا تعلیم و تربیت کے کچھ نہیں لے جاتی اور یہ اگر اچھی ہو تو جانے والوں کے لیے سفر کی پہلی ہی منزل میں بہت مفید اور بُری ہو تو بہت مضر ثابت ہوتی ہے۔

"اس لیے کہ لوگ کہتے ہیں ہر شخص کا ہمزاد جو زندگی میں اس کے ساتھ تھا اسے ایک خاص مقام پر لے جاتا ہے جہاں مردوں کی روحیں جمع ہوتی ہیں۔ اور جب ان کے مقدمے کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو سب روحیں اس رہنما کے ساتھ جو انھیں اس دنیا سے دوسری دنیا کو لے جانے کے لیے مقرر کیا جاتا ہے، عالم زیریں میں چلی جاتی ہیں اور جب وہ اپنے استحقاق کے مطابق جزا اور سزا پا چکتی ہیں اور اپنا وقت پورا کر چکتی ہیں تو زمانے کے بہت سے دور گزرنے کے بعد ایک اور رہنما انھیں اس دنیا میں واپس لاتا ہے۔ یہ راستہ جو دوسری دنیا کو

جاتا ہی، جیساکہ ایسکائیلس نے ٹیلیفس میں کہا ہی، کوئی ایک اور سیدھی سڑک نہیں ہی ـــــ اگر ایسا ہوتا تو کسی رہنما کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی شخص اس سے بھٹک ہی نہ سکتا۔ بلکہ سڑک کی بہت سی شاخیں ہیں اور ان میں بہت سے پیچ وخم ہیں۔ میں نے یہی نتیجہ نکالا ہی ان رسموں اور قربانیوں سے جو اس دنیا میں ان مقامات پر جہاں تین رستے ملتے ہیں، عالم زیریں کے دیوتاؤں کے نام پر کی جاتی ہیں۔ دانشمند اور با اصول روح ہر طرف دیکھ بھال کر سیدھے رستے پر چلتی ہی۔ لیکن جس روح کو جسم سے الفت ہوتی ہی اور جو جیساکہ میں نے پہلے کہا تھا مدت تک جسد بے روح اور عالم مرئی کے گرد منڈلاتی رہتی ہی اسے بڑی کشمکش اور تکلیف کے بعد اس کا ہمزاد زبردستی کھینچ کر لے جاتا ہی اور جب وہ اس مقام پر پہنچتی ہی جہاں سب روحیں جمع ہوتی ہیں تو اگر وہ ناپاک ہی اور اس نے ناپاک کام کیے ہیں خواہ قتل ہو یا اسی قسم کے اور جرایم ـــــ اس روح سے ہر شخص نفرت کرتا ہی اور بھاگتا ہی، کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا، کوئی اس کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی انتہائی بدی کی وجہ سے اکیلی بھٹکی پھرتی ہی یہاں تک کہ مدت پوری ہو جائے، اور جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہی تو وہ بے اختیار کھنچ کر اس جگہ پہنچ جاتی ہی جو اس کے لایق ہی۔ اسی طرح پاک اور باانصاف روح جو زندگی کی راہ سے دیوتاؤں کے ساتھ اور ان کی رہنمائی میں گزری ہی، اس مقام پر پہنچ جاتی ہی جو اس کے لیے مناسب ہی۔

"اب سنو کہ دنیا میں کئی عجیب و غریب خطے ہیں جو اپنی ماہیت اور وسعت کے لحاظ سے جغرافیہ دانوں کے تصورات سے بہت مختلف ہیں۔ یہ میں ایک شخص کی سند سے کہہ رہا ہوں جس کا نام نہیں بتاؤں گا۔"

سیمیاس نے پوچھا" اس سے تمھارا کیا مطلب ہی، سقراط میں نے

زمین کی حالت کے متعلق مختلف بیان سنے ہیں مگر مجھے یہ نہیں معلوم اور میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم ان میں سے کس کے قایل ہو۔

سیمیاس، اگر مجھ میں گلاکس کا ہنر ہوتا تو میں کہتا اگرچہ مجھے یقین نہیں کہ گلاکس کا ہنر بھی میرے بیان کی صحت کو ثابت کر سکتا جس کا خود میرے پاس کوئی ثبوت نہیں، اور اگر ہوتا بھی، تو شاید، سیمیاس، بحث کے ختم ہونے سے پہلے میری زندگی ختم ہو جاتی۔ پھر بھی تم کہو تو میں اتنا بتا دوں کہ میرے ذہن میں زمین کی شکل اور اس کے مختلف خطوں کا کیا تصور ہے۔"

"اتنا ہی کافی ہوگا۔"

"اچھا تو میرا عقیدہ یہ ہے کہ زمین ایک گول جسم ہے آسمانوں کے عین وسط میں، اس لیے اُسے ہوا یا کسی اور قوت کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنے گرد کے آسمانوں کی ہمواری اور خود اپنے توازن کی بدولت ایک حالت پر قائم ہے اور گرنے یا جھکنے نہیں پاتی۔ اس لیے کہ جو چیز خود متوازن ہو اور کسی ہموار چیز کے وسط میں ہو وہ کسی طرف ذرا بھی نہیں جھکے گی بلکہ بغیر کسی انحراف کے ایک ہی حالت میں رہے گی۔ یہ میرا پہلا خیال ہے۔"

"اور یقیناً صحیح ہے۔"

"اور میں اس کا قایل ہوں کہ زمین نہایت وسیع ہے اور ہم لوگ جو دریائے فاسس اور ستون ہراکلیس کے بیچ کے خطے میں آباد ہیں، اس کے ایک چھوٹے سے حصے میں سمندر کے گرد رہتے ہیں جیسے چیونٹیاں اور مینڈک دلدل کے آس پاس۔ اس طرح کے اور بہت سے ملک ہیں اور ان میں اور لوگ بستے ہیں۔ اس لیے کہ روئے زمین پر سب کہیں مختلف شکل اور جسامت کے گڑھے موجود ہیں جن میں پانی اور دھند اور نچلی ہوا جمع ہو جاتی ہے۔ لیکن

اصلی زمین پاک صاف ہے اور پاک صاف آسمان کے اندر واقع ہے —— جہاں ستارے بھی ہیں۔ اسی آسمان کو ہم عام طور پر اثیر کہتے ہیں —— اور یہ ہماری زمین اس کی تلچھٹ ہے جو نیچے گڑھوں میں جمع ہو گئی ہے لیکن ہم لوگ جو ان گڑھوں میں رہتے ہیں اس دھوکے ہیں ہیں کہ ہم سطح زمین پر آباد ہیں، اسی طرح جیسے سمندر کی تہ میں رہنے والی مخلوق یہ سمجھ لے کہ وہ سطح آب پر رہتی ہے اور سمندر آسمان ہے جس میں اسے سورج اور دوسرے ستارے نظر آتے ہیں اس لیے کہ وہ اپنی کمزوری اور سستی کی وجہ سے کبھی سطح پر نہیں آئی، نہ اس نے کبھی خود سر اٹھا کر دیکھا اور نہ کسی اور سے جو دیکھ چکا ہو یہ سنا کہ اُدھر ایک دنیا ہے جو اس دنیا سے کہیں زیادہ پاک صاف اور خوش نما ہے۔ بالکل یہی حالت ہماری ہے۔ کیونکہ ہم زمین کے ایک گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم سطح زمین پر ہیں۔ ہوا کو آسمان کہتے ہیں جس میں ہمارے خیال میں ستارے حرکت کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی کمزوری اور سستی کی وجہ سے ہم ہوا کی سطح تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر کوئی انسان بیرونی حد تک پہنچتا یا پرندکی طرح اڑ کر ادھر آتا تو اس مچھلی کی طرح جو پانی سے سر نکال کر دیکھتی ہے اُسے ایک اور دوسری دنیا نظر آتی۔ اور فطرت انسانی کچھ دیر اس نظارے کی تاب لا سکتی تو وہ مان لیتا کہ یہ دوسری دُنیا اصلی آسمان اور اصلی روشنی اور اصلی زمین کا مقام ہے۔ اس لیے کہ ہماری زمین اور پتھر اور ہمارے آس پاس کا سارا خطہ خراب اور گلا ہوا ہے جیسے سمندر میں ہر چیز شورے سے گل جاتی ہے۔ لیکن زمین کی ساخت عمدہ اور مکمل نہیں ہے بلکہ جہاں دیکھو گڑھے اور ریت اور کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔ یہاں تک کہ کنارہ بھی دنیا کے خوش نما مناظر میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھلا کیا مقابلہ ہے ہماری دنیا کا اُس

دُنیا سے ۔ اس بالائی زمین کے متعلق جو آسمان کے نیچے ہے میں تمھیں ایک بڑے مزے کی کہانی سناتا ہوں جو سننے کے قابل ہے۔"

"ہم بڑے شوق سے سنیں گے سقراط ۔"

وہ کہانی میرے دوست یہ ہے ۔ اول یہ کہ زمین اگر اوپر سے دیکھی جائے تو دھاری دار نظر آتی ہے ان گیندوں کی طرح جن پر رنگ برنگ کے بارہ ٹکڑوں کا چمڑا چڑھا ہوا ہوتا ہے اور وہ رنگ جو مصوّر اس دنیا میں استعمال کرتے ہیں انھیں رنگوں کے ادنیٰ سے نمونے ہیں۔ ساری زمین انھیں رنگوں سے بنی ہے جو ہمارے رنگوں سے کہیں زیادہ صاف اور چمک دار ہیں ۔ ان میں ایک بڑی آب و تاب کا ارغوانی رنگ اور ایک دمکتا ہوا سنہری رنگ ہے ۔ سفید رنگ جو زمین پر نظر آتا ہے برف اور کھریا سے کہیں زیادہ سفید ہے اسی قسم کے رنگوں سے مل کر زمین بنی ہے۔ جو تعداد اور خوش نمائی میں ان رنگوں سے کہیں بڑھ کر ہیں جنھیں انسان کی آنکھ نے آج تک دیکھا ہے ۔ خود وہ غار (جن کا میں ذکر کر رہا تھا) جو ہوا اور پانی سے بھرے ہیں ایسے نظر آتے ہیں جیسے طرح طرح کے رنگوں کے درمیان روشنی چمک رہی ہے ۔ سارا منظر ایک مسلسل نظارہ ہے کثرت میں وحدت کا۔ ہر چیز جو اس خوش نما خطے میں اُگتی ہے، درخت اور پھول اور پھل ، یہاں کی چیز سے بدرجہا زیادہ خوب صورت ہے اور وہاں پہاڑوں میں جن کے پتھر اسی نسبت سے ہمارے قیمتی سے قیمتی زمرد ، یشب ، عقیق وغیرہ سے زیادہ لطیف شفاف اور خوش رنگ ہیں اور یہ محض ان کے چھوٹے چھوٹے ریزوں کے برابر ہیں اس لیے کہ وہاں کے معمولی پتھر بھی ہمارے جواہرات کے برابر بلکہ ان سے زیادہ آب و تاب رکھتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خالص ہیں

اور ہمارے قیمتی پتھروں کی طرح شور عناصر سے آلودہ نہیں ہیں جو ان پر جم جاتے ہیں مٹی اور پتھر، حیوانات و نباتات سبھی میں گندگی اور بیماری پھیلاتے ہیں۔ بالائی زمین کے جواہرات، سونے چاندی کے پہلو بہ پہلو دن کی روشنی میں جگمگاتے ہیں اور اتنے بڑے اور اس کثرت سے ہیں کہ آدمی دیکھ کر خوش ہو جائے۔ اور وہاں آدمی اور جانور بھی ہیں۔ جن میں سے بعض وسطی خطے میں رہتے ہیں بعض ہوا کے گرد جیسے ہم سمندر کے قریب رہتے ہیں اور بعض براعظم کے قریب جزیروں میں جن کے چاروں طرف ہوا ہے۔ غرض وہ ہوا کو اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے ہم پانی اور سمندر کو اور ایثر ان کے لیے ہوا کا کام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے موسموں کا مزاج اس قدر معتدل ہے کہ ان کے یہاں کوئی بیماری نہیں ہوتی اور ان کی عمریں ہماری عمروں سے بہت زیادہ ہوتی ہیں اور ان کے دیکھنے، سننے اور سونگھنے کی حس اور دوسرے حواس اسی نسبت سے ہمارے حواس سے زیادہ مکمل ہوتے ہیں جس نسبت سے کہ ہوا پانی سے اور ایثر ہوا سے زیادہ لطیف ہے۔ پھر ان کے ہاں مندر اور تیرتھ بھی ہیں جن میں سچ مچ دیوتا رہتے ہیں اور وہ ان کی آوازیں سنتے ہیں، اُن سے اپنے سوالوں کا جواب پاتے ہیں، ان کی موجودگی کو محسوس کرتے ہیں اور ان کی زیارت کرتے ہیں۔ وہ سورج، چاند اور ستاروں کو ان کی اصلی حالت میں دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور برکت و سعادت جو انھیں حاصل ہے وہ بھی اسی شان کی ہے۔

یہ حالت ہے زمین اور اس کے ماحول کی، اس کے علاوہ روئے زمین پر جا بجا گڑھوں کے اندر بہت سے خطے ہیں جن میں سے بعض ہمارے خطے سے زیادہ گہرے اور چوڑے ہیں بعض زیادہ گہرے مگر تنگ ہیں اور

بعض زیادہ چوڑے اور تھلے ہیں۔ ان سب میں بہت سے سوراخ ہیں اور زمین کے اندرونی حصے میں بہت سے چوڑے اور پتلے راستے ہیں جو ان کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں ان میں اس طرح جیسے ندی وادیوں میں سے گزرتی ہو پانی کا ایک زبردست سیلاب اور سدا بہنے والے دریاؤں کے زمین دوز نالے اور ٹھنڈے اور گرم چشمے اور آگ کا سیلاب اور آگ کے دریا اور کیچڑ کی پتلی اور گاڑھی ندیاں، جیسے سسلی کے کیچڑ کے دریا اور لاوے کی ندیاں جو ان کے پیچھے پیچھے بہتی ہیں، آتی جاتی رہتی ہیں اور جن خطوں سے گزرتی ہیں انھیں بھر دیتی ہیں۔ زمین کے اندرونی حصے میں ایک جھولے کی سی حرکت ہوتی ہو جو ان سب چیزوں کو اٹھاتی اور گراتی رہتی ہو اور اس کا سبب یہ ہو:۔ ایک بڑا زبردست غار، جو اور سب غاروں سے زیادہ وسیع ہو ساری زمین کے اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا ہو۔ یہ وہی غار ہو جس کے متعلق ہومر کہتا ہو:

"بہت دور جہاں سطح زمین کے نیچے اندرونی قعر واقع ہو"

اور جسے اس نے دوسرے مقامات پر اور اس کے علاوہ بہت سے شاعروں نے ٹارٹرس کے نام سے موسوم کیا ہو۔ وہ جھولے کی سی حرکت اس وجہ سے ہوتی ہو کہ ندیاں اس قعر میں گر کر پھر باہر نکلتی ہیں اور جیسی زمین میں سے نکلتی ہیں ویسی ہی ہو جاتی ہیں اور ان ندیوں کے ہمیشہ گرتے اور اٹھتے رہنے کی وجہ یہ ہو کہ آبی عنصر کی کوئی تہ نہیں ہو بلکہ وہ ہمیشہ جھولتا رہتا ہو اور یہی حالت ہوا کی ہو جو اس کے گرد ہو۔ وہ بھی پانی کے ساتھ ساتھ زمین کے اوپر گرتی اٹھتی ہلتی جلتی رہتی ہو ——— جس طرح سانس لینے میں ہوا ہمیشہ اندر آتی اور باہر جاتی ہو ——— اور جب وہ پانی کے ساتھ ساتھ جھولتی ہو

تو خوفناک آندھیاں اُٹھتی ہیں۔ جب پانی زور شور سے سطح زمین کے نشیبی حصے کی طرف اٹھتا ہی تو زمین سے گزرتا ہوا ان خطوں میں پہنچ جاتا ہی اور انھیں بھر دیتا ہی جیسے پمپ سے کھینچا ہوا جارہا ہو، اور جب وہاں سے لوٹ کر ادھر آتا ہی تو یہاں کے گڑھوں کو بھرتا ہوا زمین دور راستوں سے مختلف مقامات پر گرتا ہی اور سمندر، جھیلیں، دریا، چشمے بناتا ہی اور وہاں سے اٹھ کر پھر زمین کی طرف آتا ہی۔ اس کا ایک حصہ چکر کھا کر بہت سے دور دراز ملکوں میں پہنچتا ہی اور ایک حصہ قریب کے تھوڑے سے خطوں میں رہ جاتا ہی۔ پھر یہ پانی ٹارٹرس میں گرتا ہی کوئی حصہ تو جہاں سے اٹھا تھا اس سے بہت نیچے اور کوئی کچھ کم مگر سب اس جگہ سے نیچے جہاں سے اٹھے تھے اب کچھ تو دوسری طرف پھوٹ نکلتے ہیں کچھ اسی طرف اور کچھ زمین کے گرد ایک بار یا کئی بار سانپ کی کنڈلیوں کی طرح چکر کھا کر بہت نیچے پہنچ جاتے ہیں مگر ہر صورت میں لوٹ کر اس بڑے قعر میں گرتے ہیں۔ دونوں سمت بہنے والے دریا صرف وسط تک پہنچتے ہیں۔ اس سے نیچے نہیں جاسکتے اس لیے کہ ان کے مقابل ایک کھڑی چٹان آجاتی ہی۔

دریا بہت سے اور بڑے بڑے اور مختلف قسم کے ہیں۔ ان میں سے خاص خاص چار ہیں۔ سب سے بڑا اور سب سے اوپر اوشیانس ہی جو ایک دائرے کی شکل میں زمین کے گرد چلا گیا ہی۔ اس کی مخالف سمت میں اشیرون بہتا ہی جو زمین کے نیچے صحراؤں سے گزرتا ہوا اشیروسی جھیل میں گرتا ہی، یہ وہ جھیل ہی جس کے کنارے پر عام لوگوں کی روحیں مرنے کے بعد جاتی ہیں اور ایک مقررہ وقت تک جو بعض کے لیے کم اور بعض کے لیے زیادہ ہی، ٹھہرنے کے بعد واپس کردی جاتی ہیں کہ جانوروں کی شکل میں پھر جنم لیں۔ تیسرا دریا ان دونوں کے بیچ سے گزرتا ہی اور اپنے مخرج کے قریب آگ کے ایک وسیع خطے میں گرتا ہی

اور بحر روم سے بھی بڑی ایک جھیل بناتا ہے جس میں پانی اور کیچڑ جوش کھاتی رہتی ہے پھر ایک میلے اور گدلے دریا کی شکل میں زمین کے گرد گھومتا ہوا منجملہ اور مقامات کے اشیروسی جھیل کے کنارے تک پہنچتا ہے لیکن اس جھیل میں نہیں ملتا بلکہ زمین کے کئی چکر کاٹ کر بہت نیچی سطح پر ٹارٹرس میں گر جاتا ہے۔ اس دریا کا نام پائری فلیجیتھن ہے اور یہ زمین کے مختلف حصّوں میں آگ کے فوارے اُچھالتا ہے چوتھا دریا اس کے مخالف سمت میں بہتا ہے اور سب سے پہلے ایک اُجاڑ اور بنجر خطّے میں گرتا ہے جو گہرے نیلے رنگ کا ہے یہی اسٹائجی دریا کہلاتا ہے اور اسٹائکس جھیل میں گرتا ہے اور اس کے پانی سے عجیب وغریب قوت حاصل کر کے زمین کے نیچے چلا جاتا ہے اور دوسری طرف سے چکر کاٹتا ہوا پائری فلیجیتھن کی مخالف سمت سے اشیروسی جھیل کے قریب جا پہنچتا ہے اس دریا کا پانی بھی کسی اور پانی سے نہیں ملتا بلکہ ایک دائرے کی شکل میں بہتا ہوا ٹارٹرس میں گر جاتا ہے اس دریا کا نام شاعروں نے کوکائیٹس بتایا ہے۔

یہ کیفیت ہے دوسری دنیا کی۔ اور جب مُردے وہاں پہنچتے ہیں جہاں ہر ایک کا ہمزاد اسے لے جاتا ہے تو انھیں اس لحاظ سے جزا و سزا ملتی ہے کہ انھوں نے دین داری اور نیکی کے ساتھ زندگی بسر کی ہے یا نہیں۔ وہ لوگ جن کی زندگی نہ نیک رہی ہے نہ بد دریائے اشیرون کی طرف جاتے ہیں اور کشتیوں میں بیٹھ کر جھیل میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں یہ گروہ گناہوں کی آلودگی سے پاک کیے جاتے ہیں۔ جو برائیاں انھوں نے دوسروں کے ساتھ کی ہیں ان کی سزا پا کر ان کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے استحقاق کے مطابق نیکیوں کی جزا ملتی ہے۔ مگر جو لوگ اپنے

جرائم کی سنگینی کی وجہ سے ناقابل اصلاح معلوم ہوتے ہیں ـــــ جنھوں نے دیوتاؤں کی ـــــ حرمت، ظالمانہ قتل اور اسی قسم کے شدید جرائم کثرت سے کیے ہیں ـــــ وہ ٹارٹرس میں پھینک دیے جاتے ہیں جو ان کے لیے مناسب جگہ ہی اور پھر کبھی نہیں نکلتے۔ وہ لوگ جن کے جرائم ہیں مگر ناقابل تلافی نہیں ـــــ جنھوں نے مثلاً فوری غصّے میں اپنی ماں یا باپ کے ساتھ کسی قسم کا تشدد کیا اور عمر بھر اس پر پچھتاتے رہے یا قابل معافی حالات میں کسی شخص کو مار ڈالا ـــــ ٹارٹرس میں ڈال دیے جاتے ہیں اور ایک سال تک انھیں تکلیف اٹھانی پڑتی ہی۔ اس کے بعد لہریں انھیں باہر پھینک دیتی ہیں ـــــ ـــــ محض قتل انسان کے مجرموں کو کوکائیٹس کی راہ سے اور ماں یا باپ کے قاتلوں کو پائری فلیجیتھن کی راہ سے۔ اور وہ اشیروسی جھیل کے قریب پہنچتے ہیں اور وہاں ان لوگوں کو جن کو انھوں نے قتل کیا یا ستایا تھا پکار کر کہتے ہیں کہ ہم پر رحم اور مہربانی کرو اور ہمیں جھیل کے اندر آجانے دو۔ اگر ان کی فریاد کارگر ہوئی تو وہ باہر نکل آتے ہیں اور ان کی تکلیف کا خاتمہ ہو جاتا ہی ورنہ پھر ٹارٹرس میں پہنچا دیے جاتے ہیں اور نکل کر دریاؤں کے ساتھ گردش میں رہتے ہیں یہاں تک کہ ان لوگوں کو وہ لوگ جو اپنی زندگی میں پرہیزگاری میں ممتاز رہے ہیں اس ارضی قید خانے سے چھڑا کر اوپر اپنے پاک مکان میں چلے جاتے ہیں اور پاک تر زمین پر رہتے ہیں۔ ان میں سے وہ لوگ جن کی روحوں کو فلسفے نے آلودگیوں سے پاک کر دیا ہی آیندہ بغیر جسم کے ان محلوں میں رہتے ہیں جن کی تعریف کی نہ مجھ میں طاقت ہی اور نہ مجھے فرصت ہی۔

"لہٰذا اسیمیاس، ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں اس زندگی میں نیکی اور حکمت حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہ کرنا چاہیے؟ کتنا خوش نما انعام ہی

اور کتنی بڑی امید!

کوئی سمجھدار آدمی یہ نہیں کہہ سکتا، چنانچہ مجھے بھی اس پر بھروسا نہیں کہ میں نے روح اور اس کے مقامات کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔ لیکن یہ میں ضرور کہوں گا کہ چونکہ رُوح کا لافانی ہونا ثابت ہو چکا ہے اس لیے انسان جرأت سے کام لے کر یہ خیال کر سکتا ہے کہ حقیقت کچھ اسی قسم کی ہے۔ یہ جرأت بڑی شاندار ہے اور انسان کا یہ فرض ہے کہ اس قسم کی باتوں سے اپنے دل کو تسکین دے۔ اس لیے میں نے بات کو اتنا طول دیا۔ چنانچہ میں کہتا ہوں کہ اس شخص کو اپنی روح کی طرف سے مطمئن رہنا چاہیے جس نے جسمانی لذتوں اور آلایشوں کو اپنی طبیعت کے خلاف، اور بجائے فائدے کے نقصان کا باعث سمجھ کر ترک کر دیا ہو، جو علم کی لذتوں کا طلبگار رہا ہو جس نے اپنی روح کو کسی خارجی سامان سے نہیں بلکہ اس کے اپنے زیورات، یعنی عفت اور عدل اور شجاعت اور شرافت اور حکمت سے سنوارا ہو۔ ان چیزوں سے آراستہ ہو کر وہ اپنے مقررہ وقت پر عالم زیریں میں چلے جانے کے لیے تیار رہتی ہے۔ تم کو سیمیاس اور سیبیس، اور سب انسانوں کو کبھی نہ کبھی اس سفر پر جانا ہے۔ مجھے بقول ایک المیہ نگار شاعر کے تقدیر کی آواز پکار رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں مجھے زہر پینا ہے اس لیے میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ میں پہلے غسل کر لوں تاکہ مرنے کے بعد عورتوں کو میری لاش کو نہلانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو کریٹو نے کہا "ہمارے لیے کیا حکم ہے سقراط ——— اپنے بچوں کے متعلق کوئی بات کہنی ہو یا ہمارے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بتا دو۔"

اس نے جواب دیا کوئی خاص بات نہیں کریٹو۔ صرف اتنا کہنا ہے کہ اپنا خیال

رکھنا یہی خدمت ہی جو تمھیں میری اور میرے عزیزوں کی اور ہم سب کی کرنی چاہیے خواہ تم اس کا وعدہ کرو یا نہ کرو۔ لیکن اگر تم نے اپنی فکر نہ کی اور اس راہ پر نہ چلے جو میں نے تمھیں کوئی پہلی بار نہیں بتائی ہی تو خواہ تم اس وقت کتنے ہی وعدے کر لو ان سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"ہم اپنی سی کوشش کریں گے۔ اور یہ تو بتاؤ تمھیں دفن کیوں کر کریں"۔

"جیسے تمھارا جی چاہے۔ لیکن پہلے تم مجھے پکڑ تو پاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ میں تمھارے ہاتھ سے نکل جاؤں"۔ پھر وہ ہماری طرف مڑا اور کہنے لگا "میں کسی طرح کریٹو کو یہ یقین نہیں دلا سکتا کہ میں وہی سقراط ہوں جو ابھی بحث کر رہا تھا۔ وہ سمجھتا ہی کہ میں دوسرا سقراط ہوں جو ابھی تھوڑی دیر میں نظر آئے گا۔ یعنی محض ایک لاش۔ ——— اور وہ پوچھتا ہی کہ مجھے دفن کیوں کر کرے۔ میں نے اتنی طول طویل گفتگو یہی ثابت کرنے کے لیے کی تھی کہ جب میں زہر پی لوں گا تو تم سے رخصت ہو کر اہلِ رحمت کی راحتوں کا لطف اٹھاتے چلا جاؤں گا ——— لیکن ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ان باتوں کا جو میں نے اپنی اور تمھاری تسکین کے لیے کی تھیں، کریٹو پر کوئی اثر نہیں ہوا اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس کے سامنے میرے ضامن ہو جاؤ جیسے وہ ججوں کے سامنے میرا ضامن تھا۔ لیکن یہ ضمانت بالکل مختلف چیز ہو گی۔ اس نے تو ججوں کے سامنے اس کی ضمانت دی تھی کہ میں موجود رہوں گا اور تمھیں اس کے سامنے یہ ضمانت دینی ہی کہ میں موجود نہیں رہوں گا بلکہ رخصت ہو جاؤں گا۔ پھر اسے میری موت سے اتنی تکلیف نہیں ہو گی اور جب وہ میرے جسم کو جلتے ہوئے یا دفن ہوتے ہوئے دیکھے گا تو رنج نہیں کرے گا میں نہیں چاہتا کہ وہ میری مصیبت پر افسوس کرے اور دفن کے وقت یہ کہے کہ ہم سقراط کو اس طرح رکھتے ہیں یا اس طرح قبر میں لے جاتے ہیں یا دفن کرتے ہیں۔ اس لیے

کہ جھوٹے الفاظ نہ صرف خود بُرے ہوتے ہیں بلکہ روح کو بھی بدی سے آلودہ کر دیتے ہیں پس تم رنجیدہ نہ ہونا۔ تم کریٹو یہ سمجھنا کہ تم صرف میرے جسم کو دفن کر رہے ہو۔ اور جو کچھ ایسے موقعوں پر ہوتا ہو، اور جو تم مناسب سمجھو وہ کرنا۔"

یہ کہنے کے بعد وہ اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ کریٹو اس کے ساتھ گیا اور ہم سے ٹھہرنے کو کہہ گیا۔ اس لیے ہم وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور اس تقریر کے موضوع پر اور اپنے صدمے کی شدت پر غور کرتے رہے۔ یہ شخص جو ہم سے جدا ہو رہا تھا ہمارے باپ کی طرح تھا اور ہمیں اپنی بقیہ عمر یتیموں کی طرح بسر کرنی تھی۔ جب وہ غسل کر چکا تو لوگ اس کے بچوں کو اس کے پاس لائے (اس کے دو چھوٹے بچے تھے اور ایک بڑا تھا) اس کے گھر کی عورتیں بھی آئیں۔ اس نے کچھ دیر ان سے باتیں کیں اور کریٹو کی موجودگی میں انھیں چند ہدایتیں دیں۔ اس کے بعد انھیں رخصت کرکے ہمارے پاس آگیا۔

اب غروب آفتاب کا وقت قریب آگیا تھا۔ اس لیے اسے اندر خاصی دیر لگ گئی تھی، باہر آکر وہ پھر ہمارے پاس بیٹھ گیا لیکن کچھ زیادہ بات چیت نہیں ہوئی، تھوڑی دیر میں جیلر، جو حضرات یازدہ کا نوکر تھا، آکر اس کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا" میں جانتا ہوں سقراط، کہ تم ان سب لوگوں میں جو آج تک یہاں آئے ہیں، سب سے زیادہ شریف اور حلیم اور نیک ہو۔ تم سے مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ تم غصّے کے جذبات کا اظہار کرو گے، دوسروں کی طرح جو مجھ پر جھنجھلاتے ہیں اور مجھے بُرا بھلا کہتے ہیں، جب حاکموں کے حکم کے مطابق میں ان سے زہر پینے کو کہتا ہوں ـــــ مجھے واقعی یہ یقین ہے کہ مجھ سے خفا نہیں ہو گے۔ اس لیے کہ تم جانتے ہو قصور دوسروں کا ہے میرا نہیں ہے۔ اچھا اب خدا حافظ جو بات بہر حال ہونی ہے اسے ہنسی خوشی برداشت کرو ـــــ

تم جانتے ہو میں کس کام سے آیا ہوں"۔ اس کے بعد وہ بے اختیار رو پڑا اور منہ پھیر کر باہر چلا گیا۔

سقراط نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "میں تمھاری ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور جو کہتے ہو وہی کروں گا"۔ اس کے بعد ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "کیسا اچھا آدمی ہے جب سے کہ میں قید میں ہوں برابر میرے پاس آتا تھا اور کبھی کبھی میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا تھا اور نہایت اخلاق سے پیش آتا تھا اور اب دیکھو کس قدر کشادہ دلی سے میری وجہ سے رنج کر رہا ہے ہمیں وہی کرنا چاہیے جو اس نے کہا ہے، کریٹو، اس لیے کہ دو کہ اگر زہر تیار ہو تو پیالہ لے آئیں ورنہ نوکر سے کہو کہ تیار کر دے"۔

کریٹو نے کہا "ابھی تو سورج پہاڑی کی چوٹی پر موجود ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت لوگ زہر کے پینے میں دیر کرتے ہیں اور اطلاع ملنے کے بعد کھاتے پیتے ہیں اور اپنے محبوب کی صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں، تم بھی جلدی نہ کرو۔ —— ابھی کافی وقت ہے"۔

سقراط نے کہا "ہاں کریٹو جن لوگوں کا تم ذکر کر رہے ہو وہ ایسا کرتے ہیں تو ٹھیک ہے اس لیے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ دیر کرنے میں ان کا فائدہ ہے مگر میرے لیے ان کی تقلید کرنا مناسب نہیں کیونکہ میں یہ نہیں سمجھتا ہوں کہ زہر پینے میں تھوڑی سی دیر کر دینے سے مجھے کچھ فائدہ ہوگا سبھی خود اپنے اوپر ہنسی آئے گی کہ جو جان پہلے ہی جا چکی ہے اسے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مہربانی کر کے جو میں کہتا ہوں وہ کرو اور میری درخواست رد نہ کرو"۔

کریٹو نے نوکر کو جو قریب کھڑا تھا اشارہ کیا وہ باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد جیلر کے ساتھ زہر کا پیالہ لیے ہوئے واپس آیا۔ سقراط نے کہا "میرے اچھے دوست تم ان معاملات میں تجربہ کار ہو مجھے بتاؤ کہ میں

کیا کروں؟" اس نے جواب دیا" تم صرف یہ کرو کہ اس وقت تک ٹہلتے رہو جب تک تمھاری ٹانگیں بھاری نہ ہو جائیں، اور پھر لیٹ جاؤ اور زہر کو اثر کرنے دو، یہ کہ کر اس نے پیالہ سقراط کو دے دیا جس نے نہایت سہولت اور نرمی سے بغیر اس کے کہ زرا سا بھی خوف ظاہر ہو یا چہرے کے رنگ میں فرق آئے یا تیور بدلیں، اس شخص کو نظر بھر کر دیکھا جیسا کہ ایشی کراٹیس، اس کا قائد تھا اور پیالہ ہاتھ میں لے کر کہا" تم اس بارے میں کیا کہتے ہو کہ میں اس پیالے میں سے زرا سا زہر دیوتا کے نام پر چھڑک دوں؟ اجازت ہے؟ اس نے جواب دیا" سقراط ہم صرف اتنا ہی زہر تیار کرتے ہیں جتنا ضروری ہے" سقراط نے کہا" میں سمجھ گیا۔ مگر اس کی تو اجازت ہوگی، اور یہ تو میں ضرور کروں گا۔ کہ دیوتاؤں سے خیریت کے ساتھ، اس دنیا سے دوسری دنیا میں لے جانے کی دعا کروں —— ٹھیک ہے —— خدا کرے میری یہ دعا قبول ہو جائے"۔ یہ کہ کر اس نے پیالہ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور ہنسی خوشی بات کی بات میں سارا زہر پی گیا۔ اب تک ہم میں سے اکثر لوگوں نے اپنی طبیعت کو قابو میں رکھا تھا۔ مگر جب دیکھا کہ اس نے زہر پی لیا اور سارا پیالہ ختم کر دیا تو ہم سے ضبط نہ ہو سکا اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ میں منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ اس کے حال پر نہیں بلکہ اپنی مصیبت پر کہ ایسے دوست سے جدائی ہو رہی ہے اور میں ہی پہلا شخص نہ تھا اس لیے کہ جب کریٹو سے آنسو نہ روکے جا سکے تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میں بھی اس کے ساتھ ساتھ پیچھے پیچھے چلا۔ اس وقت اپولوڈورس نے جو اس تمام عرصے میں روتا رہا تھا ایک زور کی چیخ ماری جس سے ہم سب کی ہمت جاتی رہی۔ صرف سقراط نے اپنی ہمت کو قائم رکھا اور کہا" یہ عجیب و غریب آواز کیا ہے؟ میں نے عورتوں کو زیادہ تر اسی وجہ سے رخصت کر دیا تھا کہ وہ ایسی حرکت نہ کر سکیں۔ اس لیے کہ مجھ سے کہا گیا ہے کہ انسان کو سکون سے مرنا چاہیے۔ اس لیے

خاموش رہو اور صبر کرو۔" جب ہم نے اس کے یہ الفاظ سنے تو ہمیں شرم آئی اور ہم اپنے آنسو پی گئے۔ وہ کچھ دیر تک ٹہلتا رہا اور پھر کہنے لگا کہ اب ٹانگیں کام نہیں دیتیں۔ اس کے بعد ہدایت کے مطابق چت لیٹ گیا اور وہ شخص جس نے اُسے زہر کا پیالہ دیا تھا تھوڑی دیر بعد اس کے پانوؤں اور ٹانگوں کو دیکھ لیتا تھا۔ کچھ وقفے کے بعد اس نے سقراط کے پانو کو زور سے دبایا اور پوچھا "تمھیں کچھ محسوس ہوتا ہے؟" اس نے جواب دیا "کچھ نہیں" پھر اس نے ٹانگ کو دبایا۔ اور اسی طرح اوپر بڑھتا رہا اور ہمیں دکھاتا رہا کہ سارا جسم اکڑتا جارہا ہے پھر سقراط نے خود چھو کر دیکھا اور کہا "جب زہر قلب تک پہنچ جائے گا تو خاتمہ ہوجائے گا۔" جب وہ جانگھ تک بے جان ہوچکا تو اس نے اپنا منہ کھول دیا جواب تک ڈھکا ہوا تھا اور کہا ——— یہ اس کے آخری الفاظ تھے "کریٹو، میں نے اسکلیپس کے نام پر ایک مرغ دینے کی منت مانی ہے۔ تم یاد کر کے اسے پورا کردو گے۔ کریٹو نے کہا "منت پوری ہوجائے گی، اور تو کچھ نہیں کہنا ہے؟" اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا مگر ایک دو منٹ کے بعد کچھ حرکت سی ہوئی اور نوکروں نے اس کا منہ کھول دیا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں تھیں۔ کریٹو نے اس کی آنکھیں اور منہ بند کردیا۔

یہ تھا، ایشی کراٹیس ہمارے دوست کا خاتمہ جس کے متعلق میں بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے زمانے کے سب آدمیوں میں دانش مند ترین اور نیک ترین اور بہترین تھا۔

پروٹاگورس

اشخاص مکالمہ

سقراط جو اس مکالمے کو اپنے ساتھی کے سامنے دہرا رہا ہی۔
بقراط

پروٹاگورس
ہپ پیاس } سوفسطائی
پروڈیکس
کیلیاس ایتھنس کا ایک دولت مند شخص

مقام - کیلیاس کا مکان

ساتھی :- کہاں سے آرہے ہو سقراط؟ مگر پوچھنے کی کیا ضرورت ہی میں خوب جانتا ہوں کہ تم حسین الکبیاڈیس کے پیچھے پھر رہے تھے۔ میں نے پرسوں اس کو دیکھا اس کی تو پورے جوانوں کی سی داڑھی تھی ـــــ اور ہی بھی وہ اب پورا جوان، یہ میں چپکے سے تمھارے کان میں کہتا ہوں۔ مگر اب بھی میرے خیال میں اس میں بڑی دلکشی ہی۔

سقراط :- داڑھی سے کیا ہوتا ہی؟ کیا تم ہومر کے ہم خیال نہیں ہو جس کا قول ہی:

"جوانی کی بہار تب ہی جب ڈاڑھی نکل رہی ہو"

اور یہ بہار آج کل الکبیاڈیس پر آئی ہوئی ہے۔

ساتھی:۔ اچھا اور معاملہ کیسا چل رہا ہے؟ کیا تم اس سے ملے تھے اور وہ تم سے لطف و عنایت سے پیش آیا تھا۔

سقراط:۔ ہاں میرے خیال میں تو بہت مہربانی سے پیش آیا۔ خصوصاً آج۔ میں ابھی اسی کے ہاں تھا اور اس نے ایک بحث میں میرا ساتھ دیا۔ مگر تمھیں ایک عجیب بات سناؤں؟ میں نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی اور کئی بار تو میں یہ تک بھول گیا کہ وہ اس صحبت میں موجود ہے۔

ساتھی:۔ اس کے کیا معنی؟ کیا تم میں اور اس میں کچھ اَن بن ہو گئی ہے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمھیں اس سے زیادہ حسین معشوق مل گیا ہو اس ایتھنس شہر میں تو یہ ممکن نہیں۔

سقراط:۔ بے شک اس سے کہیں زیادہ حسین۔

ساتھی:۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو — شہر کا یا باہر کا؟

سقراط:۔ باہر کا۔

ساتھی:۔ کس دیس کا؟

سقراط: ایڈیرا کا۔

ساتھی:۔ اور یہ پردیسی تمھارے خیال میں کلینیاس کے بیٹے سے زیادہ حسین معشوق ہے؟

سقراط:۔ یہ بتاؤ پیارے دوست کہ جو زیادہ دانش مند ہو وہی ہمیشہ زیادہ حسین ہوا کرتا ہے یا نہیں؟

ساتھی:۔ تو کیا واقعی تمھیں کوئی دانش مند شخص مل گیا، سقراط؟

سقراط :- یوں کہو، کہ اس زمانے کے لوگوں میں سب سے زیادہ دانشمند اگر تم پروٹاگورس کو یہ لقب دینا پسند کرو۔

ساتھی :- ہائیں! کیا پروٹاگورس ایتھنس میں ہی؟

سقراط :- ہاں دو روز سے یہیں ہی۔

ساتھی : اور تم ابھی اس سے مل کر آئے ہو؟

سقراط :- ہاں، اور بہت کچھ کہہ سُن کر۔

ساتھی :- تو اگر تمھیں کوئی کام نہ ہو تو زرا بیٹھ جاؤ اور مجھے ساری روداد سنا دو میرا ملازم اپنی جگہ تمھارے لیے خالی کر دے گا۔

سقراط :- ضرور۔ اور میں اس روداد کے سننے کا شکریہ ادا کروں گا۔

ساتھی :- میں بھی سنانے کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سقراط :- تو میں دوہرا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اچھا سنو :-

کل رات بلکہ یوں کہنا چاہیے آج بہت سویرے اپولوڈورس کا بیٹا اور فیسن کا بھائی بقراط میرے گھر پہنچا اور اس نے اپنی لاٹھی سے میرا دروازہ بہت زور سے کھٹکھٹایا۔ کسی نے دروازہ کھول دیا۔ وہ جھپٹ کر اندر آیا اور اس نے چلا کر کہا "سقراط سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو؟"

میں نے اس کی آواز پہچان لی اور کہا "تم ہو بقراط ——— کیا کوئی خبر لائے ہو؟

وہ بولا " ہاں اچھی خبر ہی۔ بہت اچھی"۔

میں نے کہا " بہت خوب۔ مگر وہ خبر کیا ہی اور تم ایسے بے وقت کیوں آئے ہو؟"

اس نے میرے قریب آکر کہا " پروٹاگورس آگیا ہی"۔

میں نے جواب دیا " وہ تو دو دن سے آیا ہوا ہے کیا تم نے ابھی سنا؟"
اس نے کہا " ہاں دیوتاؤں کی قسم مجھے تو کل شام ہی خبر ہوئی" اس کے ساتھ ہی اس نے مسہری کو ٹٹولا اور میری پائینتی بیٹھ کر کہنے لگا " کل رات گئے جب میں اونوے سے واپس آیا تھا ———— میں وہاں اپنے بھاگے ہوئے غلام سٹائرس کی تلاش میں گیا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ تم سے کہدوں۔ مگر کچھ اور بات بیچ میں آگئی ———— اور ہم سب رات کا کھانا کھا کر سونے والے تھے کہ میرے بھائی نے مجھ سے کہا کہ پروٹاگورس آگیا ہے۔ میں نے چاہا کہ فوراً تمھارے پاس آؤں پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ رات بہت جا چکی ہے مگر جوں ہی میری تکان دور ہوئی اور آنکھ کھلی میں اٹھ کر سیدھا ادھر چلا آیا۔"
میں اس شخص کی ہمت اور اس کے خبط سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے پوچھا " خیر تو ہے کیا پروٹاگورس نے تمھاری کوئی چیز چھین لی ہے؟"
اس نے ہنس کر جواب دیا " ہاں سقراط حکمت جو اس نے مجھ سے چھپا کر رکھی ہے۔"
میں نے کہا " لیکن اگر تم اسے روپیہ دو اور اس سے دوستی کر لو تو یقیناً وہ تمھیں اپنا جیسا دانش مند بنادے گا۔"
اس نے جواب دیا " کاش ایسا ہوتا! وہ چاہے تو جو کچھ میرے اور میرے دوستوں کے پاس ہے سب اس کی نذر ہے۔ میں اس وقت تمھارے پاس اسی لیے آیا ہوں کہ تم اس سے میری سفارش کر دو اس لیے کہ میں کم سن ہوں اور میں نے نہ کبھی اسے دیکھا ہے اور نہ اس کی تقریر سنی ہے (جب وہ اس سے پہلے ایتھنس آیا تھا تو میں بالکل بچہ تھا) سب لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں سقراط۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ باکمال مقرر ہے۔ ہم اسی وقت اس کے پاس

کیوں نہ چلے چلیں تاکہ وہ ضرور گھر پر مل جائے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ہپونیکس کے بیٹے کیلیاس کے ہاں ٹھہرا ہے۔ آؤ بس اب ہم روانہ ہو جائیں۔"

میں نے کہا " ابھی نہیں میرے اچھے دوست۔ ابھی تو بہت سویرا ہے لیکن آؤ ہم صحن میں ٹہلیں اور دن نکلنے کا انتظار کریں۔ جیسے ہی اجالا ہوگا ہم روانہ ہو جائیں گے۔ پروٹاگورس عموماً گھر ہی پر رہتا ہے تم گھبراؤ نہیں وہ ضرور مل جائے گا" یہ کہہ کر ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور صحن میں ٹہلنے لگے۔

میں نے سوچا کہ لاؤ اس کی آزمائش کر ڈالوں کہ اس کا ارادہ کتنا مضبوط ہے۔ اس لیے میں نے اس سے جرح کرنی شروع کی۔ میں نے پوچھا " بقراط تم پروٹاگورس کے پاس جا کر اسے رُپیہ دینا چاہتے ہو مجھے یہ بتاؤ کہ یہ شخص جس کے پاس تم جا رہے ہو خود کیا ہے اور تم کو کیا بنا دے گا؟ مثلاً اگر تم کوس کے رہنے والے بقراط اسکلیپی کے پاس جا کر اسے رُپیہ دینا چاہتے اور کوئی تم سے یہ پوچھتا کہ بقراط تم اپنے ہم نام بقراط کو رُپیہ دے رہے ہو بھلا بتاؤ کہ یہ شخص جسے تم رُپیہ دے رہے ہو کیا ہے؟ تو تم کیا جواب دیتے؟"

وہ بولا " میں یہ کہتا کہ میں اسے طبیب کی حیثیت سے رُپیہ دے رہا ہوں۔"

"اور وہ تمھیں کیا بنا دے گا؟"

"طبیب"۔

"اور اگر تم پولی کلائٹس آرگوی یا فیدیاس اتھینی کے پاس جا کر انھیں رُپیہ دینا چاہتے اور کوئی شخص تم سے پوچھتا کہ پولی کلائٹس اور فیدیاس کون ہیں؟ اور تم انھیں کیوں رُپیہ دے رہے ہو؟ تو تم کیا جواب دیتے؟"

"میں یہ جواب دیتا کہ وہ بت تراش ہیں۔"

"اور وہ تمھیں کیا بنادیں گے ؟"

"ظاہر ہی بت تراش"۔

"اچھا تو اب تم اور میں دونوں پروٹاگورس کے پاس جارہے ہیں اور اسے تمھاری طرف سے رُپیہ دینے کو تیار ہیں جو کچھ خود ہمارے پاس ہی اگر اس سے کام چل جائے اور وہ قابو میں آجائے تو کیا کہنا لیکن اگر یہ کافی نہ ہو تو ہم یہ کریں گے کہ تمھارے دوستوں کا رُپیہ بھی صرف کردیں گے۔ اب فرض کرو کہ کوئی شخص ہمیں اس جوش و خروش سے اپنے مقصد کے لیے کوشش کرتے دیکھ کر ہم سے پوچھے:

"بتاؤ سقراط اور بقراط یہ پروٹاگورس کیا ہی اور تم اسے کیوں روپیہ دے رہے ہو؟" ہم اسے کیا جواب دیں گے؟" "مجھے معلوم ہی کہ فیدیاس بت تراش ہی اور ہومر شاعر ہی مگر یہ پروٹاگورس کس لقب سے پکارا جاتا ہی؟"

"وہ سوفسطائی کہلاتا ہی سقراط"۔

"تو ہم اسے سوفسطائی کی حیثیت سے رُپیہ دے رہے ہیں؟"

"بے شک"۔

"لیکن فرض کرو کہ کوئی شخص اتنا اور پوچھے، اور اپنی تو کہو پروٹاگورس سے ملو گے تو تمھیں وہ کیا بنادے گا؟" اس کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی (اب دن نکل آیا تھا اس لیے میں اس کی صورت دیکھ سکتا تھا)

اور اس نے جواب دیا" اگر وہ ان لوگوں سے مختلف نہیں جن کی مثالیں پہلے دی جاچکی ہیں تو غالباً وہ مجھے سوفسطائی بنادے گا"۔

دیوتاؤں کی قسم تمھیں شرم نہیں آتی کہ تم یونانیوں کے سامنے سوفسطائی بن کر جاؤ گے ؟"

"سچ پوچھو تو شرم آتی ہی"۔

"مگر بقراط، تم خوامخواہ یہ کیوں فرض کیے لیتے ہو کہ پروٹاگورس کی تعلیم اسی قسم کی ہے کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تم جو کچھ اس سے سیکھو اسی طرح سیکھو جیسے تم نے صرف و نحو یا موسیقی یا ورزش سیکھی تھی۔ یعنی پیشے کے طور پر نہیں بلکہ صرف ایک جزو تعلیم کے طور پر اور اس وجہ سے کہ شریف اور آزاد آدمی کے لیے ان چیزوں کا سیکھنا ضروری ہے۔"

اس نے کہا "بالکل ٹھیک ہے میرے خیال میں یہ پروٹاگورس کی تعلیم کی کہیں زیادہ صحیح تعریف ہے۔"

"تمہیں خبر بھی ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"کیا کر رہا ہوں؟"

"تم اپنی روح ایک ایسے شخص کے سپرد کر رہے ہو جسے تم سوفسطائی کہتے ہو۔ حالانکہ میرے خیال میں تمہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ سوفسطائی کیا ہوتا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو گویا تم یہ نہیں جانتے کہ تم اپنی روح کس کے سپرد کر رہے ہو؟ اور جو چیز تم اختیار کرو گے وہ اچھی ہے یا بری؟"

"مجھے یقین ہے کہ میں جانتا ہوں۔"

"تو مجھے بتاؤ کہ تمہارے خیال میں وہ کیا ہے؟"

"میں اسے ایسا شخص سمجھتا ہوں جو حکمت کی باتیں جانتا ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔"

"کیا یہی چیز تم مصور اور بڑھئی کے متعلق نہیں کہہ سکتے؟ کیا وہ بھی حکمت کی باتیں نہیں جانتے لیکن فرض کرو کوئی ہم سے پوچھے کہ مصور کی کیا حکمت ہے؟ تو ہم جواب دیں گے تصویر کھینچنا اور اگر وہ یہ اور پوچھے کہ سوفسطائی کی حکمت کیا ہے وہ کس صنعت کا ماہر ہے؟ تو ہم کیا جواب دیں گے؟"

"کیا جواب دیں گے سقراط؟ اس کے سوا اور کیا جواب ہو سکتا ہے کہ وہ

اس فن میں ماہر ہی جو لوگوں کو خطابت سکھاتا ہی"۔

"میں نے کہا بہت ممکن ہی کہ یہ صحیح ہو مگر یہ کافی نہیں ہی۔ اس لیے کہ اس جواب سے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہی۔ سوفسطائی لوگوں کو خطابت کا کمال کس چیز میں صرف کرنا سکھاتا ہی؟ ایک بربط بجانے والے کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان کو اس چیز پر فصاحت و بلاغت سے گفتگو کرنا سکھاتا ہی جس کی وہ اسے تعلیم دیتا ہی یعنی بربط بجانے والے کے متعلق۔ ہی کہ نہیں؟"

"ٹھیک ہی"۔

"تو پھر سوفسطائی اسے کس چیز پر تقریر کرنا سکھاتا ہی؟ ظاہر ہی اسی چیز پر تقریر کرنا سکھاتا ہوگا جس کی وہ اسے تعلیم دیتا ہی"۔

"ہاں غالباً ایسا ہی ہوگا"۔

"اور وہ چیز کیا ہی جس کا سوفسطائی علم رکھتا اور جس کی وہ اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتا ہی؟"

"یہ تو میں کہہ نہیں سکتا"۔

اس کے بعد میں نے اس سے پوچھا "بھلا تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم اپنے آپ کو کس خطرے میں ڈال رہے ہو؟ اگر تم اپنا جسم کسی شخص کے سپرد کر رہے ہوتے جو اسے فائدہ بھی پہنچا سکتا اور نقصان بھی تو کیا تم اس پر اچھی طرح غور نہ کرتے اور اپنے دوستوں سے اور عزیزوں سے رائے نہ لیتے کہ آیا تمھیں اپنے جسم کی نگرانی اس کے سپرد کرنی چاہیے یا نہیں؟ لیکن جہاں روح کا معاملہ ہی جسے تم جسم سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہو اور جس کی اچھائی یا برائی پر تمھاری ساری فلاح و بہبود کا انحصار ہی وہاں تم نے نہ تو اپنے باپ سے صلاح لی اور نہ اپنے بھائی سے اور نہ ہم میں سے جو تمھارے ساتھی ہیں کسی شخص سے۔ بلکہ جیسے ہی یہ پردیسی آتا ہی

تم فوراً اپنی روح اس کی تحویل میں دینے پر تیار ہو جاتے ہو۔ شام کو جیسا تم خود کہتے ہو تم نے اس کے آنے کی خبر سنی اور صبح کو اس کے پاس چل دیے۔ یہ نہ سوچا نہ سمجھا، نہ کسی سے صلاح لی کہ تمھیں اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنا چاہیے یا نہیں ——— تم نے بالکل مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے تم پروٹاگورس کے شاگرد ضرور بنو گے۔ اور اس پر تیار ہو کہ اپنا اور اپنے دوستوں کا سارا مال اس ارادے کے پورا کرنے میں صرف کر دو حالانکہ تمھیں اعتراف ہے کہ تم اسے بالکل نہیں جانتے ہو اور کبھی اس سے گفتگو نہیں کی ہے پھر تم اسے سوفسطائی کہتے ہو اور صریحاً تمھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ سوفسطائی ہوتا کیا ہے پھر بھی اپنے آپ کو اس کے سپرد کر رہے ہو۔"

میرے منہ سے یہ بات سن کر اس نے جواب دیا "تمھارے الفاظ کے مطابق تو یہی نتیجہ نکلتا ہے سقراط"۔

میں نے پوچھا "کیا یہ صحیح نہیں ہے بقراط، کہ سوفسطائی وہ شخص ہے جو غذائے روح کی تھوک فروشی یا خردہ فروشی کرتا ہے؟ مجھے تو اس کی حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے"۔

"اور یہ غذائے روح کیا چیز ہے سقراط؟"

"غذائے روح یقیناً علم ہے۔ اور ہمیں احتیاط کرنی چاہیے میرے دوست، کہ کہیں سوفسطائی اپنے مال کی تعریف کر کے ہمیں دھوکا نہ دے۔ جیسا کہ ان تھوک فروشوں اور خردہ فروشوں کا قاعدہ ہے جو غذائے جسم بیچتے ہیں اس لیے کہ وہ بلا امتیاز چیزوں کی تعریف کرتے ہیں۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ اس میں سے کون درحقیقت مفید ہے اور کون مضر۔ اور نہ ان کے گاہکوں کو اس کی خبر ہوتی ہے بجز کسی ورزش سکھانے والے یا طبیب کے جو ان کا مال خریدے۔ اسی طرح وہ

لوگ بھی جو علم کی فیس لے کر شہروں شہروں پھرتے ہیں اور تھوک فروشی یا خردہ فروشی کے طور پر اسے ہر گاہک کے ہاتھ بیچنے پر تیار ہیں اپنی ہر چیز کی یکساں تعریف کرتے ہیں۔ حالانکہ کچھ عجب نہیں میرے دوست کہ ان میں سے اکثر یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ یہ چیزیں روح پر کیا اثر ڈالتی ہیں، اور ان کے گاہک بھی اسی قدر ناواقف ہوتے ہیں بجز اس کے کہ جو شخص ان سے مال خریدے وہ روح کا طبیب ہو۔ لہٰذا اگر تم بھلے اور برے کا فرق سمجھتے ہو تو تم بے کھٹکے پروٹاگورس سے یا کسی شخص سے مال خرید سکتے ہو۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اے میرے دوست رک جاؤ اور اپنے عزیز ترین مقاصد کو داؤ پر نہ لگاؤ، اس لیے کہ علم کے خریدنے میں اس سے کہیں زیادہ خطرہ ہے جتنا گوشت اور شراب کے خریدنے میں۔ کیونکہ ان چیزوں کو تم کسی تھوک فروش یا خردہ فروش سے خرید کر دوسرے برتنوں میں لے جاتے ہو اور قبل اس کے کہ ان کو غذا کے طور پر اپنے جسم میں داخل کرو انھیں اپنے گھر رکھتے ہو اور کسی تجربے کار دوست کو بلا کر دکھا لیتے ہو جو یہ جانتا ہے کہ کیا چیز کھانے پینے میں اچھی ہے اور کیا نہیں ہے اور کیا چیز کس وقت اور کس طرح استعمال کرنی چاہیے۔ ایسی صورت میں ان چیزوں کو خریدنے کا خطرہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن علم کے مال کو خرید کر تم دوسرے برتن میں نہیں لے جا سکتے ہو۔ جب تم اس کی قیمت ادا کر دیتے ہو تو اسے اپنی روح میں رکھ کر لے جانا پڑتا ہے اور اس سے یا تو بہت فائدہ پہنچتا ہے یا بہت نقصان۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں اور اپنے بڑوں سے صلاح کر لیں اس لیے کہ ہم بھی بہت کم سن ہیں ——— اتنے کم سن کہ اس قسم کے معاملے کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ آؤ اب اپنے ارادے کے مطابق چل کر پروٹاگورس کی گفتگو سنیں اور جب سن چکیں تو اس کے بعد دوسروں سے مشورہ لیں اس لیے کہ

کیلیاس کے گھر نہ صرف پروٹاگورس ہی بلکہ ہیپیاس ایلیائی اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو پروڈیکس کیوسی اور کئی اور دانش مند لوگ جمع ہیں۔"

اس بات پر ہم متفق ہوئے اور وہاں سے چل کر کیلیاس کے گھر کی ڈیوڑھی تک پہنچ گئے ہم نے چاہا کہ یہاں ٹھہر کر ایک بحث کو جو راستے میں ہم دونوں میں چھڑ گئی تھی ختم کر لیں۔ چنانچہ ہم دیر تک ڈیوڑھی میں کھڑے گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ وہ مسئلہ طے ہو گیا۔ میرے خیال میں دربان نے جو ایک خواجہ سرا تھا اور غالباً سوفسطائیوں کی یورش سے خفا رہا کرتا تھا ہماری گفتگو ضرور سنی ہوگی بہر حال جب ہم نے کنڈی کھٹکھٹائی اور اس نے دروازہ کھولا اور ہمیں دیکھا تو بڑبڑانے لگا۔ "پہنچ گئے سوفسطائی ——— مالک گھر پر نہیں ہے" یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے دھڑسے دروازہ بند کر لیا۔ ہم نے پھر کنڈی کھٹکھٹائی اور اس نے بغیر دروازہ کھولے جواب دیا "ابے سنا نہیں کہ میں نے کیا کہا، وہ گھر پر نہیں ہیں" میں نے کہا دوست تم کیوں گھبراتے ہو ہم سوفسطائی نہیں ہیں اور کیلیاس کے پاس نہیں آئے ہیں بلکہ پروٹاگورس سے ملنا چاہتے ہیں۔ مہربانی کر کے ہماری اطلاع کر دو، غرض بڑی مشکل سے ہم نے اسے دروازہ کھولنے پر آمادہ کیا۔

جب ہم داخل ہوئے تو یہ دیکھا کہ پروٹاگورس غلام گردش میں ٹہل رہا ہے اس کے برابر ایک طرف ہپونکس کا بیٹا کیلیاس اور اس کا سوتیلا بھائی پریکلیس کا بیٹا پیرالیس ہے اور دوسری طرف پریکلیس کا دوسرا بیٹا زین تھپس اور فلومیس کا بیٹا فیلیپیڈیس۔ ان کے علاوہ انٹیمورس مینڈوی بھی موجود تھا جو پروٹاگورس کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے اور فلسفے کو اپنا پیشہ بنانا چاہتا ہے۔ پیچھے پیچھے سننے والوں کا ایک گروہ چل رہا تھا ان میں سے اکثر پردیسی معلوم

ہوتے تھے جنھیں پروٹاگورس مختلف شہروں سے جہاں وہ اپنے سفر کے سلسلے میں گیا تھا ساتھ لے آیا تھا۔ آرفیس کی طرح اس کی آواز کی کشش سے وہ کھنچے چلے آئے تھے۔ مجھے یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ چند ایتھنس والے بھی اس صحبت میں موجود تھے۔ جس ضابطے اور قاعدے سے یہ لوگ چل رہے تھے اسے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ کبھی اس کے راستے میں نہیں آتے تھے بلکہ جب وہ اور اس کے برابر چلنے والے پلٹتے تھے تو سننے والوں کا مجمع پھٹ کر باقاعدہ ادھر ادھر ہٹ جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ ان سے آگے رہتا تھا اور سب لوگ گھوم کر پورے نظم کے ساتھ اس کے پیچھے اپنی اپنی جگہ لے لیتے تھے۔

اس کے بعد بقول ہومر کے" میں نے آنکھ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں" کہ ہپیاس الیائی مقابل کی غلام گردش میں بڑی شان سے کرسی پر متمکن ہے اور اس کے پاس بنچوں پر لوگ ہپیاس سے طبیعیات اور ہیئت کے متعلق سوالات کر رہے ہیں اور وہ استادی کی مسند سے ان سب مسائل کی تشریح کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ "میری آنکھوں نے ٹینٹیلس کو دیکھا"۔ پروڈیکس کیوسی بھی ایتھنس میں موجود تھا وہ ایک کمرے میں ٹھیرا ہوا تھا جو ہپونکس کے زمانے میں گودام کا کام دیتا تھا لیکن چونکہ مکان میں جگہ نہ تھی اس لیے کیلیاس نے اسے صاف کرا کر مہمانوں کا کمرہ بنا دیا تھا۔ پروڈیکس ابھی تک بھیڑ کی کھالیں اوڑھے بستر میں لیٹا ہوا پڑا تھا اس کے پاس کوچ پر پاسنیاس سرامی بیٹھا تھا پاسنیاس کے ساتھ ایک کمسن لڑکا تھا جو یقیناً بہت حسین ہے اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو حسنِ سیرت سے بھی آراستہ ہے۔ شاید کسی نے اسے اگاتھن کہہ کر پکارا تھا اور میرا گمان ہے کہ وہ پاسنیاس کا محبوب تھا۔ اس لڑکے کے علاوہ ڈیمینٹس

نام کے دو شخص، ایک تو سیبیس کا بیٹا اور دوسرا ایبوکولوفیڈیس کا اور کچھ اور لوگ بھی تھے۔ مجھے بہت اشتیاق تھا کہ پروڈیکس کی باتیں سنوں۔ اس لیے کہ مجھے وہ بڑا عقل کُل اور پہنچا ہوا آدمی معلوم ہوتا ہے لیکن میں اندرونی حلقے میں نہ پہنچ سکا اور اس کی خوش آیند گہری آواز کمرے میں اس طرح گونج رہی تھی کہ اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

ہمارے داخل ہوتے ہی پیچھے پیچھے الکی بیادیس بھی آ پہنچا جسے تم بجا طور پر حسین کہہ سکتے ہو اور کالاشرس کا بیٹا کری ٹیاس بھی۔ اندر پہنچ کر پہلے تو ہم نے زرا دیر ٹھیر کر آس پاس نظر ڈالی اور پھر پروٹاگورس کے پاس گئے۔ میں نے کہا پروٹاگورس میرا دوست بقراط اور میں تم سے ملنے آئے ہیں۔"

اس نے پوچھا "تم مجھ سے اکیلے میں ملنا چاہتے ہو یا اور لوگوں کے سامنے"

میں نے جواب دیا "جیسا تم چاہو۔ پہلے یہ سن لو کہ ہمارے آنے کی غرض کیا ہے؟ پھر فیصلہ کرنا۔"

اس نے پوچھا "کیا غرض ہے"

میں نے کہا "میں یہ بتا دوں کہ میرا دوست بقراط ایتھنس کا رہنے والا ہے۔ وہ اپولوڈورس کا بیٹا ہے۔ ایک اونچے اور دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور قدرتی صلاحیت اور استعداد کے لحاظ سے اپنے ہم عمروں میں کسی سے کم نہیں۔ غالباً وہ سیاست کے میدان میں امتیاز حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے خیال میں تمھارے ساتھ گفتگو کرنے سے اسے یہ بات حاصل ہو سکتی ہے۔ اب تم خود یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ تم اس سے اپنی تعلیم کے متعلق تنہائی میں باتیں کرنا پسند کرو گے یا اور لوگوں کے سامنے۔"

"سقراط تمھاری اس توجہ کا شکریہ، یقیناً ایک پردیسی کو جو بڑے شہروں

میں جاکر وہاں کے بہترین نوجوانوں کو اس کی ترغیب دے کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں، بوڑھوں اور جوانوں سب کی صحبت کو چھوڑ کر اس کے ساتھ رہیں، اس خیال سے کہ وہ اس کی گفتگو سے فائدہ اٹھائیں گے، بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کہ اس کے طرزِ عمل سے بڑی بڑی رقابتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ اس کے دشمن بن جاتے ہیں اور اس کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ میرے خیال میں سوفسطائیوں کا فن بہت قدیم ہے لیکن اگلے زمانے میں جو لوگ یہ کام کرتے تھے وہ بدنامی کے خوف سے مختلف ناموں کی آڑ میں چھپ کر کرتے تھے۔ بعض شاعروں کے نام سے جیسے ہومر، ہیسیڈ، سمونائیڈیس اور بعض کاہنوں کے نام سے جیسے آرفیس اور میوسیس، یہاں تک کہ بعض ورزش سکھانے والوں کے نام سے جیسے اکس۔ ٹارنٹمی یا زمانۂ حال کا مشہور ہیراڈیکس جو پہلے مگارا میں رہتا تھا اور اب سیلمبریا میں رہتا ہے اور اعلیٰ درجے کا سوفسطائی ہے خود تمھارے ہاں اگاتھوکلیس بظاہر موسیقی کا ماہر لیکن حقیقت میں ایک ممتاز سوفسطائی تھا۔ اسی طرح پائیتھوکلائیڈیس کیوسی اور بہت سے لوگ تھے۔ جیسا کہ میں نے کہا ان سب نے یہ فن محض آڑ کے طور پر اختیار کر لیے تھے اس لیے کہ وہ بدنامی سے ڈرتے تھے۔ لیکن میرا یہ طریقہ نہیں ہے اس لیے کہ میرے خیال میں یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ وہ حکومت کو دھوکا دینا چاہتے تھے مگر اس نے دھوکا نہیں کھایا۔ اب رہے عوام تو وہ بالکل سادہ لوح ہوتے ہیں، اور جو سبق اُن کے حاکم پڑھا دیتے ہیں اسی کو دہرایا کرتے ہیں۔ اگر انسان میدان سے بھاگ جائے اور بھاگتے ہوئے پکڑا جائے تو یہ انتہائی حماقت ہے اور اس پر لوگوں کو اور زیادہ غصہ آتا ہے اس لیے کہ وہ بھاگنے والے کو علاوہ اور اعتراضوں کے جو اس کے خلاف ہوں بدمعاش بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے

میں نے اس کے بالکل برعکس طریقہ اختیار کیا ہے اور کھلم کھلا اپنے آپ کو سوفسطائی اور معلم کہتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ اعتراف اخفا سے زیادہ قرینِ مصلحت ہے۔ میں احتیاط کی دوسری تدبیروں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ خدا کے فضل سے سوفسطائیت کا اقرار کرنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں نے یہ پیشہ سالہا سال سے اختیار کر رکھا ہے —— اس لیے کہ اگر حساب لگایا جائے تو میری عمر بہت بڑی ہے اس صحبت میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کے میں باپ کی برابر نہ ہوں۔ لہٰذا اگر تم مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو تو میں اس کو ترجیح دوں گا کہ سب کے سامنے کی جائے۔"

چونکہ مجھے شبہہ تھا کہ اس کی خوشی یہ ہے کہ پروڈیکس اور ہپیاس کے سامنے اپنا کمال دکھا کر سرخروئی حاصل کرے اور ہم لوگوں کو اپنے مداحوں کی حیثیت سے پیش کرے اس لیے میں نے کہا "ہم کیوں نہ پروڈیکس اور ہپیاس اور ان کے دوستوں کو یہاں بلالیں کہ وہ بھی ہماری باتیں سنیں۔"

اس نے کہا "ضرور"۔

کیلیاس نے کہا "اور اگر ایک مجلس ہو جائے جس میں تم بیٹھ کر بحث کرو تو کیا ہرج ہے۔"

اس پر سب نے اتفاق کیا اور اس خیال سے لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی کہ دانشمندوں کی گفتگو سننے کا موقع ملے گا۔ ہم نے خود کرسیاں اور بنچیں اٹھا کر ہپیاس کے قریب جہاں پہلے سے اور بنچیں رکھی ہوئی تھیں قرینے سے لگا دیں۔ اس اثنا میں کیلیاس اور الکی بیادس نے پروڈیکس کو بستر سے اٹھایا اور اس کے رفیقوں سمیت مجلس میں لے آئے۔

جب سب لوگ بیٹھ گئے تو پروٹاگورس نے کہا "سقراط سب حضرات

جمع ہو گئے ہیں۔ اب بتاؤ وہ کون نوجوان ہے جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے؟"

میں نے جواب دیا "میں پھر وہیں سے شروع کرتا ہوں اور یہ بتاتا ہوں کہ میں کس غرض سے آیا ہوں۔ یہ میرا دوست بقراط ہے جو تم سے ملنے کا مشتاق ہے وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ تمہاری صحبت میں رہنے سے اس پر کیا اثر ہوگا؟ بس مجھے اتنا ہی کہنا ہے۔"

پروٹاگورس نے جواب دیا "صاحبزادے اگر تم میری صحبت میں رہو گے تو پہلے ہی دن تم پہلے سے بہتر ہو کر گھر جاؤ گے۔ اور دوسرے دن اس سے بہتر غرض اسی طرح روز بروز بہتر ہوتے جاؤ گے۔"

یہ سن کر میں نے کہا "پروٹاگورس مجھے یہ بات تمہارے منہ سے سن کر مطلق تعجب نہیں ہوا اگر خود تم کو باوجود تمہاری اس عمر اور فضل و کمال کے کوئی شخص کوئی ایسی چیز سکھائے جو تم نہیں جانتے تھے تو یقیناً تم بھی پہلے سے بہتر ہو جاؤ گے۔ لیکن میں اس سے مختلف جواب چاہتا ہوں ——— تمہیں مثال دے کر سمجھا دوں۔ فرض کرو کہ بقراط بجائے تمہارے زیوکسیس ہراقلی سے جو کچھ دن ہوئے ایتھنز آیا تھا ملنا چاہتا اور جس طرح تمہارے پاس آیا ہے اس کے پاس جاتا اور جیسے تم سے سنا ہے، اس سے سنتا کہ اس کی صحبت میں روز بروز ترقی کرے گا اور بہتر ہوتا جائے گا اور پھر اس سے پوچھتا "میں کا ہے میں بہتر ہوتا جاؤں گا اور کس چیز میں ترقی کروں گا؟" تو زیوکسیس یہ جواب دیتا "مصوری میں" اور فرض کرو کہ وہ ارتھاگورس تھیبی کے پاس جاتا اس کی زبان سے یہی بات سنتا اور اس سے پوچھتا "میں کس چیز میں روز بروز بہتر ہوتا جاؤں گا؟ تو وہ یہ جواب دیتا" بانسری بجانے میں" اچھا تو میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اسی قسم کا جواب دو اس نوجوان کو اور مجھ کو جو اس کی طرف سے سوال کر رہا ہوں تم جو کہتے ہو کہ پہلے ہی

دن تمھاری صحبت میں بیٹھ کر وہ پہلے سے بہتر ہو کر گھر جائے گا۔ اور اسی طرح ہر روز ترقی کرتا رہے گا، تو یہ بتاؤ پروٹاگورس، کہ وہ کس چیز میں ترقی کرے گا؟

میری یہ بات سن کر پروٹاگورس نے جواب دیا "تم بہت مناسب سوال کرتے ہو اور میں ہر مناسب سوال کا جواب بہت خوشی سے دیتا ہوں۔ اگر بقراط میرے پاس آئے گا تو اس کو اس قسم کی دردسری نہیں اٹھانی پڑے گی جس میں دوسرے سوفسطائی اپنے شاگردوں کو مبتلا کر کے اُن کی توہین کرتے ہیں۔ وہ بیچارے ابھی علوم و فنون سے پیچھا چھڑا کر آئے ہیں اور ان کے یہ استاد انھیں پھر اسی چکر میں ڈال دیتے ہیں اور زبردستی حساب، ہیئت، اقلیدس اور موسیقی سکھاتے ہیں (یہ کہتے ہوئے اس نے ہپیاس کی طرف دیکھا)، لیکن اگر وہ میرے پاس آئے گا تو وہ چیز سیکھے گا جو اسے سیکھنی مقصود ہے یعنی ذاتی کاروبار اور امورِ عامہ دونوں میں حسن تدبیر سے کام لینا۔ وہ خود اپنے گھر کا بہترین انتظام کرنا اور ملکی معاملات میں بہترین طریقے سے گفتگو اور عمل کرنا سیکھے گا۔"

میں نے کہا "معلوم نہیں میں تمھاری بات اچھی طرح سمجھا یا نہیں۔ کیا تمھارا یہ مطلب ہے کہ تم سیاستِ مُدن کی تعلیم دیتے ہو اور لوگوں کو اچھے شہری بنانے کا دعویٰ کرتے ہو؟"

"ہاں سقراط میرا یہی دعویٰ ہے۔"

"پھر تو تم بڑا عمدہ فن جانتے ہو، بشرطیکہ اس بات میں کوئی غلط فہمی نہ ہو اس لیے کہ میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں پروٹاگورس، مجھے اس میں شبہہ ہے کہ یہ فن سکھایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی مشکل ہے کہ تمھارے دعوے کو جھوٹا سمجھوں میں تمھیں بتا دوں کہ کس وجہ سے میری یہ رائے ہے کہ یہ فن ایک شخص دوسرے شخص کو نہیں سکھا سکتا؟ میرا یہ دعویٰ ہے کہ اہلِ ایتھنز بہت سمجھدار لوگ ہیں

اور واقعی دوسرے یونانی انھیں ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ جب یہ لوگ اسمبلی میں جمع ہوتے ہیں اور جو معاملہ زیرِ بحث ہو وہ تعمیر سے تعلق رکھتا ہو، تو فنِ تعمیر کے ماہر شورے کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ اگر جہاز بنانے کا مسئلہ ہو تو کشتی ساز، اسی طرح اور فنون میں جو سکھانے اور سیکھنے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا شخص انھیں مشورہ دینا چاہے جو زیرِ بحث فن میں ان سے زیادہ مہارت نہیں رکھتا، ہاں خوب صورت دولت مند اور عالی خاندان ضرور ہو، تو وہ اس کی بات نہیں سنتے بلکہ اس پر ہنستے ہیں اور آوازے کستے ہیں یہاں تک کہ وہ اس شور سے گھبرا کر خود ہی ہٹ جائے، اگر وہ اس پر بھی جما رہے تو صدر کے حکم سے کانسٹبل اسے کھینچ کر لے جاتے ہیں لیکن جب کوئی ملکی معاملہ ہو تو ہر شخص کو رائے دینے کی آزادی ہو ——— اب بڑھئی، ٹھٹھیرا، نعل بند، ملاح، رنگریز، غریب، امیر، چھوٹا بڑا ——— جو چاہتا ہو کھڑا ہو جاتا ہو اور برخلاف پچھلی مثال کے یہاں اسے کوئی اس بات پر نہیں ٹوکتا کہ بغیر کچھ سیکھے ہوئے، بغیر کسی کی شاگردی کیے ہوئے وہ مشورہ دینے کو مستعد ہو۔ ظاہر ہو اس کی وجہ یہی ہو کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کا علم سکھایا نہیں جا سکتا۔ اور صرف ریاست ہی کا نہیں بلکہ اشخاص کا بھی یہی حال ہو۔ ہمارے بہترین اور دانشمند ترین شہری بھی اپنی سیاسی حکمت دوسروں کو نہیں سکھا سکتے۔ مثلاً ان نوجوانوں کے باپ پیری کلیس کو لے لیجیے۔ اس نے ان سب علوم و فنون میں جو استادوں سے سیکھے جا سکتے ہیں انھیں اعلیٰ درجے کی تعلیم دلائی لیکن خود اپنے شعبے یعنی سیاست میں نہ تو خود کچھ سکھایا اور نہ کسی استاد کے سپرد کیا۔ بلکہ وہ اپنے حال پر چھوڑ دیے گئے گویا اس امید پر کہ وہ خود ہی نیکی کی حقیقت معلوم کر لیں گے۔ یا ایک اور مثال پر غور کیجیے۔ ہمارے دوست الکی بیادیس کا ایک چھوٹا بھائی کلینیاس ہو جس کا

سرپرست بھی پریکلیس تھا۔ اس نے اس خوف سے کہ الکی بیادیس، کلینیاس کو بگاڑ دے گا۔ اسے بھائی سے چھڑا کر اریفرن کے یہاں تعلیم کے لیے رکھا۔ مگر چھ مہینے بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ اریفرن نے اسے واپس کر دیا، اس لیے کہ وہ تعلیم دینے سے عاجز تھا۔ اس کے علاوہ میں بے شمار مثالیں ایسے اشخاص کی دے سکتا ہوں جو خود نیک تھے لیکن کسی اور کو خواہ وہ دوست ہو یا اجنبی، نیک نہیں بنا سکے۔ ان مثالوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے پروٹاگورس میرا یہ خیال ہے کہ نیکی سکھائی نہیں جا سکتی لیکن جب تمھاری باتوں کو سنتا ہوں تو میں مذبذب ہو جاتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ تمھارے قول کی کچھ بنیاد ضرور ہے اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ تم بہت وسیع تجربہ اور علم اور قوتِ اختراع رکھتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ذرا وضاحت سے یہ بات سمجھا دو کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہے۔ کیا تم اتنی عنایت کرو گے؟"

"بڑی خوشی سے سقراط۔ لیکن تم کس بات کو پسند کرو گے؟ کیا میں بحیثیت بزرگ کے تم سب لوگوں کو جو مجھ سے چھوٹے ہو ایک اخلاقی تمثیل یا افسانہ سناؤں یا تم سے اس مسئلے پر بحث کروں؟"

اس پر حاضرین میں سے کئی آدمیوں نے یہ جواب دیا کہ "اس کا فیصلہ اسے خود ہی کرنا چاہیے۔"

اس نے کہا "اچھا تو پھر میرے خیال میں افسانہ زیادہ دلچسپ رہے گا:۔

ایک زمانے میں دنیا میں صرف دیوتا ہی دیوتا تھے۔ فانی مخلوق کا وجود نہ تھا لیکن جب اس کے پیدا ہونے کا وقت آیا تو دیوتاؤں نے انھیں مٹی اور آگ اور بہت سی چیزوں سے جو زمین کے اندر ان دونوں کے ملنے سے بنتی ہیں، پیدا کیا۔ اور جب وہ انھیں باہر روشنی میں لانا چاہتے تھے تو انھوں نے

پرومیتھیس اور اپیمیتھیس کو حکم دیا کہ انھیں مناسب صفات سے آراستہ کر دیں۔
اپیمیتھس نے پرومتھیس سے کہا میں ان میں صفات تقسیم کرتا ہوں۔ تم آکر دیکھ لینا۔
یہ بات طے ہو گئی اور اپیمتھیس نے تقسیم کا کام انجام دیا۔ جن کو اس نے طاقت دی انھیں
تیزی نہیں دی اور جو کمزور تھے انھیں تیز بنا دیا۔ بعض کو اس نے مسلح کر دیا اور بعض کو
غیر مسلح چھوڑ دیا۔ آخر الذکر کے لیے اس نے حفاظت کی اور تدبیریں نکالیں۔ بعض کو
اتنا بڑا بنایا کہ ان کی بڑائی حفاظت کا کام دے اور بعض کو چھوٹا بنایا لیکن ان کی
فطرت میں ہوا میں اڑنا یا زمین کھود کر اس میں رہنا رکھ دیا تاکہ اس طرح وہ اپنی
جان بچا سکیں۔ غرض اس طرح اس نے ہر ایک کی کمی کی تلافی کر دی اس خیال سے
کہ کوئی نسل معدوم نہ ہونے پائے۔ اور جب وہ اس کا انتظام کر چکا کہ وہ ایک
دوسرے کے ہاتھ سے برباد نہ ہوں تو اس نے انھیں موسم کے اثرات سے محفوظ
رکھنے کی تدبیریں بھی اختیار کیں، ان کے گھنے بال اور موٹے چمڑے بنا دیے کہ وہ
جاڑوں میں سردی سے اور گرمیوں میں گرمی سے بچ سکیں اور جب آرام کرنا چاہیں
تو انھیں ایک قدرتی بستر میسر ہو اس کے علاوہ اس نے انھیں سُم اور بال بھی دیے
اور اُن کے پانوں کے نیچے کا چمڑا سخت اور بے حس بنا دیا۔ پھر اس نے ان کے
لیے طرح طرح کی کھانے کی چیزیں پیدا کیں ——— بعض کے لیے زمین کی بوٹیاں
بعض کے لیے درختوں کے پھل، بعض کے لیے جڑیں اور بعض کی غذا دوسرے
جانوروں کو قرار دیا۔ بعض کو اس نے ایسا بنایا کہ ان کے بچّے بہت کم ہوں اور
جن جانوروں کا وہ شکار کرتے ہیں ان کو کثرت سے بچے دینے والا۔ اس طرح
ان کی نسل محفوظ رہی، غرض اپیمتھیس، جو کچھ زیادہ دانشمند نہ تھا، یہ بھول گیا کہ
اس نے ساری صفات جو اس کے ہاتھ میں تھیں بہائم میں تقسیم کر دیں ———
اور جب انسان کی باری آئی جسے اب تک کچھ نہیں ملا تھا تو سخت پریشان ہوا

وہ اسی پریشانی میں تھا کہ پرومتھیس تقسیم کا معائنہ کرنے آیا اور اس نے دیکھا کہ اور جانوروں کو تو مناسب سامان مل گیا ہے صرف انسان ننگے بدن اور ننگے پیر بغیر ہتھیار اور بغیر بستر کے رہ گیا ہے۔ اب وہ وقت آرہا تھا کہ انسان کو بھی نکل کر روشنی میں جانا تھا۔ پرومتھیس کے اور تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی نجات کی کیا تدبیر سوچے اس نے ہیفیسٹس اور اتھینے کی صنعتیں اور ان کے ساتھ آگ (اس لیے کہ بغیر آگ کے نہ وہ حاصل کی جا سکتی تھیں اور نہ استعمال کی جا سکتی تھیں) انسان کو دے دیں۔
اب انسان کو زندگی بسر کرنے کا شعور حاصل ہو گیا لیکن سیاسی شعور سے وہ محروم رہا اس لیے کہ وہ زیس کے قبضے میں تھا اور پرومتھیس میں یہ طاقت نہ تھی کہ اس آسمانی قلعے میں داخل ہو سکے جہاں زیس رہتا تھا اور جس کی حفاظت کے لیے بڑے خوفناک سنتری موجود تھے۔ البتہ اتھینے اور ہیفیسٹس کے مشترک کارخانے میں داخل ہو گیا جہاں وہ اپنی پسند کے کام کیا کرتے تھے اور اس نے ہیفیسٹس کا فن جو آگ کی مدد سے انجام پاتا تھا اور اتھینے کا فن لے جا کر انسان کو دے دیا اس طرح انسان کے لیے زندگی کی ضرورتیں مہیا ہو گئیں۔ مگر یہ کہا جاتا ہے کہ بعد میں اپیتھیس کی غلطی سے پرومتھیس پر چوری کا مقدمہ چلایا گیا۔

"چونکہ انسان میں دیوتاؤں کی کچھ صفات موجود تھیں لہٰذا ابتدا میں کل جانوروں میں صرف وہی دیوتاؤں کی معرفت رکھتا تھا اس لیے کہ صرف وہی ان کا ہم جنس تھا اور وہ اُن کی مورتیں اور قربان گاہیں بنایا کرتا تھا۔ تھوڑی ہی مدت میں اس نے کلام موضوع اور اسما اختراع کر لیے۔ اس کے علاوہ مکان تعمیر کیے، کپڑے، جوتے اور پلنگ بنائے اور زمین سے اپنی غذا حاصل کرنے لگا۔ اس سامان کے ساتھ انسان ابتدا میں منتشر رہا کرتے تھے اور شہروں کا وجود نہ تھا، اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ درندے انھیں ہلاک کرنے لگے اس لیے

کہ وہ ان کے مقابلے میں بالکل بے بس تھے اور ان کا فن صرف اس کے لیے کافی تھا کہ زندگی کے وسائل بہم پہنچائے اور انھیں اس قابل نہیں بنا سکتا تھا کہ جانوروں سے جنگ کر سکیں۔ غذا تو ان کے پاس تھی لیکن ابھی تک وہ حکومت کا فن نہیں جانتے تھے، جس کا فنِ جنگ ایک حصّہ ہے۔ کچھ دن کے بعد بقائے نفس کی خواہش نے انھیں شہروں میں جمع کر دیا لیکن جب وہ اکٹھے ہوئے تو حکومت کا فن نہ جاننے کی وجہ سے ایک دوسرے سے برا سلوک کرنے لگے اور پھر انتشار اور ہلاکت میں مبتلا ہو گئے۔ زیس کو اندیشہ تھا کہ ساری نسل معدوم ہو جائے گی اس لیے اس نے ہرمیس کو ان کے پاس بھیجا جس نے ادب اور انصاف پرستی، اور تالیفِ قلوب پر شہروں کے نظم کی بنیاد رکھی۔ ہرمیس نے زیس سے پوچھا کہ "میں ادب اور انصاف انسانوں کو کس طرح سکھاؤں؟ کیا یہ چیزیں ان میں اس طرح تقسیم کر دوں جیسے کہ فنون تقسیم کیے جاتے ہیں؟ یعنی صرف چند منتخب لوگوں کو مثلاً ایک شخص کے مقابلے میں جو طب یا کسی اور فن سے واقف ہوتا ہے، بہت سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں؟" زیس نے کہا "سب کو دو، میں چاہتا ہوں کہ ہر ایک کو ان میں حصہ ملے، اس لیے کہ اگر فنون کی طرح نیکیاں بھی صرف چند افراد تک محدود رہیں تو شہروں کا وجود ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ میرے حکم سے یہ قانون بنا دو کہ جو شخص ادب اور انصاف سے محروم ہوگا قتل کر دیا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ ریاست کے لیے ایک عذاب ہے۔" یہی وجہ ہے سقراط کہ اہلِ ایتھنس اور عموماً سبھی انسان جب انھیں نجاری یا کسی اور دستکاری کے مسئلے پر غور کرنا ہو، صرف چند لوگوں کو مشورے میں شامل کرتے ہیں اور اگر کوئی دوسرا شخص دخل دیتا ہے تو بقول تمھارے اسے ٹوک دیتے ہیں، اگر وہ ان چند منتخب لوگوں میں سے نہ ہو۔ اور میرے خیال میں یہ بالکل قدرتی بات ہے

لیکن جب وہ سیاسی قابلیت پر غور کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں جو صرف انصاف اور دانشمندی سے پیدا ہوتی ہے تو وہ صبر سے ہر شخص کی بات سنتے ہیں۔ یہ بھی قدرتی بات ہے اس لیے کہ ان کے خیال میں اس قابلیت میں ہر شخص کا حصہ ہونا چاہیے ورنہ ریاست قائم نہیں رہ سکتی۔ اب میں نے تمھیں اس امر کی وجہ سمجھا دی سقراط۔

"شاید تم اپنے اس خیال کو غلط سمجھو کہ سب لوگ ہر انسان کو انصاف اور دیانت اور ہر سیاسی صفت میں برابر کا حصہ دار سمجھتے ہیں۔ اس لیے میں اس کا مزید ثبوت پیش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے: تم جانتے ہو کہ دوسری صورتوں میں اگر کوئی شخص کہے کہ میں بربط بہت اچھا بجاتا ہوں یا کسی اور فن میں ماہر ہونے کا دعوے کرے جس سے وہ مطلق واقف نہیں ہے تو لوگ یا تو اس پر ہنستے ہیں یا خفا ہوتے ہیں اور اس کے رشتہ دار اسے مجنون سمجھ کر سرزنش کرتے ہیں لیکن جب دیانت یا کسی اور سیاسی صفت کا سوال ہو تو باوجود اس کے کہ انھیں اس کے بد دیانت ہونے کا علم ہو، اگر وہ مجمع عام میں اپنی بد دیانتی کا حال سچ سچ کہہ دے تو جو چیز دوسری صورتوں میں ہوشمندی سمجھی جاتی تھی اب جنون کہلائے گی۔ سب یہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو دیانت داری کا دعوے کرنا چاہیے، خواہ وہ دیانت دار ہو یا نہ ہو اور جو شخص اس کے خلاف کہے وہ پاگل ہے۔

"ان کا خیال ہے کہ ہر شخص میں تھوڑی بہت دیانت داری ہونی ضروری ہے۔ اور اگر بالکل نہ ہو تو اسے دنیا میں رہنا ہی نہ چاہیے۔ میں نے یہ دکھایا ہے کہ لوگ اس صفت کے بارے میں ہر ایک سے مشورہ لینے میں حق بجانب ہیں اس لیے کہ وہ ہر شخص کو اس میں حصہ دار سمجھتے ہیں۔ اب میں یہ ثابت کرنے کی

کوشش کروں گا کہ وہ اس صفت کو وہبی یا خود رَو نہیں سمجھتے بلکہ ایک ایسی چیز جو سکھائی جا سکتی ہے اور محنت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ کوئی شخص ان لوگوں کو نصیحت یا سرزنش نہیں کرے گا یا ان سے خفا نہیں ہوگا جن کی مصیبت کو وہ قدرتی یا اتفاقی سمجھتا ہو۔ ایسے لوگوں کو نہ سزا دی جاتی ہے اور نہ ان پر کوئی قدغن ہوتی ہے بلکہ صرف ان کی حالت پر افسوس کیا جاتا ہے۔ کون ایسا احمق ہوگا جو ایک بدصورت یا ضعیف الخلقت شخص کو سزا دے یا نصیحت کرے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اس قسم کی اچھائی یا برائی قدرتی اور اتفاقی چیز ہے لیکن اگر کسی شخص میں ان صفات کی کمی ہو جو مطالعے سے اور مشق سے، اور سکھانے سے حاصل ہوتی ہیں اور ان کے برعکس برائیاں موجود ہوں تو لوگ اس پر خفا ہوتے ہیں اسے تنبیہ کرتے ہیں اور سزا دیتے ہیں —————— ان برائیوں میں سے ایک بے دینی ہے اور دوسری ناانصافی اور انھیں ہم سیاسی صفت کے عین برعکس کہ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہر شخص دوسرے پر خفا ہوگا اور اسے سرزنش کرے گا —————— ظاہر ہے اس وجہ سے کہ اس کے خیال میں مطالعے سے اور سیکھنے سے وہ صفت جس کی دوسرے شخص میں کمی ہے حاصل کی جا سکتی ہے سقراط اگر تم سزا کی حقیقت پر غور کرو تو فوراً تمھاری سمجھ میں آ جائے گا کہ انسانوں کے نزدیک نیکی سیکھی جا سکتی ہے۔ کوئی شخص برائی کرنے والے کو اس خیال سے یا اس وجہ سے سزا نہیں دیتا کہ اس نے برا کام کیا ہے —————— صرف وحشی جانور غصّہ سے اندھے ہو کر ایسا کرتے ہیں۔ بلکہ جو شخص معقول سزا دینا چاہتا ہے اور اسے کسی پچھلی برائی کا کہ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی، انتقام لینا مقصود نہیں ہے وہ تو مستقبل کو دیکھتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ جو شخص سزا پاتے ہوئے دیکھے وہ دوبارہ بُرا کام کرنے سے باز رہے۔ وہ سزا انسداد کی غرض سے

دیتا ہی۔ یہ بات صاف طور سے اس امر پر دلالت کرتی ہی کہ نیکی سکھائی جاسکتی ہی۔ یہ خیال اُن سب لوگوں کا ہی جو ذاتی طور پر یا عمومی طور پر دوسروں سے ان کے جرم کا بدلا لیتے ہیں۔ خود تمھارے شہر کے لوگ بھی یعنی اہل ایتھنس بھی اوروں کی طرح ان لوگوں کو جنھیں وہ مجرم سمجھتے ہیں، سزا دیتے ہیں اور ان سے انتقام لیتے ہیں۔ اس سے ہم ان لوگوں کی کثرتِ تعداد کا اندازہ کرسکتے ہیں جن کا یہ خیال ہی کہ نیکی سیکھی اور سکھائی جاسکتی ہی۔ اب تک میں نے وضاحت کے ساتھ دکھایا ہی سقراط کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو تمھارے ہم وطن اس میں حق بجانب ہیں کہ وہ ٹھٹھیرے اور نعل بند سے سیاسی امور میں مشورہ لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ نیکی سیکھی اور سکھائی جاسکتی ہی۔

"مگر ابھی ایک دقّت باقی ہی جس کا تم نے اچھے آدمیوں کی اولاد کے بارے میں ذکر کیا ہی۔ کیا وجہ ہی اچھے آدمی اپنے لڑکوں کو وہ علم سکھاتے ہیں جو معلموں سے حاصل ہوتا ہی اور اس میں انھیں کامل بنا دیتے ہیں لیکن وہ صفات ان کے اندر پیدا کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرتے جن میں خود ان بزرگوں کو امتیاز حاصل ہوتا ہی؟ یہاں سقراط میں اپنی تمثیل کو ختم کرتا ہوں اور بحث شروع کرتا ہوں۔ زرا اس بات پر غور کرو، کوئی ایسی صفت ہی یا نہیں جس میں سب شہریوں کو حصّہ دار ہونا چاہیے اگر شہر کا وجود قائم رکھنا ہی؟ اسی سوال کے جواب میں تمھاری مشکل کا حل شامل ہی اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہی، اس لیے کہ اگر کوئی ایسی صفت ہی اور یہ مشترک صفت بڑھئی یا لوہار یا کمھار کا کام نہیں بلکہ عدل اور عفت اور پاک نفسی۔ مختصر یہ کہ انسانیت ہی —— اگر یہی وہ صفت ہی جس میں تمام انسانوں کو حصّہ دار ہونا چاہیے اور جس کے بغیر نہ وہ کچھ سیکھ سکتے ہیں نہ کرسکتے ہیں، اگر وہ شخص جس میں اس کی کمی ہو خواہ وہ بچہ ہو یا بڑا،

مرد ہو یا عورت، تعلیم اور تنبیہ کا مستحق ہے یہاں تک کہ اس کی اصلاح ہو جائے اور جو کوئی تعلیم اور تنبیہ سے سرکشی اختیار کرے وہ یا تو جلا وطن کر دیا جاتا ہے یا لاعلاج سمجھ کر قتل کر دیا جاتا ہے ——— اگر یہ سب کچھ صحیح ہے اور اس کے باوجود اچھے آدمی اپنے لڑکوں کو اور سب چیزیں تو سکھاتے ہیں مگر یہ چیز نہیں سکھاتے تو تم سوچو کہ ان کا طرزِ عمل کس قدر عجیب و غریب نظر آئے گا۔ اس لیے کہ ہم یہ دکھا چکے ہیں کہ ان کے نزدیک نیکی سکھائی جا سکتی ہے اور شخصی اور عمومی زندگی دونوں میں نشو و نما پا سکتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنے لڑکوں کو چھوٹی چھوٹی باتیں تو سکھاتے ہیں جن کے نہ جاننے سے سزا یا قتل کا اندیشہ نہیں، لیکن بڑی باتیں جن کا نہ جاننا لوگوں کے لیے موت اور جلا وطنی کا باعث ہو سکتا ہے بلکہ موت اور ضبطِ املاک دونوں کا، مختصر یہ کہ خاندان کی تباہی کا ——— انھیں نہیں سکھاتے اور اس کا اہتمام نہیں کرتے کہ وہ ان سے واقف ہو جائیں۔ کس قدر بعید از قیاس ہے، سقراط؟

"تعلیم اور تنبیہ تو بالکل بچپن ہی سے شروع ہو جاتی ہے اور آخر عمر تک جاری رہتی ہے۔ جہاں بچہ یہ بات سمجھنے کے قابل ہوا، ماں اور کھلائی، باپ اور اتالیق ایک سے ایک بڑھ کر اس کی اصلاح کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ اِدھر اس نے کچھ کہا یا کیا اور اُدھر نصیحتوں کا دفتر کھل گیا۔ یہ بات انصاف کی ہے، یہ بے انصافی کی، یہ عزت کی، یہ بے عزتی کی، یہ دین داری کی، یہ بے دینی کی۔ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ اگر وہ اس نصیحت پر عمل کرے تو خیر ورنہ زرا دھمکا کر اور مار پیٹ کر درست کر دیا جاتا ہے جیسے بڑھئی لکڑی کو سیدھا کرتے ہیں۔ جب زرا بڑا ہوتا ہے تو وہ اسے معلموں کے پاس بھیج دیتے ہیں اور انھیں تاکید کر دیتے ہیں کہ پڑھائی اور موسیقی سے زیادہ وہ اس کے عادات و اطوار کا خیال رکھیں اور معلم ایسا ہی کرتے ہیں

جب لڑکا حروف سیکھ چکتا ہے اور لکھی ہوئی عبارت کو سمجھنے لگتا ہے جیسے کہ پہلے زبانی گفتگو سمجھتا تھا تو وہ اُس کے ہاتھ میں بڑے بڑے شاعروں کی تصانیف دے دیتے ہیں جو وہ مدرسے میں بنچ پر بیٹھ کر پڑھتا ہے۔ ان میں بہت سی نصیحتیں اور بہت سی کہانیاں اور قدیم مشاہیر کی تعریفیں ہوتی ہیں جو اسے زبانی یاد کرنی پڑتی ہیں تاکہ وہ ان کی تقلید اور ان کا سا بننے کی کوشش کرے۔ اسی طرح بربط سکھانے والے بھی اس کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کا کم سن شاگرد تمیزدار ہو اور شرارت نہ کرے جب وہ اسے بربط بجانا سکھا چکتے ہیں تو اسے اور اچھے شاعروں یعنی غزل گو شاعروں کے کمال سے آشنا کرتے ہیں اور ان کی نظموں کو نغمے میں ڈھالتے ہیں اور ان کے وزن اور سُر کو بچوں کی طبیعت کے مناسب بناتے ہیں تاکہ ان میں زیادہ نرمی اور ہم آہنگی اور موزونیت پیدا ہو اور وہ گفتگو اور عمل کے قابل ہو جائیں اس لیے کہ ہر شخص کی زندگی میں ہم آہنگی اور موزونیت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد وہ انھیں ورزش سکھانے والوں کے پاس بھیجتے ہیں تاکہ ان کے جسم ان کی نیک طبیعت کا ساتھ دے سکیں اور انھیں جسمانی کمزوری کی وجہ سے جنگ میں یا کسی اور موقع پر بزدلی نہ دکھانی پڑے۔ یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو صاحبِ مقدور ہیں۔ اُن کے بچے سب سے پہلے اسکول جانا شروع کرتے ہیں اور سب کے بعد تعلیم ختم کرتے ہیں۔ جب وہ استادوں سے تعلیم پا چکتے ہیں تو ریاست انھیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ قوانین سے واقفیت حاصل کریں، اپنی مرضی سے نہیں بلکہ جو نمونہ انھوں نے قائم کر دیا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کریں، جس طرح لکھنا سکھاتے وقت استاد مبتدی کے لیے پہلے سلاخ کی مدد سے لکیریں کھینچ دیتے ہیں اور تختی ان کے ہاتھ میں دے کر انھی لکیروں پر لکھواتے ہیں، اسی طرح شہری ریاست ان قوانین کا خاکہ کھینچتی ہے

جو قدیم زمانے میں اچھے اچھے واضعانِ قوانین نے وضع کیے تھے۔ یہ نوجوان کے آگے رکھے جاتے ہیں تاکہ اس کے عمل کی رہنمائی کریں خواہ وہ افسر کا کام کرتا ہو یا ماتحت کا۔ جو شخص ان کی خلاف ورزی کرے اسے تنبیہ کی جاتی ہے یا دوسرے الفاظ میں اس سے مواخذہ کیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح نہ صرف تمھارے ملک میں بلکہ اور ملکوں میں بھی استعمال ہوتی ہے اور انصاف کا کام ہی یہ ہے کہ لوگوں سے مواخذہ کرے۔ جب شخصی اور عمومی نیکی کے لیے اس قدر اہتمام کیا جاتا ہے تو پھر سقراط تم کیوں اس حیرت اور شبہہ میں ہو کہ کیا نیکی واقعی سکھائی جا سکتی ہے؟ اس پر تعجب نہ کرو کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو تعجب کی بات تھی۔

"تو پھر کیا بات ہے کہ اچھے باپوں کے بیٹے اکثر بُرے نکلتے ہیں؟ یہ تو کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں اس لیے کہ جب میں نے کہا ریاست کا وجود اس پر دلالت کرتا ہے کہ نیکی کسی ایک شخص کی ملک نہیں اگر ایسا ہے ——— اور یقیناً ہے ——— تو تم مثال کے طور پر کسی اور شغل یا فن کا تصور کرو جو ریاست کے وجود کے لیے اس قدر ناگزیر ہو فرض کرو کہ ریاست کا وجود اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی بساط کے مطابق بانسری بجانا نہ جانتا ہو اور ہر شخص دھڑلے سے اس فن کی تعلیم دے اور بُرے بجانے والے کو تنبیہ کرے۔ اسی طرح جیسے آج کل ہر شخص انصاف اور قانون کی تعلیم دیتا ہے، اور فنون کی طرح انھیں چھپاتا نہیں بلکہ دوسروں کو سکھاتا ہے ——— اس لیے کہ ہم سب کو ایک دوسرے کے انصاف اور نیکی سے فائدہ پہنچتا ہے چنانچہ ہر شخص انصاف اور نیکی سکھانے پر تیار رہتا ہے ——— غرض یہ فرض کرلو کہ ہم اس قدر مستعدی اور فیاضی سے ایک دوسرے کو بانسری بجانا سکھانے لگیں تو کیا تمھارے خیال میں سقراط، اچھے بانسری بجانے والوں کے لڑکوں کو بُرے

بجانے والوں کے لڑکوں پر کوئی فوقیت حاصل ہوگی ؟ میرے خیال میں تو نہیں ہوگی ؟ ان کے لڑکوں کا امتیاز حاصل کرنا یا نہ کرنا اس پر موقوف ہوگا کہ ان میں بانسری بجانے کی قدرتی صلاحیت کتنی ہے ؟ اکثر اچھے بجانے والے کا لڑکا بُرا نکلے گا اور بُرے بجانے والے کا اچھا نکلے گا۔ اور سب کے سب ان لوگوں کے مقابلے میں بہت غنیمت ہوں گے جو سرے سے بانسری بجانا جانتے ہی نہ ہوں۔ اسی طرح یہ سمجھو کہ قانون اور علم و ادب کے سیکھنے والوں میں جو بُرے سے بُرا ہوگا وہ بھی اُن لوگوں کے مقابلے میں انصاف کا پتلا کہلائے گا جن میں نہ تعلیم ہو اور نہ عدالتیں، نہ قوانین، نہ اور کوئی بندشیں جو اُنھیں نیکی پر مجبور کرتی ہوں —— مثلاً وہ وحشی جنھیں پچھلے سال شاعر فیری کراتیس نے لینائی تہوار کے موقع پر اسٹیج پر دکھایا تھا۔ اگر تم اس کے طائفے کے مردم بیزار لوگوں کے ساتھ رہتے ہوتے تو یوری بیٹس اور فرائی نانڈاس جیسے لوگوں کی صحبت کو بہت غنیمت سمجھتے اور اس ملک کے بدمعاشوں کو حسرت سے یاد کرتے۔ تم جو اتنے غیر مطمئن ہو سقراط تو کیوں ہو؟ سبھی لوگ نیکی سکھانے والے ہیں جس کی جتنی بساط ہو اور تم یہ پوچھتے ہو کہ سکھانے والے کہاں ہیں ؟ تو ایسا ہی ہے جیسے تم پوچھو یونانی زبان کون سکھاتا ہے ؟ کیونکہ اس کے بھی کوئی خاص سکھانے والے نہیں ملیں گے۔ اگر تم یہ سوال کرو کہ ہمارے کاریگروں کے لڑکوں کو وہ فن جو انھوں نے اپنے باپ دادا سے سیکھا ہے، کون سکھائے ؟ یوں تو خود کاریگر اور اس کے ساتھیوں نے اپنی بساط کے مطابق اُنھیں سکھا دیا ہے لیکن اس فن کی مزید تعلیم کون دے گا ؟ یقیناً سقراط تمھیں ان کے لیے استاد ڈھونڈنے میں دقت ہوگی لیکن ان لوگوں کے لیے جو اس فن میں بالکل کورے ہیں استاد تلاش کرنے میں بالکل دقت نہ ہوگی۔ یہی بات نیکی پر اور دوسری چیزوں پر بھی

صادق آتی ہی۔ اگر کوئی شخص ہمارے مقابلے میں نیکی کو ایک قدم بھی آگے بڑھا دے تو ہمیں اس پر قناعت کرنی چاہیے۔ اس قسم کا ایک استاد میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں اور اپنے نزدیک اس علم میں دوسروں سے زیادہ حصہ رکھتا ہوں جو انسان کو شریف اور نیک بناتا ہی۔

"میں اپنے شاگردوں سے جتنا روپیہ لیتا ہوں اتنا بلکہ اس سے زیادہ انھیں سکھا دیتا ہوں جس کا کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے ادائگی کا یہ طریقہ نکالا ہی ——— جب کوئی شخص مجھ سے تعلیم پا چکتا ہی اگر اس کا جی چاہے تو میری مقررہ فیس ادا کر دیتا ہی، لیکن کوئی مجبوری نہیں۔ وہ پوری رقم نہ دینا چاہے تو اسے صرف یہ کرنا پڑتا ہی کہ کسی مندر میں جا کر حلف اٹھالے کہ جو کچھ اس نے سیکھا ہی اس کی قیمت اتنی ہی اور جو کچھ وہ کہتا ہی اس سے زیادہ اسے ادا نہیں کرنا پڑتا۔

"اس تمثیل سے اور اس استدلال سے سقراط میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہی کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہی، اور یہی اہل ایتھنس کی رائے ہی۔ میں نے یہ بھی دکھانا چاہا ہی کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اچھے باپوں کے بُرے بیٹے یا بُرے باپوں کے اچھے بیٹے ہوں۔ ان کا نمونہ پولی کلائٹس کے بیٹے پیش کرتے ہیں جو ہمارے ان دونوں دوستوں پیریلیس اور زان تھپس کے ساتھی ہیں اور اپنے باپ کے مقابلے میں بالکل نکمّے ہیں۔ یہی حال اور بہت سے صنّاعوں کی اولاد کا ہی۔ پیریلیس اور زان تھپس کے متعلق مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے، اس لیے کہ وہ کم سن ہیں اور ابھی ان سے بہت کچھ امید ہی۔"

پروٹاگورس کی گفتگو ختم ہوئی اور میرے کانوں میں
"اس کی آواز اس دلکش انداز سے گونجتی رہی کہ کچھ دیر تک میں یہ
سمجھتا رہا کہ وہ اب تک بول رہا ہی اور کان لگا کر سنتا رہا۔"

آخر جب مجھ پر حقیقت منکشف ہوئی کہ اس نے واقعی اپنی تقریر ختم کر دی ہے تو بڑی مشکل سے میں نے اپنے حواس درست کیے اور بقراط کی طرف دیکھ کر اس سے کہا " اے اپولوڈورس کے بیٹے میں تمہارا دل سے شکر گزار ہوں کہ تم مجھے یہاں لائے۔ اگر میں پروٹاگورس کی تقریر نہ سنتا تو مجھے نہایت افسوس ہوتا۔ میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ کسی انسان کی کوشش انسانوں کو نیک نہیں بنا سکتی لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔

"تاہم ابھی ایک ذرا سی مشکل باقی ہے، جسے میرے خیال میں پروٹاگورس آسانی سے حل کر دے گا جیسے کہ اس نے اور بہت سی مشکلوں کو حل کر دیا۔ اگر کوئی شخص پیریکلیس یا ہمارے ملک کے کسی اور زبردست مقرر سے جا کر ان معاملات میں رائے لے تو غالباً وہ لوگ بھی اتنی ہی عمدہ تقریر کریں گے۔ لیکن جب کوئی شخص ان سے سوال کرے تو وہ کتاب کی طرح نہ کچھ بتا سکتے ہیں اور نہ کچھ پوچھ سکتے ہیں۔ اور اگر کوئی ان کے خطبے کے کسی ایک معمولی جز پر اعتراض کرے تو وہ ایک لمبی چوڑی تقریر شروع کر دیتے ہیں اور پیتل کے برتنوں کی طرح جب ایک بار بجنا شروع کرتے ہیں تو جب تک کوئی شخص ان پر ہاتھ نہ رکھ دے برابر بجتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارا دوست پروٹاگورس نہ صرف اچھی تقریر کر سکتا ہے جیسا کہ وہ پہلے ہی ثابت کر چکا ہے بلکہ جب کوئی سوال کیا جائے تو اختصار سے جواب دے سکتا ہے۔ اور جب وہ خود کوئی سوال کرتا ہے تو جواب کا انتظار کرتا ہے اور اسے سنتا ہے۔ یہ بڑی نایاب صفت ہے۔ اچھا پروٹاگورس، اب میں تم سے ایک چھوٹا سا سوال کرنا چاہتا ہوں اور اگر تم اس کا جواب دے دو تو میں بالکل مطمئن ہو جاؤں گا۔ تم کہہ رہے تھے کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہے۔ اس بات کو میں تمہاری سند پر مانے لیتا ہوں۔ تم پر میں اتنا بھروسا کرنے کو تیار ہوں

جتنا اور کسی پر نہیں کرتا لیکن ایک بات ہے، میں حیران ہوں اور چاہتا ہوں کہ تشفی ہو جائے۔ تم کہہ رہے تھے کہ زیس انسانوں کو انصاف اور ادب عطا کرتا ہے اور اپنی تقریر کے دوران میں تم نے کئی بار عدل اور عفّت اور دین داری کا ذکر اس طرح کیا گو یا نیکی ان چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دو کہ آیا نیکی ایک سالم چیز ہے، جس کے عدل اور عفت اور دین داری حصے ہیں، یا یہ سب ایک ہی چیز کے نام ہیں؟ یہ شبہہ ہے جو میرے دل میں اب تک باقی ہے۔"

"اس کا جواب بہت آسان ہے سقراط۔ جن صفات کا تم ذکر کر رہے ہو وہ نیکی کے حصے ہیں جو ایک واحد چیز ہے۔"

"کیا یہ حصے اسی معنی میں ہیں جس معنی میں منہ، ناک، آنکھیں اور کان چہرے کے حصے ہیں یا وہ سونے کے اجزا کی طرح ہیں جو ایک دوسرے سے اور اپنے کُل سے صرف چھوٹے بڑے ہونے کے اعتبار سے مختلف ہیں؟"

"میرے خیال میں سقراط ان میں جو اختلاف ہے وہ پہلی قسم کا ہے۔ اُن میں آپس میں وہی تعلق ہے جو ایک چہرے کے حصوں کو کل چہرے سے ہوتا ہے۔"

"اور کیا یہ ممکن ہے کہ بعض لوگ نیکی کا ایک حصہ رکھتے ہوں، بعض دوسرا حصہ؟ یا جو شخص ایک حصہ رکھتا ہو وہ لازمی طور پر دوسرے اور حصے بھی رکھتا ہو گا؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ بہت سے لوگ بہادر ہوتے ہیں اور با انصاف نہیں ہوتے۔ یا با انصاف ہوتے ہیں اور دانش مند نہیں ہوتے۔"

"تو تم اس سے انکار نہیں کرتے کہ شجاعت اور حکمت بھی نیکی کے حصے ہیں؟"

"بے شک ہیں اور حکمت ان میں سب سے افضل ہے۔"

"اور وہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟"

"ہاں۔"

"اور کیا اُن میں سے ہر ایک چہرے کے حصوں کی طرح اپنا ایک الگ کام رکھتا ہے ———— مثلاً آنکھ کان سے مختلف ہے اور اس کا کام بھی مختلف ہے، اسی طرح دوسرے حصے بھی نہ اپنے کام کے لحاظ سے اور نہ اور کسی لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہ ہیں؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا یہی صورت نیکی کے حصوں کی ہے؟ کیا وہ بھی ایک دوسرے سے اپنی ماہیت اور اپنے کام کے لحاظ سے مختلف ہیں؟ اس لیے کہ ظاہر ہے یہ تشبیہ اسی پر دلالت کرتی ہے۔"

"ہاں سقراط تمھارا یہ خیال صحیح ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لیے کہ ظاہر ہے یہ تشبیہ اسی پر دلالت کرتی ہے۔"

"تو نیکی کا کوئی اور حصہ علم یا عدل یا شجاعت یا عفت یا دین داری سے مشابہ نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

اچھا تو اب آؤ، ذرا ان کی ماہیت کی تحقیقات کریں۔ پہلے یہ بتاؤ تم مجھ سے اس بات میں متفق ہو یا نہیں کہ عدل میں کسی چیز کی خاصیت پائی جاتی ہے میری تو یہی رائے ہے۔ کیا تمھاری نہیں ہے؟"

"میری بھی ہے۔"

"اور فرض کرو کہ کوئی شخص ہم سے پوچھے اے 'پروٹاگورس' اور اے

سقراط، یہ چیز جس کو تم عدل کہتے ہو، اس کی خاصیت عدل ہی یا ظلم؟ اور میں جواب دوں کہ عدل تو تم میری تائید کروگے یا تردید؟"

"تائید کروں گا۔"

"تو میں پوچھنے والے کو یہ جواب دوں گا کہ عدل کی خاصیت عدالت ہی۔ ہی کہ نہیں؟"

"ٹھیک ہی۔"

اور فرض کرو کہ وہ یہ بھی پوچھے "اچھا یہ بتاؤ کیا دین داری بھی کوئی چیز ہی؟ تو میرے خیال میں ہم یہی جواب دیں گے کہ ہاں۔"

"بے شک۔"

"تم بھی اسے کوئی چیز مانتے ہو۔ ہی کہ نہیں۔"

اُس نے اس سے اتفاق کیا۔

"اور جو وہ پوچھے کہ کیا اس چیز میں دین داری کی خاصیت ہی یا بے دینی کی؟ تو مجھے اس سوال پر غصّہ آجائے گا اور میں کہوں گا۔ ارے بھلے آدمی کیوں خواہ مخواہ میرا سر کھاتے ہو۔ اگر دین داری میں دین داری کی صفت نہ ہوگی تو اور کاہے میں ہوگی؟ تمھاری کیا رائے ہی؟ تم بھی یہی جواب دوگے نا؟"

"یقیناً۔"

"اور اگر وہ اس کے بعد آکر سوال کرے، ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟ شاید میں نے غلط سنا ہو مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ تم نے کہا نیکی کے مختلف حصّے ایک سے نہیں ہوتے، تو میں جواب دوں گا 'سنا تو تم نے بالکل صحیح مگر تمھارا یہ خیال غلط ہی کہ تم نے مجھ سے سُنا میں نے تو صرف سوال کیا تھا جواب پروٹاگورس نے دیا تھا، اور فرض کرو وہ تمھاری طرف مخاطب ہو کر کہے' کیا

یہ سچ ہے پروٹاگورس؟ کیا تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ نیکی کا ہر حصہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے ــــــ تو تم اسے کیا جواب دوگے؟

"مجھے اقرار کرنا پڑے گا سقراط کہ جو وہ کہتا ہے ٹھیک ہے۔"

"اچھا پروٹاگورس، یہ سب باتیں ہم نے مان لیں۔ اب فرض کرو کہ اس کے آگے وہ یہ کہے تو پھر دین داری میں عدل کی خاصیت نہیں ہوتی اور نہ عدل میں دین داری کی بلکہ بے دینی کی۔ اسی طرح دین داری میں عدل کی نہیں بلکہ ظلم کی خاصیت ہوتی ہے، تو ہم اسے کیا جواب دیں گے؟ میں اپنی طرف سے تو یقیناً یہ کہوں گا کہ عدل دین داری کی صفت ہے اور دین داری عدل کی۔ اور اگر تمہاری اجازت ہوگی تو تمہاری طرف سے بھی یہی کہوں گا کہ عدل بالکل یا قریب قریب وہی چیز ہے جو دین داری۔ اور یہ تو میں دعوے سے کہوں گا کہ عدل دین داری سے مشابہ ہے اور دین داری عدل سے۔ میں تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میں تمہاری طرف سے یہ جواب دے سکتا ہوں؟ اور تم مجھ سے اتفاق کروگے؟"

"میں تو اس قضیے سے اتفاق کر ہی نہیں سکتا سقراط کہ عدل میں دین داری کی خاصیت ہے اور دین داری میں عدل کی۔ اس لیے کہ مجھے ان دونوں میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ مگر کیا حرج ہے؟ اگر تمہاری یہ خوشی ہے تو میری بھی یہی خوشی ہے اگر تم چاہتے ہو تو میں یہ مانے لیتا ہوں کہ عدل میں دین داری اور دین داری میں عدل کی خاصیت ہے۔"

"قصور معاف میں 'اگر تمہاری خوشی ہو' ــ اور 'اگر تمہاری مرضی ہو' والا نتیجہ ثابت نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنے اور تمہارے قول کو ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اچھا ثبوت وہ ہے جس میں اگر مگر کچھ نہ ہو۔"

"اچھا میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ عدل دین داری سے مشابہ ہی اس لیے کہ کوئی نقطۂ نظر ایسا ضرور ہوتا ہی جس کے لحاظ سے ہر چیز، ہر چیز سے مشابہ ہوتی ہی۔ سفید ایک لحاظ سے سیاہ سے اور سخت نرم سے مشابہ ہی۔ اسی طرح انتہائی اضداد میں کوئی نہ کوئی صفت مشترک ہوتی ہی۔ یہاں تک کہ چہرے کے مختلف حصے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اگرچہ ایک دوسرے سے الگ ہیں اور الگ الگ کام رکھتے ہیں پھر بھی ایک لحاظ سے یکساں ہیں اور ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ اور تم اس اصول پر کہ سب چیزیں ایک دوسرے سے مشابہ ہوتی ہیں انھیں بھی ایک دوسرے سے مشابہ ثابت کر سکتے ہو۔ حالانکہ اشیا کو محض کسی ایک جزکی مشابہت کی بنا پر ایک دوسرے سے مشابہ کہنا چاہیے اور نہ محض خفیف اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف۔"

اس پر میں نے تعجب کے لہجے میں کہا "کیا تمھارے خیال میں عدل اور دین داری میں محض خفیف سی مشابہت ہی؟"

"نہیں۔ مگر مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں جو تمھارے ذہن میں ہی۔"

"اچھا چونکہ اس کے ماننے میں بظاہر تمھیں دقت محسوس ہوتی ہی اس لیے ہم ان چیزوں میں سے جن کا تم نے ذکر کیا تھا۔ کوئی اور مثال لیے لیتے ہیں۔ تم حماقت کے وجود کو مانتے ہو۔"

"ہاں مانتا ہوں۔"

"کیا دانش مندی حماقت کی ضد نہیں ہی؟"

"ضرور ہی۔"

"اور جب لوگ مناسب اور مضبوط طریقے سے کام کرتے ہیں تو تمھیں ان کے فعل میں اعتدال نظر آتا ہی۔"

"ہاں"۔

"اور یہ اعتدال عفت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے؟"

"یقیناً"۔

"اور جو لوگ مناسب طریقے سے کام نہیں کرتے وہ حماقت کرتے ہیں اور ان کے فعل میں اعتدال نہیں ہوتا"۔

"ٹھیک ہے"۔

"تو حماقت سے کام کرنا اعتدال سے کام کرنے کی ضد ہے؟"

اس نے اس سے اتفاق کیا

"اور حماقت کے فعل حماقت کی وجہ سے اور اعتدال کے کام عفت کی وجہ سے کیے جاتے ہیں؟"

اس نے اس سے اتفاق کیا

"اور جو کام مضبوطی سے کیا جائے وہ طاقت کی وجہ سے اور جو کمزوری سے کیا جائے وہ ناطاقتی کی وجہ سے ہوتا ہے؟"

اس نے اتفاق کیا

"اور جو کام تیزی سے کیا جائے وہ تیز اور جو آہستگی سے کیا جائے وہ آہستہ ہوتا ہے؟"

اس نے پھر اتفاق کیا

"اور جو کام ایک خاص طریقے سے کیا جائے اس کی ایک خاص وجہ ہوتی ہے درجو اس سے متضاد طریقے سے کیا جائے اس کی متضاد وجہ ہوتی ہے"۔

اس نے اتفاق کیا

"اچھا ایک بات اور بتادو کہ کوئی شے حسین ہوتی ہے یا نہیں!"

"ہوتی ہے"۔

"جس کی ایک ہی ضد ہے یعنی قبیح ؟"

"اس کے سوا کچھ نہیں"۔

"اور کوئی شے نیک ہوتی ہے ؟"

"ہوتی ہے"۔

"جس کی ضد ایک ہی ہے یعنی بد ؟"

"اس کے سوا اور کچھ نہیں"۔

"کوئی آواز باریک ہوتی ہے ؟"

"بے شک"۔

"جس کی ضد صرف ایک ہی ہے یعنی موٹی آواز ؟"

"ہاں ایک ہی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں"۔

"غرض ہر چیز کی صرف ایک ہی ضد ہوتی ہے۔ ایک سے زیادہ نہیں ہوتیں"

اس نے اس سے اتفاق کیا

"اچھا تو ہم نے اب تک جتنی باتیں مانی ہیں انھیں ایک بار پھر دُہرا لیں۔ اول ہم نے یہ تسلیم کیا کہ ہر چیز کی صرف ایک ہی ضد ہوتی ہے ایک سے زیادہ نہیں ہوتی ؟"

"ہاں تسلیم کیا تھا"۔

اور ہم نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ جو کام متضاد طریقے سے کیا جائے اس کی وجہ متضاد ہوتی ہے ؟"

"ہاں"۔

"اور ہم نے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ جو کام حماقت سے کیا جائے اس کا طریقہ

ضد ہو اس کام کے طریقے کی جو اعتدال سے کیا جائے ؟"

"ہاں"۔

"اور جو کام اعتدال سے کیا جائے اس کی وجہ عفت اور جو حماقت سے کیا جائے اس کی وجہ حماقت ہوتی ہو ؟"

اس نے اتفاق کیا

"اور جو کام متضاد طریقے سے کیا جائے اس کی وجہ متضاد ہوتی ہو؟"

"ہاں"۔

"جو کام عفت سے کیا جائے وہ کچھ اور ہوتا ہو اور جو حماقت سے کیا جائے وہ کچھ اور ہوتا ہو ؟"

"ہاں"۔

"اور ان کے طریقے ایک دوسرے کی ضد ہیں ؟"

"بے شک"۔

"اس لیے ان کی وجوہ بھی ایک دوسرے کی ضد ہیں یعنی حماقت، عفت کی ضد ہو ؟"

"ظاہر ہو"۔

"اور تمھیں یاد ہو نا کہ ہم یہ پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ حماقت دانش مندی کی ضد ہو ؟"

اس نے اتفاق کیا

"اور ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر چیز کی صرف ایک ہی ضد ہوتی ہو ؟"

"ہاں"۔

تو پھر پروتاگورس ہم دو دعووں میں سے کس کو ترک کریں ؟ ایک تو یہ ہو

کہ ہر چیز کی صرف ایک ہی ضد ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ دانش مندی عفت سے جدا ہے اور دونوں نیکی کے حصے ہیں اور وہ اپنی ماہیت اور کام کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جُدا ہی نہیں بلکہ چہرے کے حصوں کی طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تو اب یہ بتاؤ کہ ان دونوں دعووں میں سے ہم کسے ترک کریں؟ اس لیے یہ تو ظاہر ہے کہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں اور ان میں کسی طرح مطابقت نہیں ہو سکتی بھلا ہم انھیں کیونکر ایک دوسرے کے مطابق کہہ سکتے ہیں، جب ایک طرف یہ مانا جا چکا ہے کہ ہر چیز کی ایک ہی ضد ہوتی ہے ایک سے زیادہ نہیں ہوتی اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ حماقت ایک چیز ہے اور اس کی ضد دو ہیں — — دانش مندی اور عفت۔ ہے نا پروٹاگورس؟ تم یہی کہو گے نا؟"

اس نے اتفاق تو کیا مگر بادل ناخواستہ

"تو پھر عفت اور دانش مندی ایک ہی چیز ہے جیسے پہلے عدل اور دین داری ہمیں قریب قریب ایک ہی چیز معلوم ہوئی تھی۔ آؤ پروٹاگورس، اس بحث کو ختم ہی کر لیں۔ ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے کیا تمھارے خیال میں ایک بے انصاف آدمی اپنی بے انصافی میں اعتدال سے کام لے سکتا ہے؟

"مجھے تو یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، سقراط، مگر بہت سے لوگ مل جائیں گے جو یہ بات کہیں گے۔"

"تو پھر میں تم سے بحث کروں یا ان لوگوں سے؟"

"میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم مہربانی کر کے پہلے ان لوگوں سے بحث کر لو۔"

"جیسی تمھاری مرضی۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم مجھے جواب دیتے جاؤ اور یہ کہتے جاؤ کہ تمھیں میری رائے سے اتفاق ہے یا نہیں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ اس دعوے کی صحت کا امتحان کروں مگر ممکن ہے کہ میں جو پوچھنے والا ہوں اور تم جو جواب دینے والے

ہو دونوں ہی کا امتحان ہو جائے۔"

پروٹاگورس پہلے تو دکھانے کے لیے یہ کہہ کر انکار کرتا رہا کہ یہ بحث کچھ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ آخر جواب دینے پر راضی ہوگیا۔

میں نے کہا "تو آؤ ہم شروع سے چلتے ہیں۔ تم مجھے جواب دیتے جاؤ تمھارا خیال ہے کہ بعض لوگ باوجود بے انصاف ہونے کے باعفت ہوتے ہیں۔"

"ہاں میں یہ مانے لیتا ہوں"۔

"اور عفت مصلحت اندیشی کا نام ہے"۔

"ہاں"۔

"اور مصلحت اندیشی کے معنی یہ ہیں کہ سوچ سمجھ کر بے انصافی کی جائے؟"

"ٹھیک ہے"۔

"اگر اس میں کامیابی ہو؟ یا ناکامی کی صورت میں بھی؟"

"اگر کامیابی ہو"۔

"اور تم نیکی کے قائل ہو؟"

"ہاں"۔

"اور نیکی وہی ہے جو انسان کی مصلحت کے مطابق ہو؟"

"ہاں، بے شک، مگر بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو خلافِ مصلحت ہیں، پھر بھی میں انھیں اچھا سمجھتا ہوں۔"

مجھے یہ خیال ہوا کہ پروٹاگورس کچھ برہم اور جز بز ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے کام سے کام رکھا اور آہستہ سے کہا "پروٹاگورس جب تم یہ کہتے ہو کہ خلافِ مصلحت چیزیں اچھی ہوتی ہیں تو تمھاری مراد ان چیزوں سے ہے جو صرف انسان کے لیے خلافِ مصلحت ہیں یا

علی العموم خلافِ مصلحت ہ؟ کیا تم آخر الذکر کو اچھا کہتے ہو؟"

اس نے جواب دیا "ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں بہت سی چیزیں ــــــ گوشت اور شراب کی بعض قسمیں، دوائیں اور ہزارہا اشیا ہیں جن کا استعمال ان کے لیے خلافِ مصلحت ہ اور بعض ایسی بھی ہیں جن کا استعمال مصلحت کے مطابق ہ۔ بعض ہیں جو انسان کے لیے نہ مفید ہیں نہ مضر، بلکہ صرف گھوڑوں کے کام کی ہیں، بعض بیلوں کے اور بعض کتوں کے کام کی بعض جانوروں کے نہیں بلکہ درختوں کے کام کی۔ بعض درختوں کی جڑوں کے کام کی ہیں مگر ان کی شاخوں کے لیے اچھی نہیں مثلاً کھاد جو درخت کی جڑیں دی جائے تو بہت مفید ہ لیکن اگر شاخوں اور ٹہنیوں پر ڈال دی جائے تو مہلک ہ یا مثلاً زیتون کے تیل کو لے لو جو سب پودوں کے لیے مضر ہ اور عموماً انسان کے سوا سب جانوروں کے بالوں کے لیے نہایت نقصان دہ لیکن انسان کے بالوں اور اس کے جسم کے لیے مفید ہ اور اس طور پر استعمال کرنے میں بھی (جس کے مختلف طریقے اور مختلف تاثیریں ہیں) وہی چیز جو جسم انسانی کے بیرونی حصوں کے لیے نہایت اچھی ہ اس کے اندرونی حصوں کے لیے بے حد بُری۔ اسی لیے اطبا ہمیشہ اپنے مریضوں کو غذا میں تیل کے استعمال کی ممانعت کرتے ہیں بجز اس کے کہ وہ بہت کم مقدار میں استعمال کیا جائے۔ یعنی صرف گوشت کی لساند دور کرنے کے لیے یا چٹنی کے لیے۔"

جب اس کا یہ جواب ختم ہو گیا تو لوگوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیے۔ میں نے کہا "پروٹاگورس میرا حافظہ بہت خراب ہ۔ جب کوئی لمبی تقریر کرتا ہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہ۔ اگر میں بہرا ہوتا اور تم مجھ سے باتیں کرتے تو تمھیں آواز اونچی کرنی پڑتی۔ اسی طرح اپنے حافظے کی خرابی کی وجہ سے میں یہ درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے جوابوں میں اختصار سے کام لو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں بحث

میں تمھارے ساتھ چل سکوں"۔

"اس سے تمھارا کیا مطلب۔ میں اختصار کیوں کر کروں کیا حد سے زیادہ مختصر جواب دوں"۔

"ہرگز نہیں"۔

"بلکہ مناسب حد تک مختصر"۔

"ہاں"۔

"تو ایسے جواب دوں جو مجھے مناسب حد تک مختصر معلوم ہوں یا تھیں؟"

"میں نے سنا ہی کہ تم لوگوں کو اس قدر شرح و بسط سے گفتگو کرنا بھی سکھاتے ہو کہ الفاظ امڈے چلے آتے ہیں اور اس قدر اختصار سے بھی کہ کم سے کم لفظ استعمال کیے جائیں۔ اس لیے مہربانی کر کے اگر تم مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو تو یہ دوسرا یعنی اختصار کا طریقہ اختیار کرو"۔

"سقراط میں نے بارہا الفاظ کی لڑائیاں لڑی ہیں اگر میں بحث کا وہ طریقہ اختیار کرتا جو میرے حریف چاہتے تھے جیسے کہ تم اس وقت چاہتے ہو تو مجھے دوسروں پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہوتی اور کوئی پروٹاگورس کا نام بھی نہ جانتا"۔

میں نے دیکھا کہ وہ اپنے پچھلے جوابوں سے مطمئن نہیں ہی اور اب جہاں تک ہو سکے گا جواب دینے سے پہلو تہی کرے گا۔ میں نے سوچا کہ مجھے کیا پڑی ہی کہ میں گفتگو جاری رکھوں۔ اس لیے میں نے کہا "پروٹاگورس اگر تمھارا دل گفتگو کرنے کو نہیں چاہتا تو میں تمھیں مجبور نہیں کرتا، مگر اب میں بحث، اسی صورت میں کروں گا جب تم اس طریقے سے بحث کرو کہ میں سمجھ سکوں۔ تم تو جیسا کہ دوسرے کہتے ہیں اور تم خود کہتے ہو طویل تقریر بھی کر سکتے ہو اور مختصر بھی اس لیے کہ تم

حکمت کے ماہر ہو مگر میں لمبی تقریروں کو نہیں سنبھال سکتا - کاش! مجھ میں یہ قابلیت ہوتی - تو اب چونکہ تم دونوں طرح سے تقریر کر سکتے ہو تمھیں چاہیے کہ اختصار سے کام لو۔ اسی صورت میں ہم دونوں کی گفتگو ممکن ہی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تمھارا یہ منشا نہیں ہی اور مجھے ایک کام ہی جس کی وجہ سے میں تمھاری مفصل تقریر سننے کے لیے نہیں ٹھیر سکتا (کیونکہ مجھے دوسری جگہ جانا ہی) اب میں جاتا ہوں اگرچہ تمھاری تقریر سننے کو بہت جی چاہتا ہی۔

میں یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا کہ کیلیاس نے سیدھے ہاتھ سے مجھ کو اور الٹے ہاتھ سے میرے پرانے لبادے کو پکڑ لیا۔ اس نے کہا "سقراط ہم تمھیں نہیں جانے دیں گے، اس لیے کہ اگر تم چلے گئے تو ہماری بحث ختم ہو جائے گی میری التجا ہی کہ تم ٹھیر جاؤ اس لیے کہ مجھے تمھاری اور پروٹاگورس کی گفتگو سننے کا اس قدر شوق ہی کہ دنیا کی اور کسی چیز کا نہیں - ہم سب لوگوں کو جو یہاں موجود ہیں اس مسرت سے محروم نہ کرو۔"

اب میں اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اسے جواب دیا "ہپونکس کے بیٹے، میں نے تمھارے فلسفیانہ ذوق کی ہمیشہ تعریف کی ہی اور اب بھی دل سے تعریف کرتا ہوں اور اگر ہو سکتا تو میں تمھاری فرمایش ضرور پوری کرتا۔ مگر سچی بات یہ ہی کہ میں مجبور ہوں۔ جو تم مجھ سے چاہتے ہو وہ میرے لیے اس قدر ناممکن ہی جیسے تم مجھ سے کریسن سیمیری کے ساتھ جب کہ وہ جوان تھا یا کسی اور لمبے دوڑنے والے کے ساتھ دوڑنے کو کہتے۔ اس فرمایش کے جواب میں میں یہ کہتا کہ میں بھی اپنی ٹانگوں سے یہی چاہتا ہوں مگر وہ انکار کرتی ہیں۔ اس لیے کہ اگر تم مجھے اور کریسن کو ایک ہی ورزش گاہ میں دوڑتے دیکھنا چاہتے ہو تو اس سے کہو کہ وہ اپنی رفتار کم کر کے میرے برابر کرے۔ اس لیے کہ میں تیز نہیں دوڑ سکتا مگر وہ آہستہ

دوڑ سکتا ہی۔ اسی طرح اگر تم میری اور پروٹاگورس کی گفتگو سننا چاہتے ہو تو اس سے کہو کہ مختصر جواب دے اور اصل موضوع سے نہ ہٹے جیسا اس نے پہلے کیا تھا۔ اگر یہ نہ ہوا تو بحث کیونکر ہو سکتی ہی؟ اس لیے کہ میری ناچیز رائے میں بحث اور چیز ہی اور خطبہ دینا اور چیز۔"

کیلیاس نے کہا "مگر یہ تو دیکھو سقراط کہ پروٹاگورس کا یہ مطالبہ کہ وہ اپنے انداز سے تقریر کرے جیسا کہ تم اپنے انداز میں کرتے ہو کچھ بے جا تو نہیں ہی؟"

اس مقام پر الکی بیادیس نے بات کاٹ کر کہا "کیلیاس تم نے صورت حال صحیح بیان نہیں کی اس لیے کہ ہمارا دوست سقراط یہ تسلیم کرتا ہی کہ وہ تقریر نہیں کر سکتا ــــــ اس معاملے میں وہ پروٹاگورس سے ہار مانتا ہی لیکن اگر بحث کرنے میں وہ دنیا میں کسی شخص سے ہار مان جائے تو مجھے تعجب ہوگا۔ اب اگر پروٹاگورس بھی اسی طرح اعتراف کرلے کہ وہ بحث میں سقراط سے ہیٹا ہی تو سقراط کے لیے یہ کافی ہی۔ لیکن اگر اس کا دعویٰ ہی کہ وہ بحث کرنے میں بھی اس سے بڑھ کر ہی تو اسے چاہیے کہ سوال جواب کرے ــــــ یہ نہیں کہ جب کوئی سوال پوچھا جائے تو موضوع سے ہٹ جائے اور بجائے جواب دینے کے ایک طول طویل تقریر شروع کردے تاکہ سننے والے اصل بات کو بھول جائیں (مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ سقراط بھولنے والا ہی ــــــ یہ میرا ذمہ ہی کہ وہ کبھی نہیں بھولنے کا اگرچہ وہ مذاق میں اپنے حافظے کی خرابی کا بہانہ کرتا ہی، مجھے تو پروٹاگورس کے مقابلے میں سقراط حق بجانب معلوم ہوتا ہی۔ یہ میری رائے ہی اور ہر شخص کو چاہیے کہ اپنا اپنا خیال ظاہر کرے۔"

جب الکی بیادیس اپنی بات ختم کرچکا تو کسی شخص نے ــــــ شاید کریٹیاس نے کہا اے پروڈیکس اور ہپیاس مجھے ایسا معلوم ہوتا ہی کہ کیلیاس

پروٹاگورس کا طرف دار ہے اس لیے الگی بیاد دیں جسے مخالفت کا شوق ہے دوسرے فریق کا طرف دار بن گیا۔ لیکن ہمیں نہ تو سقراط کی طرفداری کرنی چاہیے اور نہ پروٹاگورس کی بلکہ سب کو مل کر ان دونوں سے یہ درخواست کرنی چاہیے کہ اس صحبت کو درہم برہم نہ ہونے دیں۔"

پروڈیکس نے کہا "کریٹیاس یہ تم نے بہت خوب بات کہی، اس لیے جو لوگ ایسی صحبتوں میں موجود ہوں انھیں غیر جانب داری سے فریقین کی بات سننی چاہیے مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غیر جانب داری کے معنی برابری کے نہیں۔ گفتگو دونوں کی غیر جانب داری سے سننی چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ دونوں کی یکساں تعریف کی جائے بلکہ جو زیادہ دانش مند ہے وہ زیادہ تعریف کا مستحق ہے اور جو کم دانش مند ہے وہ کم کا۔ میری اور کریٹیاس دونوں کی پروٹاگورس اور سقراط سے درخواست ہے کہ وہ ایک دوسرے بحث کریں، نزاع نہ کریں۔ اس لیے بحث تو دوستوں میں آشتی سے ہوتی ہے اور نزاع صرف حریفوں اور دشمنوں میں ہوا کرتی ہے اگر ایسا ہو تو یہ صحبت بہت پُرلطف ہوگی کیونکہ اس طرح ہم لوگ جو سننے والے ہیں ان دونوں کی صرف تعریف ہی نہیں بلکہ تحسین کریں گے اس لیے کہ تحسین ایک خلوص کی کیفیت ہے جو سننے والوں کے دل میں پیدا ہوتی ہے لیکن تعریف اکثر لوگ جھوٹ موٹ اپنے عقیدے کے خلاف بھی کر دیتے ہیں اور ہم سننے والوں کو صرف لذت نہیں بلکہ تسکین حاصل ہوگی، اس لیے کہ تسکین قلب سے تعلق رکھتی ہے اور اس وقت میسر ہوتی ہے جب ہم علم و حکمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں مگر لذت صرف جسم تک محدود ہے اور اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کھانا کھاتے ہیں یا کوئی اور جسمانی لطف حاصل کرتے ہیں۔" پروڈیکس کی یہ بات سُن کر بہت سے لوگوں نے اظہار تحسین کیا۔

اس کے بعد دانش مند ہپیاس نے تقریر کی اس نے کہا "میں تم سب

لوگوں کو جو یہاں جمع ہیں عزیز اور دوست اور ہم وطن سمجھتا ہوں۔ قانون کی رُو سے نہیں بلکہ فطرت کی رُو سے، اس لیے کہ فطرت کے مطابق ہم جنس چیزیں ایک دوسرے سے قریب ہوتی ہیں مگر قانون نوعِ انسانی کا مستبد حکمراں ہے اور ہمیں اکثر بہت سے خلافِ فطرت کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ کتنی شرم کی بات ہوگی اگر ہم لوگ جو اشیا کی حقیقت کو جانتے ہیں یونانیوں میں سب سے زیادہ دانش مند ہیں اور اس شہر میں جو حکمت کا مرکز اور اس گھر میں جو شہر میں سب سے زیادہ شاندار ہے جمع ہوئے ہیں بجائے ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کے جو اس کی عظمت و شان کے شایاں ہو ادنیٰ ترین انسانوں کی طرح آپس میں تُو تُو میں میں کریں۔ پروٹاگورس میں تم سے اور سقراط تم سے یہ درخواست کرتا ہوں اور تمھیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ مصالحت کرلو۔ ہم لوگ صلح کرانے کے لیے تیار ہیں۔ سقراط اگر پروٹاگورس نہیں چاہتا تو تم تقریر میں انتہائی اختصار برتنے پر اصرار نہ کرو بلکہ ناطقے کی باگیں ڈھیلی کردو تاکہ تمھارے الفاظ زیادہ پُرشوکت اور تمھارے شایانِ شان ہوں اور تم بھی پروٹاگورس یہ نہ کرو کہ تیز ہوا پر سوار، بادبان چڑھائے، الفاظ کے سمندر میں، کنارے سے دُور ہٹتے چلے جاؤ بلکہ تم دونوں اعتدال کا لحاظ رکھو جو میں کہتا ہوں وہی کرو اور میری بات مان لو کہ ایک پنچ یا ناظر یا صدر منتخب کرلو وہ تمھاری تقریروں کی نگرانی کرتا رہے گا اور اس کا خیال رکھے گا کہ وہ زیادہ طویل نہ ہونے پائیں۔"

تجویز کو کل حاضرین نے بہت پسند کیا۔ کیلیاس نے مجھ سے کہا کہ میں تم کو نہیں چھوڑوں گا اور یہ درخواست کی کہ ایک پنچ چُن لو۔ مگر میں نے یہ کہا تقریر کے لیے کوئی ثالث مقرر کرنا نامناسب ہوگا اس لیے کہ اگر وہ شخص جو منتخب کیا جائے مرتبے میں کم ہو تو کم تر کو برتر کی نگرانی کرنے کا حق نہیں ہے اور اگر وہ برابر کا ہو تب بھی اچھا نہیں اس لیے کہ جو شخص ہمارے برابر کا ہو وہ وہی کرے گا جو ہم کرتے ہیں پھر

پنچ بنانے سے کیا فائدہ اور اگر تم یہ کہو کہ "ہم کسی بہتر آدمی کو مقرر کریں" ـــــ تو میں یہ جواب دوں گا کہ پروٹاگورس سے زیادہ دانش مند کوئی مل ہی نہیں سکتا. اگر تم کسی اور شخص کو جو حقیقت میں اس سے بہتر نہ ہو، بہتر کہہ کر منتخب کرو اور دوسرے کو اس کا نگراں بناؤ گویا وہ کوئی ادنیٰ درجہ کا آدمی ہے تو یہ اس کی توہین ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے توہین کی پروا نہیں۔ اب مجھ سے سنو کہ میں کیا کروں گا تاکہ تمھاری مرضی کے مطابق گفتگو اور بحث ہو سکے۔ اگر پروٹاگورس جواب دینا نہیں چاہتا تو وہ سوال کرے میں جواب دوں گا اور اسی کے ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ میں اس سے کس طرح کا جواب چاہتا ہوں۔ جب وہ جی بھر کے سوال کر چکے تو پھر اسی طرح میرے سوالوں کا جواب دے اور اگر وہ اس سوال کا جو اس سے پوچھا جائے ٹھیک ٹھیک جواب دینے پر آمادہ نہ ہو تو تم اور میں مل کر اس سے درخواست کریں گے جیسے تم نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ بحث کو خراب نہ کرو اور اس کے لیے کسی خاص پنچ کی ضرورت نہیں ہوگی ـــ تم سب ہی پنچ ہوگے"۔

یہ بات عام طور پر پسند کی گئی اور پروٹاگورس کو با دل ناخواستہ یہ منظور کرنا پڑا کہ وہ سوالات پوچھے اور جب کافی سوال کر چکے تو پھر اس کی باری آئے گی کہ جو سوال اس سے پوچھے جائیں ان کا مختصر جواب دے۔ اس نے اس طرح سوال کرنا شروع کیا۔

"میری رائے میں سقراط شعر فہمی کا سلیقہ تعلیم کا جزو اعظم ہے۔ اور میں اس سے مراد لیتا ہوں یہ تمیز کر سکنا کہ شاعروں کی کون سی نظمیں صحیح ہیں کون سی نہیں ہیں، اور ان میں کیا فرق ہے اور یہ سمجھا سکنا کہ اس فرق کی کیا وجہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس مسئلے پر تم میں اور مجھ میں بحث ہو رہی تھی اسے شاعری کے میدان میں منتقل کر دیں۔ ہم بدستور نیکی کا ذکر کریں گے لیکن ایک شاعر کے اشعار کے سلسلے میں

سمونائیڈیس کریون تھسالوی کے بیٹے اسکوپاس سے کہتا ہے :۔

"ایک طرف یہ درحقیقت مشکل ہے کہ انسان نیک ہو جائے، ہاتھوں، پیروں اور دماغ ان سب کے لحاظ سے مکمل، ہر عیب سے پاک"۔

"تمھیں یہ نظم یاد ہے یا میں ساری پڑھ کر سناؤں ؟"

میں نے کہا" نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ——— میں نے بہت غور سے پڑھی ہے"۔

"بہت اچھا۔ اب یہ بتاؤ کیا وہ تمھارے خیال میں اچھی نظم ہے اور سچی ؟"

"ہاں اچھی بھی اور سچی بھی"۔

"لیکن اگر اس میں تناقض موجود ہو تو پھر یہ اچھی اور سچی نظم کہلائے گی ؟"

"نہیں اس صورت میں تو نہیں کہلائے گی"۔

"تو کیا اس میں کوئی تناقض نہیں ہے ؟ سوچ لو"۔

"ہاں میرے دوست میں نے سوچ لیا"۔

"تو کیا شاعر آگے چل کر یہ نہیں کہتا ہے۔ مجھے پٹاکس کے قول سے اتفاق نہیں اگرچہ یہ ایک دانش مند کا قول ہے: مشکل ہے کہ کوئی انسان نیک ہو؟ اب غور کرو کہ یہ اسی شاعر نے کہا ہے"۔

"مجھے معلوم ہے"۔

"تو کیا تمھارے خیال میں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں ؟"

"ہاں میرے خیال میں تو رکھتے ہیں (مگر ساتھ ہی میرے دل میں بے اختیار یہ اندیشہ ہوا کہ شاید اس کا یہ کہنا صحیح ہو) کیا تمھارا خیال کچھ اور ہے"۔

"بھلا ان دونوں باتوں میں مطابقت کیونکر ہو سکتی ہے ؟ پہلے تو وہ اپنے خیال کی حیثیت سے اسے پیش کرتا ہے: مشکل ہے کہ کوئی انسان حقیقتاً نیک بن سکے

اور اسی نظم میں کچھ دور آگے چل کر یہ بھول جاتا ہے۔ اور پٹاکس کے اس قول پر اعتراض کرتا ہے اور اس کے تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے "مشکل ہے کوئی انسان نیک ہو"، حالانکہ یہ بھی وہی بات ہے جب وہ اس شخص پر اعتراض کرتا ہے جس نے وہی بات کہی جو خود اس نے کہی تھی تو گویا اپنے آپ پر اعتراض کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا یا تو پہلا قول غلط ہے یا دوسرا قول غلط ہے۔"

اکثر حاضرین نے اس پر نعرہ ہائے تحسین بلند کیے اور میں نے جب اس کی گفتگو اور نعرہ ہائے تحسین سنے تو پہلے تو میرا یہ حال ہوا کہ چکر آگیا اور دل بیٹھنے لگا۔ جیسے کسی ماہر مکّے باز نے ایک زور کا ہاتھ مارا ہو۔ سچ پوچھو تو میں تھوڑی سی مہلت چاہتا تھا کہ اس پر غور کر سکوں کہ شاعر کا مفہوم درحقیقت کیا ہے۔ اس لیے میں نے پروڈیکس کی طرف متوجہ ہو کر اسے پکارا میں نے کہا پروڈیکس، سمونائیڈیس تمھارا ہم وطن ہے اور تمھیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ جس طرح ہومر کے ہاں دریائے اسکے مینڈر نے جب وقت ایچلیس نے اس کا محاصرہ کیا تھا سموئیس کو اپنی مدد کے لیے بلایا تھا ان الفاظ کے ساتھ: پیارے بھائی آؤ ہم دونوں مل کر اس سورما کی ٹکر کو روکیں۔ میں تم کو مدد کے لیے بلاتا ہوں اس لیے کہ مجھے خوف ہے کہ پروٹاگورس، سمونائیڈیس کا خاتمہ کر دے گا۔ یہی وقت ہے کہ تم سمونائیڈیس کی ساکھ کو دوبارہ قائم کر دو اپنے فلسفۂ مترادفات جس کی بدولت تم "چاہنے اور خواہش کرنے" میں تفریق کرتے ہو اور اسی قسم کے دوسرے دلچسپ فرق نکالتے ہو جیسا کہ تم نے ابھی کیا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم اس سے اتفاق کرتے ہو یا نہیں۔ اس لیے کہ میرے خیال میں تو سمونائیڈیس کے الفاظ میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو بتاؤ پروڈیکس کیا تمھارے نزدیک "ہونا" اور "ہو جانا" ایک ہی چیز ہے؟

پروڈیکس نے جواب دیا "نہیں ہرگز ایک چیز نہیں"۔

"کیا سموناٸیڈیس نے خود اپنی طرف سے یہ راے ظاہر نہیں کی تھی کہ مشکل ہے کہ کوئی انسان حقیقتاً نیک ہو جائے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"تو پھر وہ پٹاکس پر اس لیے اعتراض نہیں کرتا جیسا پروٹاگورس نے سمجھ رکھا ہے کہ اس نے وہی بات کہی جو خود اس نے (سموناٸیڈیس نے) کہی تھی، بلکہ اس لیے کہ اس نے کچھ اور ہی بات کہی، پٹاکس سموناٸیڈیس کی طرح یہ نہیں کہتا کہ مشکل ہے انسان نیک ہو جائے بلکہ یہ کہتا ہے کہ "مشکل ہے کہ انسان نیک ہو" اور ہمارا دوست پروڈیکس یہ کہے گا، پروٹاگورس، کہ "ہونا" اور "ہو جانا" ایک ہی چیز نہیں ہے۔ اور جب ایک ہی چیز نہیں ہے تو سموناٸیڈیس کے قول میں کوئی تناقض پیدا نہیں ہوتا، شاید پروڈیکس اور بہت سے اور لوگ ہیسیڈ کے ہمزبان ہو کر یہ کہیں گے:

ایک طرف تو یہ مشکل کہ انسان نیک ہو جائے اس لیے کہ دیوتاؤں نے نیکی کو محنت و مشقت کا انعام قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف جب تم ایک بار اس بلندی پر پہنچ جاؤ تو نیکی کا قائم رکھنا آسان ہے خواہ اس کا حاصل کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔"

پروڈیکس نے یہ بات سنی اور پسند کی لیکن پروٹاگورس نے کہا "سقراط تمھاری اصلاح میں اس سے بڑی غلطی موجود ہے، جتنی اس جملے میں تھی جس میں تم اصلاح دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "افسوس پروٹاگورس پھر تو میں بہت ہی نکما طبیب ہوں کہ جس بیماری کا علاج کرنا چاہتا ہوں اسے اور بڑھا دیتا ہوں۔"

"واقعہ تو یہی ہے۔"

"کیسے؟"

"شاعر کبھی ایسی غلطی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کہے کہ نیکی، جسے سب انسان سب سے مشکل چیز سمجھتے ہیں آسانی سے قائم رکھی جا سکتی ہے۔"

"خیر یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ پروڈیکس عین وقت پر یہاں موجود تھا۔ اس لیے کہ پروٹاگورس جو حکمت اس کے پاس ہے وہ میرے خیال میں فوق انسانی ہے اور بہت قدیم ہے شاید سمونائیڈیس کے زمانے کی بلکہ اس سے بھی پہلے کی۔ تم باوجود اپنے علم و فضل کے اس جز سے مطلق واقفیت نہیں رکھتے۔ مگر میں واقف ہوں، اس لیے کہ میں اس کا شاگرد ہوں۔ اب یہی دیکھو نہ کہ میرے خیال میں تم لفظ "مشکل" سے وہ مفہوم نہیں سمجھتے جو سمونائیڈیس کے پیش نظر تھا۔ اور میں اس پر مجبور ہوں کہ تمھیں اصلاح دوں۔ جیسے پروڈیکس مجھے اصلاح دیتا ہے، جب کہ میں لفظ "سخت" کو تعریف کے محل پر استعمال کرتا ہوں۔ اگر میں کہوں کہ پروٹاگورس یا کوئی اور شخص "سخت" دانش مند ہے تو وہ مجھ سے پوچھتا ہے تمھیں شرم نہیں آتی کہ اچھی چیز کے لیے "سخت" کا استعمال کرتے ہو اور پھر یہ سمجھاتا ہے کہ "سخت" ہمیشہ بُرے معنی میں آتا ہے اور کوئی شخص "سخت" تندرست یا "سخت" دولت مند یا "سخت" امن نہیں کہتا بلکہ "سخت" بیماری "سخت" جنگ اور سخت" غربت کہی جاتی ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ لفظ سخت بُرے معنی رکھتا ہے۔ اسی طرح میرے خیال میں سمونائیڈیس اور اس کے ہم وطن کیائی "مشکل" کے لفظ کو برائی کے معنی میں یا کسی اور معنی میں استعمال کرتے تھے جسے تم نہیں جانتے۔ آؤ پروڈیکس سے پوچھیں وہ یقیناً ان سوالات کا جواب دے سکے گا جو سمونائیڈیس کی زبان کے متعلق کیے جائیں۔ بتاؤ پروڈیکس اس نے لفظ "مشکل" کو کس معنی میں استعمال کیا ہے؟"

"برائی کے معنی میں"۔

"اس لیے پروڈیکس، وہ پٹاکس کے اس قول پر کہ "نیک ہونا مشکل ہے"

اعتراض کرتا ہے گویا اس نے یہ کہا کہ "نیک ہونا بُرا ہے۔"

"ہاں یقیناً اس کا یہی مفہوم تھا اور وہ پٹاکس پر یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ الفاظ سے ناواقف ہے جو ایک لیسبیا کے رہنے والے اور غیر یونانی زبان بولنے والے شخص کے لیے قدرتی بات ہے۔"

"پروٹاگورس سنتے ہو ہمارا دوست پروڈیکس کیا کہہ رہا ہے۔ تمھارے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟"

پروٹاگورس نے کہا "پروڈیکس تمھارا خیال غلط ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ سمونائیڈیس نے لفظ "مشکل" کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے جس میں ہم سب استعمال کرتے ہیں "بدی" نہیں وہ چیز جو آسان نہ ہو ـــــ جس میں بہت زحمت اٹھانی پڑے میری تو یہ قطعی رائے ہے۔"

میں نے کہا "میرا بھی یہی خیال ہے پروٹاگورس کہ سمونائیڈیس کا یہی مفہوم تھا۔ ہمارا دوست پروڈیکس بھی اچھی طرح یہ بات جانتا تھا مگر اس نے یہ سوچا ہوگا کہ ذرا دیر دل لگی کرے اور یہ دیکھے کہ تم اپنے دعوے کو ثابت کرسکتے ہو یا نہیں۔ اس کے سوا سمونائیڈیس کا کچھ اور مفہوم ہو ہی نہیں سکتا اور یہ سیاقِ کلام سے صاف ظاہر ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ یہ نعمت صرف خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ بھلا وہ یہ کیسے کہتا کہ نیک ہونا بُرا ہے جب کہ وہ آگے چل کر کہتا ہے کہ یہ نعمت صرف خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے اور یہ صفت صرف اسی کی ہے کسی اور کی نہیں۔ اگر وہ یہ کہتا تو پروڈیکس، سمونائیڈیس پر بے ادب اور بے باک ہونے کا الزام لگاتا جو اس کے ایک ہم وطن سے بہت بعید ہے۔ میں تمھیں یہ بتاؤں کہ میرے خیال میں درحقیقت سمونائیڈیس نے اس نظم میں کس مطلب کو ادا کیا ہے اگر تم اپنی اصطلاح میں میرے ذوقِ شعر کا امتحان لینا چاہتے ہو۔ لیکن اگر تمھاری مرضی ہو تو تم کہو اور میں سنوں۔"

اس پر پروٹاگورس نے کہا "جیسا تم چاہو" ——— اور ہپیاس اور پروڈیکس وغیرہ نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنی تجویز پر عمل کروں۔

میں نے کہا "اچھا تو پھر میں تمھیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ میرا سمونائیڈیس کی اس نظم کے متعلق کیا خیال ہے۔ ایک قدیم فلسفہ ہے جو کریٹ اور لیسی ڈیمونیا میں یونان کے اور حصوں سے زیادہ رائج ہے، اور جتنے فلسفی ان ملکوں میں ہیں دنیا میں کہیں بھی نہیں۔ لیکن یہ ایک راز ہے جسے لیسی ڈیمونیا کے لوگ ظاہر نہیں کرتے وہ جاہل بنتے ہیں تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ ان سوفسطائیوں کی طرح جن کا پروٹاگورس ذکر کر رہا تھا، دنیا پر تلوار کے زور سے نہیں بلکہ حکمت کے زور سے حکومت کرتے ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ اگر ان کی فوقیت کی وجہ ظاہر ہو گئی تو دوسرے بھی ان کی طرح حکمت اختیار کر لیں گے۔ ان کے اس بھید کی ان لوگوں کو آج تک خبر نہیں ہوئی جو دوسرے شہروں میں لیسی ڈیمونیا والوں کی نقالی کرتے ہیں، ان کی تقلید میں زخمی کان لیے پھرتے ہیں اپنے بازوؤں پر بازوبند باندھتے ہیں ہمیشہ ورزش کیا کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے لبادے پہنتے ہیں۔ انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان چیزوں نے لیسی ڈیمونیا والوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ بقیہ یونان کو فتح کر لیں۔ خیر تو جب لیسی ڈیمونیا والے مخلّی بالطبع ہو کر اپنے ہاں کے دانش مندوں سے بے تکلف بات چیت کرنا چاہتے ہیں اور محض خفیہ گفتگو پر قناعت نہیں کرتے تو وہ غیر ملکیوں کو نکال دیتے ہیں اور فلسفیانہ صحبت منعقد کرتے ہیں جس کی باہر والوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنے نوجوانوں کو دوسرے ملکوں میں جانے کی ممانعت کر دیتے ہیں ——— اس میں وہ اہل کریٹ سے مشابہ ہیں ——— تاکہ انھیں جو سبق پڑھائے گئے ہیں وہ نہ بھولنے پائیں۔ لیسی ڈیمونیا اور کریٹ میں نہ صرف مردوں کو بلکہ عورتوں کو بھی اپنی تہذیب پر ناز ہے۔ تمھیں اس بات سے اندازہ

ہو سکتا ہے کہ ہم اہلِ لیسی ڈیمونیا کی طرف یہ صفت منسوب کرنے میں حق بجانب ہیں:۔ اگر کوئی وہاں کے ایک معمولی شخص سے بھی باتیں کرے تو عام گفتگو میں وہ اسے شاذ و نادر ہی اچھا پائے گا مگر موقع موقع سے وہ شخص ایسی مختصر اور پُر مغز بات کہہ دے گا جو تیر کی طرح نشانے پر بیٹھ جائے گی اور جس شخص سے وہ گفتگو کر رہا ہے وہ اس کے سامنے بچہ سا معلوم ہوگا۔ خود ہمارے زمانے کے اور قدیم زمانے کے بہت سے لوگوں کی یہ رائے ہے کہ سچی لیسی ڈیمونی سیرت میں فلسفے کی محبت جمناسٹک کی محبت پر بھی غالب ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسے فقرے صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو مکمل تعلیم یافتہ ہو۔ ایسے لوگ طالیس، ملی ٹس، پٹاکس، میٹلینی، بیاس، پرینی، ہمارا سولن اور کلیو بیولس لنڈی اور مائی سن شینی تھے۔ ساتواں نمبر دانش مندوں کی فہرست میں چیکو لیسی ڈیمونی کا ہے۔ یہ سب لوگ لیسی ڈیمونی تہذیب کے شیدا اور پیرو تھے اور ہر شخص کو صاف نظر آتا ہے کہ ان کی حکمت اسی طرز کی تھی یعنی چھوٹے چھوٹے یادگار جملوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ ڈیلفی میں اپالو کے مندر میں جمع ہوئے اور اپنی حکمت کے پہلے ثمرے کے طور پر انھوں نے یہ مشہور و معروف کتبے مندر میں کندہ کرائے —— "اپنے آپ کو پہچان" "کوئی چیز حد سے زیادہ نہ ہو"۔

"میں سب یہ باتیں کیوں کہہ رہا ہوں۔ میں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اہلِ لیسی ڈیمونیا کا یہ ایجاز و اختصار ابتدائی فلسفے کا خاص طرز تھا۔ اچھا تو پٹاکس کا ایک قول ہے جسے لوگ ایک دوسرے سے نقل کیا کرتے تھے اور سب حکما پسند کیا کرتے تھے:۔ "بہت مشکل ہے نیک ہونا" اور سمونائیڈیس جسے دانش مند کہلانے کا بہت شوق تھا، جانتا تھا اگر وہ اس قول کو غلط ثابت کر دے تو اپنے ہم عصروں میں سب پر سبقت لے جائے گا۔ گویا اس نے ایک مشہور پہلوان کو پچھاڑا ہے اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس نے ساری نظم اسی غرض سے لکھی کہ پٹاکس کو بدنام کرے اور

اس کے قول کو جھٹلائے ۔

"آؤ ہم سب مل کر اس کے الفاظ پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ جو بات میں نے کہی وہ ٹھیک ہے یا نہیں اگر سمونائیڈس صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ نیک ہو جانا مشکل ہے تو وہ کچھ پاگل تھا کہ بیچ میں "ایک طرف" کا لفظ ٹھونس دیتا"۔ ایک طرف یہ مشکل ہے کہ انسان نیک ہو جائے ؟" ایک طرف کا لفظ استعمال کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی سوائے اس کے کہ وہ پٹاکس کے قول پر تعریض کر رہا ہو۔ پٹاکس نے کہا تھا "بہت مشکل ہے نیک ہونا" اور وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ اے پٹاکس مشکل درحقیقت نیک ہو جانا ہے ۔ اس میں درحقیقت کا تعلق نیک سے نہیں بلکہ مشکل سے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حقیقی طور پر نیک ہونا مشکل ہے گویا بعض لوگ تو حقیقی طور پر نیک ہوتے ہیں اور بعض نیک تو ہوتے ہیں مگر حقیقی طور پر نہیں (یہ تو بالکل بیش افتادہ بات ہوتی جو سمونائیڈس کے شایانِ شان نہ تھی) بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ "درحقیقت" کے لفظ کو دوسری طرف راجع کرتا ہے۔ اور اس کے قول کا ترجمہ یوں کرنا چاہیے (یہ فرض کرتے ہوئے کہ پٹاکس نے کوئی بات کہی ہے اور سمونائیڈس اس کا جواب دے رہا ہے) پٹاکس کہتا ہے: "اے میرے دوستو مشکل ہے نیک ہونا" اور سمونائیڈس جواب دیتا ہے" یہ پٹاکس تمھاری غلطی ہے۔ مشکل چیز نیک ہونا نہیں ہے بلکہ ایک طرف نیک ہو جانا، ہاتھ پیر اور دماغ ان سب کے لحاظ سے مکمل عیب سے پاک۔ یہ درحقیقت مشکل ہے۔ اس عبارت کا یہ مطلب لینے سے "ایک طرف" کے استعمال کی بھی توجیہ ہو جاتی ہے اور اس کی بھی کہ" درحقیقت'' کا لفظ جملے کے آخر میں لایا گیا اور بعد کے مصرعوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس نظم کی باریکیوں کی تعریف میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ یہ فن شعر کا ایک دلکش نمونہ ہے اور ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ لیکن ان جزئیات سے آپ لوگوں کی سمع خراشی ہوگی۔ البتہ میں اس

نظم کے عام مقصد کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں جس کے ہر حصے میں پٹاکس کے قول کی تردید ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس لیے کہ شاعر نے آگے چل کر جو کچھ کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خیال میں گو نیک ہو جانا مشکل ہے پھر بھی تھوڑی دیر کے لیے ممکن ہے صرف تھوڑی دیر کے لیے لیکن نیک ہو جانے کے بعد ہمیشہ نیکی کی حالت میں رہنا جس کا تم ذکر کرتے ہو پٹاکس ناممکن ہے اور انسان کے نصیب میں نہیں۔ یہ صفت صرف خدا کی ہے۔

"انسان بدی سے باز نہیں رہ سکتا جب واقعات کی قوت اسے بے بس کر دیتی ہے۔"

اب سوال یہ ہے کہ جہاز کی ناخدائی میں واقعات کی قوت کسے بے بس کر دیتی ہے؟ ظاہر ہے کہ عام آدمیوں کو نہیں اس لیے کہ وہ تو ہمیشہ ہی بے بس ہوتے ہیں۔ جیسے وہ شخص جو پہلے ہی سے چت ہو پچھاڑا نہیں جا سکتا۔ صرف وہی شخص جو سیدھا کھڑا ہو گرایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح واقعات کی قوت صرف اس شخص کو بے بس کر سکتی ہے جس کے پاس کبھی طاقت رہی ہو نہ کہ اس شخص کو جو ہمیشہ سے بے طاقت ہو۔ ایک بڑے طوفان کے آجانے سے ناخدا بے بس ہو سکتا ہے اور موسم کی شدت سے کاشتکار یا طبیب بے بس ہو سکتا ہے اس لیے کہ جو اچھے ہیں وہ برے ہو سکتے ہیں جیسا کہ ایک اور شاعر کہتا ہے:

"نیک لوگ کبھی اچھے ہوتے ہیں اور کبھی برے"

لیکن جو بد ہیں وہ برے ہو نہیں جاتے بلکہ وہ ہمیشہ ہی سے برے ہوتے ہیں غرض جب واقعات کی قوت یا تدبیر باسلیقہ اور نیک آدمی کو بے قابو کر دیتی ہے تو وہ بد ہونے سے باز نہیں رہ سکتا اور تم پٹاکس یہ کہہ رہے ہو کہ "نیک ہونا مشکل ہے" مشکل دراصل نیک ہو جانا ہے۔ مگر پھر بھی اس کا امکان ہے نیک ہونا تو قطعاً ناممکن ہے ——— "اس لیے کہ جو اچھا کام کرے وہ نیک ہے اور جو برا کام کرے وہ بد ہے۔"

مگر اب سوال یہ ہے کہ علم و ادب کے معاملے میں اچھائی کسے کہتے ہیں اور کیا چیز انسان کو علم و ادب میں اچھا بناتی ہے؟ ظاہر ہے ان کا جاننا۔ اور کون سی چیز انسان کو اچھا طبیب بناتی ہے؟ ظاہر ہے کہ علاج کے فن کو جاننا۔ مگر "جو برا کام کرے وہ بد ہے"۔ اب سوال یہ ہے کہ برا طبیب کون ہوتا ہے؟ ظاہر ہے وہ شخص جو پہلے طبیب ہو اور اچھا طبیب ہو اس لیے کہ وہی برا طبیب بھی ہو سکتا ہے لیکن ہم ناواقف لوگوں میں سے کوئی کتنی ہی برائی کیوں نہ کرے ہرگز طبیب نہیں ہو سکتا جس طرح کہ بڑھئی وغیرہ نہیں ہو سکتا اور جو شخص برا کام کرنے سے سرے سے طبیب ہی نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ وہ برا طبیب بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح نیک آدمی استداد زمانہ سے یا رنج و محن سے یا بیماری سے یا اور کسی حادثے سے بگڑ سکتا ہے۔ (حقیقی برائی صرف یہ ہے کہ انسان علم سے محروم ہو جائے) لیکن برا آدمی کبھی نہیں بگڑ سکتا اس لیے کہ وہ ہمیشہ سے بگڑا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نظم کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ایک تو انسان مسلسل نیک نہیں رہ سکتا بلکہ کبھی نیک ہوگا اور کبھی بد اور دوسرے۔

وہی لوگ سب سے زیادہ عرصے تک نیک رہتے ہیں جن پر دیوتا مہربان ہوں"۔

ان سب باتوں کا تعلق پٹاکس سے ہے جیسا کہ خاتمے سے ثابت ہوتا ہے اس لیے کہ وہ (سمونائیڈیس) آگے چل کر کہتا ہے:-

> "اس لیے میں اپنی مدت حیات کو اس میں برباد نہیں کروں گا
> کہ ناممکن چیز کو تلاش کرتا رہوں اور خواہ مخواہ امید رکھوں کہ جو لوگ
> زمین کے وسیع باغ کا پھل کھاتے ہیں اُن میں کوئی ایسا مل جائے گا
> جو کامل طور پر بے عیب ہو۔ اگر مل گیا تو میں تمھیں کہلا بھیجوں گا"۔

(اس جوش و خروش سے ساری نظم میں اس نے پٹاکس پر حملہ کیا ہے)

مگر اس شخص کی جو کوئی برائی نہیں کرتا بالقصد میں تعریف کرتا ہوں اور اس سے محبت کرتا ہوں ——— مجبوری کا مقابلہ دیوتا بھی نہیں کرسکتے ۔"

ان سب اشعار میں ایک ہی مطلب پیش نظر ہی اس لیے کہ سمونائیڈیس کچھ اتنا جاہل نہ تھا کہ وہ یہ کہتا میں اُن لوگوں کی تعریف کرتا ہوں جو بالقصد کوئی برائی نہیں کرتے گویا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو بالقصد برائی کرتے ہیں ۔ میرے خیال میں تو کوئی دانش مند اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ کوئی انسان بالقصد غلطی کرتا ہی یا بالقصد برائی یا ذلیل کام کرتا ہی وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جتنے آدمی بُرے یا ذلیل کام کرتے ہیں سب کے سب اپنی مرضی کے خلاف کرتے ہیں ۔ سمونائیڈیس ہرگز یہ نہیں کہتا کہ وہ اس شخص کی تعریف کرتا ہی جو بالقصد برائی نہ کرے ۔ "بالقصد" کا لفظ خود اس کی ذات کی طرف راجع ہوتا ہی کیونکہ اس کا یہ خیال تھا کہ اچھے آدمی کو اکثر دوسروں سے مجبوراً محبت اور ان کی تعریف کرنی پڑتی ہی اور ان کا دوست اور مداح بننا پڑتا ہی ۔ اس کے علاوہ ایک بلا قصد محبت بھی ہوسکتی ہی جیسی کہ انسانوں کو بے مہر باپ یا ماں یا ملک وغیرہ سے ہوتی ہی ۔ بُرے آدمیوں کا تو یہ قاعدہ ہی کہ اگر ان کے والدین میں یا اُن کے ملک میں کوئی برائیاں پائی جائیں تو وہ اپنی بدباطنی سے خوش ہوتے ہیں ، ان کی نکتہ چینی کرتے ہیں اور دوسروں کے سامنے ان کے عیب کا اظہار کرتے ہیں اس خیال سے کہ کہیں لوگ ضرور ان کو بُرا نہ کہیں اور ان پر غفلت کا الزام نہ لگائیں ۔ اور وہ ان پر الزام لگانے میں حد سے زیادہ سختی کرتے ہیں تاکہ انھیں اور زیادہ بدنام کریں ۔ لیکن نیک آدمی اپنے جذبات کو چھپاتا ہی اور اپنی طبیعت پر جبر کرکے ان کی تعریف کرتا ہی ۔ اگر انھوں نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی ہو اور غصہ آگیا ہو تو وہ اپنے غصے کو ضبط کرکے ان سے مصالحت کرلیتا ہی اور اپنے آپ کو اس پر مجبور کرتا ہی کہ وہ اپنے عزیزوں سے محبت کرے

اور ان کی تعریف کرے اور غالباً سمونائیڈیس نے یہ سوچا ہوگا کہ خود اس کو اکثر ایک مستبد حاکم یا اسی قسم کے اور لوگوں کی جبراً قہراً تعریف کرنی پڑی اور وہ پٹاکس پر یہ بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میں تمھیں بُرا اس وجہ سے نہیں کہتا کہ مجھے بُرا کہنے کی عادت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر انسان بالکل بد اور محض احمق نہ ہو تو میں اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں اور اگر وہ عدل کو (جو ریاست کی صحت و تندرستی کا نام ہے) جانتا ہے اور صحیح دماغ رکھتا ہے تو میں اس پر نکتہ چینی نہیں کرتا اس لیے کہ مجھے نکتہ چینی کی عادت نہیں اور دنیا میں احمقوں کی کمی نہیں ہے (یعنی اگر اسے نکتہ چینی کا شوق ہوتا تو اسے اس کے موقع بہت کثرت سے حاصل ہو سکتے تھے)

"سب چیزیں اچھی ہیں جن میں کوئی برائی نہ ہو"

ان الفاظ سے اس کی یہ مراد نہیں کہ وہ سب چیزیں اچھی ہیں جو برائی سے خالی ہوں جیسے تم کہو: وہ سب چیزیں سفید ہیں جو سیاہی سے خالی ہوں" اس لیے کہ یہ تو بالکل مہمل بات ہوتی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اوسط یا درمیانی حالت کو غنیمت سمجھتا ہے اور اس پر نکتہ چینی نہیں کرتا۔

(وہ کہتا ہے "جو لوگ دنیا کے وسیع باغ کے پھل کھاتے ہیں ان میں کوئی ایسا مل جائے جو کامل طور پر بے عیب ہو (اگر مل گیا تو میں تمھیں کہلا بھیجوں گا) اس حیثیت سے میں کسی انسان کی تعریف نہیں کرتا لیکن جو شخص اوسط حد تک نیک ہو اور کوئی بُرا کام نہ کرتا ہو اسے میں غنیمت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ مجھے ہر ایک شخص سے محبت ہے اور ہر ایک شخص سے محبت کرتا ہوں)

(یہاں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نے پسند کرنے کے لیے لیبسی زبان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لیے اس کا خطاب پٹاکس سے ہے۔)

"ہر شخص سے محبت ہے اور ہر شخص کو پسند کرتا ہوں بالقصد اگر وہ کوئی بُرا کام

نہ کرتا ہو"۔ یہ ملحوظ رہے کہ علامتِ وقف" بالقصد" کے بعد آنی چاہیے" اگر بعض لوگ ایسے ہیں جن کی میں بلا قصد تعریف اور جن سے بلا قصد محبت کرتا ہوں اور تم کو پٹاکس میں ہرگز الزام نہ دیتا اگر تم اوسط درجے کی معقول اور سچی بات کہتے لیکن اب میں تمہیں اس وجہ سے الزام دیتا ہوں کہ سچائی کے پردے میں تم اہم ترین مسائل کی بابت جھوٹی باتیں کہہ رہے ہو"۔۔۔ یہ ہیں اے پروڈیکس اور پروٹاگورس، سمونائیڈس کی اس نظم کے معنی۔

ہپیاس نے کہا" سقراط میرے خیال میں تم نے اس نظم کی بہت اچھی تفسیر کی ہے لیکن میرے ذہن میں ایک اور نہایت عمدہ تعبیر ہے اگر اجازت ہو تو پیش کروں۔"

الکی بیادیس نے کہا" نہیں ہپیاس اس وقت نہیں کسی اور وقت، اس وقت تو ہمیں اس معاہدے کی پابندی کرنی چاہیے جو سقراط اور پروٹاگورس میں ہوا ہے کہ جب تک پروٹاگورس سوال کرے سقراط کو جواب دینا چاہیے یا اگر وہ جواب دینا زیادہ پسند کرے تو سقراط سوال کرے۔"

میں نے کہا" میں اسے پروٹاگورس پر منحصر رکھتا ہوں۔ جی چاہے تو سوال کرے ورنہ جواب دے لیکن اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو یہ نظموں اور قصیدوں کا سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ میں یہ چاہتا ہوں پروٹاگورس کہ ہم اس سوال کی طرف لوٹیں جو میں نے ابتدا میں تم سے کیا تھا اور تمہاری مدد سے اسے نبٹا دیں۔ شاعروں کے متعلق یہ بحث تو میرے خیال میں اس عامیانہ تفریح کی طرح ہے جس سے معمولی لوگ لطف اٹھاتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ اپنی بے وقوفی سے اس قابل نہیں ہوتے کہ شراب کی محفل میں باہم گفتگو کر سکیں، اس لیے بڑی بڑی رقموں کے بدلے بانسری کی آواز کرائے پر لے کر لطف صحبت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اور بازار میں بانسری

بجانے والیوں کی شرح بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن جہاں حقیقی شریف اور تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت ہو وہاں تمھیں نہ بانسری والیاں نظر آتی ہیں نہ ناچنے والیاں اور نہ بربط والیاں، اور ان کے اور مہملات اور کھیل وغیرہ بھی نہیں ہوتے بلکہ وہ صرف باہمی مکالمے پر قناعت کرتے ہیں جس کا ذریعہ خود اُن کی آوازیں ہیں۔ یہ گفتگو وہ باری باری سے سلیقے اور ترتیب کے ساتھ کرتے ہیں۔ گو وہ اسی کے ساتھ دل کھول کر شراب بھی پیتے جاتے ہیں۔ ایسی صحبت کو جیسی ہم لوگوں کی ہی اور ایسے آدمیوں کو جیسا ہم اپنے آپ کو کہتے ہیں نہ کسی دوسرے کی آواز سے مدد لینے کی ضرورت ہی اور نہ ان شاعروں کی حاجت ہی جن سے اس کے متعلق جرح نہیں جا سکتی کہ ان کے کلام کا صحیح مفہوم کیا ہی؟ جو لوگ ان کا حوالہ دیتے ہیں اُن میں سے بعض ان کے شعر کے کچھ اور معنی بتاتے ہیں اور بعض کچھ اور اس نزاع کا کبھی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کی تفریح کو وہ لوگ ناپسند کرتے ہیں اور اسے ترجیح دیتے ہیں کہ آپس میں باتیں کریں اور گفتگو میں ایک دوسرے کا امتحان لیں یہ وہ نمونے ہیں جن کی تم کو اور مجھ کو تقلید کرنی چاہیے تو اب ہم شاعروں کو چھوڑ کر صرف ایک دوسرے سے سروکار رکھیں، ایک دوسرے کے جوہر کو پرکھیں اور حق کو گفتگو کی کسوٹی پر کسیں۔ اگر تم سوال کرنا چاہو تو میں جواب دینے کو تیار ہوں یا تم جواب دینا پسند کرو تو مجھے یہ موقع دو کہ جو بحث ناتمام رہ گئی تھی اسے پھر سے شروع کر دوں۔"

میں نے یہ اور اسی قسم کی باتیں کہیں مگر پروٹاگورس صاف نہیں کہتا تھا کہ وہ کیا کرے گا؟ اس پر الکی بیادیس نے کیلیاس سے مخاطب ہو کر کہا: "کیلیاس کیا تمھارے خیال میں پروٹاگورس کی یہ بات قرینِ انصاف ہی کہ وہ یہ بتانے سے انکار کرتا ہی کہ وہ جواب دے گا یا نہیں؟ میرے خیال میں تو یہ بالکل بے انصافی ہی۔ اسے یا تو بحث جاری رکھنی چاہیے یا اس کے جاری رکھنے سے صاف انکار کر دینا

چاہیے۔ تاکہ ہمیں اُس کا ارادہ معلوم ہو جائے۔ اس صورت میں سقراط کسی اور سے گفتگو کرے گا اور باقی لوگوں کو آزادی ہوگی کہ آپس میں بات چیت کریں۔"

میرے خیال میں پروٹاگورس کو واقعی الکی بیادیس کے ان الفاظ سے شرم آئی اور پھر اس کے علاوہ کیلیاس اور دوسرے حاضرین نے اس سے التجا بھی کی۔ بہر حال وہ بحث پر آمادہ ہوگیا۔ اور اس نے مجھ سے کہا کہ "تم سوال کرو اور میں جواب دوں گا۔"

میں نے کہا "پروٹاگورس یہ نہ سمجھنا کہ تم سے سوال کرنے سے اپنی مشکلات کو حل کرنے کے سوا میری کوئی اور غرض ہے میرے خیال میں ہومر نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ:

"جب دو اکٹھے ہو جائیں تو ان کی نظر ایک دوسرے سے آگے پہنچتی ہے"

چنانچہ ہر شخص جس کا کوئی رفیق ہو، قول، فعل، یا خیال میں زیادہ مستعد ہوتا ہے لیکن اگر کسی شخص کو:

"بات اس وقت سوجھتی ہے جب وہ اکیلا ہو۔"

تو وہ فوراً کسی اور کو تلاش کرتا ہے تاکہ جو بات اس نے دریافت کی ہے اسے دکھائے اور اس سے تصدیق کرے، اور تم سے گفتگو کرنے کو میں ہر دوسرے شخص سے گفتگو کرنے پر ترجیح دیتا ہوں اس لیے کہ میرے خیال میں تم سے بڑھ کر کوئی ان چیزوں کو نہیں سمجھتا جن کے سمجھنے کی ایک نیک آدمی سے توقع ہوتی ہے خصوصاً نیکی کو اس لیے کہ جو بات تم میں ہے وہ کسی میں نہیں۔ تم نہ صرف خود ایک نیک اور شریف آدمی ہو اس لیے کہ بہت سے لوگ خود نیک اور شریف ہوتے ہیں مگر دوسروں کو نیک بنانے کی طاقت نہیں رکھتے ـــــ بلکہ خود نیک ہونے کے علاوہ اوروں کو بھی نیک بناتے ہو۔ اس کے علاوہ تمہیں اپنے اوپر اتنا اعتماد ہے کہ اور سوفسطائی تو اپنے

پیشے کو چھپاتے ہیں اور تم سارے یونان میں پکار پکار کر کہتے ہو کہ تم سوفسطائی یعنی نیکی اور فن تعلیم کے سکھانے والے ہو اور تم پہلے شخص تھے جس نے درس کا معاوضہ طلب کیا۔ میرے لیے اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ تم سے ان مسائل پر نظر ڈالنے کی درخواست کروں اور اپنی ہدایت کے لیے سوالات پوچھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سے پوچھ کر ان سوالات کو اپنے ذہن میں تازہ کروں جو میں نے ابتدا میں کیے تھے اور تمھاری مدد سے ان پر غور کروں"۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو سوال یہ تھا: کیا حکمت اور عفت اور شجاعت اور عدل اور دین داری ایک ہی چیز کے پانچ نام ہیں؟ یا ان میں سے ہر اسم ایک ایک مسمیٰ رکھتا ہے جن کی ماہیت اور کام ایک دوسرے سے جدا ہیں اور آپس میں کوئی مشابہت نہیں رکھتے؟ اور تم نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ یہ پانچ نام ایک ہی چیز کے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کا ایک جداگانہ معروض ہے اور یہ سب معروضات نیکی کے حصے ہیں اس طرح نہیں جیسے سونے کے اجزا ایک دوسرے سے اور اس کل سے جس کے وہ اجزا ہیں مشابہ ہوتے ہیں بلکہ اس طرح جیسے چہرے کے حصے ایک دوسرے سے اور اس کل سے جس کے وہ جز ہیں غیر مشابہ ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنا ایک الگ کام رکھتا ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تم اب تک اس رائے پر قائم ہو؟ یا اگر ایسا نہیں ہے تو میں تم سے درخواست کروں گا کہ اپنے مطلب کو واضح کر دو۔ اور میں تمھیں یہ الزام نہیں دوں گا کہ تم نے اپنی رائے کیوں بدل دی اس لیے کہ غالباً تم نے جو کچھ کہا وہ صرف میرے آزمانے کے لیے کہا تھا"۔

اس نے کہا "سقراط میرا جواب یہ ہے کہ یہ سب صفات نیکی کے حصے ہیں اور ان پانچ میں سے چار تو ایک حد تک ایک دوسرے سے مشابہ ہیں لیکن پانچواں یعنی شجاعت ان چاروں سے بہت مختلف ہے۔ جسے میں اس طرح سے ثابت کروں گا

تم نے دیکھا ہوگا کہ بہت سے لوگ باوجود بے انصاف، بے دین، بے اعتدال اور جاہل ہونے کے شجاعت میں ممتاز ہوتے ہیں"۔

"ٹھہرو زرا مجھے سوچنے دو۔ جب تم بہادروں کا ذکر کر رہے ہو تو تمھاری مراد ان لوگوں سے ہے جو جری اور بے باک ہیں یا اور کسی قسم کے لوگوں سے؟"

"ہاں میری مراد تند مزاج لوگوں سے ہے جو اس جگہ بے تکلف دھاوا کر دیتے ہیں جہاں دوسرے قدم دھرتے ڈرتے ہیں"۔

"اس کے بعد تم یہ کہو گے کہ نیکی اچھی چیز ہے جس کے معلم ہونے کا تم کو دعویٰ ہے؟"

"بے شک۔ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ بہترین چیز ہے اگر میرا دماغ صحیح ہے"۔

"اور وہ کسی قدر اچھی اور کسی قدر بُری ہے یا سراسر اچھی ہے"۔

"سراسر اچھی اور انتہائی درجے کی اچھی"۔

"اچھا اب مجھے یہ بتاؤ وہ کون لوگ ہیں جو کنوئیں میں غوطہ لگانے میں جری ہوتے ہیں؟"

"غوطہ خور"۔

"اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کام کو جانتے ہیں؟"

"ہاں یہی وجہ ہے"۔

"اور گھوڑے پر چڑھ کر لڑنے میں کون لوگ جری ہوتے ہیں —— سیکھے ہوئے سوار یا بن سیکھے؟"

"سیکھے ہوئے"۔

"اور ہلکی ڈھالیں لے کر لڑنے میں۔ سبک سپر سپاہی یا غیر سبک سپر؟"

"سبک سپر۔ اور یہ بات سب چیزوں پر صادق آتی ہے اگر تم اسی کو ثابت کرنا چاہتے ہو۔ جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ جاہلوں سے زیادہ جری ہوتے ہیں اور خود

ان میں سیکھنے کے بعد اس سے زیادہ جرأت ہوتی ہے جتنی سیکھنے سے پہلے تھی ۔"

"کیا تم نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جو ان چیزوں میں بالکل جاہل ہیں۔ پھر بھی ان کے بارے میں جری اور بے باک ہوتے ہیں ؟"

"ہاں میں نے دیکھا ہے کہ ایسے لوگ انتہا سے زیادہ بے باک ہوتے ہیں ۔"

"تو کیا یہ بے باک لوگ بہادر نہیں ہوتے ؟"

"اگر ایسا ہوتا تو بہادری بڑی نکمی چیز ہوتی ۔ اس لیے کہ یہ لوگ تو یقیناً مجنون ہوتے ہیں ۔"

"اور بہادر ؟ کیا وہ جری اور بے باک نہیں ہوتے ؟"

"بے شک اس قول پر میں اب تک قائم ہوں ۔"

"اور وہ لوگ جو اس طرح بغیر علم کے جری ہوتے ہیں۔ حقیقت میں بہادر نہیں بلکہ مجنوں ہوتے ہیں۔ اس صورت میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ دانش مند ہیں وہی سب سے زیادہ جری ۔ اور جو سب سے زیادہ جری ہیں وہی سب سے زیادہ بہادر۔ گویا حکمت اور شجاعت ایک چیز ہے ۔"

"نہیں سقراط تمہیں میری بات غلط یاد ہے ۔ جب تم نے مجھ سے پوچھا تو میں نے یقیناً یہ کہا تھا کہ بہادر جری ہوتے ہیں ۔ لیکن یہ سوال مجھ سے ہرگز نہیں کیا گیا کہ کیا جری بہادر ہوتے ہیں ؟ اگر تم مجھ سے پوچھتے تو میں جواب دیتا "سب کے سب نہیں" اور جو کچھ میں نے کہا تھا اس کو تم نے غلط ثابت نہیں کیا ہے ۔ اگرچہ تم نے یہ دکھایا کہ جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ اس سے زیادہ بہادر ہوتے ہیں جو علم نہیں رکھتے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ شجاعت اور حکمت ایک ہی چیز ہے مگر اس طرح کے استدلال سے تو تم یہ بھی سمجھ لو گے کہ طاقت اور حکمت ایک ہی چیز ہے ۔ تم یہ سوال کرو گے کہ کیا طاقت ور لوگ قابل ہوتے ہیں ؟ اور میں کہوں گا کہ ہاں ہوتے ہیں ۔ پھر یہ پوچھو گے کہ

کیا وہ لوگ جو کشتی لڑنا جانتے ہیں نہ جاننے والوں سے زیادہ قابل ہوتے ہیں اور وہ خود سیکھنے کے بعد اس سے زیادہ قابل ہوتے ہیں۔ جیسے سیکھنے سے پہلے تھے؟ اور میں اس کی تصدیق کروں گا۔ جب میں یہ مان لوں گا تو تم میرے اس اقرار کو اس طرح استعمال کروگے جس سے یہ ثابت ہوگا کہ میری رائے میں حکمت اور طاقت ایک ہی چیز ہے، حالانکہ اس صورت میں بھی پہلی صورت کی طرح میں نے یہ ہرگز نہیں مانا کہ قابل طاقت ور ہوتے ہیں اگرچہ یہ تسلیم کیا ہے کہ طاقت ور قابل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ قابلیت اور طاقت میں فرق ہے۔ قابلیت علم سے بھی پیدا ہوتی ہے اور جنون اور غصے کی وجہ سے بھی۔ لیکن طاقت ایک فطری چیز ہے اور صحت جسمانی پر مبنی ہے اسی طرح میں جرأت اور شجاعت کے بارے میں بھی یہ کہتا ہوں کہ وہ ایک چیز نہیں ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ بہادر جری ہوتے ہیں لیکن کل بہادر جری نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ جرأت انسان علم وفن سے بھی حاصل کرسکتا ہے اور قابلیت کی طرح جنون اور غصے سے بھی۔ لیکن شجاعت فطری چیز ہے اور صحت روحانی پر مبنی ہے۔"

"پروٹاگورس یہ تو تم مانوگے کہ بعض اچھی طرح زندگی بسر کرتے ہیں اور بعض بری طرح۔"

اس نے تسلیم کیا

"اور کیا تمھارے خیال میں وہ شخص جو تکلیف یا رنج اٹھاتا ہے اچھی طرح زندگی بسر کرتا ہے؟"

"نہیں"۔

"اور اگر وہ آخر وقت تک راحت میں رہا ہو تو کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے اچھی طرح زندگی بسر کی؟"

"بے شک"۔

"تو راحت میں زندگی بسر کرنا، اچھا ہے اور تکلیف میں بسر کرنا بُرا ہے۔"

"ہاں بشرطیکہ راحت اچھی اور پسندیدہ ہو۔"

"تو کیا، پروٹاگورس تم بھی ساری دنیا کی طرح بعض راحت بخش چیزوں کو بُرا اور بعض تکلیف دہ چیزوں کو اچھا کہتے ہو؟ ——— اس لیے کہ میرا تو کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ اشیا جس حد تک راحت بخش ہیں اسی حد تک وہ اچھی ہیں بشرطیکہ ان کا نتیجہ الٹا نہ ہو اور جس حد تک تکلیف دہ ہیں بُری ہیں۔"

"سقراط میں تو اس طرح غیر مشروط طریقے پر یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ راحت اچھی ہے اور تکلیف بُری۔ نہ صرف اپنے موجودہ جواب کے لحاظ سے بلکہ اپنی ساری زندگی کو نظر میں رکھتے ہوئے اگر میں غلطی نہیں کرتا تو احتیاطاً مجھے یہ کہنا چاہیے کہ بعض راحت بخش چیزیں اچھی نہیں ہوتیں اور بعض تکلیف دہ چیزیں اچھی ہوتی ہیں، بعض بُری ہوتی ہیں، اور بعض اچھی نہ بُری۔"

"اور راحت بخش تو تم انھیں چیزوں کو کہتے ہو نا جن میں راحت پائی جائے یا جو راحت پیدا کریں۔"

"یقیناً۔"

"تو پھر میرے قول کے یہ معنی ہوئے کہ اشیا اس حد تک اچھی ہیں جہاں تک راحت بخش ہیں اور میرا سوال اس پر دلالت کرے گا کہ راحت فی نفسہٖ اچھی چیز ہے۔"

"بقول تمھارے سقراط۔ آؤ ذرا اس پر غور کریں، اگر یہ غور و فکر مفید ہوا اور اس کے نتیجے کے طور پر یہ ثابت ہو کہ راحت اور نیکی واقعی ایک ہی چیز ہے تو ہم متفق ہو جائیں گے ورنہ بحث کرتے رہیں گے۔"

"تو یہ تحقیق تم شروع کرنا چاہتے یا میں شروع کروں؟"

"تمھیں کو ابتدا کرنی چاہیے اس لیے کہ تمھیں بحث کے بانی ہو۔"

"اگر اجازت ہو تو میں ایک مثال سے اپنے مطلب کو واضح کروں۔ فرض کرو کہ ایک شخص دوسرے کی صحت یا کسی اور جسمانی صفت کی تحقیق کر رہا ہے۔ وہ اس کے چہرے پر اور انگلیوں کے ناخنوں پر نظر ڈالتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے ذرا اپنا منہ اور پیٹھ کھولو تاکہ میں اور اچھی طرح دیکھ سکوں۔ یہی چیز میں اس بحث میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا دل میرے آگے کھول دو پروٹاگورس اور مجھے یہ دکھا دو کہ تمھاری رائے علم کے متعلق کیا ہے تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ تم دنیا کے اور لوگوں سے اتفاق رکھتے ہو یا نہیں۔ دنیا کے اور لوگوں کی تو یہ رائے ہے کہ علم کوئی طاقت، یا حکومت یا فرماں روائی کا جوہر نہیں ہے۔ ان کے خیال میں ممکن ہے کہ انسان علم رکھتا ہو لیکن اس کا علم غصے یا راحت یا الم یا محبت یا خوف سے مغلوب ہو جائے ——— گویا علم ایک غلام ہے اور اسے کان پکڑ کر جدھر سے جاؤ اُدھر چلا جاتا ہے۔ اب بتاؤ کیا تمھاری بھی یہی رائے ہے؟ یا تم یہ سمجھتے ہو کہ علم ایک برتر اور باوقار چیز ہے جو کسی شے سے مغلوب نہیں ہوتا اور کسی انسان کو اگر وہ نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے کوئی ایسا کام کرنے نہیں دیتا جو علم کے منافی ہو بلکہ اپنی قوت سے اس کی مدد کرتا ہے۔"

"میں تم سے متفق ہوں سقراط اور صرف یہی نہیں بلکہ میں تو سب سے زیادہ اس بات کا قائل ہوں کہ علم و حکمت انسانی صفات میں سب سے برتر ہیں۔"

"تم نے بڑی اچھی اور سچی بات کہی لیکن کیا تم یہ جانتے ہو کہ دنیا میں اکثر لوگوں کی رائے اس سے مختلف ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان یہ جانتے ہیں کہ سب سے اچھا کام کیا ہے اور اسے کر بھی سکتے ہیں مگر پھر بھی نہیں کرتے اور میں نے اس کی وجہ پوچھی تو بہت سے لوگوں نے یہ کہا کہ جس وقت انسان علم کے منافی کام کرتا ہے اس وقت وہ الم یا راحت یا اُن جذبات میں سے جن کا میں ابھی ذکر کر رہا تھا کسی اور جذبے

مغلوب ہوتا ہی ۔"

"بے شک یہی بات ہی سقراط ۔ اور صرف یہی ایک چیز نہیں ہی جس میں عموماً انسان غلطی پر ہی ۔"

فرض کرو کہ ہم تم اُنھیں یہ سمجھانے کی کوشش کریں کہ جس چیز کو وہ راحت سے مغلوب ہوجانا کہتے ہیں اور جسے وہ اس کا باعث قرار دیتے ہیں کہ انسان ہمیشہ بہترین کام نہیں کرسکتا اس کی حقیقت کیا ہی؟ جب ہم ان سے کہیں گے: دوستو تم غلطی پر ہو اور ایسی بات کہ رہے ہو جو خلاف واقعہ ہی تو غالباً وہ یہ جواب دیں گے: سقراط اور پروٹاگورس، اگر نفس کی اس کیفیت کو ہم راحت سے مغلوب ہوجانا نہ کہیں تو مہربانی کرکے تمھیں بتاؤ کہ وہ کیا ہی اور کس نام سے پکارا جائے گا ؟"

" مگر سقراط، ہم لوگ کیوں عام لوگوں کی رائے کی فکر کریں ؟ ان کے تو جو جی میں آتا ہی کہہ دیتے ہیں ۔"

" میرے خیال میں وہ ہمیں یہ بات معلوم کرنے میں مدد دے سکتے ہیں کہ شجاعت کا نیکی کے دوسرے حصوں سے کیا تعلق ہی؟ اگر تم اس معاہدے پر قائم ہو جو ہم دونوں میں ہوا تھا کہ میں بحث میں آگے آگے چلوں اور وہ طریقہ اختیار کروں جس سے ہماری موجودہ مشکلات آسانی سے دور ہوجائیں تو تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ ورنہ جانے دو ۔"

"تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح تم نے بحث شروع کی ہی اسی طرح آگے بڑھو ۔"

"اچھا اب فرض کرو کہ وہ اپنے سوال کو دہراتے ہیں کہ تم اس چیز کو کیا کہوگے جس کو ہم اپنی اصطلاح میں راحت سے مغلوب ہوجانا کہتے ہیں ؟ میں اس کا یہ جواب دوں گا۔ غور سے سنو: میں اور پروٹاگورس تمھیں سمجھانے کی کوشش کریں گے

جب لوگ کھانے پینے کی اور دوسری نفسانی خواہشات سے جو راحت بخش ہیں مغلوب ہوجاتے ہیں، اُن کو بُرا سمجھنے کے باوجود اُن میں مبتلا ہوتے ہیں تو کیا تم یہ نہیں کہو گے کہ وہ راحت سے مغلوب ہو گئے؟ وہ اس سے انکار نہیں کریں گے۔ اب فرض کرو کہ ہم تم اُن سے پھر پوچھیں، تم کس لحاظ سے ان چیزوں کو بُرا کہتے ہو۔ اس لحاظ سے کہ وہ راحت بخش ہیں اور ان سے فوری لذت حاصل ہوتی ہے یا اس لیے کہ وہ آگے چل کر بیماری اور افلاس اور دوسری خرابیوں کا باعث ہوتی ہیں؟ اگر ان کے کوئی بُرے نتائج نہ ہوتے تو کیا پھر بھی وہ بُری کہلاتیں محض اس لیے کہ ان میں کسی نہ کسی طرح کی لذت کا احساس پایا جاتا ہے؟ —— تو کیا وہ یہ جواب نہیں دیں گے کہ یہ چیزیں اس لذت کی وجہ سے بُری نہیں جو فی الفور حاصل ہوتی ہے بلکہ اپنے نتائج یعنی بیماری وغیرہ کی وجہ سے"۔

"میرے خیال میں لوگ عام طور پر وہی جواب دیں گے جو تم دے رہے ہو"۔

"اور جب ان سے بیماری پیدا ہوتی ہے تو کیا الم پیدا نہیں ہوتا؟ اور جب افلاس پیدا ہوتا ہے تو کیا الم پیدا نہیں ہوتا؟ —— میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس سے بھی اتفاق کریں گے"۔

پروٹاگورس نے تصدیق کی۔

"تب میں اپنی اور تمھاری طرف سے اُن سے کہوں گا: کیا تم انھیں کسی اور وجہ سے بُرا سمجھتے ہو بجز اس کے کہ ان کا انجام الم ہوتا ہے اور وہ ہمیں دوسری لذتوں سے محروم کردیتی ہیں اس سے بھی وہ اتفاق کریں گے؟"

ہم دونوں کا خیال ہے کہ وہ اتفاق کریں گے۔

"اس کے بعد میں اس مسئلے پر دوسرے پہلو سے بحث کروں گا اور کہوں گا میرے دوستو، جب تم یہ کہتے ہو کہ اچھی چیزیں تکلیف دہ ہوتی ہیں تو کیا تمھاری

مراد اُن چیزوں سے نہیں ہوتی جو علاج کا کام دیتی ہیں مثلاً جمناسٹک کی مشقیں، فوجی خدمت اور طبیب کا جلانا، کاٹنا، دوا پلانا اور فاقے دینا؟ کیا یہی چیزیں ہیں جو اچھی ہیں مگر اسی کے ساتھ تکلیف دہ بھی ہیں؟ کیا وہ مجھ سے اتفاق کریں گے؟"

اس نے اس کی تائید کی۔

"کیا تم انھیں اچھا اس وجہ سے کہتے ہو کہ ان سے انتہائی فوری تکلیف ہوتی ہے یا اس لیے کہ آگے چل کر ان سے صحت و تندرستی حاصل ہوتی ہے، ریاست اپنے دشمنوں سے محفوظ رہتی ہے اور دولت واقتدار حاصل کرتی ہے؟ میرے خیال میں وہ دوسری بات سے اتفاق کریں گے۔"

اُس نے تائید کی۔

"کیا ان چیزوں کے اچھے ہونے کی وجہ اس کے سوا کچھ اور ہے کہ ان کا انجام راحت ہے اور یہ الم سے بچاتی ہیں اور نجات دلاتی ہیں؟ کیا ان کو اچھا کہتے وقت تمھارے پیشِ نظر راحت والم کے سوا کوئی اور معیار ہے؟ وہ اقرار کریں گے کہ ان کے پیشِ نظر اس کے سوا کوئی اور معیار نہیں ہے۔"

پروٹاگورس نے کہا "میرے خیال میں ضرور اقرار کریں گے۔"

"کیا راحت کو اچھا سمجھ کر اسے حاصل کرنے کی اور الم کو بُرا سمجھ کر اس سے بچنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟"

اس نے اتفاق کیا۔

"تو تمھارے خیال میں الم بدی ہے اور راحت نیکی ہے۔ اور راحت کو بھی تم بدی سمجھتے ہو جب کہ وہ جتنی راحت پہنچاتی ہے اس سے زیادہ سے محروم کر دیتی ہے یا راحت سے زیادہ الم کا باعث ہوتی ہو۔ البتہ اگر تم راحت کو کسی اور مقصد یا معیار کے لحاظ سے بُرا کہتے ہو تو ہمیں وہ معیار دکھاؤ لیکن تمھارے پاس کوئی اور معیار ہے ہی نہیں۔

دکھاؤ گے کیا؟"

"سچ ہی۔"

فرض کرو کہ لوگ مجھ سے کہیں تم کیوں اس موضوع پر اتنے زیادہ الفاظ صرف کرتے ہو اور ہر پہلو سے بحث کر رہے ہو؟ تو میں یہ جواب دوں گا کہ میرے دوستو مجھے معاف کرنا مگر سب سے پہلے تو "راحت سے مغلوب ہو جانا" اسی فقرے کا مفہوم سمجھانے میں دقت پیش آ رہی ہی حالانکہ اسی پر ساری بحث کی بنیاد ہی اور اب بھی اگر تمھیں کوئی صورت ایسی نظر آئے کہ بدی کی، سوا الم کے اور نیکی کی، سوا راحت کے کچھ اور تعبیر کی جا سکے تو تم اپنے الفاظ واپس لے سکتے ہو۔ اچھا تو اب یہ بتاؤ کہ راحت کی زندگی سے جو الم سے خالی ہو مطمئن ہو یا نہیں اگر تم مطمئن ہو اور تمھارے خیال میں کوئی نیکی نہیں جس کا انجام راحت نہ ہو اور کوئی بدی نہیں جس کا انجام الم نہ ہو تو اس کے نتائج بھی سن لو:— اگر تمھارا کہنا صحیح ہی تو یہ بات بالکل مہمل ہی کہ انسان اکثر جان بوجھ کر بدی کرتا ہی حالانکہ وہ اس سے باز رہ سکتا تھا، اس لیے کہ وہ راحت کے فریب میں آجاتا ہی اور اس کے آگے بے بس ہو جاتا ہی یا وہ نیک کام کرنے سے انکار کر دیتا ہی اس لیے کہ راحت سے مغلوب ہو جاتا ہی اس بات کا مہمل ہونا صاف ظاہر ہو جائے گا اگر ہم راحت و الم اور نیکی و بدی کو مختلف ناموں سے پکارنا چھوڑ دیں۔ چیزیں صرف دو ہی ہیں اس لیے ان کے نام بھی دو ہی رکھو:— پہلے انھیں نیکی اور بدی کہو پھر راحت و الم۔ یہ مان لینے کے بعد اب پھر وہ بات دہراؤ کہ انسان بدی کرتا ہی یہ جان کر کہ وہ بدی کر رہا ہی۔ اگر کوئی شخص پوچھے کیوں؟ تو پہلا جواب ہوگا: اس لیے کہ وہ مغلوب ہو جاتا ہی۔ پوچھنے والا پوچھے گا: کس چیز سے مغلوب ہو جاتا ہی؟" اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ راحت سے اس لیے کہ راحت کا نام بدل کر نیکی کر دیا گیا ہی۔ ہم جواب میں

صرف اتنا ہی کہیں گے کہ وہ مغلوب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ پوچھے گا: "آخر کس چیز سے؟" ہمیں جواب دینا پڑے گا "نیکی سے"۔ ظاہر ہے کہ اس کے سوا ہم کوئی جواب دے ہی نہیں سکتے۔

"اگر وہ شخص ذرا طرار واقع ہوا ہے تو ایک قہقہہ لگا کر کہے گا: "یہ تو نہایت مضحک بات ہے کہ انسان اس کام کو جسے وہ بُرا سمجھتا ہے اور جو اسے نہ کرنا چاہیے اس لیے کرے کہ وہ نیکی سے مغلوب ہو گیا ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ نیکی میں بدی پر غالب آنے کی صلاحیت ہے یا اس میں اس کی صلاحیت نہیں ہے؟" ظاہر ہے ہم اس کے جواب میں یہی کہیں گے" اس وجہ سے کہ اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔ اگر اس میں یہ صلاحیت ہوتی تو وہ شخص جس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ راحت سے مغلوب ہو گیا، غلطی پر نہ سمجھا جاتا۔" مگر وہ پوچھے گا: "یہ کیونکر ممکن ہے کہ نیکی میں بدی کا اور بدی میں نیکی کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو؟ کیا اس کی حقیقی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے چھوٹی بڑی ہوتی ہیں یعنی مقدار یا تعداد میں کم یا زیادہ؟" اس میں ہمیں انکار کی گنجایش نہیں۔ پھر وہ کہے گا: "جب تم مغلوب ہونے کا ذکر کرتے ہو تو تمھارا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ چھوٹی نیکی پر بڑی نیکی کو ترجیح دے گا؟" اچھا یہ بات مان لی۔ اب نیکی اور بدی کی جگہ راحت اور الم کے الفاظ رکھ دو۔ اور جو پہلے کہا تھا کہ انسان جان بوجھ کر بدی کرتا ہے وہ نہیں بلکہ یہ کہو کہ انسان جان بوجھ کر الم انگیز کام کرتا ہے اس لیے کہ وہ راحت سے مغلوب ہو جاتا ہے جس کا مقابلہ کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں۔ تو آخر راحت اور الم کی باہمی نسبت کا پیمانہ سوا کمی اور زیادتی کے کیا ہو سکتا ہے؟ ——— یعنی یہ کہ وہ مقدار اور تعداد اور کیفیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کم یا زیادہ ہوتے ہیں اس لیے کہ اگر کوئی کہے "لیکن سقراط موجودہ راحت آیندہ راحت والم سے بہت مختلف ہوتی ہے" ———

تو مَیں یہ جواب دوں گا: "آخر ان میں جو فرق ہو وہ راحت اور الم ہی کے لحاظ سے تو ہو ان کے لیے کوئی اور پیمانہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تم یہی کرتے ہو کہ ایک ہوشیار وزن کرنے والے کی طرح راحت اور الم اور ان کے قرب و بُعد وغیرہ کو ترازو میں رکھ کر تولتے ہو اور یہ بتا دیتے ہو کہ کس کا پلہ بھاری ہو؟ اگر راحتوں کا مقابلہ راحتوں سے ہو تو ظاہر ہو کہ تم اُنھیں اختیار کرتے ہو جو مقدار اور تعداد میں زیادہ ہوں۔ یا اگر آلام کا مقابلہ آلام سے ہو تو انھیں اختیار کرتے ہو جو تعداد اور مقدار میں کم ہوں۔ اسی طرح اگر راحتوں کا مقابلہ آلام سے ہو تو تم وہ کام کرتے ہو جس میں راحت الم سے زیادہ ہو خواہ آیندہ راحت موجودہ الم سے یا موجودہ راحت آیندہ الم سے اور اس کام سے باز رہتے ہو جس میں الم راحت سے زیادہ ہو۔ میرے دوستو کیا تم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یہ بات ٹھیک ہو؟ مجھے یقین ہو کہ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"پھر مَیں اُن سے کہوں گا: اگر تم یہاں تک مجھ سے متفق ہو تو مہربانی کر کے ایک سوال کا جواب دو: "کیا وہی تعداد تمھیں قریب سے بڑی اور دور سے چھوٹی نظر نہیں آتی؟" وہ اسے تسلیم کریں گے۔" اور یہی بات ضخامت اور عدد پر صادق آتی ہو۔ نیز آوازیں جو فی نفسہ بالکل برابر ہوتی ہیں۔ قریب سے اونچی اور دور سے مدھم سنائی دیتی ہیں۔" وہ اس کو بھی مان لیں گے۔" اب فرض کرو کہ راحت بڑی مقدار کے اختیار کرنے اور چھوٹی مقدار کے ترک کرنے پر مشتمل ہو تو انسان کی نجات کا اصول کون سا ہو گا؟ پیمایش کا فن یا محض ظاہری اندازہ! کیا ظاہری اندازہ دھوکے کی چیز نہیں ہو جو ہمیں اِدھر اُدھر بھٹکاتی ہو اور ایک وقت ہمیں وہ بات اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہو جس پر ہم دوسرے وقت پچھتاتے

ہیں خواہ اچھے بُرے کام کا سوال ہو یا چھوٹی بڑی چیز میں فرق کرنے کا؟ لیکن پیمایش کا فن ظاہری شکل وصورت کے اثر کو زائل کر دیتا ہی اور حقیقت کا جلوہ دکھا کر روح کو حق سے آسودہ ہونا سکھاتا ہی اور اس طرح ہماری نجات کا باعث بنتا ہی۔ کیا لوگ عام طور پر اس بات کو تسلیم نہ کریں گے کہ جس فن سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہی وہ پیمایش کا فن ہی؟"

"بے شک وہ پیمایش کا فن ہی"۔

"فرض کرو کہ انسان کی نجات طاق اور جفت کے علم پر اور اس بات کے علم پر موقوف ہی کہ وہ کس وقت چھوٹی یا بڑی چیز اختیار کرے، خواہ وہ ذاتی حیثیت سے چھوٹی بڑی ہو یا اضافی حیثیت سے، خواہ قریب ہو یا بعید، اس صورت میں کون سی چیز ہمیں نجات دلانے والی ہوگی بجز علم کے ——— اگر چھوٹے بڑے کا سوال ہو تو پیمایش کا علم اور اگر طاق وجفت کا سوال ہو تو اعداد کا علم۔ لوگ اس بات کو تسلیم کرلیں گے، ہی کہ نہیں؟"

پروٹاگورس کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ تسلیم کرلیں گے۔

"پھر میں ان سے کہوں گا: اچھا دوستو جب انسان کی نجات راحت اور الم کے صحیح تعین پر مشتمل ہی ——— یعنی چھوٹے بڑے، کم زیادہ اور قریب وبعید کے تعین پر ——— تو پیمایش کے معنی یہی ہوں گے نا کہ ان کے ایک دوسرے کی نسبت سے کم وبیش یا مساوی ہونے پر غور کیا جائے؟"

"بے شک یہی ہوں گے"۔

اور چونکہ یہ پیمایش ایک قاعدہ اور ضابطہ رکھتی ہی اس لیے یقیناً اس کا کوئی علم یا فن ہوگا"۔

"لوگ اس سے اتفاق کریں گے"۔

"اس علم یا فن کی ماہیت پر ہم کبھی آیندہ غور کریں گے مگر اس علم کا وجود اس سوال کا مدلل جواب ہے جو تم لوگوں نے مجھ سے اور پروٹاگورس سے پوچھا تھا۔ تمھیں یاد ہوگا جب تم نے یہ سوال کیا تو ہم دونوں نے کہا تھا کہ علم سے زیادہ قوی کوئی چیز نہیں اور علم جس چیز میں بھی موجود ہوگا راحت وغیرہ سب پر فائق ہوگا۔ اس پر تم نے یہ کہا کہ راحت اکثر اس شخص کو مغلوب کر لیتی ہے جو علم رکھتا ہے، ہم نے اس سے انکار کیا تو تم نے فوراً جواب دیا: پروٹاگورس اور سقراط، آخر راحت سے مغلوب ہو جانے کے اس کے سوا اور کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ —— بتاؤ اس حالت کو تم کیا کہو گے؟" اگر ہم اس وقت جواب دیتے "جہالت" تو تم ہم پر ہنستے۔ لیکن اب اگر تم ہم پر ہنسو گے تو گویا اپنے آپ پر ہنسو گے اس لیے کہ خود تسلیم کر چکے ہو کہ لوگ راحت اور الم یعنی نیکی اور بدی کے انتخاب میں علم کی کمی کی وجہ سے غلطی کرتے ہیں اور یہ مان چکے ہو کہ ان کی غلطی کا باعث محض علم کی عام کمی نہیں ہوتی بلکہ اس خاص علم کی کمی جو پیمائش کہلاتا ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ جو خطا علم کی کمی کی وجہ سے کی جاتی ہے وہ جہالت کی خطا کہلاتی ہے۔"

"چنانچہ راحت سے مغلوب ہو جانے کے معنی یہ ہیں: جہالت اور وہ بھی انتہا کو پہنچی ہوئی۔ ہمارے دوست پروٹاگورس، پروڈیکس اور ہپیاس یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ جہالت کے معالج ہیں۔ لیکن تم جو اس غلط فہمی میں ہو کہ جہالت سبب نہیں ہے اور وہ فن جس کا میں ذکر کر رہا ہوں سکھایا نہیں جا سکتا، سوفسطائیوں کے پاس جو ان مسائل کے معلم ہیں نہ خود جاتے ہو اور نہ اپنے بچوں کو بھیجتے ہو۔ —— تم اپنا پیسہ بچا کر رکھتے ہو اور انھیں کچھ نہیں دیتے، نتیجہ یہ ہے کہ تمھاری شخصی زندگی اور عمومی زندگی دونوں بگڑ گئی ہیں۔" فرض کرو یہ جواب ہے جو ہم لوگوں کو دیں گے۔ اب میں صرف پروٹاگورس ہی سے نہیں بلکہ ہپیاس اور پروڈیکس تم سے

بھی (اس لیے کہ بحث میں صرف ہم دونوں نہیں بلکہ تم بھی شامل ہو) یہ پوچھتا ہوں کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا نہیں؟"

ان سب کا یہ خیال تھا کہ میں نے جو کچھ کہا بالکل ٹھیک ہے۔

"تو پھر تم اس پر متفق ہو کہ راحت نیکی اور الم بدی ہے یہاں میں اپنے دوست پروڈیکس سے درخواست کروں گا کہ لفظی باریکیوں کو دخل نہ دے خواہ وہ راحت کی جگہ لذت، خوشی یا لطف کچھ بھی کہتا ہو۔ میرے اچھے پروڈیکس خواہ تم ان میں سے کسی لفظ کو پسند کرو مہربانی کر کے مجھے اس کا لحاظ رکھ کر جواب دو کہ میں نے الفاظ کو کس معنی میں استعمال کیا ہے۔"

پروڈیکس ہنسنے لگا اور اس نے اور دوسروں نے میری بات کو مان لیا۔

"تو میرے دوستو تمھاری اس بارے میں کیا رائے ہے کیا وہ سب کام قابلِ قدر یا مفید نہیں ہیں جو زندگی کو الم سے پاک اور راحت سے معمور کرتے ہیں؟ جو کام قابلِ قدر ہو وہ مفید اور نیک بھی ہوتا ہے نہ؟"

یہ تسلیم کر لیا گیا

"پھر اگر راحت اور نیکی ایک چیز ہے تو کوئی شخص یہ جان کر کہ ایک کام دوسرے کام سے بہتر بھی ہے اور قابلِ حصول بھی یہ نہیں کر سکتا کہ پہلے کام کو چھوڑ کر دوسرا کام کرے۔ انسان کا اپنے کام سے کم تر کام کرنا محض جہالت ہے اور برتر کام کرنا حکمت۔"

اُن سب نے اتفاق کیا

"کیا جہالت کے یہ معنی نہیں کہ انسان غلط رائے رکھتا ہو اور اہم معاملات میں دھوکے میں ہو؟"

اس سے بھی اُن سب نے اتفاق کیا

میں نے کہا "تو پھر کوئی شخص بُرا کام یا ایسا کام جسے وہ بُرا سمجھتا ہو عمداً

نہیں کرتا۔ بدی کو نیکی پر ترجیح دینا انسان کی فطرت میں نہیں۔ جب کبھی انسان کو دو بدیوں میں سے ایک اختیار کرنی پڑتی ہے تو کوئی ایسا نہ ہو گا جو اپنی مرضی سے چھوٹی بدی کو چھوڑ کر بڑی کو اختیار کرے۔"

ہم سب نے اسے لفظ بہ لفظ مان لیا۔

"اچھا تو ایک چیز ہے جسے خوف یا دہشت کہتے ہیں۔ یہاں 'پروڈیکس' میں خاص طور پر یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں اس خوف یا دہشت کو بدی کا اندیشہ کہوں تو تمہیں اس سے اتفاق ہو گا یا نہیں۔"

پروڈیکس اور ہپیاس نے اس سے اتفاق کیا البتہ پروڈیکس نے اتنی بات کہی کہ یہ چیز دہشت نہیں بلکہ خوف ہے۔

"خیر اسے چھوڑو، پروڈیکس۔ میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ اگر ہمارے پہلے دعوے صحیح ہیں تو کوئی شخص اُس چیز کو اختیار کرے گا جس سے وہ ڈرتا ہے جب کہ اسے کوئی مجبوری نہ ہو؟ کیا یہ اس بات کی نقیض نہیں جسے ہم پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان جس چیز سے ڈرتا ہے اُسے بُرا سمجھتا ہے اور جس چیز کو بُرا سمجھتا ہے اسے کبھی اپنی مرضی سے قبول یا اختیار نہیں کرتا؟"

اسے بھی سب نے مان لیا۔

"یہ ہیں، ہپیاس اور پروڈیکس، ہمارے مقدمات۔ اب میں پروٹیگورس سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں یہ سمجھائے کہ جو اس نے پہلے کہا تھا وہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ میرا اشارہ اس بات کی طرف نہیں جو اس نے سب سے پہلے کہی تھی۔ وہ تو تمہیں یاد ہو گا۔ یہ تھی کہ نیکی کے پانچ حصے ہیں جن میں سے کوئی ایک دوسرے سے مشابہ نہیں۔ ہر ایک کا کام الگ الگ ہے۔ میں اس کا ذکر نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس دعوے کا جو اس نے آگے چل کر کیا کہ پانچ

نیکیوں میں سے چار تو ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتی ہیں مگر پانچویں یعنی شجاعت دوسری نیکیوں سے بہت مختلف ہے اور اس کا ثبوت اس نے اس طرح دیا تھا: "تم دیکھتے ہو سقراط، کہ بعض لوگ جو نہایت بے دین، بے انصاف، بے اعتدال اور جاہل ہیں بڑے بہادروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شجاعت نیکی کے دوسرے حصّوں سے بہت مختلف ہے۔" مجھے اُس وقت اس کی یہ بات سن کر تعجب ہوا تھا اور اب تم سے اس معاملے پر بحث کرنے کے بعد تو اور بھی زیادہ تعجب ہوتا ہے۔ اس پر میں نے پوچھا کہ کیا بہادر سے تم جری اور بے باک مراد لیتے ہو تو اس نے کہا کہ ہاں تند مزاج یا بے دھڑک آگے بڑھنے والے (تمھیں یاد ہوگا پروٹاگورس کہ تم نے یہی جواب دیا تھا)

اس نے اس کی تائید کی۔

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ بہادر کس چیز کے مقابلے میں آگے بڑھتے ہیں کیا انھیں خطروں کے مقابلے میں جن کا بزدل سامنا کرتے ہیں؟"

اُس نے کہا "نہیں"۔

"تو پھر کسی اور چیز کے مقابلے میں؟"

"ہاں"۔

"تو بزدل وہاں آگے بڑھتے ہیں جہاں سلامتی ہو اور بہادر اس جگہ جہاں خطرہ ہو۔"

"ہاں یہی کہا جاتا ہے، سقراط"۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ تمھارے نزدیک بہادر کس چیز کے مقابلے میں آگے بڑھنے کو تیار رہتے ہیں ــــ خطروں کے مقابلے میں یہ

جانتے ہوئے کہ وہ خطرے ہیں یا کسی اور چیز کے مقابلے میں؟"

"نہیں پہلی صورت کو تو تم اسی سابقہ بحث میں ناممکن ثابت کر چکے ہو۔"

"یہ بھی بالکل درست ہے اور اگر یہ استدلال صحیح تھا تو کوئی شخص جان بوجھ کر خطروں کا سامنا نہیں کرتا کیونکہ یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ضبط کی کمی جس کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتا ہے جہالت ہے۔"

اس نے اس کو تسلیم کیا۔

"اور بہادر اور بزدل دونوں اس چیز کے مقابلے کے لیے آگے بڑھتے ہیں جس کے مارنے میں وہ جری اور بے باک ہوں گویا اس نقطۂ نظر سے بہادر اور بزدل ایک ہی چیز کے مقابلے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔"

پروٹاگورس نے کہا "مگر سقراط جس چیز کا مقابلہ بزدل کرتا ہے وہ اور ہے اور جس چیز کا بہادر کرتا وہ اور ہے مثلاً بہادر تو میدانِ جنگ میں جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور بزدل تیار نہیں ہوتا۔"

میں نے پوچھا" اور میدان جنگ میں جانا عزت کی بات ہے یا ذلت کی؟"

اس نے جواب دیا "عزت کی۔"

"اور اگر عزت کی بات ہے تو جیسا ہم تسلیم کر چکے ہیں نیکی ہے کیونکہ ہم نے یہ مان لیا ہے ہر باعزت کام نیک ہے"۔

بالکل ٹھیک ہے۔ میں اس رائے پر ہمیشہ قائم رہوں گا۔"

"اچھا مگر یہ بتاؤ کہ دونوں میں سے کون بہ قول تمھارے، میدانِ جنگ میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو ایک نیک اور باعزت کام ہے۔"

اس نے جواب دیا "بزدل"۔

"اور جو چیز اچھی اور باعزت ہو وہ خوشگوار بھی ہوتی ہے؟"

"بے شک وہ خوشگوار سمجھی جاتی ہے"۔

"تو کیا بزدل جان بوجھ کر بہتر اور برتر اور خوشگوار چیز میں شریک ہونے سے انکار کرتے ہیں؟"

"اگر ہم اسے تسلیم کریں تو اُن باتوں سے جو پہلے تسلیم کر چکے ہیں انکار کرنا پڑے گا"۔

"تو بہادر اور بزدل دونوں اس چیز میں شرکت کرتے ہیں جو بہتر اور برتر اور خوشگوار ہے؟"

"یہ تو ماننا پڑے گا"۔

"اور بہادر کے دل میں خوف یا جراُت کا کوئی ذلیل جذبہ نہیں ہوتا؟"

"ٹھیک ہے"۔

"اگر ذلیل نہیں ہوتا تو باعزت ہوتا ہے؟"

اُس نے اتفاق کیا

"اور اگر باعزت ہے تو نیک ہے؟"

"ہاں"۔

"لیکن ایک بزدل یا جری یا مجنون آدمی کا خوف اور جراُت ذلیل چیزیں ہیں؟"

اس نے اتفاق کیا

"اور یہ ذلیل خوف اور جراُت، جہالت اور بے علمی پر مبنی ہے؟"

"ٹھیک ہے"۔

"اچھا تو اس چیز کو جو بزدل کے فعل کی محرک ہوتی ہے تم بزدلی کہو گے یا بہادری؟"

"بزدلی کہوں گا"۔

"اور کیا ہم یہ ثابت نہیں کر چکے ہیں کہ وہ بزدل خطروں کی حقیقت سے ناواقف

ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں؟"

"بے شک"۔

"تو اس جہالت کی وجہ سے وہ بزدل ہوتے ہیں؟"

اس نے اتفاق کیا

"اور یہ تم مان چکے ہو کہ وہ بزدلی کی وجہ سے بزدل ہوتے ہیں؟"

اس نے پھر اتفاق کیا

"تو پھر خطرے کے بارے میں ناواقفیت اور جہالت بزدلی ہی؟"

اس نے سر کے اشارے سے اقرار کیا

"مگر شجاعت بزدلی کی ضد ہی؟"

"ہاں"۔

اور وہ حکمت جس سے انسانوں کو خطروں کا علم ہوتا ہی ان سے ناواقفیت یا جہالت کی ضد ہی؟"

اس کا بھی اس نے سر کے اشارے سے اقرار کیا۔

"اور ان سے ناواقفیت بزدلی ہی؟"

اس نے بادلِ ناخواستہ اقرار کیا۔

"اور خطرے کی حقیقت کا علم شجاعت ہی اور وہ اس حقیقت سے ناواقفیت کی ضد ہی؟"

یہاں پر اس نے اقرار کرنا چھوڑ دیا اور خاموش ہو گیا۔

"یہ کیا بات ہی پروٹاگورس تم نہ اقرار کرتے ہو نہ انکار؟"

"تم اکیلے ہی بحث کو ختم کر لو"۔

"میں صرف ایک سوال اور پوچھنا چاہتا ہوں کیا تمھارے خیال میں ایسے لوگ

بھی ہوتے ہیں جو نہایت جاہل ہوں مگر اس کے باوجود نہایت بہادر ہوں ؟"

"تمہیں جواب لینے کا بے انتہا شوق معلوم ہوتا ہی سقراط، اس لیے میں تمھاری خوشی کرتا ہوں اور یہ مانے لیتا ہوں کہ پچھلی بحث کی بنا پر یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہی۔"

"میرا اس بحث کے جاری رکھنے میں صرف یہ مقصد تھا کہ نیکی کی حقیقت اور اس کی مختلف اقسام کے باہمی تعلقات معلوم ہو جائیں۔ اس لیے کہ مجھے پوری طرح سے یقین ہی کہ اگر یہ بات صاف ہو جائے تو وہ دوسرا مسئلہ بھی جس پر ہم دونوں میں اس شرح و بسط سے بحث ہوئی تھی ——— تمھارا دعویٰ تھا کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہی اور مجھے اس سے انکار تھا، صاف ہو جائے گا۔ ہماری اس بحث کا نتیجہ مجھے کچھ عجیب معلوم ہوتا ہی۔ اگر اس بحث کی انسان کی طرح زبان ہوتی تو اس کی آواز ہم پر ہنستی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی: 'پروٹاگورس اور سقراط تم بھی عجیب لوگ ہو۔ تم تو یہ کہہ رہے تھے 'سقراط کہ نیکی سکھائی نہیں جا سکتی اور اب تم اپنی تردید آپ کر رہے ہو تمھاری کوشش ہی کہ یہ ثابت کرو کہ عدل، عفت، شجاعت ہر چیز علم ہی ——— جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ نیکی یقیناً سکھائی جا سکتی ہی۔ اگر نیکی علم سے علیحدہ کوئی چیز ہوتی جیسا کہ پروٹاگورس ثابت کرنا چاہتا تھا تو ظاہر ہی کہ وہ سکھائی نہ جا سکتی۔ لیکن اگر نیکی سراسر علم ہی جیسا کہ تم ثابت کرنا چاہتے ہو تو میں یہ ماننے پر مجبور ہوں کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہی۔ برخلاف اس کے پروٹاگورس جس نے شروع میں یہ کہا تھا کہ نیکی سکھائی جا سکتی ہی اب یہ ثابت کرنے کی فکر میں ہی کہ وہ اور چاہے جو کچھ ہو مگر علم نہیں ہی اگر یہ ٹھیک ہو تو وہ ہرگز سکھائی نہیں جا سکتی اب پروٹاگورس اپنے خیالات کی یہ الجھن دیکھ کر میرا جی بہت چاہتا ہی کہ یہ کسی طرح دور ہو جائے میں چاہتا ہوں کہ ہم اس بحث کو جاری رکھیں جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا چیز ہی؟ اور وہ سکھائی جا سکتی ہی یا نہیں سکھائی جا سکتی ؟

بروٹاگورس نے جواب دیا" سقراط میری طبیعت میں کمینہ پن نہیں ہے۔ اور کبھی کسی پر حسد نہیں کرتا۔ میں دل سے تمھارے زورِ بیان اور طرزِ استدلال کی داد دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے اکثر کہا ہے کہ جتنے لوگوں کو میں جانتا ہوں اُن سے زیادہ اور تمھارے ہم عمروں سے تو بدرجہا زیادہ میں تمھاری قدر کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم فلسفے میں بہت شہرت اور امتیاز حاصل کرو گے۔ اس موضوع پر ہم کبھی آیندہ بحث کریں گے۔ اس وقت کسی اور چیز پر گفتگو ہونی چاہیے"۔

"میں نے کہا بڑی خوشی سے اگر تمھاری یہ خواہش ہے۔ مجھے اب سے بہت پہلے اس کام کے لیے پہنچنا تھا جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ اور میں صرف اس لیے ٹھیر گیا تھا کہ شریف کیلیاس کی فرمائش کو رد نہیں کر سکتا تھا"۔ اس طرح یہ گفتگو ختم ہوگئی۔ اور ہم نے اپنی راہ لی۔

فیڈرس

اشخاص مکالمہ

سقراط فیڈرس

مقام :- دریائے ایلیس کے کنارے چنار کے درخت کے نیچے ۔

سقراط :- "عزیز من فیڈرس تم کہاں سے آرہے ہو اور کدھر کا ارادہ ہے ؟"

فیڈرس ۔ میں کفالس کے بیٹے لیسیاس کے ہاں سے آرہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ فصیل کے باہر جاکر ٹہلوں اس لیے کہ صبح کو سارے وقت میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اور ہمارا دوست اکیومینس کہتا ہے کہ کھلی ہوا میں ٹہلنا خانقاہ میں بند رہنے سے زیادہ فرحت بخش ہے ۔"

سقراط ۔ یہ تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ اچھا تو لیسیاس شہر میں تھا ؟

فیڈرس ۔ ہاں وہ موریکس کے ہاں اپی کراٹس کے ساتھ ٹھیرا تھا، اس مکان میں جو اولمپی زیس کے مندر کے پاس ہے۔

سقراط ۔ اور اس نے تمھاری کیا خاطر کی ؟ کیا میرا خیال غلط ہے کہ لیسیاس نے تمھیں اپنی گفتگو سے محظوظ کیا ؟

فیڈرس ۔ میں تمھیں سناؤں گا اگر تمھارے پاس اتنا وقت ہو کہ میرے ساتھ ٹہلنے چلو۔

سقراط ۔ مجھے چاہیے کہ بقول پنڈارس کے تمھاری اور لیسیاس کی گفتگو کو

"ہر کام سے زیادہ اہم سمجھوں گا"

فیڈرس ۔ تو پھر چلو۔

سقراط ۔ اور تم اپنا قصہ کہو چلو ۔

فیڈرس ۔ میرا قصہ سقراط تمھارے مذاق کا ہی۔ اس لیے کہ ہماری گفتگو کا موضوع عشق تھا لیسیاس نے ایک حسین نوجوان کی داستان لکھی ہی جس کو ایک شخص پھسلانا چاہتا تھا مگر وہ اس کا عاشق نہ تھا اور یہی سارے قصے کا نچوڑ ہی۔ اس نے بڑی خوبی سے یہ ثابت کیا ہی کہ جو عاشق نہ ہو اسے عاشق پر ترجیح دینی چاہیے ۔

سقراط ۔ شاباش ہی اس کو! کاش وہ یہ کہتا کہ غریب کو امیر پر اور بوڑھے کو جوان پر ترجیح دینی چاہیے ——— تو میرا اور بہت سے لوگوں کا بھلا ہوتا ۔ اس کے الفاظ دل کو تسکین دیتے اور وہ خلق خدا کا محسن سمجھا جاتا ۔ مجھ سے پوچھو تو مجھے اس کی تقریر سننے کا اتنا شوق ہی کہ اگر تم ٹہلتے ہوئے یہاں سے میگارا تک جاؤ اور اس کی فصیل تک پہنچ کر ہیروڈِکس کی ہدایت کے مطابق بغیر اندر قدم رکھے الٹے پھر واپس آجاؤ تب بھی میں تمھارا ساتھ نہ چھوڑوں گا ۔

فیڈرس ۔ میرے اچھے سقراط تمھارا مطلب کیا ہی؟ تم کیونکر یہ توقع کرسکتے ہو کہ میرا بے مشق حافظہ اتنے زبردست کارنامے کو یاد رکھ سکتا ہی جو اس زمانے کے سب سے بڑے ادیب اور خطیب نے مدتوں میں تصنیف کیا ہی؟ سچ کہتا ہوں یہ میری طاقت سے باہر ہی ۔ اگر مجھ میں یہ بات پیدا ہو جائے تو میں بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار ہوں ۔

سقراط ۔ میں فیڈرس کو اتنی ہی اچھی طرح جانتا ہوں جتنا اپنے آپ کو اور مجھے پورا یقین ہی کہ اس نے لیسیاس کی تقریر ایک بار نہیں بلکہ بار بار سنی ——— اس نے اس سے کئی بار دہرانے پر اصرار کیا اور لیسیاس نے خوشی سے اس کی فرمایش

پوری کی۔ آخر جب اس طرح کام نہ چلا تو اس نے کتاب اٹھائی اور اس حصے کو جو اسے سب سے زیادہ پسند تھا دیکھتا رہا ـــــــ اس شغل میں اس کا صبح کا سارا وقت گزرا ـــــــ اور جب وہ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اس نے ارادہ کیا کہ جا کر ٹہلے مگر قسم ہے مقدس کتے کی کہ اسی وقت جب کہ وہ ساری تقریر کو زبانی یاد کر چکا تھا اگر وہ غیر معمولی طور پر لمبی ہو تو اور بات ہے) اور فصیل کے باہر ایک جگہ پہنچا تھا کہ اپنے سبق کی مشق کر سکے وہاں اسے ایک اور شخص نظر آیا جس میں یہی کمزوری تھی یعنی اس کی طرح تقریر کا رسیا تھا؟ ـــــــ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے دل میں سوچا "ایک ہم مشرب مل گیا اب خوب دور رہے گا" اور اس نے اسے دعوت دی کہ میرے ساتھ ٹہلنے چلو۔ لیکن جب تقریر کے شائق نے درخواست کی کہ وہ قصہ دہراؤں تو وہ بننے لگا اور اس نے کہا "یہ مجھ سے نہیں ہونے کا۔ گویا اس کی طبیعت ناساز ہے حالانکہ اگر سننے والا انکار کر دیتا تو وہ اسے کچھ دیر بعد زبردستی سناتا اس لیے فیڈرس اس سے کہو کہ جو کام کچھ دیر کے بعد بغیر فرمائش کے وہ خود ہی کرے گا وہ ابھی کر دے۔"

فیڈرس ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک میں کسی نہ کسی طرح سنا نہ دوں تم میرا پیچھا نہیں چھوڑنے کے اس لیے بہتر یہی ہے کہ جیسا کچھ مجھ سے بنے سنا ہی دوں ۔

"بہت ٹھیک کہا تم نے"۔

"اچھا تو میں سناتا ہوں۔ مگر سچ کہتا ہوں سقراط میں نے لفظ بہ لفظ یاد نہیں کیا ـــــــ بالکل نہیں۔ پھر بھی اس کی گفتگو کا ایک مجموعی تصور میرے ذہن میں موجود ہے اور اس نے عاشق اور غیر عاشق کے جو جو فرق بتائے تھے ان کا خلاصہ تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ تم کہو تو شروع سے کہہ چلوں"!

"ہاں میرے پیارے دوست۔ مگر پہلے یہ دکھاؤ کہ تمہارے اُلٹے ہاتھ میں لبادے کے نیچے کیا چیز ہے۔ میرے خیال میں تو یہ پلندہ اس تقریر کا مسودہ ہے۔ مجھے

تم سے اتنی محبت ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمھارے حافظے پر زور پڑے۔ اگر خود لیسیاس صاحب یہاں دھرے ہوئے ہیں۔"

"بس بس میں سمجھ گیا کہ میری چالیں تمھارے سامنے نہیں چلیں گی۔ لیکن اگر میں پڑھوں تو تم کہاں بیٹھ کر سننا پسند کرو گے۔"

"آؤ سڑک چھوڑ کر ایلیس کے کنارے چلے چلیں، کوئی خاموش سی جگہ دیکھ کر بیٹھ جائیں گے۔"

"خوش قسمتی سے میں آج چپل نہیں پہنے ہوئے ہوں اور تم تو کبھی پہنتے ہی نہیں اس لیے ہم چشمے کے کنارے جاکر اپنے پانو پانی میں لٹکا کر بیٹھ سکتے ہیں۔ یہی سب سے آسان طریقہ ہے اور گرمی میں دوپہر کے وقت اس سے زیادہ خوشگوار اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔"

"اچھا تم آگے آگے چلو اور کوئی ایسی جگہ ڈھونڈو جہاں ہم بیٹھ سکیں۔"

"تمھیں وہ سب سے اونچا چنار کا درخت نظر آتا ہے؟"

"ہاں۔"

"وہاں سایہ بھی ہے، ٹھنڈی ہوا بھی اور گھاس بھی جس پر ہم بیٹھ سکتے ہیں یا جی چاہے تو لیٹ سکتے ہیں۔"

"اچھا تو چلو۔"

"معلوم نہیں سقراط وہ جگہ یہیں کہیں ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ بوریاس اوریتھیا کو ایلیس کے کنارے پکڑ لے گیا تھا۔"

"ہاں روایت تو یہی ہے۔"

"کیا عین اسی مقام سے؟ ندی کا پانی کس قدر صاف اور چمکدار ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے اگر چشم تصور سے دیکھیں تو آس پاس حسین لڑکیاں بھی کھیلتی نظر آئیں گی۔"

"میرے خیال میں وہ جگہ ٹھیک اس مقام پر نہیں بلکہ پاؤ میل آگے ہے جہاں سے

ندی کو پار کر کے آرٹیمس کے مندر کو جاتے ہیں اور غالباً وہاں بوریاس کے نام کی ایک قربان گاہ بھی بنی ہے۔"

"میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ مگر مہربانی کر کے سقراط یہ تو بتاؤ کہ تم اس قصے کے قائل ہو؟"

"دانش مند لوگ ذرا شکی ہوا کرتے ہیں، اگر میں بھی ان کی طرح شک سے کام لوں تو کوئی انوکھی بات نہ ہوگی۔ میں اس کی عقلی توجیہہ کر سکتا ہوں کہ اوریتھیا فارمیسیا کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ شمال سے ایک آندھی آئی اور اسے اڑا کر قریب کے پہاڑ پر لے گئی اور چونکہ اس کی موت اس طریقے سے واقع ہوئی اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اُسے بوریاس پکڑلے گیا۔ لیکن مقام کے بارے میں اختلاف ہے۔ یہ روایت ایک دوسری طرح بھی مشہور ہے کہ وہ یہاں سے نہیں بلکہ ایروپیگس سے پکڑی گئی تھی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مثالی قصے بہت خوب ہیں لیکن جس شخص کو یہ گھڑنے پڑتے ہیں اس کی حالت کچھ قابلِ رشک نہیں ہوتی اور اسے بڑی محنت اور اپج سے کام لینا پڑتا ہے اور جب اس نے ایک بار ابتدا کر دی تو اسے انسان نما گھوڑوں اور خوفناک ہوّوں کی ہوا باندھنی پڑتی ہے۔ مار زلف عورتوں اور پردار گھوڑوں اور طرح طرح کی بعید از قیاس اور عجیب و غریب مخلوق کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ اور اگر وہ شکی طبیعت کا آدمی ہے اور ان سب کو قیاس کے احاطے میں لانا چاہتا ہے تو اس قسم کے اُن گھڑ فلسفے میں بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ مجھے تو ان چیزوں کی تحقیق کی بالکل فرصت نہیں۔ تمھیں اس کی وجہ بتاؤں؟ بات یہ ہے کہ پہلے مجھے اپنی حقیقت معلوم کرنی ہے جیسا ڈیلفی کے مندر کا کتبہ کہتا ہے۔ جب تک میں اپنے آپ سے نہ واقف ہوں اُن چیزوں کو جاننے کی فکر کرنا جن سے مجھے کوئی تعلق نہیں ایک مضحکہ خیز بات ہوگی۔ اس لیے میں ان سب چیزوں کو خیرباد کہتا ہوں۔ عام رائے میرے لیے کافی ہے۔ اس لیے کہ جیسا میں کہہ چکا ہوں مجھے اس کو جاننے کی

فکر نہیں بلکہ اپنے آپ کو جاننے کی فکر ہے۔ کیا میں بھی کوئی عفریت ہوں ٹائیفو اژدہے سے زیادہ پیچیدہ اور جذبات و خواہشات سے پھولا ہوا یا ایک سیدھا اور شائستہ مخلوق جسے قدرت نے روحانیت عطا کی ہے اور عجز و انکسار کی زندگی کے لیے بنایا ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ میرے دوست وہ چنار کا درخت یہی تو نہیں ہے جہاں تم مجھے لے جا رہے تھے؟"

"ہاں۔ یہی ہے۔"

"قسم ہے میرے دیوی کی کیسی خوب صورت آرام گاہ ہے، موسم گرما کی آوازوں اور خوشبوؤں سے معمور۔ یہ سر بفلک سایہ دار درخت، یہ اونچا گھنا ست جھاڑ، اس کے پھولوں کی بہار اور ان کی روح پرور خوشبو، یہ چنار کے نیچے بہتی ہوئی ندی جس کے ٹھنڈے پانی میں پیروں کو بڑا لطف آتا ہے اگر آرائشی کاموں اور مورتوں سے اندازہ کیا جائے تو یہ ان جگہوں میں سے ہے جو اکیلوس اور جل پریوں سے منسوب کی جاتی ہے کس قدر خوشگوار ہوا ہے، کیسی فرحت بخش۔ اس کے زناٹے کی آواز گویا اس گیت کا جواب ہے جو جھینگر ل کر گا رہے ہیں۔ مگر سب سے مزے کی چیز یہ گھاس ہے جس پر سر رکھیے تو تکیے کی طرح نرم اور گدگدی معلوم ہوتی ہے۔ میرے عزیز فیدرس تم تو بڑی اچھی جگہ لائے۔"

"تم بھی عجیب و غریب آدمی ہو، سقراط۔ دیہات میں جا کر تم واقعی ایک اجنبی معلوم ہوتے ہو جس کو کوئی راستہ بتانے والا ساتھ لیے پھر رہا ہو، کبھی تم سرحد پار بھی جاتے ہو؟ میرے خیال میں تو تم شہر کے پھاٹک کے باہر بھی قدم نہ رکھتے ہوگے۔"

"بالکل ٹھیک ہے میرے اچھے دوست۔ مجھے امید ہے کہ جب تمھیں اس کا سبب معلوم ہوگا تو مجھے معذور سمجھو گے۔ بات یہ ہے کہ میں علم کا شائق ہوں اور شہر کے رہنے والے میرے استاد ہیں۔ میں جو کچھ سیکھتا ہوں ان سے سیکھتا ہوں درختوں اور گانووں سے نہیں۔ البتہ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے کوئی ایسا منتر سیکھ لیا ہے جس سے

مجھے شہر سے دیہات میں کھینچ لائے ہو ایک بھوکی گائے کی طرح جسے کوئی درخت کی شاخ یا پھلوں کا گچھا دکھا کر لائے۔ مجھے بس دور سے کوئی کتاب دکھا دو اور پھر سارے یونان میں اور ساری دنیا میں لیے لیے پھرو۔ خیر اب یہاں پہنچ کر میں تو لیٹتا ہوں اور تم کو جس کل بیٹھنے یا لیٹنے میں پڑھنے کی آسانی ہو، اسی کو اختیار کرو۔ اچھا تو پھر شروع کرو۔"

"سلنو:۔

تمھیں میرا حال معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس معاملے کی بہترین صورت جس میں ہم دونوں کا بھلا ہو کیا ہو سکتی ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ مجھے اپنے مقصد میں اس وجہ سے ناکامیابی نہیں ہونی چاہیے کہ میں تمھارا عاشق نہیں ہوں۔ عاشق تو جب ان کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے ان خدمتوں پر جو انھوں نے اپنے محبوب کی کی ہیں پچھتاتے ہیں مگر غیر عاشق جو اپنی مرضی کے مالک ہیں اور کسی چیز سے مجبور نہیں کبھی نہیں پچھتاتے اس لیے کہ وہ اتنا ہی سلوک کرتے ہیں جتنا ان کے مقدور میں ہے اور جتنا خود ان کے مقصد کے لیے مفید ہے۔ پھر یہ کہ عاشق سوچتے ہیں کہ انھوں نے محبت کی خاطر اپنا کام چھوڑ کر دوسرے کی خدمت کی ہے اور جب اس کے ساتھ وہ ان تکلیفوں کا حساب لگاتے ہیں جو انھوں نے اٹھائی ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے محبوب کے احسانوں کی بخوبی تلافی کر دی۔ مگر غیر عاشق کے دل میں کبھی ایسے تکلیف دہ خیالات نہیں آتے۔ اس نے نہ تو کبھی محبت کی خاطر اپنا کام چھوڑا اور نہ اپنے عزیزوں سے بگاڑی ہے۔ اسے نہ تو اپنی تکلیفیں شمار کرنی ہیں اور نہ بہانے بنانے۔ جب ان میں سے کوئی بات نہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ بغیر کسی تکلیف کے وہ کام نہ کرے جس میں محبوب کی خوشی ہو۔ اگر تم یہ کہو کہ عاشق اس وجہ سے قابل قدر ہے کہ اس کی محبت زیادہ گہری ہے اور وہ محبوب کو خوش کرنے کے لیے وہ سب کچھ کہنے اور کرنے کو تیار ہے جو دوسروں

کے لیے قابل نفرت ہے۔ یہ اگر سچ ہے تو محض اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاں اسے کوئی دوسرا محبوب مل گیا تو وہ موجودہ محبوب کی پروا نہیں کرے گا اور نئے کی خاطر پرانے کو ناخوش کرنے میں اسے تامل نہیں ہوگا۔ بھلا بتاؤ تو اس قدر اہم معاملے میں انسان کیونکر اس شخص پر اعتبار کر سکتا ہے جو ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ کوئی تجربہ کار آدمی اس علاج کی ہامی نہ بھرتا ہو اور مریض خود یہ اعتراف کرتا ہو کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں بلکہ اس کے دماغ میں خلل ہے اور اس کو اپنے اوپر قابو نہیں! اور اگر اسے ہوش آگیا تو کیا وہ یہ سمجھے گا کہ جو خواہشیں خلل دماغ کی حالت میں اس کے دل میں پیدا ہوئی تھیں وہ اچھی ہیں؟ اس کے علاوہ غیر عاشقوں کی تعداد عاشقوں سے کہیں زیادہ ہے اور اگر تم بہترین عشاق کا انتخاب کرنا چاہو تو انتخاب کا حلقہ بہت محدود ہوگا لیکن اگر غیر عاشقوں میں سے انتخاب کرنا ہو تو بہت بڑا حلقہ موجود ہے اور اس کا کہیں زیادہ امکان ہے کہ ان میں تمھیں ایسا شخص مل جائے گا جو تمھاری دوستی کے لائق ہو۔ اگر تم لوگوں کی چہ میگوئیوں سے ڈرتے ہو اور بدنامی سے بچنا چاہتے ہو تو غالباً عاشق جو ہمیشہ یہ سمجھا کرتا ہے کہ جتنا وہ دوسروں پر رشک کرتا ہے دوسرے بھی اس پر کرتے ہیں۔ کسی نہ کسی سے اپنی کامیابیوں کی شیخیاں بگھارے گا اور اترا کر انھیں کھلم کھلا بیان کرے گا! وہ دوسروں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس کی محنت رائگاں نہیں گئی لیکن غیر عاشق کو اپنے اوپر زیادہ قابو ہوتا ہے۔ اسے اپنے کام سے کام ہے لوگوں کو دکھانے سے مطلب نہیں پھر یہ کہ عاشق جب دیکھو محبوب کے پیچھے پیچھے پھرا کرتا ہے (سچ پوچھو تو یہ اس کا باقاعدہ پیشہ ہے) اور جہاں انھوں نے ایک دو باتیں کیں تو لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ہو نہ ہو کوئی اگلا پچھلا عشق ہی کا معاملہ ہے۔ لیکن جب کبھی غیر عاشق ایک دوسرے سے ملتے ہیں خواہ دوستی کی وجہ سے یا محض دل بہلانے کے لیے تو کوئی نہیں پوچھتا اس لیے کہ لوگ جانتے ہیں کہ دو

آدمیوں کا باتیں کرنا ایک قدرتی بات ہے۔ اس کے علاوہ تم کو دوستی کی ناپائداری کا ڈر ہو تو تم اس بات کو سوچو کہ اور تو ہر صورت میں آپس کی نزاع طرفین کے لیے ایک مصیبت ہوتی ہے لیکن عاشق کے مقابلے میں جسے تم اپنی سب سے بڑی دولت دے چکے ہو تمھیں کو زیادہ نقصان ہوگا اس لیے تمھیں عاشق سے اور بھی ڈرنا چاہیے کیونکہ وہ بہت سی چیزوں سے بھڑکتا ہے اور ہمیشہ یہ سوچا کرتا ہے کہ ساری دنیا نے اس کے خلاف سازش کر رکھی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے محبوب کو لوگوں سے ملنے جلنے نہیں دیتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ تم دولت مندوں سے ملو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے پاس اس سے زیادہ دولت ہو، یا اہلِ علم سے کہ مبادا وہ اس سے زیادہ عقل و فہم رکھتے ہوں اسی طرح وہ ہر اس شخص کے اثر سے جو اس سے بہتر ہو ڈرتا ہے۔ اگر اس کے کہنے سے تم سب سے قطع تعلق کر لو تو تم دنیا میں اکیلے رہ جاتے ہو اور اگر اپنے فائدے کو سوچ کر تم نے اس کی بات نہ مانی تو پھر اس سے لڑائی ہوتی ہے لیکن جو لوگ غیر عاشق ہیں اور جن کا محبت میں کامیاب ہونا ان کی قابلیت پر موقوف ہے اپنے محبوب کے ملنے جلنے والوں پر رشک نہیں کریں گے بلکہ جو لوگ اس سے ملنے سے انکار کریں ان پر نفرین کریں گے اس لیے کہ ان کے نزدیک آخر الذکر اس کی توہین کرتے ہیں اور اول الذکر اسے فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اگر محبوب کی لوگوں سے دوستی ہوگی تو اس میں بھلائی ہے نہ کہ برائی۔ پھر بہت سے عاشق اپنے محبوب کی شکل و صورت سے محبت کرنے لگتے ہیں قبل اس کے کہ اس کی سیرت یا حالات سے واقف ہوں چنانچہ جب ان کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے تو کوئی اعتبار نہیں کہ ان کی دوستی قائم رہے گی یا نہیں۔ رہے غیر عاشق جو ہمیشہ دوستی کی حد کے اندر رہتے ہیں ان کی دوستی محبوب کی عنایتوں کی وجہ سے کم نہیں ہوتی بلکہ پچھلی عنایتوں کی یاد اور اگلی مہربانیوں کی امید ان کے دل میں ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ پھر مجھ سے تو تم یہ توقع کر سکتے ہو کہ میں تمھاری اصلاح کروں گا

لیکن عاشق تمھاری عادتیں بگاڑ دے گا اس لیے کہ یہ لوگ تمھارے ہر قول اور ہر فعل کی بے جا تعریف کرتے ہیں کچھ تو اس وجہ سے کہ تمھاری خفگی سے ڈرتے ہیں اور کچھ اس لیے کہ جذبات کے جوش میں انھیں اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی عشق کے عجب عجب کارنامے ہیں اس کی بدولت حسرت زدہ دلوں کو انھیں چیزوں سے سخت تکلیفیں پہنچتی ہیں جن سے دوسروں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی اور اسی کی بدولت کامیاب عاشقوں کو مجبوراً ان چیزوں کی تعریف کرنی پڑتی ہے جن سے انھیں کوئی راحت حاصل نہیں ہوتی اس لیے ان کے محبوب کی حالت رشک کے قابل نہیں بلکہ افسوس کے قابل ہوتی ہے۔ لیکن اگر تم میری بات مانو تو اول تم سے ملنے جلنے میں صرف موجودہ خوشی کا نہیں بلکہ آیندہ فائدے کا لحاظ رکھوں گا اس لیے کہ میں عشق سے مغلوب نہیں ہوں بلکہ اپنے اوپر قابو رکھتا ہوں۔ میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر آگ بگولا نہیں ہو جاؤں گا بلکہ اگر کوئی بڑی بات ہو تب بھی رفتہ رفتہ تھوڑے بہت غصے کا اظہار کروں گا ——— جو قصور بے جانے بوجھے کیا جائے اسے معاف کر دوں گا اور جو جان بوجھ کر کیا جائے اُسے روکنے کی کوشش کروں گا۔ یہی پایدار دوستی کی نشانیاں ہیں۔ کیا تمھارے خیال میں صرف عاشق ہی پکا دوست ہو سکتا ہے؟ زرا سوچو تو: ——— اگر ایسا ہوتا تو ہم اپنی اولاد کی یا ماں باپ کی کوئی قدر نہ کرتے اور نہ ہمارے کوئی وفادار دوست ہوتے اس لیے کہ ہمیں ان سے جو محبت ہوتی ہے وہ جذبات کے جوش پر نہیں بلکہ اور قسم کے تعلقات پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہ کہا جائے کہ لطف و عنایت کے مستحق وہ لوگ ہیں جو سب سے زیادہ سرگرم عاشق ہیں تو اس اصول کے مطابق بھلائی ان لوگوں کے ساتھ نہیں کرنی چاہیے جو سب سے زیادہ نیک ہیں بلکہ ان کے ساتھ جو سب سے زیادہ محتاج ہیں اس لیے کہ انھی کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے گا اور یہی سب سے زیادہ شکر گزار

ہوں گے اور جب دعوت کرنی ہو تو اپنے دوستوں کو نہیں بلانا چاہیے بلکہ بھک منگوں اور ادچھے لوگوں کو کہ وہ تم سے مانوس ہو جائیں گے، تمھارے پیچھے پیچھے پھریں گے، تمھارے دروازہ پر پڑے رہیں گے، انتہائی خوشی اور احسان مندی کا اظہار کریں گے اور لاکھوں دعائیں دیں گے۔ لیکن در اصل تمھیں احسان ان لوگوں پر نہیں کرنا چاہیے جو تمھیں التجاؤں سے تنگ کریں بلکہ ان لوگوں پر جو اس کے بدلے میں تمھاری سب سے زیادہ خدمت کر سکیں، اس شخص پر نہیں جو محض تم سے محبت کرتا ہے بلکہ ان لوگوں پر جو محبت کے مستحق ہیں۔ ان پر نہیں جو تمھارے شباب کی بہار لوٹنا چاہتے ہیں بلکہ ان پر جو بڑھاپے میں تمھیں اپنے دھن دولت میں شریک کریں گے، ان پر نہیں جو کامیاب ہو کر دوسروں کے آگے شیخیاں بگھاریں گے بلکہ ان پر جو انکسار اور رازداری سے کام لیں گے، ان پر نہیں جنھیں صرف دم بھر کی چاہ ہے بلکہ ان پر جو عمر بھر دوستی نباہیں گے، ان پر نہیں جو جذبات کا جوش ٹھنڈا پڑ جانے کے بعد تم سے بگاڑ کر لیں گے بلکہ ان پر جو تمھارے شباب کے ڈھل جانے کے بعد اپنی شرافت اور نیکی کا ثبوت دیں گے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے یاد رکھو اور ایک اور بات پر بھی غور کرو۔ عاشق کو دوست سرزنش کرتے ہیں یہ سمجھ کر کہ اس کا طرزِ عمل برا ہے لیکن غیر عاشق کو آج تک کسی عزیز نے سرزنش نہیں کی اور نہ یہ خیال کیا کہ وہ اپنے بھلے برے سے واقف نہیں۔

شاید تم مجھ سے یہ پوچھو کہ کیا میں تمھیں ہر غیر عاشق پر مہربانی کرنے کی رائے دیتا ہوں تو میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ یہ تو کوئی عاشق بھی نہیں کہے گا کہ تم سب عاشقوں پر مہربانی کرو اس لیے کہ جو بخشش بلا تفریق سب کے ساتھ ہو اس کی کوئی معقول آدمی قدر نہیں کرتا اور جو شخص لوگوں کی نکتہ چینی سے بچنا چاہتا ہے وہ اسے آسانی سے چھپا بھی نہیں سکتا۔ محبت میں طرفین کا فائدہ ہونا چاہیے اور دونوں

میں سے ایک کو بھی نقصان نہ پہنچنا چاہیے۔

میرے خیال میں اس موضوع پر جو کچھ میں نے کہا ہے وہ بہت کافی ہے لیکن اگر تم کچھ اور چاہتے ہو اور تمھارے خیال میں کسی چیز کی کمی رہ گئی ہے تو تم پوچھو میں جواب دینے کو تیار ہوں۔"

فیڈرس نے پوچھا "کہو سقراط کیا رائے ہے؟ ہے نا اعلیٰ درجے کی تقریر، خصوصاً زبان کے لحاظ سے؟"

"ہاں واقعی بہت عمدہ ہے۔ مجھ پر اتنا اثر ہوا جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اور یہ سب تمھاری بدولت فیڈرس، اس لیے کہ میں نے دیکھا پڑھتے وقت تم پر وجد کا عالم طاری تھا اور اس خیال سے کہ تم ان معاملات میں مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہو میں نے بھی تمھاری تقلید کی اور تمھاری طرح پیارے دوست، میں بھی وجد کرنے لگا۔"

"تمھیں تو مذاق سوجھا ہے۔"

"کیا تمھارے خیال میں یہ بات میں سنجیدگی سے نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"اس طرح کی باتیں نہ کرو سقراط، بلکہ مجھے اپنی اصل رائے بتاؤ۔ میں تمھیں دوستی کے دیوتا زیس کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا یونان میں کوئی شخص اس موضوع پر اس سے زیادہ یا اس سے بہتر کچھ کہہ سکتا تھا۔"

"تو کیا ہمیں تمھیں مصنف کے خیالات کی بھی تعریف کرنی ہے یا صرف اس کی زبان کی صفائی اور سلاست اور الفاظ کی ترتیب اور موزونیت ہی کی جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے تم بہتر اندازہ کر سکتے ہو اور میں تمھاری رائے ماننے کو تیار ہوں۔ خود مجھے رائے دینے کا کوئی حق نہیں اس لیے کہ میں تو صرف اس کے خطیبانہ انداز بیان پر غور کر رہا تھا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ اس کی تو شاید لیسیاس بھی حمایت نہ کر سکتا۔ میرا تو خیال ہے، اگر غلط ہو تو تم ٹوک دینا کہ اس نے کئی جگہ ایک ہی بات کو

مکرر کہا ہے یا تو اس لیے کہ اس کا ذخیرۂ الفاظ کم ہے یا اس وجہ سے کہ وہ محنت نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے علاوہ وہ بڑے فخر کے ساتھ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ وہ کس خوبی سے ایک ہی مضمون کو دو تین طرح سے ادا کر سکتا ہے۔"

"یہ تو بالکل مہمل بات ہے سقراط! جسے تم تکرار کہتے ہو یہ تو تقریر کا کمال ہے اس لیے کہ اس نے مضمون کے کسی پہلو کو نہیں چھوڑا۔ میرے خیال میں اس سے بہتر اور جامع تقریر کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔"

"اس میں مجھے تم سے اتفاق نہیں۔ اگر میں مروت میں آکر تمھاری تائید کردوں تو قدیم زمانے کے سب دانشمند، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، جنھوں نے ان مسائل کے متعلق کچھ کہا ہے یا لکھا ہے، مجھے ملزم قرار دیں گے۔"

"بتاؤ وہ کون لوگ ہیں اور تم نے اس سے اچھی چیز کہاں سُنی ہے؟"

"سُنی تو ضرور ہے مگر اس وقت یاد نہیں کہ کس سے شاید حسین سیفو سے یا دانش مند اناکیرون سے، یا پھر کسی نثر نگار سے۔ تم پوچھتے ہو کہ میں کس وجہ سے کہہ رہا ہوں؟ اس وجہ سے کہ میرے دل میں خیالات کا دریا امڈ رہا ہے اور میں خود اتنی ہی اچھی تقریر کر سکتا ہوں جتنی لیسیاس کی تھی اور اس سے بالکل مختلف چونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ خود میری اُپج نہیں ہے (مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ میں تو بالکل جاہل ہوں) اس لیے میں صرف یہی نتیجہ نکال سکتا ہوں کہ یہ خیال کسی اور نے مجھ میں کان کے رستے بھر دیے ہوں گے، جیسے گھڑے کو بھرتے ہیں، اگرچہ میں اپنی حماقت سے یہ بھول گیا کہ وہ کون تھا۔"

"یہ خوب رہی: — خیر اس کو جانے دو کہ تم نے یہ تقریر کہاں سنی اور کس سے سُنی۔ اسے راز ہی رہنے دو اور میں التجا بھی کروں تو نہ بتاؤ۔ البتہ جیسا تم کہہ رہے ہو اس بات کا وعدہ کر لو کہ تم اسی موضوع پر ایک دوسری اور بہتر تقریر کرو گے

جو اتنی ہی لمبی اور بالکل نئی ہوگی اور میں ایتھنس کے نو مجسٹریٹوں کی طرح یہ وعدہ کروں گا کہ اپنی اور تمھاری قدآدم سونے کی مورتیں بنوا کر ڈلفی کے مندر میں رکھوا دوں گا۔"

"تم بھی بالکل اللہ میاں کی گائے ہو۔ اگر تم میرا مطلب یہ سمجھتے ہو کہ لیسیاس نے جو کچھ کہا سراسر غلط ہے اور میں ایسی تقریر کر سکتا ہوں جس میں اس کی دلیلوں میں سے ایک بھی نہ آنے پائے گی۔ بڑے سے بڑا مصنف بھی کوئی بات تو کام کی کہتا ہی ہے مثلاً کون شخص ہوگا جو اس موضوع پر گفتگو کرے اور غیر عاشق کی احتیاط کی تعریف اور عاشق کی بے احتیاطی کی مذمت نہ کرے؟ یہ تو پیش پا افتادہ باتیں ہیں جو ضرور ہی کہی جائیں گی (کیونکہ اس کے سوا اور کہا ہی کیا جا سکتا ہے) اور جنھیں ناگزیر سمجھ کر ان سے درگزر کرنی پڑے گی۔ خوبی کا سوال ان کی ترتیب میں پیدا ہوتا ہے کیونکہ جدت کے لحاظ سے ان میں کسی خوبی کی گنجائش ہی نہیں۔ البتہ ان پیش پا افتادہ باتوں کے علاوہ ممکن ہے کوئی نئی بات بھی کہی جا سکے۔"

"میں یہ مانتا ہوں کہ تمھاری بات معقولیت سے خالی نہیں اور میں بھی معقول پسندی سے کام لے کر تمھیں اس کی اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنی تقریر اسی مقصد سے شروع کرو کہ عاشق غیر عاشق سے زیادہ بدحواس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر تم لیسیاس کی تقریر سے زیادہ طویل اور بہتر تقریر کرو اور نئی دلیلوں سے کام لو تو میں پھر کہتا ہوں کہ تمھارے نام کا سونے کا بت نصب کیا جائے گا۔ اور تم اولمپیا میں سپسیلیڈوں کی نذر کی ہوئی عظیم الشان مورتوں کی صف میں جگہ پاؤ گے۔"

"کس قدر جوش ہے عاشق کو اس وجہ سے کہ اسے چھیڑنے کے لیے میں نے اس کے محبوب پر حرف گیری کی ہے تو کیا فیڈرس تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ میں لیسیاس سے زیادہ قابلیت دکھا سکتا ہوں؟"

"اب میں نے تمھیں پکڑ پایا ہے جیسے تم نے مجھے پکڑا تھا اور تمھیں تقریر کرنی پڑے گی جیسی بھی بن پڑے"۔ اس سے کیا فائدہ کہ ہم ایک دوسرے کی بات کو الٹیں جیسا ناٹک کی نقل میں ہوتا ہے اور مجھے مجبور ہو کر تم سے وہی کہنا پڑے جو تم نے مجھ سے کہا تھا "میں سقراط کو اتنی ہی اچھی طرح جانتا ہوں جتنا اپنے آپ کو اس کا دل تو تقریر کرنے کو چاہتا تھا مگر بن رہا تھا" یہ سمجھ لو کہ جب تک تم تقریر نہ کر لو گے یہاں سے ہلنے نہیں پاؤ گے اس لیے کہ ہم یہاں اکیلے ہیں اور یہ یاد رہے کہ تم سے مضبوط ہوں۔ تم بوڑھے ہو اور میں جوان ہوں:—— اچھی طرح سوچ لو اور مجھے تشدد پر مجبور نہ کرو"۔

"مگر پیارے فیڈرس یہ تو بالکل مضحک بات ہو گی کہ میں فی البدیہہ تقریر میں لیسیاس کا مقابلہ کروں اور وہ اپنے فن کا استاد ہے اور میں ایک اناڑی آدمی ہوں"

"دیکھو معاملہ نازک ہے بس زیادہ بہانے نہ بناؤ۔ مجھے ایک ایسی بات معلوم ہے جس سے تم بالکل بے بس ہو جاؤ گے"۔

"تو پھر اسے ہرگز نہ کہنا"۔

"میں تو ضرور کہوں گا اور وہ بات ایک قسم کی صورت میں ہو گی میں کہتا ہوں بلکہ یہ قسم کھاتا ہوں —— لیکن جو شخص میری قسم کا گواہ ہے اس کی گواہی کس کام کی ہو گی —— قسم ہے اس چنار کے درخت کی کہ اگر تم نے اس جگہ اس چنار کے درخت کے سامنے تقریر نہ کی تو میں پھر کبھی تمھیں کوئی خطبہ نہیں سناؤں گا بلکہ کسی خطبے کی ہوا تک نہ دوں گا"۔

"ارے ظالم بس میں ہار گیا۔ بھلا وہ غریب جو خطبوں کا عاشق ہے اب کیا کہہ سکتا ہے"۔

"تو پھر تم کیوں یہ چالیں چل رہے ہو"۔

تمھاری اس قسم کے بعد اب میں کوئی چال نہیں چلوں گا اس لیے کہ مجھے اس روحانی غذا کے بغیر فاقے کرنا گوارا نہیں۔"

"تو پھر شروع کرو۔"

"میں تمھیں بتاؤں کہ میں کیا کروں گا؟"

"بتاؤ کیا کرو گے؟"

"میں اپنا چہرہ چھپالوں گا اور سرپٹ تقریر کرڈالوں گا اس لیے کہ اگر تم سے آنکھیں چار ہوئیں تو مجھ سے شرم کے مارے کچھ نہ کہا جائے گا۔"

"تم بس تقریر کرتے جاؤ اور باقی جو جی چاہے کرو۔"

"آؤ اے آرٹ کی دیویو، جو سریلی کہلاتی ہو، خواہ اپنے نغموں کی وجہ سے یا اس لیے کہ اہل لیلیا موسیقی سے فطری مناسبت رکھتے ہیں آؤ میری مدد کرو اس کہانی میں جو یہ میرا اچھا دوست مجھ سے کہلوانا چاہتا ہے تاکہ یہ نیاز مند جسے وہ ہمیشہ دانش مند سمجھتا رہا ہے اس کی نظروں میں اور بھی زیادہ دانش مند معلوم ہو۔

"اگلے زمانے میں ایک حسین لڑکا تھا بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ایک حسین نوجوان تھا وہ بڑا خوب صورت تھا اور اس کے بہت سے عاشق تھے۔ ان میں سے ایک بڑا چالاک تھا جس نے اس نوجوان کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ مجھے تم سے عشق نہیں ہے حالانکہ حقیقت میں وہ اس سے عشق رکھتا تھا۔ ایک دن جب وہ اس سے عرض حال کر رہا تھا تو اس نے اسی دلیل سے کام لیا ——— کہ تمھیں عاشق کے مقابلے میں غیر عاشق کو قبول کرنا چاہیے۔ اس کے الفاظ یہ تھے :-

"ہر اچھی صلاح کے شروع ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ انسان کو اس چیز سے جس کے بارے میں وہ رائے دے رہا ہے واقف ہو جانا چاہیے ورنہ اس کی رائے بالکل بیکار ہوگی۔ لیکن جو لوگ خواہ مخواہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم ان چیزوں کی حقیقت کو جانتے ہیں

حالانکہ وہ نہیں جانتے اور چونکہ شروع میں وہ اپنی واقفیت کے زعم میں بات کو صاف نہیں کرتے اس لیے انجام وہی ہوتا ہی جس کی ہم توقع کر سکتے ہیں کہ ان میں اور دوسروں میں اختلاف اور خود ان کے الفاظ میں تناقض پیدا ہو جاتا ہی۔ اچھا تو ہمیں اور تمھیں یہ بنیادی غلطی نہیں کرنی چاہیے جس کا ہم دوسروں کو قصور دار ٹھیراتے ہیں۔ چونکہ ہمارا مسئلہ یہ ہی کہ آیا عاشق کو ترجیح ہی یا غیر عاشق کو اس لیے ہمیں پہلے متفق ہو کر عشق کی تعریف کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اس کی مدد سے اس پر غور کرنا چاہیے کہ آیا عشق سے فائدہ ہوتا ہی یا نقصان۔

"ہر شخص جانتا ہی کہ عشق ایک خواہش کا نام ہی اور یہ بھی معلوم ہی کہ غیر عاشق کو بھی حسن اور نیکی کی خواہش ہوتی ہی۔ اب سوال یہ ہی کہ عاشق اور غیر عاشق میں فرق کیسے کیا جائے۔ دیکھو ہم میں سے ہر ایک میں دو جوہر کارفرما ہیں اور ہمیں جدھر چاہتے ہیں لے جاتے ہیں۔ ایک تو راحت کی وہبی خواہش دوسرے ایک کسبی خیال کہ ہم نیکی کے سب سے بلند درجے پر پہنچ جائیں۔ ان دونوں میں کبھی ہم آہنگی ہوتی ہی اور کبھی جنگ اور اس میں کبھی ایک کی فتح ہوتی ہی کبھی دوسرے کی۔ جب ہمارا خیال عقل کی مدد سے نیکی کے بلند ترین درجے پر پہنچا دیتا ہی تو جوہر غالب عفت کہلاتا ہی لیکن جب خواہش جو عقل سے خالی ہوتی ہی ہم پر غالب آجاتی ہی اور ہمیں راحت و عیش میں ڈال دیتی ہی تو یہ بدنظمی کی قوت بے اعتدالی کہلاتی ہی۔ اس بے اعتدالی کے بہت سے نام ہیں۔ بہت سے حصے ہیں اور بہت سی صورتیں ہیں اور ہر صورت جب وہ بہت نمایاں ہو جائے ایک خاص نام سے پکاری جاتی ہی اور یہ نام جس شخص سے منسوب کیا جائے اس کے لیے نہ باعث عزت ہوتا ہی نہ قابل فخر۔ مثلاً کھانے کی خواہش، جب عقل پر اور دوسری خواہشات پر غالب آجائے تو پیٹوپن کہلاتی ہی اور وہ شخص جو اس کا بندہ ہو پیٹو کہلاتا ہی۔ شراب کی ظالم خواہش جو

انسان کو پینے کی طرف مائل کرتی ہے، اس کا نام تو ظاہر ہی ہے۔ اسی طرح اس قبیل کی جتنی خواہشیں ہیں ان کا نام رکھنے میں کوئی دقت نہیں —— ان میں سے جو غالب ہو وہی نام رکھا جائے گا۔ میرے خیال میں اب تم سمجھ جاؤ گے کہ میری تقریر کا رجحان کدھر ہے۔ لیکن چونکہ کہی ہوئی بات، ایک لحاظ سے بن کہی بات سے زیادہ واضح ہوتی ہے اس لیے میں کہہ ہی ڈالوں کہ وہ بے عقل خواہش جو عقل اندیشی پر غالب آکر اپنی جیسی اور خواہشات کے اثر سے، حسن خصوصاً شخصی حسن کا لطف اٹھانے میں مصروف ہو جاتی ہے —— وہ زبردست خواہش جو اور سب پر فتح پاتی ہے جذبات کے جوش سے نت نئی قوت حاصل کرتی ہے اور عشق کہلاتی ہے۔ ——
—— میرے عزیز فیدرس، میں دم بھر ٹھیر کر تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تمھارے خیال میں مجھے الہام نہیں ہو رہا ہے؟"

"ہاں سقراط، تمھارے الفاظ میں روانی تو غیر معمولی ہے۔"

"تو پھر میری تقریر خاموشی سے سنو اس لیے کہ یقیناً یہ جگہ مقدس ہے۔ تم تعجب نہ کرنا اگر آگے چل کر یہ معلوم ہو کہ مجھ پر جذب کی کیفیت طاری ہے۔ اس لیے کہ میری تقریر کا جوش بڑھتا جاتا ہے۔"

"یہ تو سچ ہے۔"

"اس کی ذمہ داری تم پر ہے۔ مگر سنو تو کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ شاید میں اس دورے سے بچ جاؤں۔ دیوتاؤں میں سب کچھ طاقت ہے۔ میں اپنے نوجوان سے باتوں کا سلسلہ پھر شروع کرتا ہوں سنو:-

اس طرح میرے دوست ہم نے موضوع کی نوعیت کو واضح کر دیا ہے اور اس کی تعریف کر دی ہے۔ اس تعریف کو نظر میں رکھتے ہوئے اب ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ عاشق یا غیر عاشق سے کیا فائدہ یا نقصان پہنچنے کی توقع ہو سکتی ہے اس شخص کو جو ان کی التجاؤں کو

قبول کرے۔

"ظاہر ہے کہ عاشق جو اپنے جذبات سے مجبور اور راحت کا بندہ ہے جہاں تک ممکن ہے محبوب کو اپنی پسند کے لائق بنانے کی کوشش کرے گا۔ جس شخص کے خیالات فاسد ہوں اسے ہر وہ چیز پسند آتی ہے جو اس کے خلاف مزاج نہ ہو لیکن وہ چیز جو اس کے برابر یا بہتر ہو پسند نہیں آتی اس لیے عاشق محبوب کی برابری یا برتری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ اسی دھن میں رہتا ہے کہ محبوب کو اپنے سے کم تر درجے پر لے آئے۔ جاہل عالم سے کم تر ہوتا ہے، بزدل بہادر سے، جو تقریر میں ہیٹا ہو وہ اچھے مقرر سے اور جو کند ذہن ہو وہ ذہین سے۔ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سے محبوب کے ذہنی نقائص ہیں اگر یہ نقائص فطری طور پر محبوب میں موجود ہوں تو لازماً عاشق کے لیے خوشی کا باعث ہیں اور اگر موجود نہ ہوں تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ باتیں محبوب میں پیدا ہو جائیں تاکہ عاشق اپنی عارضی خوشی سے محروم نہ رہے۔ اس لیے اس میں لامحالہ رشک کا مادہ ہوتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اسے ایسی صحبت کے فوائد سے محروم رکھے جس سے اس میں مردانگی کی صفات پیدا ہوں خصوصاً ایسی صحبت سے جو اسے دانشمند بنا دے اور اس طرح وہ اسے بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ یعنی اس کے دل پر یہ خوف چھایا رہتا ہے کہ کہیں وہ محبوب کی نظروں میں حقیر نہ ہو جائے اس لیے وہ اس پر مجبور ہے کہ وہ اسے فلسفے کے مطالعے سے دور رکھے اور اس سے بڑھ کر اس کے حق میں کوئی بدسلوکی نہیں ہو سکتی۔ وہ ایسی تدبیریں کرتا ہے کہ اس کا محبوب بالکل جاہل رہے اور ہر بات میں اس کی مدد کا محتاج ہو گویا وہ عاشق کے لیے راحتِ جان اور اپنے لیے بلائے جان ہو۔ غرض جہاں تک ذہنی زندگی کا تعلق ہے ماشاء اللہ حضرت عاشق اس کے لیے نہایت ہی کارآمد اتالیق اور رفیق ہیں۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ آقا صاحب جن کا اصول زندگی نیکی نہیں بلکہ راحت ہے

اپنے خادم کے جسم کی حفاظت اور تربیت کیونکر کرتے ہیں۔ ظاہر ہی کہ وہ ایسا محبوب منتخب کریں گے جو چاق چوبند نہیں بلکہ دھان پان ہو، ایسا نوجوان جس نے سورج کی روشنی میں نہیں بلکہ سایہ دار درختوں کے کنج میں پرورش پائی ہو جو مردانہ ورزشوں سے ناواقف اور مشقت کی عرق ریزی سے بیگانہ ہو، جو پرتکلف غذاؤں کا عادی ہو، جس کے چہرے پر صحت کی سرخی کے بجائے غازے کی لالی اور آرائش کا رنگ جھلکتا ہو، غرض ایسی زندگی بسر کرتا ہو جس کا ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہی مجھے تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہی اس کا خلاصہ ایک لفظ میں بیان کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ ایسا شخص جنگ میں یا زندگی کے اور نازک موقعوں پر اپنے دوستوں کے لیے اور خود اپنے عاشق کے لیے باعث تشویش ہوگا نہ کہ اپنے دشمنوں کے لیے باعث خوف۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

"میں یہ بھی بتا دوں کہ محبوب کو عاشق کی سرپرستی اور رفاقت سے اپنی دولت کے معاملے میں کیا فائدہ یا نقصان پہنچتا ہی۔ عاشق خود اس بات کو سمجھتا ہی اور دوسروں پر بھی اچھی طرح ظاہر ہی کہ اس کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہی کہ محبوب کو اس کی بہترین، عزیز ترین، اور مقدس ترین دولت یعنی ماں باپ، رشتہ داروں، دوستوں اور ان سب سے بچھڑا دے جن سے یہ اندیشہ ہی کہ وہ عاشق و معشوق کی پرلطف صحبت میں حائل ہوں گے یا اس پر معترض ہوں گے یہاں تک کہ وہ محبوب کے زروسیم اور دوسری املاک کو بھی رشک کی نظر سے دیکھتا ہی کیونکہ ان کی وجہ سے اس کا قابو میں آنا اور آ بھی جائے تو رہنا مشکل ہی اس لیے لامحالہ اسے ان چیزوں کا محبوب کے پاس ہونا برا لگتا ہی اور ان کے ضائع ہو جانے سے خوشی ہوتی ہی۔ وہ چاہتا ہی محبوب بال بچے گھر بار سب سے محروم ہو اور جتنے طویل عرصے تک محروم رہے اتنا ہی اچھا ہی اس لیے کہ جتنے زیادہ دن تک وہ اس حالت میں رہے گا اتنا ہی زیادہ

عاشق کو اس کی محبت سے لطف اٹھانے کا موقع ملے گا۔

"بعض جانور ایسے ہوتے ہیں، مثلاً خوشامدی ٹٹو جو خطرناک اور شریر تو ضرور ہیں لیکن قدرت نے ان میں ایک طرح کی خوشنمائی رکھی ہے اور ان سے ایک عارضی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تم کسبیوں کو بہت مضر سمجھتے ہو اور ان کے چلن کو برا جانتے ہو تاہم وقتی طور پر ان کی صحبت بہت خوشگوار ہوتی ہے۔ لیکن عاشق نہ صرف اپنے محبوب کے لیے مضر ہے بلکہ اس کی صحبت سے نہایت کوفت ہوتی ہے۔ پرانی مثل ہے۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ شاید ہم عمری کی وجہ سے لوگ ایک ہی قسم کی راحتوں کو پسند کرتے ہیں اور اس اشتراک مذاق کی بنا پر ان میں دوستی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی کبھی کبھی حد سے بڑھ جاتی ہے اور جبر ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اب تم عاشق کو دیکھو تو وہ نہ صرف محبوب سے مختلف ہوتا ہے بلکہ زبردستی اس کی صحبت میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ وہ بوڑھا ہوتا ہے اور محبوب جوان اور اگر اس کے اختیار میں ہو تو دن رات اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ ضرورت اور آرزو کی خلش اسے اکسا کر آگے بڑھاتی ہے۔ اور وہ راحت جو محبوب کو دیکھنے، اس کی آواز سننے، اسے چھونے غرض کسی طرح اس کا ادراک کرنے سے حاصل ہوتی ہے اس کے دل کو لبھاتی ہے اس لیے وہ خوشی سے اس کا دامن تھام لیتا ہے اور اس کی خدمت کرتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ محبوب کو اس سے کیا خوشی یا تسکین حاصل ہو سکتی ہے؟ کیا اسے عاشق کا جھریوں پڑا چہرہ اور اسی نمونے کی ساری قطع دیکھ کر گھن نہ آتی ہوگی؟ اس کا تو ذکر تک ناگوار ہوتا ہے پھر جسے روزانہ اس کی صحبت میں رہنا پڑے اسے نفرت ہو جائے تو کیا عجب ہے؟ اس کے علاوہ ہر شخص سے اور ہر چیز سے اس کی چوکسی اور حفاظت کی جاتی ہے۔ اسے اپنی بے جا اور مبالغہ آمیز تعریفیں اور اسی قدر بے جا شکایتیں سننی پڑتی ہیں۔ جب عاشق ہوش میں ہو تب بھی اس کی یہ باتیں ناقابل برداشت ہوتی ہیں اور جب وہ

نشے میں ہو تو ناقابلِ برداشت ہونے کے علاوہ یہ بیہودہ اور بے لطف باتیں ساری دُنیا میں مشہور ہو جاتی ہیں۔

"عاشق کی یہ شرارت اور ناشایستگی صرف اسی وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ اس کا عشق باقی رہتا ہے بلکہ اس کے ختم ہو جانے کے بعد وہ اسی شخص کا دغاباز دشمن بن جاتا ہے جس کو وہ قسموں، التجاؤں اور وعدوں سے پرچانے کی کوشش کیا کرتا تھا اور اس کے باوجود اس پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے فائدے کے لیے بھی اس کی صحبت کی کوفت برداشت کرے۔ اب انتقام کا وقت آتا ہے اور وہ ایک دوسرے آقا کا غلام ہو جاتا ہے، اب عشق اور والہانہ محبت کی جگہ اس کے دل پر حکمت اور عفت کی حکومت ہوتی ہے لیکن محبوب اس تبدیلی کو محسوس نہیں کرتا جو اس میں پیدا ہو گئی ہے؛ اور اس کی پرانی باتیں یاد دلا کر پھر بلانا چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اسی شخص سے گفتگو کر رہا ہوں اور اس کے مخاطب میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ سچی بات کا اعتراف کرے، اب چونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان قسموں اور وعدوں کو کیونکر پورا کرے جو اس نے حماقت میں آ کر کیے تھے اور وہ دانش مند اور باعفت ہو گیا ہے اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ ان پہلی حرکتوں کو پھر دہرائے لہٰذا وہ بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور مجبوراً بے وفائی اختیار کرتا ہے۔ اب پانسہ پلٹ گیا ہے ـــــ وہ محبوب کا تعاقب کرنے کے بجائے اس سے بھاگتا ہے اور محبوب چار ناچار جھنجھلاتا، بکتا جھکتا اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ اسے سرے سے یہ کرنا ہی نہیں چاہیے تھا کہ ذی ہوش غیر عاشق کی بجائے مخبوط الحواس عاشق کو منتخب کرے اور اس انتخاب کی بدولت اس نے اپنے آپ کو ایک بے وفا، اکل کھرے، حاسد اور بدمزاج کے حوالے کر دیا ہے جو اس کی املاک کا، اس کی جسمانی صحت کا، اور سب سے بڑھ کر اس کی تہذیب نفس کا دشمن ہے جس سے زیادہ قابلِ قدر دیوتاؤں اور انسانوں کی نظر میں

نہ کوئی چیز ہی اور نہ ہوگی - اے حسین نوجوان ان باتوں پر غور کر اور یہ جان لے کہ کہ عاشق کی دوستی حقیقت میں دوستی نہیں ہی- وہ خواہشِ نفس کا بندہ ہی اور تجھے اپنا شکار بنانا چاہتا ہی -

"جیسی بھیڑوں کو میمنوں سے محبت ہوتی ہی ویسی ہی عاشقوں کو معشوقوں سے ہوتی ہی"
مگر دیکھو وہی ہوا جو میں نے تم سے کہا تھا۔ اب میں شعر میں بات کرنے لگا اس لیے اب اس سلسلے کو ختم ہی کر دینا مناسب ہی- بس ہو چکا ۔"

"میں تو یہ سمجھا تھا کہ ابھی تم صرف آدھی دور پہنچے ہو اور اسی طرح ایک تقریر غیر عاشق کے انتخاب کے فوائد پر کرنے والے ہو- آخر تم آگے کیوں نہیں بڑھتے ؟"

"کیا تم اتنے بھولے ہو کہ تم نے یہ نہیں دیکھا کہ عاشق کی مذمت ہی میں میں جذباتی شاعری سے رزمیہ شاعری کے میدان میں جا پہنچا۔ اب اگر میں غیر عاشق کی مدح شروع کروں تو میرا کیا انجام ہوگا۔ تمھیں یہ نظر نہیں آتا کہ تمھاری شرارت کی وجہ سے مجھ پر پہلے ہی ایک جذب کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہی اس لیے میں صرف اسی پر اکتفا کروں گا کہ غیر عاشق میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جس کی عاشق میں کمی بتائی جاتی ہی اور اب اس سے زیادہ میں ایک حرف بھی نہیں کہوں گا۔ بس بہت ہو چکا۔ اب میرا دونوں کو دور ہی سے سلام ہی- میں کہانی کو اس کی تقدیر پر چھوڑتا ہوں اور دریا کو پار کر کے اپنے گھر کی راہ لیتا ہوں کہ مبادا میں اس سے بھی بدتر تقریر کر کے تمھاری اور بھی زیادہ سمع خراشی کروں ۔"

"آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا ہی بہتر یہی ہی کہ ہم یہاں ٹھیر کر ان باتوں پر جو کہی جا چکی ہیں بحث کریں اور ٹھنڈے وقت وہاں جائیں ۔"

"بھئی فیڈرس تمھارا علمی بحث کا شوق تو ایک فوق انسانی چیز ہی جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہی میرے خیال میں تمھارے ہم عصروں میں سے کوئی ایسا نہیں ہی جس نے اتنی

تقریریں خود کی ہوں یا دوسروں سے کرائی ہوں سیمیاس تھیبی کے سوا اور سب اس معاملے میں تم سے بہت پیچھے ہیں اور اب معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک اور تقریر کا باعث ہوگئے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے مگر صاف صاف بتاؤ کہ تمھارا کیا مطلب ہے۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ابھی جب میں دریا کو عبور کرنے والا تھا۔ مجھے غیب سے وہی مقررہ اشارہ کیا گیا — جو کبھی کسی کام کرنے کے لیے نہیں بلکہ بعض کاموں سے روکنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میرے کان میں ایک آواز آرہی ہو کہ تو بے دینی کا مرتکب ہوا ہے اور تجھے اس وقت تک جانا نہیں چاہیے جب تک اس کی تلافی نہ کردے۔ میں خود بھی ایک کاہن ہوں گو بہت اچھا نہ سہی مجھے مذہب میں اتنا دخل ضرور ہے جو میری ذات کے لیے کافی ہے جیسے کسی بُرے مصنف کے بارے میں کہا جائے کہ وہ اپنا کام چلانے کے لائق لکھ لیتا ہے۔ اور مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہورہا ہے کہ میں نے غلطی کی۔ اے میرے دوست انسانی روح کی غیب دانی کا کیا ٹھکانا ہے۔ اس وقت بھی میرے دل میں شبہہ تھا اور ابیکس کی طرح" میں بہت پریشان تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں انسانوں کی نظر میں عزت حاصل کرنے کے لیے دیوتاؤں کا گناہ کر رہا ہوں۔ اب مجھ پر اپنی غلطی صاف ظاہر ہوگئی۔"

"کون سی غلطی۔"

"بڑی بُری تقریر تھی، جو تم اپنے ساتھ لائے تھے اور جو تقریر تم نے مجھ سے کرائی وہ بھی اس سے کچھ کم بُری نہ تھی۔"

"وہ کیسے۔"

"سراسر حماقت تھی بلکہ ایک حد تک بے دینی، اس سے بدتر اور کیا چیز ہوسکتی ہے۔"

"کوئی چیز نہیں ہو سکتی اگر یہ تقریر واقعی ایسی تھی جیسی تم کہتے ہو"۔

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ کیا عشق افروڈائٹ دیوی کا بیٹا ہی اور وہ خود دیوتا نہیں ہی؟"

"ہاں لوگ تو یہی کہتے ہیں"۔

"مگر اس کا اعتراف نہ تو لیسیاس نے اپنی تقریر میں کیا اور نہ تم نے اس تقریر میں جو تم نے جادو کے زور سے میری زبان سے کرائی۔ اس لیے کہ اگر عشق دیوتا ہی جس میں ذرا بھی شبہہ نہیں تو وہ برا ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن دونوں تقریروں میں یہ غلطی کی گئی کہ اس کو برا کہا گیا اور تو اور ان تقریروں کے بھولے پن پر پیار کرتا ہی، ان میں سچائی اور خلوص کا نام تک نہ تھا پھر بھی ان کو یہ زعم تھا کہ ہم بھی کچھ ہیں اور یہ امید تھی کہ روئے زمین کے باشندوں کو دھوکا دیکر شہرت حاصل کر لیں گی۔ اس لیے مجھے اس کی تلافی کرنی ضروری ہی اور مجھے تلافی کی ایک پرانی تدبیر یاد آئی ہی۔ یہ دیومالا کی ایک غلطی کی تلافی تھی جو ہومر کو نہیں سوجھی۔ اس لیے کہ اس میں اتنی سمجھ نہ تھی کہ اپنے اندھے ہونے کی وجہ معلوم کر سکے بلکہ اسٹیسی کورس کو جو ایک فلسفی تھا اور اس کی وجہ جانتا تھا۔ جب حسین ہیلن کو بدنام کرنے کی سزا میں اس کی آنکھیں جاتی رہیں تو اس نے فوراً اپنے گناہ کی تلافی کی یہ تلافی توبہ کی صورت میں تھی جس کے شروع کے الفاظ یہ ہیں :۔

"میری بات بالکل جھوٹی تھی —— سچی بات یہ ہی کہ تو نہ کبھی جہاز پر سوار ہوئی اور نہ طرائے کی فصیلوں تک پہنچی"۔

اور جوں ہی اس نے اپنی یہ نظم جو "توبہ" کہلاتی ہی ختم کی فوراً اس کی بینائی واپس آ گئی۔ اچھا تو اب میں اسٹیسی کورس اور ہومر دونوں سے زیادہ دانش مندی کا ثبوت دوں گا یعنی اس سے پہلے کہ عشق کو برا کہنے کی وجہ سے مجھ پر کوئی مصیبت آئے میں توبہ کر لوں گا۔ اور یہ میں پہلے کی طرح منہ چھپا کر شرمندگی کے ساتھ نہیں کروں گا۔

بلکہ کھلم کھلا بے باکی کے ساتھ۔"

"مجھے تمھاری یہ بات سن کر جتنی خوشی ہوئی کسی چیز سے نہیں ہو سکتی تھی۔"

ذرا سوچو تو میرے اچھے فیڈرس کہ ان دونوں تقریروں سے کس قدر بدتمیزی ظاہر ہوتی ہے، خود میری تقریر سے اور اس تقریر سے جو تم نے کتاب میں سے پڑھ کر سُنائی۔ کوئی شخص جو خود شریف اور نیک ہو اور کسی اپنی جیسی طبیعت والے سے محبت کرتا ہو یا کر چکا ہو جب ہماری زبان سے یہ سنے گا کہ عاشق چھوٹی چھوٹی باتوں پر رشک کرتے ہیں، حد سے زیادہ دشمنی سے کام لیتے ہیں اور اپنے معشوق کو نقصان پہنچاتے ہیں تو وہ یقیناً یہ خیال کرے گا کہ ہم نے اپنا عشق کا تصور کسی ملاحوں کے اڈے سے لیا ہے جہاں کوئی تہذیب اور اخلاق کا نام تک نہیں جانتا یقیناً وہ ان الزامات کو جو ہم نے لگائے ہیں کبھی حق بجانب نہ سمجھے گا۔"

"غالباً ایسا ہی ہو گا سقراط"۔

لہٰذا چونکہ ایک تو مجھے اس شخص کے خیال سے شرم آتی ہے۔ دوسرے خود عشق سے ڈر لگتا ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنے کانوں کے آپ شور کو چشمے کے میٹھے پانی سے دھو کر نکال دوں اور میں لیسیاس کو یہ مشورہ دوں گا کہ فوراً ایک تقریر لکھے جس میں یہ ثابت کیا جائے کہ "بہ حالات موجودہ عاشق کو غیر عاشق پر ترجیح دینی چاہیے"۔

"تم اطمینان رکھو وہ ضرور لکھے گا۔ پہلے تمھیں عاشق کی تعریف بیان کرنی ہو گی اس کے بعد میں لیسیاس کو مجبور کر کے اس سے اس موضوع پر ایک اور تقریر لکھواؤں گا۔"

"یہ تو تمھاری فطرت میں داخل ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے۔"

"اچھا تو کہہ چلو، ڈرتے کیوں ہو۔"

مگر وہ حسین نوجوان کہاں ہی جو پہلے میرا مخاطب تھا۔ اس کو یہ تقریر سنانی ضروری ہی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بے سمجھے بوجھے غیر عاشق کو قبول کرلے؛

"وہ یہیں موجود ہی اور ہمیشہ تمھاری خدمت کے لیے حاضر ہی۔"

"تو پھر سن اے حسین نوجوان کہ جو کچھ پہلے کہا گیا وہ فیڈرس کا کلام تھا جو خودپسند انسان کا بیٹا اور شہر مائی رینا کا رہنے والا ہی اور جو کچھ میں اب کہوں گا وہ اسٹیسی کورس کی تو بہ ہی جو خدا پرست انسان کا بیٹا اور قصبہ ہمیرا کا باشندہ ہی۔ وہ یہ کہتا ہی :-

"میری یہ بات بالکل جھوٹی تھی کہ معشوق کو چاہیے کہ غیر عاشق کو عاشق پر ترجیح دے اس لیے کہ وہ ہوشیار اور یہ دیوانہ ہوتا ہی۔ اگر دیوانگی یکسر بری چیز ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا لیکن دیوانگی ایسی بھی ہوتی ہی جو خدا کی دین ہی اور انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہی اس لیے کہ کہانت دیوانگی ہی اور ڈیلفی کی کاہنہ اور ڈوڈونا کی کاہنات نے دیوانگی کی حالت میں یونان کی عمومی زندگی اور شخصی زندگی دونوں کے لحاظ سے بڑے بڑے فائدے پہنچائے ہیں لیکن ہوشیاری کی حالت میں بہت کم فائدہ پہنچایا ہی۔ میں تمھیں یہ بھی بتاتا کہ سبیل اور دوسرے اشخاص نے کس طرح جذب کی حالت میں بہتوں کو آیندہ کی خبریں دیں جن کی بدولت وہ ہلاکت سے بچ گئے لیکن ان باتوں کا ذکر کرنے سے کیا فائدہ جنھیں ہر شخص جانتا ہی۔

اس سے تو یہ بہتر ہوگا کہ ان قدما کی طرف رجوع کریں جنھوں نے ان ناموں کو وضع کیا تھا وہ ہرگز کہانت کو جو آیندہ کا حال بتاتی ہی اور وہ شریف ترین فن ہی، دیوانگی سے نسبت نہ دیتے اور ان دونوں کے لیے ایک ہی نام تجویز نہ کرتے اگر وہ دیوانگی کو شرم یا ذلت کی چیز سمجھتے ———— ان کا یقیناً یہ خیال ہوگا کہ ایک الہامی دیوانگی یا جذب بھی ہوتا ہی جو ایک اعلےٰ اور

افضل چیز ہے۔ کہانت اور دیوانگی کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت میں بالکل ایک ہیں۔ محض ایک حرف ٹ[1] زمانۂ حال میں بدمذاقی سے بڑھا دیا گیا ہے۔ اس کی تصدیق اس لفظ سے ہوتی ہے جو مستقبل کا حال عقل سے خواہ پرندوں کے ذریعے سے یا کسی دوسرے شگون سے معلوم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ایسا فن ہے جو قوت استدلال کے ذریعے انسان کے خیال کو بصیرت اور خبر بخشتا ہے اس لیے اس کا وہ نام تجویز کیا گیا جو عقل اور علم کے معنی دیتا ہے مگر کچھ عرصے سے اس لفظ میں کچھ ترمیم ہو گئی ہے اور ایک حرف کا اضافہ کر کے اسے زیادہ رعب دار بنا دیا گیا ہے اور جس قدر یہ کہانت شگون کے فن سے، نام اور حقیقت دونوں کے اعتبار سے زیادہ مکمل اور شاندار ہے اسی قدر بہ قول قدما کے دیوانگی فرزانگی سے افضل ہے اس لیے کہ فرزانگی انسانی صفت ہے اور دیوانگی خدا کی دین ہے۔ پھر تم نے دیکھا ہوگا کہ جن خاندانوں میں کسی قدیم موروثی عیب کی وجہ سے بیماری اور مصیبت چلی آتی ہے وہاں مجذوبیت مقدس دعاؤں اور رسموں کے ساتھ پہنچی اور اس نے الہامی الفاظ کے ذریعے ان غریبوں کے لیے نجات کی صورت پیدا کر دی جو شخص اس نعمت سے بہرہ ور ہوتا ہے اس پر حقیقت میں کسی کا سایہ ہو جاتا ہے اور اسے دیوانہ کر دیتا ہے۔ اسے دھونی دے کر اور مذہبی رسمیں ادا کر کے چنگا اور اگلی پچھلی برائیوں سے پاک کر دیتے ہیں اور وہ جس مصیبت میں مبتلا تھا اس سے رہائی پا جاتا ہے۔ تیسری قسم ان لوگوں کا جذب ہے جن میں فنون لطیفہ کی دیویوں کی روح سما جاتی ہے۔ یہ جذب ایک لطیف اور معصوم روح پر طاری ہو کر اسے وارفتہ بنا دیتا ہے اور اس میں غنائی شاعری اور دوسرے اصناف شعر

---

(۱) قدیم یونانی زبان میں کہانت کے لیے مانٹکے اور دیوانگی کے لیے مانیکے کا لفظ آتا تھا اور ان میں صرف حرف ٹ کا فرق تھا۔

کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس کے ذریعے سے قدیم سورماؤں کے بے شمار کارناموں کو آیندہ نسلوں کی ہدایت کے لیے سراہتا ہے لیکن جو شخص ان دیویوں کے جذب سے محروم ہے اور مندر کے دروازے پر یہ امید لے کر آتا ہے کہ محض آرٹ کی مدد سے اندر داخل ہو جائے گا، اس کو اور اس کی شاعری کو باریابی نصیب نہیں ہوتی۔ غرض فرزانہ دیوانے کے مقابلے میں ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔

"میں تمھیں اور بہت سے بڑے بڑے کارنامے سنا سکتا ہوں جو جذب کی بدولت ظہور میں آئے۔ اس لیے اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اعتدال پسند دوست مجذوب دوست کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے تو ہمیں اس سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ اس سے اس بات کا ثبوت طلب کرنا چاہیے کہ عشق کو دیوتاؤں نے عاشق یا معشوق کے لیے فلاح کا باعث نہیں بنایا ہے۔ اگر وہ یہ ثابت کر دے تو ہم اس کی فتح تسلیم کریں گے اور ہم اپنی طرف سے یہ ثابت کریں گے کہ عشق کی دیوانگی خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور اس کا ایسا ثبوت دیں گے جسے دانش مند مان لیں گے گو احمق نہ مانیں لیکن سب سے پہلے ہمیں یہ چاہیے کہ روح الٰہی اور روح انسانی کے فعل و انفعال پر نظر ڈالیں اور ان کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارا ثبوت اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"روح سراسر لافانی ہے اس لیے کہ وہ چیز جو ہمیشہ متحرک ہو لافانی ہوتی ہے لیکن وہ چیز جو دوسری چیزوں کو حرکت میں لائے اور خود بھی متحرک بالغیر ہو اپنی حرکت ختم ہوتے ہی فنا ہو جاتی ہے۔ صرف متحرک بالذات غیر سکون پذیر نفس ایسا ہے کہ اس کی حرکت کبھی ختم نہیں ہوتی اور وہ ہر اور متحرک حرکت کا منبع اور مبدا ہے۔ مبدا کا قدیم ہونا ضروری ہے اس لیے کہ ہر حادث مبدا سے نکلا ہے لیکن خود مبدا کسی دوسری چیز سے نہیں نکلا اس لیے کہ اگر وہ کسی چیز سے نکلتا تو ہر حادث اس سے

نہ نکلتا۔ لیکن اگر وہ قدیم ہے تو لازوال بھی ہوگا اس لیے کہ اگر مبدا فنا ہو جائے تو کسی چیز کی ابتدا بھی نہ ہو سکے حالانکہ ہر چیز کی ابتدا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا جو چیز متحرک بالذات ہو وہ ہر حرکت کا مبدا ہے اور وہ فنا اور حدوث دونوں سے بری ہے ورنہ سارے آسمان اور کل کائنات فنا ہو جائے اور سارا نظام عالم رُک جائے اور اسے پھر کبھی حرکت یا وجود نصیب نہ ہو۔

"جب یہ ثابت ہو گیا کہ متحرک بالذات ہونا روح کی ماہیت میں داخل ہے تو کوئی دقت نہیں رہتی اس لیے کہ وہ جسم جو خارجی اثر سے حرکت میں آتا ہے بے روح ہے۔ لیکن وہ جسم جو خود بخود حرکت میں آتا ہے روح رکھتا ہے اس لیے کہ روح کی ماہیت ہی یہ ہے۔ اگر یہ سب باتیں صحیح ہیں تو یقیناً روح متحرک بالذات ہے لہٰذا لازماً قدیم اور لافانی ہے۔ بس بقائے روح کی بحث ہو چکی اسے زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں۔

"اب رہی روح کی ماہیت تو گو اس کی حقیقت ایک بہت بڑا اور بے ڈھب موضوع ہے مگر میں کوشش کروں گا کہ اُسے اختصار کے ساتھ ایک تمثیل کی صورت میں بیان کروں۔ اس تمثیل کے دو جز ہیں پردار گھوڑے اور رتھ بان۔ دیوتاؤں کے پردار گھوڑے اور رتھ بان تو سب کے سب شریف اور اچھی نسل کے ہوتے ہیں مگر دوسری قوموں کے اچھے اور بُرے دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ انسانی قوم کا رتھ بان ایک جوڑی ہانکتا ہے جن میں سے ایک گھوڑا شریف اور اچھی نسل کا ہے اور دوسرا بد اور بُری نسل کا اور ظاہر ہے کہ انھیں ہانکنے میں اسے بڑی دقت ہوتی ہے۔ میں تمھیں یہ سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ فانی اور لافانی مخلوق میں کیا فرق ہوتا ہے۔ روح اپنی مکمل صورت میں ساری کائنات میں غیر ذی روح کی نگراں اور محافظ ہے اور مختلف شکلوں میں ظاہر ہو کر سارے آسمان کی سیر کرتی ہے، جب وہ کامل ہو اور پر پرواز رکھتی ہو تو عالم بالا کی طرف مائل ہوتی ہے اور کل کائنات پر حکومت کرتی ہے

لیکن ناقص روح کے پَر جھڑ جاتے ہیں وہ اُڑتے اڑتے گرتی ہی اور سطح زمین پر آکر ٹک جاتی ہی ۔ یہاں بسیرا لینے کے بعد وہ ایک قالب خاکی پاتی ہی جو بظاہر متحرک بالذات نظر آتا ہی لیکن حقیقت میں اس کی قوت سے حرکت کرتا ہی ۔ یہ روح اور جسم کا مرکب ایک فانی مخلوق کہلاتا ہی ۔ اس لیے کہ ایک ایسے مرکب کا لافانی ہونا عقل قبول نہیں کرتی گو تخیل جس نے نہ خدا کو دیکھا ہی اور نہ اس کی حقیقت کو پہچانا ہی ایک لافانی مخلوق فرض کرے جو جسم بھی رکھتی ہی اور روح بھی جس کے اندر یہ دونوں چیزیں ابد تک متحد رہیں گی ۔ بہر حال ان باتوں کو خدا ہی بہتر جانتا ہی اور اسی کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے ۔ ہمارے سامنے تو اب یہ سوال ہی کہ روح کے پَر کیوں جھڑ جاتے ہیں ۔

"پر جسم کا وہ حصہ ہی جس میں ربانیت کی جھلک نظر آتی ہی جس کی فطرت میں بلند پروازی ہی اور جو پستی کی طرف مائل جسم کو عالم بالا پر ، دیوتاؤں کے نشیمن میں پہنچا دیتا ہی ۔ یہ عالم ربانی حُسن ، حکمت اور خیر وغیرہ سے معمور ہی ۔ ان چیزوں سے غذا حاصل کرکے روح کے پر بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں لیکن جب اس کی غذا نیکی کی ضد یعنی بدی اور آلائش ہو تو اس کے پَر سڑ کر گر جاتے ہیں ۔ عظیم الشان دیوتا زیس ایک پردار گھوڑے کے رتھ میں سوار باگیں سنبھالے آگے آگے چلتا ہی سب پر حکم چلاتا ہی اور سب کی حفاظت کرتا ہی اس کے پیچھے دیوتاؤں اور دیوناروں کی گیارہ قطاریں ہوتی ہیں فقط ہیسٹیا قصر فلک میں بیٹھی رہتی ہی ۔ باقی دیوتاؤں میں سے وہ جو بارہ سرداروں میں شمار ہوتے ہیں اپنی مقررہ ترتیب سے اس جلوس میں چلتے ہیں ۔ وہ آسمان کے اندر بے شمار مبارک منظر دیکھتے ہیں اور آنے جانے کے بہت سے رستے ہیں جن سے مقدس دیوتا اپنے اپنے کام میں مصروف گزرتے رہتے ہیں جو چاہے اور جس سے ہو سکے اسے اجازت ہی کہ ان کے پیچھے پیچھے چلے اس لیے کہ آسمانی جلوس میں رشک و حسد کا کوئی گزر نہیں ۔ لیکن جب انھیں دعوت یا تہوار میں شرکت کرنی

ہوتی ہے تو وہ گنبد فلک پر سید ہے چڑھ کر چوٹی تک پہنچ جاتے ہیں۔ دیوتاؤں کی رتھیں صحیح توازن کے ساتھ باگ کے اشارے پر تیزی سے چڑھ جاتی ہیں مگر دوسروں کو بڑی دقت پیش آتی ہے اس لیے کہ یہ گھوڑا بڑی شکل سے قدم اٹھاتا ہے اور اس رتھ بان کو جس کا گھوڑا اچھی طرح سدھایا ہوا نہ ہو زمین کی طرف کھینچتا ہے:۔ یہی روح کے لیے سخت مصیبت اور کش مکش کی گھڑی ہوتی ہے اس لیے کہ دیوتا اپنا راستہ طے کر کے آسمان کے بیرونی رُخ پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔ کروں کی گردش انھیں چکر دیتی ہے اور وہ ان مناظر کا لطف اٹھاتے ہیں جو آسمان سے پرے ہیں۔ اب رہا فلک الافلاک تو اس کی کماحقہ تعریف روے زمین کے کسی شاعر نے نہ آج تک کی ہے اور نہ کبھی کرے گا۔ اس کی کیفیت میں بیان کرتا ہوں اس لیے کہ جب میرا موضوع بیان حق ہے تو مجھے حق گوئی کی جرأت دکھانی چاہیے۔ یہی مسکن ہے اس ذاتِ مطلق کا جس سے سچے علم کو سروکار ہے۔ وہ بے رنگ بے شکل غیر محسوس جوہر جسے صرف عقل، جو روح کی رہنما ہے، دیکھ سکتی ہے۔ دیوتاؤں کا ذہن جو عقل اور علم محض سے پرورش پاتا ہے اور ہر ایک روح جو اس غذا کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے یہاں تک کہ گردش کائنات اسے پھر اسی مقام پر لے آئے اس گردش میں وہ عدل محض اور عفت محض اور علم محض کا جلوہ دیکھتی ہے اس تخلیق یا تعلق کی صورت میں نہیں جسے ہم انسان وجود کہتے ہیں بلکہ علم مطلق کے وجود مطلق کا۔ اسی طرح دوسری حقیقی ہستیوں کا مشاہدہ کرتی ہوئی اور ان کا لطف اٹھاتی ہوئی وہ آسمان کے اندر لوٹ آتی ہے اور اپنے گھر پہنچ جاتی ہے۔ یہاں رتھ بان اپنے گھوڑوں کو اصطبل میں باندھ دیتا ہے اور انھیں آسمانی غذا کھانے کو اور آب حیات پینے کو دیتا ہے۔

"یہ ہے دیوتاؤں کی زندگی۔ اب رہیں دوسری روحیں تو وہ روح جو خدا کے حکم پر چلتی ہے اور اس کا پرتو رکھتی ہے اپنی رتھ کو لے کر آسمان کے باہر پہنچ جاتی ہے

اور گردش کائنات کے ساتھ چکر کاٹتی ہی لیکن اپنے گھوڑوں کی وجہ سے پریشان رہتی ہی اور بڑی مشکل سے وجود حقیقی کا مشاہدہ کرتی ہی۔ ایک دوسری روح اپنے گھوڑوں کے بے قابو ہونے کی وجہ سے کبھی اٹھتی ہی اور کبھی گرتی ہی، کبھی دیکھتی ہی اور کبھی دیکھنے سے محروم رہتی ہی۔ باقی روحیں بھی عالم بالا کے شوق میں ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں لیکن اپنی ناطاقتی کی وجہ سے سطح آسمان سے نیچے گرجاتی ہیں، اگر کر ٹھوکریں کھاتی ہیں اور آگے بڑھنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو کچلتی ہیں۔ ان میں عجیب ابتری نظر آتی اور وہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے لگاتے پسینے پسینے ہو جاتی ہیں۔ رتھ بانوں کے پھوہڑپن سے ان میں سے بہتوں کے پانو ٹوٹ جاتے ہیں یا پَر جھڑ جاتے ہیں اور وہ سب کی سب اس سعیٔ لاحاصل کے بعد وجود حقیقی کے اسرار سے محروم ہو کر واپس آتی ہیں اور محض قیاس پر بسر کرتی ہیں۔ روحوں کا یہ ذوق شوق میدان حق کی سیر کے لیے اس وجہ سے ہی کہ وہاں وہ چارہ ملتا ہی جو روح کے سب سے اعلیٰ عنصر کا کھاجا ہی اور ان پروں کو جن سے روح اڑتی ہی تقویت پہنچتی ہی۔ تقدیر کا ایک قانون ہی کہ جو روح کسی دیوتا کے ساتھ ایک بار حق کا جلوہ دیکھ لے وہ دوسری نوبت تک شر سے محفوظ رہتی ہی اور اگر ہمیشہ یہ جلوہ دیکھتی ہی تو ہمیشہ محفوظ رہتی ہی لیکن جب وہ دیوتاؤں کی پیروی نہیں کر سکتی اور حق کے دیدار سے محروم رہ جاتی ہی اور سوئے اتفاق سے غفلت اور بدی کے دہرے بوجھ سے شل ہو جاتی ہی اور اس کے پر جھڑ جاتے ہیں اور زمین پر گر پڑتی ہی تو قانون کے مطابق یہ روح آیندہ جنم میں کسی جانور کے جسم میں نہیں بلکہ انسان کے جسم میں پیدا ہوتی ہی۔ وہ روح جس نے سب سے زیادہ حقیقت کا مشاہدہ کیا ہی کسی فلسفی یا صناع یا موسیقی داں یا عاشق کا جنم لیتی ہی، وہ روح جس نے دوسرے درجے پر حق کا مطالعہ کیا ہی کسی عادل بادشاہ یا جنگجو سردار کی صورت اختیار کرتی ہی تیسرے درجے کی روح سیاست داں

یا ماہر معاشیات یا تاجر بنتی ہے چوتھے درجے کی ورزش کی شائق یا طبیب ہو جاتی ہے پانچویں درجے کی کسی کاہن یا پجاری کی زندگی بسر کرتی ہے، چھٹے درجے کی روح کو شاعر یا کسی اور نقال صناع کی حیثیت دی جاتی ہے، ساتویں درجے والی کو کاری گر یا کاشتکار کی زندگی نصیب ہوتی ہے آٹھویں درجے والی کو سوفسطائی یا عوام کے لیڈر کی اور نویں درجے والی کو ظالم فرماں روا کی :- یہ سب امتحان کی حالتیں ہیں اور جو ان میں رہ کر نیکی کی زندگی بسر کرے وہ ترقی کرتا ہے اور جو بدی اختیار کرتا ہے وہ اور بھی گر جاتا ہے۔

"دس ہزار سال کا عرصہ درکار ہے کہ ان میں ہر ایک کی روح اس جگہ واپس جائے جہاں سے آئی تھی اس لیے کہ اس سے کم میں اُس کے پَر اُگ نہیں سکتے۔ صرف فلسفی کی روح جو معصوم اور سچی روح ہوتی ہے یا اس عاشق کی روح جو فلسفے کے ذوق سے خالی نہ ہو، ممکن ہے کہ ہزار ہزار سال کے دو دور گزرنے کے بعد تیسرے دور میں پر پرواز حاصل کرلے۔ ان میں اور معمولی نیک انسان میں فرق کرنا چاہیے جسے تین ہزار سال میں پَر مِل جاتے ہیں :- وہ لوگ جو تین بار مسلسل یہی زندگی اختیار کریں تین ہزار سال کے بعد پَر حاصل کر کے اُڑ جاتے ہیں۔ لیکن دوسروں کو پہلے جنم کے بعد اپنے اعمال کا حساب دینا ہوتا ہے اور اس کے بعد ان میں سے بعض سطح زمین کے نیچے عقوبت خانوں میں جا کر سزا پاتے ہیں اور بعض انصاف کی سبک پروازی سے آسمان کے کسی مقام پر پہنچا دیے جاتے ہیں جہاں وہ اسی کے مناسب زندگی بسر کرتے ہیں جیسی انھوں نے انسانوں کی صورت میں زمین پر گزاری تھی۔ پہلے ہزار سال گزرنے کے بعد اچھی روحیں اور بُری روحیں نئی زندگی کے لیے قرعہ ڈالتی ہیں اور اس میں سے جو چاہتی ہیں اٹھا لیتی ہیں۔ کبھی انسان کی روح جانور کے جسم میں چلی جاتی ہے اور کبھی جانور سے انسان کے جسم میں واپس آجاتی ہے

لیکن جس روح نے کبھی حق کا جلوہ نہیں دیکھا وہ انسان کی شکل اختیار نہیں کر سکتی کیونکہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ کلیات کا علم رکھتا ہو اور حس کے کثیر جزئیات سے عقل کے واحد تصور تک پہنچ سکتا ہو —— یہی تذکرہ ہے ان اشیا کا جن کا روح نے کسی زمانے میں شاہدِ حقیقی کے ہمراہ مشاہدہ کیا تھا جب وہ وجودِ مجازی سے قطع نظر کرکے وجودِ حقیقی کی طرف متوجہ تھی۔ لہٰذا صرف فلسفی کی روح پرواز رکھتی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے اس لیے کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق ہمیشہ ان چیزوں کو یاد رکھتا ہے جن میں ذاتِ الٰہی جلوہ گر ہے اور جن کا مشاہدہ شاہدِ حقیقی کی مخصوص صفت ہے جو شخص ان چیزوں کی یاد کا صحیح استعمال کرتا ہے وہی محرمِ اسرار بنایا جاتا ہے اور اسی کو حقیقی کمال حاصل ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ دنیاوی اغراض کو بھول جاتا ہے اور ذکر و فکر میں محو رہتا ہے اس لیے عوام الناس اسے دیوانہ سمجھ کر بُرا بھلا کہتے ہیں انھیں یہ نہیں سوجھتا کہ اس پر جذب کی حالت طاری ہے۔

"اب تک میں نے جذب یا دیوانگی کی چوتھی اور آخری قسم کا ذکر کیا ہے یہ اس شخص کی طرف منسوب کی جاتی ہے جو ارضی حسن کو دیکھ کر حقیقی حسن کی یاد سے مست ہو جاتا ہے وہ اُڑنا چاہتا ہے لیکن اُڑ نہیں سکتا اس کی حالت ایک پرندے کی سی ہوتی ہے جو اوپر نہ اٹھائے پروں کو پھڑپھڑاتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ نیچے کیا ہے۔ اس لیے اس کو لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں۔ اور میں نے یہ دکھایا ہے کہ جذب کی یہ قسم جس کسی کو نصیب ہو اس کے حق میں سب سے بلند و برتر ہے اور جو شخص حسن سے محبت رکھتا ہے وہ عاشق کہلاتا ہے اس لیے کہ یہ چیز اس کے حصے میں آئی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ہر انسانی روح فطری طریقے کے مطابق وجودِ حقیقی کا مشاہدہ کر چکی ہے۔ یہ شرط ہے اس کے انسانی قالب میں آنے کی۔ لیکن سب روحیں دوسری دوسری دنیا کی چیزوں کو آسانی سے یاد نہیں رکھ سکتیں۔ ممکن ہے کہ انھوں نے ان کا

مشاہدہ صرف تھوڑی سی دیر کیا ہو یا بدقسمتی سے ان کی زندگی موجودہ دنیا میں اچھی نہ رہی ہو اور کسی ناپاک اثر نے ان کے دلوں کو بدی کی طرف مائل کر دیا ہو جس کی بدولت وہ ان پاک چیزوں کی یاد سے محروم ہو جائیں جو انھوں نے کسی زمانے میں دیکھی تھیں۔ صرف معدودے چند آدمیوں کو یہ چیزیں کافی طور پر یاد رہتی ہیں اور یہ لوگ جب اس عالم کی کسی شے کی شبیہہ اس دنیا میں دیکھتے ہیں تو وجد کرنے لگتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کے اس وجد کے کیا معنی ہیں کیونکہ انھیں حقیقت کا واضح ادراک نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ ان چیزوں کی جو شبیہیں عالم ارضی میں نظر آتی ہیں ان میں عدل یا عفت اور بلند و برتر اعیان کی روشنی نہیں ہوتی جو روحوں کو عزیز ہے بہت کم لوگ ان شبیہوں کے پیچھے حقائق کی جھلک دیکھتے ہیں اور وہ بھی بڑی مشکل سے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب انھوں نے ایک مبارک جماعت کے ساتھ حسن حقیقی کی آب و تاب کا دیدار حاصل کیا تھا ——— ہم فلسفیوں نے زیس دیوتا کی جلو میں اور دوسروں نے اور دیوتاؤں کے ہمراہ اس وقت ہم نے یہ روح پرور نظارہ دیکھا اور ہم اس راز کے محرم بنائے گئے جو حقیقی معنی میں مبارک کہا جا سکتا ہے اور ہم نے بڑی خوشیاں منائیں ایک معصومیت کی حالت میں جب کہ ہمیں آنے والی برائیوں کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اور ہم ان صورتوں کا مشاہدہ کر رہے تھے جو منزہ اور بسیط پُرسکون اور پُرمسرت ہیں۔ ہم نے انھیں نورِ محض میں جلوہ گر دیکھا اس وقت جب کہ ہم خود معصوم تھے اور ہنوز اس زندہ قبر میں بند نہیں ہوئے تھے جسے اب ہم ساتھ لیے پھرتے ہیں اور جسم میں اس طرح قید ہیں جیسے موتی صدف میں۔ جی چاہتا ہے کہ جو مناظر اس گزرے ہوئے زمانے میں دیکھے تھے ان کی یاد سے کچھ دیر اور لطف اٹھاؤں۔

تمہیں پھر ایک بار کہتا ہوں کہ ان آسمانی صورتوں کے جھرمٹ میں ہم نے

حسن کو بھی رونق افروز دیکھا تھا اور جب زمین پر آئے تو یہاں بھی ہمیں اس کا جلوہ اس حس کے ذریعے سے جو سب سے زیادہ روشن نظر آیا اس لیے کہ ہمارے حواس ظاہری میں بصارت ہی سب سے زیادہ تیز ہے اگرچہ ہم اس کے ذریعے سے حکمت کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ اگر عین حکمت کی کوئی مرئی شبیہ موجود ہوتی تو ہم اس کے حسن کو دیکھ کر بیخود ہو جاتے۔ اسی طرح اگر دوسرے اعیان کی بھی مرئی مثالیں ہوتیں تو وہ بھی اسی قدر حسین ہوتیں لیکن یہ شرف عین حسن ہی کو حاصل ہے کہ وہ سب سے زیادہ حسین بھی ہے اور سب سے زیادہ آسانی سے دیکھا بھی جا سکتا ہے، لیکن وہ شخص جو عالم حقیقت کا تازہ محرم نہ ہو یا عالم مادی کی ہوا سے بگڑ گیا ہو آسانی کے ساتھ اس دنیا سے گزر کر دوسری دنیا میں نہیں پہنچ سکتا کہ وہاں حسنِ حقیقی کا مشاہدہ کرے۔ لیکن جو شخص ابھی حال ہی میں محرم ہوا ہو اور دوسری دنیا کے چند در چند شاندار مناظر دیکھ چکا ہو وہ جب کوئی حسین صورت یا موزوں قد و قامت دیکھتا ہے تو اسے حسنِ الٰہی کا مظہر سمجھ کر حیرت اور مسرت سے معمور ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ سر سے پیر تک لرز جاتا ہے اور پھر اس کے دل پر وہی پرانا رعب چھا جاتا ہے۔ وہ معشوق کے چہرے پر اس عقیدت سے نظر ڈالتا ہے جیسے کسی دیوتا کی زیارت کر رہا ہو اگر اسے یہ ڈر نہ ہوتا کہ لوگ اسے بالکل مجنون سمجھیں گے تو وہ معشوق کے آگے قربانی کرتا جیسی دیوتاؤں کی مورت کے آگے کی جاتی ہے اس کی صورت دیکھتے ہی دیکھتے یک بارگی اس کی کیفیت بدل جاتی ہے اور لرزے کی جگہ سارے جسم میں شدید حرارت کی لہر دوڑ جاتی ہے اور پسینہ ٹپکنے لگتا ہے اس لیے کہ آنکھوں کی راہ سے حسن کی شعاعیں اس کے جسم میں داخل ہوتی ہیں اس کے پیروں میں نمی پہنچتی ہے اور تمام جسم گرم ہو جاتا ہے۔ اس گرمی کی وجہ سے جسم کے وہ حصے جن سے پنکھ نکلتے ہیں اور جو اب تک بند اور جکڑے ہوئے تھے اور پروں کے نکلنے میں حائل تھے کھل جاتے ہیں اور جب انھیں غذا پہنچنے لگتی ہے تو پنکھ کا نچلا سرا پھولنا شروع

ہوتا ہے اور جڑ سے اُگنے لگتا ہے اور یہ نشو و نما ساری روح میں پھیل جاتی ہے ——— اس لیے کہ ایک زمانے میں روح سراپا بال و پر تھی اس اثنا میں ساری روح ایک ہیجان اور بحران کی حالت میں ہوتی ہے ——— جس کی مثال اس تکلیف اور بے چینی کی سی ہے جو مسوڑھوں میں دانت نکلتے وقت ہوتی ہے ——— وہ ابلنے لگتی ہے اور اسے ایک عجیب خلش سی محسوس ہوتی ہے لیکن جب روح کے پر اس طرح سے نکل رہے ہوں اور اسے معشوق کے حُسن کا جلوہ نظر آجائے تو گرم محسوس ذرات کی ایک لہر دوڑ کر اس کے جسم میں داخل ہوتی ہے یہ جذبات کہلاتے ہیں اور اسے تازگی اور حرارت بخشتے ہیں اور وہ درد سے نجات پاکر مسرت سے معمور ہو جاتی ہے لیکن جب وہ اپنے محبوب سے جُدا ہو جاتی ہے اور اس میں وہ نمی اور تازگی نہیں رہتی تو وہ سوراخ جہاں سے کہ پنکھ نکلتے ہیں سوکھ کر بند ہو جاتے ہیں اور بال و پر کا نمو رُک جاتا ہے ان کا مادہ جذبات سمیت گھُٹ کر رہ جاتا ہے اور اس طرح تپکتا ہے جیسے کوئی شریان اس کو نکاس کی جو سب سے قریب جگہ ملتی ہے اسے چھید ڈالتا ہے یہاں تک کہ ساری روح چھلنی ہو جاتی ہے کبھی درد کی شدت اسے دیوانہ کر دیتی ہے اور کبھی محبوب کی یاد ساری تکلیف بھلا دیتی ہے۔ ان دونوں چیزوں کی بدولت روح اپنی انوکھی حالت پر کُڑھتی ہے اور عجیب کشمکش اور بے چینی محسوس کرتی ہے۔ جوشِ جنوں نہ اسے رات کو سونے دیتا ہے اور نہ دن کو ایک جگہ ٹھیرنے دیتا ہے۔ جہاں کہیں وہ یہ سمجھتی ہے کہ اس حسین کا دیدار نصیب ہو گا وفورِ آرزو میں اُسی طرف دوڑتی ہے۔ جب وہ اس کی صورت دیکھ لیتی ہے اور حسن کے دریا میں نہا لیتی ہے تو وہ بندشیں جن سے وہ جکڑی ہوئی تھی ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ وہ پھر سے تر و تازہ ہو جاتی ہے اور اس کا سارا دکھ درد دور ہو جاتا ہے اس سے بڑھ کر اس وقت کوئی اور لذت نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ عاشق کی روح محبوب کو جو اسے سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے کبھی نہیں چھوڑتی۔ عاشق اپنی

ماں کو اور بھائیوں کو اور رفیقوں کو بھول جاتا ہی اور اپنی املاک کی کس مپرسی اور بربادی کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ زندگی کے آداب وضوابط جن پر اسے پہلے ناز تھا اب اس کی نظر میں حقیر ہو جاتے ہیں۔ اور ایک نوکر کی طرح جہاں کہیں حکم ہو حتی الامکان اپنے مطلوب کے در کے قریب پڑ رہتا ہی اس لیے کہ وہی دیوتا ہی جس کی وہ پرستش کرتا ہی، اور وہی ایک طبیب ہی جو اس کے درد کی شدت کو کم کر سکتا ہی۔ اے مرے عزیز، خیالی نوجوان، جس سے میں باتیں کر رہا ہوں۔ یہی وہ حالت ہی جسے انسان محبت کہتے ہیں اور دیوتاؤں کے یہاں اس کا ایک اور نام ہی جس کی شاید تم اپنی سادگی کی وجہ سے ہنسی اڑاؤ گے۔ یہ نام ایک کتاب میں جو بغیر کسی سند کے ہومر کی طرف منسوب ہی ایک شعر میں آیا ہی۔ اس کا پہلا مصرعہ بیہودہ ہی اور کچھ وزن سے بھی گرتا ہی۔ وہ شعر یہ ہی:۔

"فانی انسانوں نے اس کا نام پرفلیغ عشق رکھا ہی"
لیکن لافانی دیوتا اسے پردار عشق کہتے ہیں کیونکہ بال وپر
کی حرکت اس کے لیے لازمی ہی۔

تم چاہو تو اسے مانو اور نہ چاہو تو نہ مانو۔ بہر حال عاشقوں کی محبت اور اس کے اسباب وہی ہیں جو میں نے بیان کیے۔

"اچھا تو وہ عاشق جو زیس کا پیرو سمجھا جاتا ہی" پردار عشق" کا زیادہ تحمل کر سکتا ہی اور زیادہ بھاری بوجھ اٹھا سکتا ہی لیکن آریس کے رفیق اور ہم رکاب عشق کی حالت میں اگر یہ سمجھ لیں کہ ان پر ذرا سا بھی ظلم ہوا ہی تو وہ مرنے مارنے اور اپنا اور اپنے محبوب کا خاتمہ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر شخص جو کسی اور دیوتا کا پیرو ہوتا ہی جب تک آلودگیوں سے پاک رہے اور اس کے اثر میں رہے اپنے امکان بھر اس کی پرستش اور تقلید کرتا رہے۔ اپنی ارضی زندگی کے پہلے دور میں وہ اپنے محبوب

کے ساتھ اور ساری دنیا کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا رہے جیسا کہ اس کے دیوتا کا طریقہ ہے ہر شخص اپنی اپنی سیرت کے مطابق حسینوں کے زمرے سے اپنا معشوق چن لیتا ہے اسے اپنا دیوتا مانتا ہے اور ایک مورت کی طرح گھڑتا اور سنوارتا ہے جس کی اسے سربسجدہ ہو کر پرستش کرنی ہوتی ہے۔ زیس کے پیرو چاہتے ہیں کہ ان کے معشوق کی روح اس دیوتا کی طرح ہو، اس لیے وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرتے ہیں جو فلسفیانہ اور شاہانہ مزاج رکھتا ہو اور جب انھیں ایسا شخص مل جاتا ہے اور وہ اس پر عاشق ہو جاتے ہیں تو دل و جان سے کوشش کرتے ہیں کہ اس کی یہ سیرت اور زیادہ راسخ ہو جائے اور اگر انھیں اب تک ایسی سیرت کے متعلق کچھ واقفیت نہ ہو تو وہ کسی جاننے والے سے سیکھتے ہیں اور اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں۔ انھیں اپنے دیوتا کی سیرت کی جھلک اپنے اندر پانے میں اس وجہ سے اور بھی کم دقّت ہوتی ہے کہ وہ بہت غور سے اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اس کی یاد ان کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے وہ خود ان کے دل میں بس جاتا ہے وہ اس کی سی سیرت اور مزاج اختیار کر لیتے ہیں اس حد تک جہاں تک کہ انسانوں کے لیے دیوتاؤں کا شریک ہونا ممکن ہے۔ اپنے دیوتا کی صفات وہ اپنے محبوب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اس وجہ سے انھیں اس سے اور بھی زیادہ محبت ہو جاتی ہے۔ اگر باکس دیوتا کی پجارنوں کی طرح انھیں زیس کا فیضان حاصل ہوتا ہے تو وہ اسے اپنے تخیل کے فوارے میں نہلاتے ہیں ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے اپنے دیوتا کا مشابہ بنا لیں لیکن ہیرے دیوی کے پیرو ایک شاہانہ مزاج کا معشوق تلاش کرتے ہیں اور جب وہ ان کے ہاتھ آ جاتا ہے تو اس کے ساتھ بالکل یہی عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح اپالو کے اور دوسرے دیوتاؤں کے پیرو اپنے اپنے دیوتا کے طریق پر چلتے ہیں اور ایک ایسا معشوق ڈھونڈتے ہیں جو ان کے معبود کا مشابہ بن سکے اور جب وہ مل جاتا ہے تو وہ خود بھی اپنے دیوتا کی تقلید کرتے ہیں اور اسے بھی اس کی ترغیب دیتے ہیں اور جہاں تک

ہو سکتا ہے دیوتا کی سیرت اور اخلاق کے مطابق اس کی تربیت کرتے ہیں وہ اپنے معشوق کی طرف سے رشک و حسد کے جذبات دل میں نہیں آنے دیتے بلکہ انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ اسے اپنے آپ سے اور اپنے معبود سے زیادہ سے زیادہ مشابہ بنالیں۔ پس جس عاشق کو دیوتاؤں کا فیضان حاصل ہے اس کی آرزو اور سچے عشق کا محرم اسرار ہونا جس کا میں ذکر کر رہا ہوں معشوق کے حق میں نیک اور بابرکت ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ عاشق کے قبضے میں آجائے اور دونوں کا مقصد پورا ہو جائے جس طریقے سے معشوق قبضے میں آتا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

اس کہانی کے شروع میں میں نے کہا تھا کہ ہر روح دو گھوڑوں اور ایک رتھ بان پر مشتمل ہوتی ہے ان میں سے ایک گھوڑا نیک ہوتا ہے اور دوسرا بد۔ یہ تقسیم اپنی جگہ پر ٹھیک ہے لیکن میں نے ابھی تک یہ نہیں سمجھایا ہے کہ ایک کی نیکی اور دوسرے کی بدی سے کیا مراد ہے؟ اب میں اس کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ سیدھے ہاتھ کے گھوڑے کا جسم ستواں اور سڈول اس کا رنگ سفید اور اس کی آنکھیں سیاہ ہوتی ہیں۔ وہ عزتِ نفس، حیا اور عفت کا دلدادہ اور سچی عظمت کا طالب ہے۔ اسے کوڑے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی رہنمائی کے لیے ایک لفظ اور للکار کافی ہے۔ دوسرا ایک بھدی چال کا بے ڈول جانور ہے اس کی گردن کوتاہ اور موٹی ہے چہرہ چپٹا اور کالا ہے، آنکھیں بھوری اور خونخوار ہیں کان جھبرے اور بہرے، غرور اور نخوت میں ڈوبا ہوا جس پر نہ کوڑے کا اثر ہوا اور نہ مہمیز کا۔ جب رتھ بان محبت کا جلوہ دیکھتا ہے اور اس کی ساری روح حس کی شدت سے گرما جاتی ہے اور آرزو کی خلش سے بے چین ہوتی ہے تو فرماں بردار گھوڑا جو ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی حیا کا پابند ہوتا ہے معشوق پر جھپٹنے سے باز رہتا ہے مگر دوسرا گھوڑا جسے نہ مہمیز کی پروا ہوتی ہے اور نہ کوڑوں کی، بگٹٹ بھاگتا ہے اپنے رفیق اور رتھ بان کو طرح طرح ستاتا ہے اور انھیں زبردستی معشوق کے پاس کھینچ لے جاتا ہے اور عشق کی لذتیں

یاد دلاتا ہے وہ پہلے تو غصے میں بھرے ہوئے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ گوارا نہیں کرتے کہ وہ انھیں خوفناک اور ناجائز کاموں پر اکسائے۔ لیکن جب وہ برابر ستائے جاتا ہے تو آخر کار وہ مغلوب ہو جاتے ہیں اور اس کی فرمائش کے مطابق عمل کرنے کا اقرار کر لیتے ہیں۔ اب وہ منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں اور معشوق کے حسن تابدار کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جب رتھ بان یہ نظارہ دیکھتا تو اس کے دل میں حسن حقیقی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو اسے عفت کی دیوی کے ساتھ ایک مورت کی طرح ایک بلند کرسی پر جلوہ گر نظر آتا ہے۔ وہ اسے دیکھتا تو ہے مگر مرعوب ہو جاتا ہے اور ادب و احترام سے پیچھے ہٹتا ہے اور ہٹنے کی وجہ سے اسے باگیں اس زور سے کھینچنی پڑتی ہیں کہ دونوں گھوڑے پٹھے ٹیک دیتے ہیں ایک تو خوشی سے اور بغیر کسی مزاحمت کے اور دوسرا یعنی سرکش گھوڑا نہایت ناخوشی سے۔ اور جب وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ جاتے ہیں تو پہلا گھوڑا شرم اور حیرت میں ڈوب جاتا ہے اور اس کی ساری روح پسینے میں نہا جاتی ہے۔ دوسرا اس تکلیف کے دور ہو جانے کے بعد جو لگام کے جھٹکے اور گرنے کی وجہ سے ہوئی تھی اور بڑی دقت سے سانس لینے کے بعد غصے سے بے تاب ہو جاتا ہے اور رتھ بان اور دوسرے گھوڑے پر بزدلی اور نامردی کا الزام رکھ کر طعن و تشنیع کی بوچھار کر دیتا ہے کہ تم نے اپنے عہد کو توڑ دیا اور مجھ سے غداری کی۔ وہ پھر انکار کرتے ہیں اور وہ اصرار کیے جاتا ہے اور ان کی درخواست بمشکل مانتا ہے کہ اس وقت ٹھہر جاؤ کسی اور وقت دیکھا جائے گا۔ جب مقررہ وقت آتا ہے تو وہ ایسے بن جاتے ہیں جیسے اپنا وعدہ بھول گئے ہوں اور وہ انھیں یاد دلاتا ہے اور لڑتا ہے اور ہنہناتا ہے اور انھیں آگے کھینچتا ہے یہاں تک کہ وہ اسی ارادے کو دل میں ٹھانے ہوئے آخر کار انھیں مجبور کرتا ہے کہ پھر معشوق کی طرف بڑھیں اور جب وہ اس کے قریب پہنچ جاتا ہے تو وہ سر جھکا کر دُم اٹھا کر دہانے کو دانتوں میں بھینچ کر بغیر کسی شرم کے پوری طاقت سے کھینچتا ہے۔ اس

وقت رتھ بان کی حالت اور بھی ابتر ہوتی ہے وہ سوار کی طرح جو گھڑدوڑ میں کٹھرے تک پہنچ گیا ہو پیچھے ہٹتا ہے اور بڑی زور کے جھٹکے کے ساتھ دہانے کو سرکش گھوڑے کے دانتوں سے نکالتا ہے، اس کی گندی زبان اور جبڑوں کو خون میں تھیٹر دیتا ہے، اس کی ٹانگوں اور پٹھے کو زمین سے ملا دیتا ہے اور اسے سخت سزا دیتا ہے۔ جب یہ واقعہ کئی بار پیش آچکتا ہے اور بدمعاش گھوڑا اپنی بیہودگی سے باز آجاتا ہے تو وہ سیدھا ہو جاتا ہے اور رتھ بان کی مرضی پر چلنے لگتا ہے اور جب اس حسین معشوق کو دیکھتا ہے تو خوف کے مارے اس کی جان نکل جاتی ہے۔ اس وقت سے عاشق کی روح معشوق کے پیچھے ادب وانکسار کے ساتھ چلتی ہے۔

پس معشوق جسے عاشق نے ایک دیوتا سمجھ کر خلوص اور وفاداری سے، محض دکھاوے کے لیے نہیں بلکہ سچے دل سے اس کی ہر طرح خدمت کی ہے، خود بھی فطرتاً عاشق پر مہربان ہوتا ہے اگر پہلے وہ اپنی محبت کا اقرار کرتے ہوئے شرماتا تھا اور عاشق کو جھڑک دیتا تھا کیونکہ اس کے نوجوان رفیقوں یا دوسرے لوگوں نے افترا پردازی سے اس کے کان میں یہ پھونک دیا تھا کہ وہ رسوا ہو جائے گا، اب ایک مدت کے بعد ایک خاص عمر میں اس سے میل جول پیدا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ تقدیر کا جہاں یہ فرمان ہے کہ بدوں میں کبھی دوستی نہیں ہوگی وہاں یہ بھی ہے کہ نیکوں میں ہمیشہ دوستی رہے گی۔ اور جب معشوق عاشق سے بے تکلف اور شیر وشکر ہو جاتا ہے تو وہ اس کے خلوص کو دیکھ کر حیرت میں رہ جاتا ہے۔ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دیوانہ دوست اکیلا اور سب دوستوں اور عزیزوں کے برابر ہے ان کی دوستی کو اس کی دوستی سے کوئی نسبت نہیں۔ جب یہ احساس ایک مدت تک رہتا ہے اور معشوق عاشق سے قریب تر ہو جاتا ہے اور جمناسٹک کی مشق میں اور ملاقات کے دوسرے موقعوں پر اس سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ اس چشمے کا فوارہ جس کا نام زیس نے گینی میڈ کے

عشق کے زمانے میں آرزو رکھا تھا، عاشق پر برسنے لگتا ہے اور اس کا کچھ حصہ عاشق کی روح میں داخل ہوتا ہے اور جب وہ لبالب بھر جاتی ہے تو کچھ حصہ باہر چھلک پڑتا ہے اور جس طرح ہوا یا صدا ہموار چٹانوں سے لوٹتی ہے اور جہاں سے آئی تھی وہیں واپس جاتی ہے اسی طرح حسن کا چشمہ آنکھوں سے جو روح کے دریچے ہیں گزر کر پھر صاحبِ حُسن کی طرف لوٹ جاتا ہے، وہاں پہنچ کر پروں کے ہر ایک منفذ میں جان ڈال دیتا ہے، ان کی آبیاری کرتا ہے اور ان میں نمو کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور معشوق کی روح کو بھی محبت سے معمور کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ محبت کرنے لگتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ کس چیز سے، وہ اپنی حالت کو نہ سمجھتا ہے اور نہ بیان کر سکتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق کا اندھاپن اس میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ عاشق اس کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنی صورت دیکھتا ہے مگر اسے اس بات کی خبر نہیں ہوتی۔ جب وہ عاشق سے ملتا ہے تو دونوں کا درد مٹ جاتا ہے لیکن جب وہ اس سے جدا ہوتا ہے تو دونوں کا دل آرزو کی خلش سے بے چین ہو جاتا ہے اور اس دو طرفہ عشق کا نقش اس کے دل میں بیٹھ جاتا ہے جسے وہ عشق نہیں کہتا اور نہیں سمجھتا بلکہ صرف دوستی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی آرزو بھی عاشق کی آرزو کی طرح ہوتی ہے مگر اس سے کچھ کم۔ وہ اسے دیکھنے، چھونے، پیار کرنے اور گلے لگانے کی خواہش رکھتا ہے اور غالباً بہت جلد اس کی خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ جب وہ ملتے ہیں تو عاشق کا بدمعاش گھوڑا اپنے رتھ بان سے بہت کچھ کہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اتنی تکلیفوں کے بدلے کچھ تھوڑی سی لذت حاصل ہو۔ مگر معشوق کا بدمعاش گھوڑا ایک لفظ بھی نہیں کہتا اس لیے کہ اس کے دل میں ایک ایسے جذبے کا طوفان برپا ہوتا ہے جسے وہ خود نہیں سمجھتا ہے وہ عاشق کے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے اور اسے اپنا سب سے پیارا دوست سمجھ کر اس سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ جب ایک دوسرے کے پہلو میں ہوتے ہیں تو معشوق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ عاشق جو کچھ بھی مانگے اس کے دینے میں انکار نہیں کر سکتا۔

گو دوسرا گھوڑا اور رتھ بان شرم اور عقل کی دلیلوں سے اس کی مخالفت کریں۔ اس کے بعد ان کی راحت و مسرت کا دارومدار ان کے ضبطِ نفس پر ہے۔ اگر نفس کے برتر عناصر نظم اور حکمت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں تو وہ دنیا میں اپنی زندگی راحت اور ہم آہنگی سے بسر کرتے ہیں، اپنے اوپر قابو رکھتے ہیں اور ضبط سے کام لیتے ہیں۔ روح کے بدعنصر کو قید اور نیک عنصر کو آزاد کر دیتے ہیں۔ اور جب آخری وقت آتا ہے تو وہ اپنے کو سبک اور قابلِ پرواز پاتے ہیں اس لیے کہ وہ تین آسمانی یا حقیقی معنی میں اولمپی مقابلوں میں سے ایک میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اس سے بڑی کوئی نعمت انسان کو سعیِ بشری یا تائیدِ الٰہی سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر اس کے برعکس وہ حکمت کو ترک کر کے ادنیٰ نفسانی زندگی بسر کرتے ہیں تو غالباً شراب کے نشے میں یا کسی اور لااُبالی پن کے موقع پر دونوں بدمعاش گھوڑے دونوں روحوں کو غافل پا کر اکٹھا کر دیتے ہیں، اور اپنے دل کی اس خواہش کو پورا کرتے ہیں جو بہتوں کے لیے انتہائی مسرت ہے۔ ایک بار اس کا لطف اٹھانے کے بعد وہ آیندہ بھی لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن شاذ و نادر۔ اس لیے کہ ان کی پوری روح اسے پسند نہیں کرتی۔ وہ بھی ایک دوسرے کو عزیز رکھتے ہیں لیکن اتنا نہیں جتنا وہ دونوں، نہ تو عشق کے دوران میں اور نہ اس کے بعد۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ایک دوسرے سے اٹل عہد کیا ہے جسے توڑ کر وہ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو سکتے۔ آخر کار ان کی روحیں جسم سے جدا ہو جاتی ہیں۔ وہ پروں سے محروم ہوتی ہیں مگر اڑنے کے لیے بے تاب، اور یہ ان کی محبت اور دیوانگی کا کچھ کم صلہ نہیں ہے۔ اس لیے جو لوگ ایک بار آسمان کی زیارت کے لیے کمر باندھ کر چل کھڑے ہوں وہ تاریکی میں اتر کر زمین کے نیچے سفر کرنے نہیں جا سکتے بلکہ ہمیشہ روشنی میں رہتے ہیں، سفر میں ایک دوسرے کے اچھے رفیق ہوتے ہیں اور جب وہ وقت آتا ہے کہ انھیں بال و پر نصیب

ہوتے ہیں تو دونوں کو باہمی محبت کی وجہ سے ایک سے پر ملتے ہیں۔"

بس میرے پیارے نوجوان، عاشق کی دوستی کی بدولت تمھیں بڑی بڑی آسمانی برکتیں نصیب ہوں گی۔ اب رہی غیر عاشق کی دوستی جو دنیاوی مصلحتوں سے آلودہ ہوتی ہے اور فائدہ پہنچانے میں دنیاداری اور کنجوسی سے کام لیتی ہے، سو وہ تمھاری روح میں وہ ادنیٰ صفات پیدا کر دے گی جنھیں عوام پسند کرتے ہیں، تمھیں تو ہزار سال تک زمین کے گرد پھرائے گی اور آخر عالمِ زیریں میں بے وقوف بنا کر چھوڑ دے گی۔

"اس طرح اے عشق کے دیوتا میں نے اپنے جرم کی تلافی کی ہے جس قدر خوبی سے مجھ سے ہو سکتی تھی، خصوصاً تشبیہات و استعارات کے لحاظ سے جن سے مجھے مجبوراً کام لینا پڑا اس لیے کہ فیڈرس کا اصرار تھا۔ اب جو کچھ ہو چکا اسے معاف کر دے اور جو کچھ ہے اسے قبول کر لے۔ مجھ پر رحم اور کرم فرما اور غصے میں اپنے قہر و غضب سے مجھے بصارت سے محروم نہ کر اور مجھ سے محبت کا ہنر نہ چھین جو تو نے مجھے عطا کیا ہے بلکہ ایسا کر کہ میری قدر حسینوں کی نظر میں اور بھی بڑھ جائے۔ اور اگر فیڈرس نے یا میں نے اپنی پہلی تقریروں میں کوئی گستاخی کی بات کہی تو اس کا الزام لیسیاس پر رکھ جو اس بچّے کا باپ ہے اور ہمیں اس کی دوسری اولاد سے محفوظ رکھ۔ اسے حکم دے کہ اپنے بھائی پولیمارکس کی طرح فلسفے کا مطالعہ کرے، تب اس کا عاشق فیڈرس اس دُبدا میں نہیں رہے گا، بلکہ اپنے آپ کو ہمہ تن عشق و محبت اور حکیمانہ مذاکروں کے لیے وقف کر دے گا۔"

فیڈرس۔ میں تمھاری دعا میں شریک ہوں سقراطؔ اور تمھارا ہم زبان ہو کر کہتا ہوں کہ اگر میرا بھلا اسی میں ہے تو خدا کرے تمھاری بات پوری ہو مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے دوسری تقریر پہلی تقریر سے اس قدر بہتر کیوں کی؟ آخر کیا بات ہے؟ اور مجھے یہ ڈر ہو چلا ہے کہ لیسیاس میری نظر سے گر جائے گا اور تمھارے مقابلے میں

بیٹا معلوم ہوگا۔ خواہ وہ اس پر بھی تیار ہو جائے کہ ایک اور تقریر اتنی ہی اچھی اور لمبی ہو جتنی تمھاری تھی لکھ ڈالے جس میں مجھے شبہہ ہے۔ اس لیے کہ ابھی تھوڑے دن ہوئے ہمارا ایک سیاست داں اسے اسی بات پر بُرا بھلا کہہ رہا تھا اور بار بار "تقریر نویس" کے لقب سے یاد کرتا تھا اس لیے ممکن ہے غیرت میں آکر وہ تقریریں لکھنا چھوڑ دے۔

سقراط۔ بھئی کیا مزے کی بات ہے! مگر میرے پیارے نوجوان میرے خیال میں تم اپنے دوست کو جانتے ہی نہیں اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ ذرا سی غرفش سے ڈر جائے گا۔ کیا تمھارے خیال میں جو شخص اسے بُرا بھلا کہہ رہا تھا وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا؟

فیڈرس۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں 'سقراط'۔ تمھیں معلوم ہے کہ ہمارے سب سے بڑے اور سب سے با اثر مدبر تقریر لکھنے کو اور اپنے بعد تحریر کی صورت میں چھوڑ جانے کو باعث ننگ سمجھتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آیندہ نسلیں انھیں سوفسطائی کے لقب سے یاد کریں۔

سقراط۔ شاید تمھیں یہ معلوم نہیں فیڈرس کہ مثل میں جس "میٹھی کہنی" کا ذکر ہے[1] وہ حقیقت میں دریائے نیل کا لمبا بازو ہے اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ ان حضرات کی میٹھی کہنی کا بازو بھی بہت لمبا ہے۔ اصل میں ہمارے سیاست دانوں کو اس سے بڑھ کر کسی چیز کا شوق نہیں کہ تقریریں لکھیں اور آیندہ نسلوں کے لیے چھوڑ جائیں۔ اور وہ اپنی تحریروں کے سرورق پر اپنے مداحوں کے نام بھی ازراہِ شکر گزاری درج فرما دیتے ہیں۔

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یونانی زبان میں اس مضمون کی کوئی مثل تھی کہ کہنی تو بڑی میٹھی ہے مگر بازو بہت لمبا ہے (اس لیے منہ کا کہنی تک پہنچنا دشوار ہے) اور یہ مثل ایسے موقع پر استعمال ہوتی تھی کہ جب کوئی چیز پسند تو ہو مگر اس کا حاصل کرنا مشکل ہو۔

فیڈرس۔ میں سمجھا نہیں تمھارا کیا مطلب ہے۔

سقراط۔ واہ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ جب سیاست داں کچھ لکھتا ہے تو اپنے مداحوں کے نام سے ابتدا کرتا ہے۔

فیڈرس۔ وہ کیسے؟

سقراط۔ بھئی وہ اس طرح شروع کرتا ہے "ذیل کا قانون بنایا جائے سینٹ یا جمہوریا ان دونوں کی طرف سے فلاں شخص کی تحریک پر" یعنی خود مصنف کی۔ اس طرح بڑی سنجیدگی کے ساتھ وہ اپنے مداحوں کے سامنے اپنی دانش مندی کا اظہار کرتا ہے ایک تحریر کی صورت میں جو اکثر لمبی اور اکتا دینے والی ہوتی ہے۔ اب بتاؤ کہ یہ تصنیف نہیں تو اور کیا ہے؟

فیڈرس۔ بے شک تصنیف ہے۔

سقراط۔ اور اگر قانون آخر میں منظور ہو جاتا ہے مصنف بہت خوش خوش ایوان سے نکلتا ہے لیکن اگر نامنظور ہو گیا اور اسے تقریر نویسی کا موقع نہ ملا اور وہ لکھنے کے قابل نہ سمجھا گیا تو وہ اور اس کی پارٹی سوگ مناتی ہے۔

فیڈرس۔ بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط۔ تقریر لکھنے کو حقیر سمجھنا در کنار، یہ لوگ تو اس کی حد درجہ قدر کرتے ہیں۔

فیڈرس۔ بے شک۔

سقراط۔ اور جب کسی بادشاہ یا خطیب کو لکرگس یا سولن یا دارا کی طرح اس کا موقع ملتا ہے کہ تصنیف کے ذریعے سے اپنی ریاست میں بقائے دوام حاصل کرے تو کیا آیندہ نسلیں اس کی تحریروں کو دیکھ کر اسے دیوتا نہیں بنا لیتیں اور وہ خود اپنی زندگی میں اپنے آپ کو دیوتا نہیں سمجھتا؟

فیڈرس۔ واقعی یہی بات ہے۔

سقراط ۔ تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طبقے کا کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی بدمزاج کیوں نہ ہو لیسیاس کو مصنف ہونے پر ملامت کرے گا۔

فیڈرس ۔ تمھارے خیال کے مطابق تو نہیں کرے گا اس لیے کہ بقول تمھارے اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ خود اپنے محبوب شغل کو بُرا کہتا ہے۔

سقراط ۔ تو یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ لکھنے میں فی نفسہٖ کوئی قباحت نہیں۔

فیڈرس ۔ بے شک کوئی قباحت نہیں۔

سقراط ۔ قباحت تو اس وقت ہوگی جب انسان اچھا نہیں بُرا لکھتا ہو۔

فیڈرس ۔ ظاہر ہے۔

سقراط ۔ اچھا لکھنے میں اور بُرا لکھنے میں کیا فرق ہے ——— کیا ہمیں لیسیاس یا کسی اور شاعر یا خطیب سے جس نے کوئی سیاسی یا غیر سیاسی، موزوں یا ناموزوں نظم یا نثر لکھی ہو یا اب لکھنے والا ہو اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے؟

فیڈرس ۔ ضرورت کی ایک ہی کہی ۔ آخر انسان کی زندگی کا مقصد ہی کیا ہے سوا اس کے کہ اس قسم کے مذاکروں سے لطف اندوز ہو ۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد جسمانی لذتیں تو ہو نہیں سکتیں جن سے پہلے الم کا ہونا ضروری ہے اور اسی لیے وہ بجا طور پر غلاموں سے منسوب کی جاتی ہیں۔

سقراط ۔ وقت تو کافی ہے ۔ میرے خیال میں یہ ٹڈے جو دوپہر کی گرمی میں اپنی بولی بول رہے ہیں آپس میں باتیں کرتے جاتے ہیں اور ہماری طرف جھانکتے جاتے ہیں ۔ یہ اپنے دل میں کیا کہیں گے اگر انھوں نے دیکھا کہ ہم عام لوگوں کی طرح گفتگو کرنے کے بجائے ان کی آواز کی لوری سے دوپہر کو سو رہے ہیں اور اس قدر آرام طلب ہیں کہ غور و فکر کی زحمت گوارا نہیں کرتے ۔ کیا انھیں یہ حق نہ ہوگا کہ ہماری ہنسی اڑائیں ؟ شاید وہ یہ سمجھیں کہ یہ لوگ غلام ہیں جو اس تفریح گاہ میں

سستانے کے لیے آگئے ہیں اور بھیڑوں کی طرح جو دوپہر کے وقت کسی کنویں کے آس پاس پڑ رہتی ہیں سو رہے ہیں۔ لیکن اگر وہ یہ دیکھیں گے کہ گفتگو میں مصروف اور اوڈی سیس کی طرح ان کے پاس سے گزرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور ان کی موہنی آواز پر کان نہیں دھرتے تو شاید وہ مرعوب ہو کر ہمیں ان نعمتوں میں سے کچھ دے دیں جو انھیں دیوتاؤں سے ملتی ہیں تاکہ وہ انسانوں کو پہنچا دیں۔

فیڈرس۔ کون سی نعمتیں میں نے تو ان کا نام بھی نہیں سنا۔

سقراط۔ تم جیسے موسیقی کے شائق نے ٹڈوں کی کہانی ضرور سنی ہوگی جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ فنونِ لطیفہ کی دیویوں کے وجود میں آنے سے پہلے انسان تھے۔ جب یہ دیویاں پیدا ہوئیں اور نغمہ ایجاد ہوا تو ان پر فرطِ خوشی سے وجد کی حالت طاری ہو گئی۔ انھیں ہر وقت گانے کی دُھن رہتی تھی اور کھانے پینے کی سدھ نہ تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسی محویت کی حالت میں جان سے گزر گئے۔ اب انھوں نے ٹڈوں کی شکل میں جنم لیا ہے اور فنونِ لطیفہ کی دیویوں نے انھیں یہ صلہ عطا کیا ہے کہ وہ بھوک اور پیاس کے جھگڑے سے آزاد ہیں، جب سے پیدا ہوتے ہیں برابر گاتے رہتے ہیں اور کھانے پینے کا نام بھی نہیں لیتے اور جب مرتے ہیں تو آسمان پر جا کر فنونِ لطیفہ کی دیویوں کو اطلاع دیتے ہیں کہ دنیا میں کون شخص ان کی قدر کرتا ہے وہ اپنی سفارش سے ترپسکور کو ناچنے والوں پر مہربان کر دیتے ہیں، ایرٹو کو عاشقوں پر اور دوسری دیویوں کو ان لوگوں پر جو اپنے اپنے رنگ میں ان کی پرستش کرتے ہیں کیلیوپ کو جو سب دیویوں میں عمر میں بڑی ہے اور یورانیا کو جو اس سے چھوٹی ہے فلسفیوں پر ان کی موسیقی کی تعریف بیان کر کے، اس لیے کہ انھی دیویوں کو زیادہ تر آسمان سے اور انسانوں اور دیوتاؤں کے خیالات سے تعلق ہے اور ان کی آواز نہایت شیریں ہے غرض بہت سی وجوہ سے ہمیں دوپہر کو باتیں کرنا چاہییں، سونا نہیں چاہیے۔

فیڈرس ۔ اچھا تو پھر آؤ، باتیں کریں۔

سقراط ۔ تو کیا ہم تحریر و تقریر کے اصولوں پر بحث کریں جیسا کہ ہمارا ارادہ تھا۔

فیڈرس ۔ ضرور۔

سقراط ۔ کیا اچھی تقریر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مقرر کو اس معاملے کی حقیقت کا علم ہو جس کے متعلق وہ تقریر کرنے والا ہے۔

فیڈرس ۔ مگر میں نے تو یہ سنا ہے سقراط جو شخص مقرر بننا چاہے اسے حقیقی انصاف سے سروکار نہیں بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ جمہور جو فیصلہ کرنے والے ہیں، کس بات کو پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح اسے حقیقی نیکی یا شرافت سے کوئی مطلب نہیں بلکہ ان قیاسات سے غرض ہے جو ان چیزوں کے متعلق قائم کیے گئے ہیں۔ لوگوں کو ترغیب قیاسات کی بنا پر دی جاتی ہے نہ کہ حقیقت کی۔

سقراط ۔ دانش مندوں کے قول کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ غالباً اُن میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے لہذا ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے انھیں محض سرسری طور پر ٹالنا نہیں چاہیے۔

فیڈرس ۔ بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط ۔ اچھا تو اس سوال کو یوں پیش کریں، فرض کرو کہ میں تمھیں اس بات کی ترغیب دوں کہ گھوڑا خریدو اور لڑائی میں شریک ہو جاؤ اور ہم میں سے کسی کو اس کا علم نہ ہو کہ گھوڑا کیسا ہوتا ہے۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ تمھارے خیال میں گھوڑا وہ پالتو جانور ہے جس کے کان سب سے لمبے ہوں۔

فیڈرس ۔ یہ تو ایک مضحک بات ہوگی۔

سقراط ۔ اس سے بھی زیادہ مضحک بات اب آتی ہے۔ فرض کرو میں تمھیں نہایت سنجیدگی سے اس کا یقین دلا دوں اور ایک تقریر ایک گدھے کی شان میں

جس کا نام میں گھوڑا رکھوں تیار کروں جو ان الفاظ سے شروع ہو "بڑا شریف جانور ہی اور بڑے کام کا ہی خصوصاً لڑائی میں۔ تم اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر لڑ سکتے ہو اور وہ سامان وغیرہ بھی اٹھائے گا۔"

فیڈرس۔ کس قدر مضحک ہی۔

سقراط۔ ہاں مضحک تو ضرور ہی مگر کیا ایک مضحک دوست بھی ایک چالاک دشمن سے بہتر نہیں ہوتا؟

فیڈرس۔ بے شک۔

سقراط۔ اور اگر مقرر گدھے کو گھوڑا بنانے کی بجائے بدی کو نیکی بنا کر پیش کرے اس لیے کہ وہ خود بھی ان دونوں کی حقیقت سے ناواقف ہی اور اس شہر کے لوگ بھی جنھیں وہ دھوکے میں ڈال رہا ہی، اور لوگوں کے خیالات کا مطالعہ کرنے کے بعد انھیں غلط بیانی سے کام لے کر گدھے کے سایے کو گھوڑا سمجھنے کی نہیں بلکہ بدی کو نیکی سمجھنے کی ترغیب دے تو اس بیج کو بو کر خطابت کو کس چیز کی فصل کاٹنے کی توقع رکھنی چاہیے۔

فیڈرس۔ برائی کی۔

سقراط۔ مگر شاید ہم نے خطابت کے ساتھ بہت زیادتی کی ہی اور ممکن ہی وہ یہ کہے "تم عجب جہل باتیں کر رہے ہو گویا میں نے کسی کو مجبور کیا ہی کہ حقیقت کو جانے بغیر تقریر کرے! میری رائے کی کچھ قیمت ہو یا نہ ہو مگر میں تو اس سے یہی کہتی کہ پہلے حقیقت دریافت کرلے پھر میرے پاس آئے۔ مگر اسی کے ساتھ میں دعوے سے کہتی ہوں کہ محض حقیقت کے علم سے ترغیب دینے کا فن نہیں آتا۔"

فیڈرس۔ ان خاتون نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا وہ معقولیت سے خالی نہیں۔

سقراط۔ ٹھیک ہے یہ بشرطیکہ وہ دلیلیں جو ابھی پیش کرنی باقی ہیں اس کی شہادت دیں کہ خطابت دراصل کوئی فن ہے۔ مگر مجھے تو کچھ ایسا سنائی دیتا ہے کہ وہ سب اس کے خلاف صف بندی کر رہی ہیں اور یہ کہہ رہی ہیں کہ اس کا دعویٰ غلط ہے اور خطابت کوئی فن نہیں بلکہ محض ایک بندھا ہوا ڈھرّا اور ایک خاص ڈھب ہے۔ وہ دیکھو ایک اسپارٹا والا نمودار ہوتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ تقریر کا کوئی فن جو سچائی سے جدا ہو نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔

فیڈرس۔ وہ دلیلیں کیا ہیں سقراط۔ انھیں بیان تو کرو کہ ہم انھیں جانچ کر دیکھیں۔

سقراط۔ آؤ میرے پیارے بچو، اور فیڈرس کو جو خود تم جیسے حسین بچوں کا باپ ہے، یہ یقین دلانے کی کوشش کرو کہ وہ ہرگز کسی چیز کے متعلق ایسی تقریر نہیں کر سکے گا جیسی اسے کرنی چاہیے، جب تک فلسفے کا علم نہ رکھتا ہو اور پھر اسے جواب دینے دو۔

فیڈرس۔ تم سوال تو کرو۔

سقراط۔ کیا خطابت کی عام تعریف یہ نہیں ہے کہ وہ ایک عالمگیر فن ہے ذہن کو جادو کے دلائل سے موہ لینے کا جس سے نہ صرف عدالتوں میں اور عام جلسوں میں بلکہ گھروں میں بھی کام لیا جاتا ہے، جو ہر قسم کے چھوٹے بڑے معاملات سے تعلق رکھتا ہے اور ہر صورت میں صحیح اور قابلِ قدر ہے —— یہی تم نے سنا ہوگا؟

فیڈرس۔ نہیں بالکل ایسا تو نہیں میں نے تو یہ سنا ہے کہ لوگ اس فن کے دائرے کو عدالتی مقدمات میں تحریر و تقریر سے کام لینے اور مجمع میں بولنے تک محدود رکھتے ہیں۔ اس سے آگے نہیں بڑھاتے۔

سقراط۔ تو شاید تم نے صرف نیسٹر اور اوڈیسیس کا ذکر سنا ہے جو وہ ٹرائے

کے قیام کے زمانے میں فرصت کے اوقات میں تصنیف کیا کرتے تھے اور پلیمڈیس کی خطابت کا ذکر کبھی نہیں سُنا۔

فیڈرس۔ میں نے تو نیسٹر اور اوڈیسیس کے خطبوں کا بھی نام نہیں سنا الّا یہ کہ نیسٹر سے تمہاری مُراد گورگیاس اور اوڈیسیس سے تھریسیماکس یا تھیوڈورس ہو۔

سقراط۔ ممکن ہی میرا مطلب یہی ہو مگر خیر اس قصے کو چھوڑو اور مجھے یہ بتاؤ کہ مدعی اور مدعا علیہ عدالت میں کیا کرتے ہیں۔ آپس میں جھگڑتے ہی ہیں نہ؟

فیڈرس۔ بے شک۔

سقراط۔ اور جھگڑا حق اور ناحق پر ہوتا ہی؟

فیڈرس۔ ہاں اسی پر۔

سقراط۔ اور جو شخص خطابت کے فن میں ماہر ہی وہ اسی بات کو انھی لوگوں کے سامنے جب چاہتا ہی حق ثابت کر دیتا ہی اور جب چاہتا ہی ناحق۔

فیڈرس۔ بالکل ٹھیک ہی۔

سقراط۔ اور مجمع عام میں تقریر کرتے ہوے شہر کے لوگوں کی نظر میں ایک ہی چیز کو کبھی اچھا بنا دیتا ہی اور کبھی بُرا۔

فیڈرس۔ سچ ہی۔

سقراط۔ ہم نے پیلیمڈیس ایلیائی (زینو) کا نام تو سنا ہی کہ جسے تقریر میں یہ کمال ہی کہ اپنے سامعین کے سامنے انھیں چیزوں میں اتحاد اور اختلاف وحدت اور کثرت، سکون اور حرکت ثابت کر دیتا ہی۔

فیڈرس۔ بالکل سچ ہی۔

سقراط۔ غرض علم کلام عدالتوں اور عام جلسوں تک محدود نہیں بلکہ یہی چیز زبان کے ہر استعمال میں پائی جاتی ہی۔ یہ وہ فن ہی، اگر اسے فن کہا جائے، جو

حتی الامکان ہر شے کے مشابہ کوئی دوسری شے ڈھونڈ نکالتا ہے اور دوسروں کے متشابہات اور التباسات کی قلعی کھول دیتا ہے۔

فیڈرس۔ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

سقراط۔ اچھا میں اسے دوسری طرح سمجھاتا ہوں۔ دوسروں کو دھوکے میں ڈالنے کا امکان کس حالت میں زیادہ ہوگا ——— جب دو چیزوں میں فرق کم ہو یا جب زیادہ ہو؟

فیڈرس۔ جب فرق کم ہو۔

سقراط۔ اور اگر تم بحث میں ایک انتہا سے دوسری انتہا تک بتدریج چلو تو پکڑے جانے کا اندیشہ اس سے کم ہوگا جتنا اس وقت جب تم ایک دم سے اس سرے سے اس سرے پر پہنچ جاؤ؟

فیڈرس۔ ظاہر ہے۔

سقراط۔ لہذا جو شخص یہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو دھوکا دے اور خود دھوکا نہ کھائے اسے اشیا کی باہمی مشابہت اور فرق کا بالکل صحیح علم ہونا ضروری ہے؟

فیڈرس۔ بے شک ضروری ہے۔

سقراط۔ اگر وہ کسی شے کی حقیقت سے ناواقف ہو تو وہ یہ کیوں کر معلوم کر سکتا ہے کہ دوسری اشیا اس سے کم شابہت رکھتی ہیں یا زیادہ جس سے وہ ہمارے مفروضے کے مطابق ناواقف ہے؟

فیڈرس نہیں معلوم کر سکتا۔

سقراط۔ اور جب لوگ دھوکا کھاتے ہیں اور ان کے تصورات حقائق کے خلاف ہوں تو ظاہر ہے کہ غلطی تشابہات کی وجہ سے واقع ہوتی ہے؟

فیڈرس۔ ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔

سقراط ۔ لہٰذا جو شخص اس فن میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہو اس کے لیے ضروری ہو کہ ہر شے کی حقیقی ماہیت کو سمجھتا ہو، ورنہ نہ تو اسے یہ معلوم ہوگا کہ حق سے باطل کی طرف بتدریج کیوں کر قدم بڑھانا چاہیے جو تشابہات کے ذریعے سے عمل میں آتا ہو اور نہ یہ معلوم ہوگا کہ اس سے کیونکر بچنا چاہیے؟

فیڈرس ۔ واقعی اسے نہیں معلوم ہوگا۔

سقراط ۔ پس جو شخص حقیقت سے ناواقف ہو اور محض ظاہری چیزوں کو دیکھتا ہو اس کا فن خطابت بس ایسا ہی ہوگا کہ سننے کے قابل ہو اور سرے سے فن ہی نہ کہا جا سکے؟

فیڈرس ۔ اور کیا ہی توقع کی جا سکتی ہو۔

سقراط ۔ تو کیا اب میں یہ تجویز پیش کروں کہ ہم نے خطابت کا جو تصور اپنے ذہن میں قائم کیا ہو اس کے مطابق لیسیاس کی تقریر میں جو تمہارے ہاتھ میں ہو اور خود میری تقریر میں فن کی خوبیاں اور خامیاں تلاش کی جائیں؟

فیڈرس ۔ اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی اور میرا واقعی یہ خیال ہو کہ ہماری پچھلی بحث کچھ بہت ہی نظری اور مجرد تھی اور اس میں مثالوں کی کمی تھی۔

سقراط ۔ ہاں یہ ٹھیک ہو اور یہ دونوں تقریریں اس بات کی بہت عمدہ مثال ہیں کہ کس طرح ایک مقرر جو حقیقت سے واقف ہو بغیر کسی خاص کوشش کے سننے والوں کے دلوں کو موہ لیتا ہو ۔ اس خوش نصیبی کو میں مقامی دیوتاؤں سے منسوب کرتا ہوں اور ممکن ہو کہ فنونِ لطیفہ کی دیویوں کے ان قاصدوں نے جو ادھر بیٹھے گا رہے ہیں مجھے اپنا فیضان پہنچایا ہو اس لیے کہ میں نہیں سمجھتا کہ خود مجھ میں خطابت کا ذرا بھی مادہ ہو۔

فیڈرس ۔ میں یہ مانے لیتا ہوں بشرطیکہ تم اپنی گفتگو جاری رکھو۔

سقراط۔ ذرا تم لیسیاس کی تقریر کے ابتدائی الفاظ تو مجھے پڑھ کر سناؤ۔

فیڈرس۔ تمھیں میرا حال معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس معاملے کی بہترین صورت جس میں ہم دونوں کا بھلا ہو، کیا ہو سکتی ہے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ مجھے اس وجہ سے اپنے مقصد میں ناکامیابی نہیں ہونی چاہیے کہ میں تمھارا عاشق نہیں ہوں اس لیے کہ عاشق تو ——

سقراط۔ بس:۔ اب میں بتاؤں کہ ان الفاظ میں خطابت کی کیا غلطی ہے؟

فیڈرس۔ ہاں بتاؤ۔

سقراط۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بعض باتوں میں ہم متفق ہوتے ہیں اور بعض میں اختلاف رکھتے ہیں؟

فیڈرس۔ غالباً میں تمھارا مطلب سمجھتا ہوں۔ مگر اسے اور واضح کر دو تو اچھا ہے۔

سقراط۔ جب کوئی شخص لوہے یا چاندی کا ذکر کرتا ہے تو سب کے ذہن میں ایک ہی چیز ہوتی ہے۔ ہے کہ نہیں؟

فیڈرس۔ یقیناً۔

سقراط۔ لیکن جب کوئی انصاف اور نیکی کا ذکر کرتا ہے تو ہم میں پھوٹ پڑجاتی ہے اور ہم ایک دوسرے سے اور خود اپنے آپ سے اختلاف کرنے لگتے ہیں؟

فیڈرس۔ بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط۔ پس بعض چیزوں میں ہم متفق ہوتے ہیں مگر بعض میں نہیں ہوتے؟

فیڈرس۔ یہ سچ ہے۔

سقراط۔ کن چیزوں میں دھوکا کھانے کا زیادہ احتمال ہے اور خطابت کا زیادہ اثر پڑ سکتا ہے؟

فیڈرس۔ ظاہر ہے اس قسم کی چیزوں میں جو غیر یقینی ہوں۔

سقراط۔ پس خطیبوں کو چاہیے کہ وہ اشیا کی باقاعدہ تقسیم کریں اور دونوں قسموں کا صحیح تصور قائم کریں۔ اس کا بھی جس میں عام لوگ غلطی کرتے ہیں اور اس کا بھی جس میں وہ غلطی نہیں کرتے؟

فیڈرس۔ جو شخص یہ تفریق کرے اس کے پاس ایک نہایت عمدہ اصول ہو گا۔

سقراط۔ ہاں۔ اور اس کے علاوہ اسے تقریر کرتے وقت جزئیات کے مشاہدے میں دقت نظر سے کام لینا چاہیے اور اس معاملے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے کہ کون سی چیز کس ذیل میں شمار کی جائے۔

فیڈرس بے شک۔

سقراط۔ اچھا تو عشق کس ذیل میں آتا ہے —— ان چیزوں میں جن کے بارے میں اختلاف ہے یا ان میں جن کے بارے میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں؟

فیڈرس۔ ظاہر ہے ان چیزوں میں جن کے بارے میں اختلاف ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا تمہارے خیال میں عشق تمہیں اس کی اجازت دیتا کہ تم یہ بھی کہو کہ وہ عاشق و معشوق دونوں کے لیے برا ہے اور یہ بھی کہ وہ دنیا میں سب سے اچھی چیز ہے؟

سقراط۔ بہت خوب۔ مگر مہربانی کر کے مجھے یہ بتاؤ کہ میں نے اپنی تقریر کے شروع میں عشق کی کوئی تعریف بیان کی تھی یا نہیں کیونکہ مجھ پر تو اس وقت ایک وجد کا عالم طاری تھا اس لیے مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔

فیڈرس۔ ہاں ہاں کی تھی، مجھے خوب یاد ہے۔

سقراط۔ تو میں دیکھتا ہوں کہ اچیلوس کی جل پریاں اور ہرمیس کا بیٹا پین جن کے فیضان سے میں بول رہا تھا خطابت میں کفالس کے بیٹے لیسیاس سے کہیں بہتر تھے۔ افسوس وہ ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ مگر شاید میں غلطی کر رہا ہوں اور لیسیاس نے اپنی تقریر کے شروع میں اس پر زور دیا تھا کہ

ہم عشق کو فلاں چیز سمجھیں جو وہ خود سمجھتا ہی اور اسی نمونے کے مطابق بقیہ تقریر کی تھی۔ ذرا اس کی تقریر کا ابتدائی حصہ پھر پڑھنا۔

فیڈرس۔ جیسی تمھاری مرضی۔ مگر جو چیز تم چاہتے ہو وہ اس میں نہیں ملنے کی۔

سقراط۔ تم پڑھ تو دو تاکہ مجھے اس کے صحیح الفاظ معلوم ہو جائیں۔

فیڈرس۔ تمھیں میرا حال معلوم ہی اور یہ بھی معلوم ہی کہ اس معاملے کی بہترین صورت جس میں ہم دونوں کا بھلا ہو، کیا ہو سکتی ہی۔ میرا دعویٰ ہی کہ مجھے اس وجہ سے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہونی چاہیے کہ میں تمھارا عاشق نہیں ہوں اس لیے کہ عاشق تو جب ان کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہی ان خدمتوں پر جو انھوں نے محبوب کی کی ہیں، پچھتاتے ہیں۔

سقراط۔ یہاں اس نے اس کے بالکل برعکس کیا ہی جو اسے کرنا چاہیے تھا اس لیے کہ اس نے خاتمے سے ابتدا کی ہی اور دریا کے دھارے میں بیٹھ کے بل پیرتا ہوا اس مقام کی طرف آرہا ہی جہاں سے روانہ ہونا چاہیے تھا۔ حسین نوجوان سے اس کا خطاب اس جگہ سے شروع ہوتا ہی جس جگہ عاشق اپنی تقریر ختم کرتا ہی کیا میں غلط کہہ رہا ہوں پیارے فیڈرس؟

فیڈرس۔ واقعی سقراط اس نے خاتمے سے شروع کیا ہی۔

سقراط۔ اب رہے دوسرے مضامین ——— کیا وہ یونہی اٹکل پچو بکھیر نہیں دیے گئے؟ کیا ان کی ترتیب میں کوئی اصول ہی؟ دوسرا مضمون دوسرے نمبر پر یا کسی اور نمبر کا مضمون اس نمبر پر کیوں ہی؟ میں تو اپنی جہالت سے یہ خیال کرنے پر مجبور ہوں کہ اس نے بے دھڑک جو کچھ سمجھ میں آیا لکھ ڈالا۔ لیکن غالباً تم اس بات کو تسلیم کرو گے کہ کسی تقریر کے اجزا میں خطابت کے اصول کے مطابق ایک لازمی ترتیب ہوتی ہی۔

فیڈرس ۔ یہ محض تمھارا حسن ظن ہی۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں انشا کے اصول سے اس قدر واقفیت رکھتا ہوں ۔

سقراط ۔ بہر حال یہ تو تم مانو گے کہ ہر خطبہ ایک زندہ چیز ہوتی چاہیے جس کا دھڑ ہو، سر ہو، پیر ہوں، یعنی وسطی حصہ، ابتدائی حصہ اور خاتمہ، جو ایک دوسرے کے ساتھ اور کل کے ساتھ اچھی طرح کھپ جائیں ؟

فیڈرس ۔ بے شک ۔

سقراط ۔ کیا لیسیاس کے خطبے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہی کہ اس میں یہ بات موجود ہی؟ ذرا غور کرو تو تم اس کے الفاظ کو اس کتبے سے کم بے ربط نہ پاؤ گے جو بقول بعض لوگوں کے میڈیاس فریجی کی قبر پر کندہ کیا گیا تھا۔

فیڈرس ۔ کیوں اس کتبے میں کیا خاص بات ہی ؟

سقراط ۔ وہ کتبہ یہ ہی:-

"میں کانسے کی دوشیزہ ہوں اور میڈاس کی قبر پر
پڑی ہوں ۔ جب تک پانی بہتا رہے گا اور اونچے درخت
اُگتے رہیں گے اس حسرت ناک قبر سے بیٹھی میں
رہگیروں کو جتاتی رہوں گی کہ اس کے نیچے میڈاس
سو رہا ہی"۔

ان اشعار میں تم یہ دیکھو گے کہ کسی مصرع کو آگے پیچھے کر دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

فیڈرس ۔ تم تو ہمارے خطبے کی ہنسی اڑا رہے ہو ۔

سقراط ۔ اچھا میں تمھارے دوست کے خطبے کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا کہ کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ اگرچہ اس میں ان عیوب کی اور بہت سی مثالیں

ں سکتی ہیں جن سے انسان کو بچنا چاہیے۔ اب میں دوسری تقریر کو لیتا ہوں۔ وہ بھی میرے خیال میں خطابت سیکھنے والوں کے لیے بہت سبق آموز ہے۔

فیڈرس۔ وہ کیسے؟

سقراط۔ تمہیں یاد ہوگا کہ یہ تقریریں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں ایک میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ عاشق کو اور دوسری میں یہ کہ غیر عاشق کو قبول کرنا چاہیے۔

فیڈرس۔ بے شک اور بڑی مردانگی سے کوشش کی گئی تھی۔

سقراط۔ یوں کہو کہ دیوانگی سے اور ان کا موضوع بھی دیوانگی ہی تھی اس لیے کہ جیسا میں نے کہا تھا عشق ایک قسم کا جذب یا دیوانگی ہے۔

فیڈرس۔ ٹھیک ہے۔

سقراط۔ اور جذب یا دیوانگی کی میں نے دو قسمیں قرار دی تھیں ایک وہ جو انسانی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری ایک ملکوتی چیز ہے یعنی روح کی رہائی رسم و رواج کی قید سے۔

فیڈرس۔ بے شک۔

سقراط۔ ملکوتی جذب کی چار قسمیں کی گئی تھیں کاہنانہ، عارفانہ، شاعرانہ اور عاشقانہ جو چار دیوتاؤں سے منسوب ہیں۔ پہلا اپالو کا فیضان ہے۔ دوسرا ڈایونیس کا۔ تیسرا فنونِ لطیفہ کی دیویوں کا اور چوتھا افروڈائٹ اور ایروس کا۔ جذب کی آخری قسم کو جو سب سے بہتر قرار دی گئی تھی، بیان کرتے ہوئے ہم نے عشق کے جذبے کو ایک استعارے کے ذریعے سے ظاہر کیا تھا اور اس میں ایک دیومالا کی ایک کہانی سے کام لیا تھا جو خاصی قرینِ قیاس ہے اور ممکن ہے کہ سچی ہو اگرچہ اس کا ایک حصہ غلط ہے۔ یہ صرف کہانی ہی نہیں بلکہ ایک بھجن بھی تھا عشق کے دیوتا کی

شان میں جو میرا اور تمھارا دونوں کا مالک ہی فیڈرس، اور حسین بچوں کا والی ہے ہم نے یہ بھجن نہایت سنجیدہ لہجے میں باقاعدہ لے کے ساتھ سنایا تھا۔

فیڈرس۔ اور میں نے تمھارے الفاظ نہایت مسرت کے ساتھ سنے تھے۔

سقراط۔ اس مثال کو لے کر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کس طرح مذمت سے تعریف کی طرف رجوع کیا گیا۔

فیڈرس۔ اس سے تمھارا کیا مطلب ہی؟

سقراط۔ میرا مطلب یہ ہی کہ اگرچہ وہ تقریر زیادہ تر مزاحیہ تھی لیکن اس خوش وقتی میں دو ایسے اصول مدنظر رکھے گئے کہ اگر اہلِ فن انھیں زیادہ وضاحت سے بیان کر سکیں تو ہمیں بڑی خوشی ہو۔

فیڈرس۔ کون سے اصول؟

سقراط۔ ایک تو منتشر جزئیات کو ایک کلی تصور کے تحت میں لانا جس طرح ہم نے اپنی عشق کی تعریف میں کیا تھا وہ صحیح ہو یا غلط مگر اس نے تقریر میں وضاحت اور یک رنگی ضرور پیدا کر دی تھی ـــــــ اسی طرح مقرر کو چاہیے کہ اپنے تصورات کی تعریف کر کے اپنے مطلب کو واضح کر دے۔

فیڈرس۔ اور دوسرا اصول کیا ہی سقراط!

سقراط۔ دوسرا اصول یہ ہی کہ ایک کُل کو جزئیات میں اس کی قدرتی ساخت کے مطابق تقسیم کیا جائے اُس جگہ سے جہاں جوڑ ہی۔ یہ نہیں کہ ایک بدسلیقہ کاٹنے والے کی طرح ریکتے ہوئے گوشت کے سلم پارچے کاٹتے وقت اکسی حصے کو توڑ کر خراب کر دیا جائے۔ مثلاً ہم نے اپنی دونوں تقریروں میں پہلے بے عقلی (یعنی جذبۂ عشق) کا ایک ہی پیکر فرض کیا۔ پھر جس طرح ہر جسم ایک سے دو ہو جاتا ہی اور داہنے اور بائیں حصے میں تقسیم کیا جا سکتا ہی جن میں ایک ہی نام کے داہنے اور

بائیں اعضا موجود ہیں ——— اسی طریقے سے مقرر نے اس پیکر کے بائیں حصے کی تقسیم شروع کی۔ یہاں تک کہ اس نے بائیں ہاتھ والے یا برے عشق کو ڈھونڈ نکالا اور بجا طور پر اس کی مذمت کی۔ دوسری تقریر میں اس نے داہنی طرف کے جذب کا ذکر کرتے ہوئے عشق کی ایک اور قسم دریافت کی۔ اس کا نام تو وہی عشق ہے مگر یہ ایک ملکوتی شے ہے اسے مقرر نے بے حد تعریف کے ساتھ نمونے کے طور پر ہمارے سامنے پیش کیا اور اس کے بڑے بڑے فوائد بتائے۔

فیڈرس۔ بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط۔ مجھے خود بھی تقسیم اور تعمیم کے یہ عمل بہت پسند ہیں ان سے مجھے تقریر کرنے اور سوچنے میں مدد ملتی ہے اور اگر مجھے کوئی ایسا شخص مل جائے جو عالم طبیعی میں "وحدت و کثرت" کا مشاہدہ کر سکتا ہے تو میں "اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں اور اُسے دیوتا سمجھ کر اس کے پیچھے چلتا ہوں"۔ اور جو لوگ یہ فن جانتے ہیں ان کے لیے میں اب تک متکلمین کا لفظ استعمال کرتا رہا ہوں۔ مگر خدا جانے یہ لفظ مناسب ہے یا نہیں میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اپنے یا لیسیاس کے پیرووں کے لیے کیا نام تجویز کرو گے؟ اور یہ کہ کہیں یہی تو وہ مشہور فن خطابت نہیں جس سے تھریسیماکس وغیرہ کام لیتے ہیں اور وہ جو دوسروں کو سکھاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ وہ عمدہ مقرر ہیں اور ہر اس شخص کو اپنا ہنر سکھاتے ہیں جو انھیں بادشاہوں کی طرح سمجھے اور ان کے آگے نذریں پیش کرے۔

فیڈرس۔ ہاں واقعی یہ لوگ شاہانہ مزاج رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا فن اُن لوگوں کے فن سے مختلف ہے جنھیں تم نے میرے خیال میں، بجا طور پر متکلمین کہا ہے:۔ اس کا پتا ہمیں اب تک نہیں چلا کہ فن خطابت کیا ہے؟

سقراط۔ یہ تم کیسے کہتے ہو؟ اس فن کا بقیہ حصہ، اگر واقعی کوئی ایسی چیز

باقی ہی جو اصولِ فن کے تحت میں لائی جاسکتی ہی، عجیب و غریب چیز ہوگی اور کم سے کم تمھارے اور میرے لیے بہت قابلِ قدر ہوگی۔ مگر معلوم تو ہو کہ باقی کیا رہا؟

فیڈرس۔ فن خطابت کی کتابوں میں یقیناً بہت کچھ ہوگا؟

سقراط۔ ہاں ٹھیک ہی تم نے اچھا یاد دلایا:- جہاں تک مجھے یاد ہی ایک تو تمہید ہوتی ہی جس میں یہ دکھایا جاتا ہی کہ تقریر کیونکر شروع کی جائے۔ تمھاری مراد انھی فن کی باریکیوں سے ہی نہ؟

فیڈرس۔ ہاں۔

سقراط۔ اس کے بعد واقعات کی روداد اور پھر شواہد، تیسرے نمبر پر دلائل اور چوتھے نمبر پر احتمالات، اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ہمارے جید بازنطینی واضعِ اصطلاحات نے تصدیق اور تصدیقِ مزید کا بھی ذکر کیا ہی۔

فیڈرس۔ تمھارا اشارہ باکمال تھیوڈورس کی طرف ہی؟

سقراط۔ ہاں اور پھر وہ یہ بتاتا ہی کہ تردید اور تردیدِ مزید کیونکر کرنی چاہیے، خواہ الزامی ہو یا جوابی۔ اسی سلسلے میں مجھے مشہور و معروف ایونیس پاریائی کا بھی ذکر کرنا چاہیے جس نے سب سے پہلے در پردہ تعریض اور بالواسطہ تعریف کی ایجاد کی۔ وہی بالواسطہ ملاقات کا بھی موجد تھا جس کے اصول اس نے بقول بعض لوگوں کے نظم کر دیے تھے تاکہ آسانی سے یاد ہو سکیں، اور مجھے ٹیسیاس اور گورگیاس کو بھی طاقِ نسیاں پر نہ دھر دینا چاہیے جو یہ جانتے ہیں کہ ظن حق سے افضل ہی اور اپنی دلیل کے زور سے چھوٹے کو بڑا اور بڑے کو چھوٹا کر دکھاتے ہیں، پرانی چیزوں کو نئی اور نئی کو پرانی کے بھیس میں دکھاتے ہیں اور جنھوں نے ہر بات کی دو صورتیں نکالی ہیں ایک حد سے زیادہ مختصر اور دوسری حد سے زیادہ طویل۔ مجھے یاد ہی کہ جب میں نے پروڈیکس سے اس کا

ذکر کیا تو اس نے ہنس کر کہا کہ میں نے تو فن خطابت کا صحیح اصول معلوم کر لیا ہے کہ کلام کو نہ مختصر کیا جائے اور نہ بہت طول دیا جائے بلکہ مناسب حد کے اندر رکھا جائے۔

فیڈرس۔ شاباش پروڈیکس۔

سقراط۔ اس کے علاوہ نووارد ہیپیاس ایلیائی ہے اور غالباً وہ بھی اس خیال سے متفق ہے۔

فیڈرس۔ ہاں۔

پھر پولس ہے جو حکیمانہ اقوال اور اشباہ کے خزانوں کا مالک ہے اور ان کے سلسلے میں وہ نام سکھاتا ہے جو اس نے لیسمنس سے سیکھے تھے تاکہ آئینۂ کلام پر صیقل کا کام دیں۔

فیڈرس۔ پروٹاگورس کے ہاں بھی تو اس قسم کی کوئی چیز ہے؟

سقراط۔ ہاں صحیح انتخاب الفاظ کے قاعدے اور بہت سی اور ہدایتیں کسی "غریب بوڑھے کا دکھ درد" یا کوئی اور رقت کا مضمون بیان کرنے میں کوئی اس زبردست چیلسیڈونی خطیب سے سبقت نہیں لے جا سکتا۔ وہ اپنے کلام کے جادو سے پورے مجمع کے جذبات کو جب چاہتا ہے بھڑکا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے دھیما کر دیتا ہے اور اسے اس میں کمال ہے کہ ہر طرح کی تہمت گھڑ لیتا ہے اور دوسروں کی لگائی ہوئی تہمتوں کو رد کر دیتا ہے خواہ ان کی کوئی بنیاد ہو یا نہ ہو۔ یہ سب لوگ اس پر متفق ہیں کہ تقریر کا خاتمہ اعادہ پر ہونا چاہیے تاکہ وہ سننے والوں کے ذہن میں تازہ ہو جائیں۔

فیڈرس۔ تمھارا مطلب یہ ہے کہ دلائل کو اختصار کے ساتھ دہرانا چاہیے تاکہ وہ سننے والوں کے ذہن میں تازہ ہو جائیں۔

سقراط۔ مجھے فن خطابت کے متعلق جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ کیا تمھیں

اس پر کچھ اضافہ کرتا ہے۔

فیڈرس۔ کچھ یوں ہی سا۔ مگر وہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

سقراط۔ خیر غیر اہم باتوں کو چھوڑ دو ہمیں تو اس مسئلے پر روشنی ڈالنا ہے جو حقیقت میں اہمیت رکھتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ فن خطابت کیا اثر ڈالتا ہے؟ اور کب ڈالتا ہے؟

فیڈرس۔ عام جلسوں میں اس کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔

سقراط۔ بے شک پڑتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں خطیبوں کے متعلق تمہارا بھی وہی خیال ہے یا نہیں جو میرا ہے؟ مجھے تو ان کی بنائی ہوئی عمارت میں بہت سے رخنے نظر آتے ہیں۔

فیڈرس۔ کوئی مثال تو دو۔

سقراط۔ ہاں دیتا ہوں۔ فرض کرو کوئی شخص تمہارے دوست اریکسماکس یا اس کے والد کیومینس کے پاس آئے اور کہے: "میں ان دواؤں کا استعمال جانتا ہوں جن کا اثر ٹھنڈا یا گرم ہوتا ہے اور قے اور اسہال وغیرہ کی دوائیں بھی دے سکتا ہوں۔ اس علم کی بنا پر میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں طبیب ہوں اور دوسروں کو یہ باتیں سکھا کر طبیب بنا سکتا ہوں ——— تمہارے خیال میں یہ سن کر وہ کیا کہیں گے؟

فیڈرس۔ یقیناً وہ اس سے یہ پوچھیں گے کہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ دوائیں کس کو اور کب اور کتنی دینی چاہییں؟"

سقراط۔ فرض کرو وہ یہ جواب دے: "یہ سب باتیں مجھے معلوم نہیں۔ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ جو مریض مجھ سے مشورہ کرتا ہے وہ یہ سب باتیں خود ہی کرے گا۔"

فیڈرس۔ وہ اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ وہ شخص یا تو مجنون ہے یا بر خود غلط جو محض اس برتے پر اپنے آپ کو طبیب سمجھتا ہے کہ اس نے کسی کتاب میں کچھ

پڑھ لیا ہے یا کہیں سے دو ایک نسخے پا گیا ہے. گو اسے طب کے فن میں مطلق دخل نہیں۔

سقراط۔ اور فرض کرو کہ ایک شخص سوفوکلیس یا یوری پڈیس کے پاس آکر یہ کہے کہ وہ ایک چھوٹی سی بات کو بڑھا کر اور بڑی بات کو مختصر کر کے بیان کر سکتا ہے، اور اس کے علاوہ رقت خیز، دہشت انگیز، تہدید آمیز غرض ہر قسم کی تقریر کر سکتا ہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے کر یہ سمجھتا ہے کہ المیہ نگاری کا فن سکھا رہا ہے۔

فیڈرس۔ یقیناً وہ بھی اس پر ہنسیں گے اگر اسے یہ خبر نہیں کہ المیہ نگاری حقیقت میں ان اجزا کو اس طرح ترتیب دینے کا نام ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اور کل سے مناسبت رکھتے ہوں۔

سقراط۔ مگر میرے خیال میں وہ یہ نہیں کریں گے کہ اسے جھڑک دیں یا بُرا بھلا کہیں، بلکہ اس کے ساتھ اس طرح پیش آئیں گے جیسے ایک موسیقی داں اس شخص کے ساتھ پیش آتا ہے جو صرف اتنی سی بات پر اپنے آپ کو فن نغمہ کا ماہر سمجھتا ہے کہ وہ سارے پنچم اور مدھم سُر نکال سکتا ہے۔ اگر ایسے شخص سے سابقہ پڑے تو وہ جھلا کر اس سے یہ نہیں کہیں گے "اے احمق تو پاگل ہو گیا ہے"؛ بلکہ اس طریقے سے جو ایک موسیقی داں کے شایانِ شان ہے نرم اور سریلی آواز میں جواب دیں گے "میرے پیارے دوست جو شخص فن نغمہ کا ماہر بننا چاہتا ہے اسے یقیناً یہ باتیں جاننی چاہئیں لیکن اگر اس کا علم اس حد سے آگے نہیں بڑھا تو در حقیقت اسے فن نغمہ میں کچھ بھی دخل نہیں تم تو صرف فن نغمہ کی تمہید سے واقف ہو نہ کہ خود فن سے"!

فیڈرس۔ بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط۔ اسی طرح سفوکلیس المیہ نگاری کے مدعی کے کرتب دیکھ کر یہ کہے گا کہ یہ المیہ نہیں بلکہ محض اس کی تمہید ہے اور اکیومینس طبابت کے مدعی سے یہی بات کہے گا۔ ہے کہ نہیں؟

فیڈرس۔ ضرور کہے گا۔

سقراط۔ اگر شیریں بیان ایڈراسٹس یا پیری کلیس ان عجیب وغریب علوم علم الایجاز اور علم الاشباہ وغیرہ کا ذکر اور وہ سب موٹے موٹے نام جو ہم نے ابھی بتائے ہیں سنیں تو وہ کیا کہیں گے۔ بجائے اس کے کہ انھیں غصہ آجائے اور میری اور تمھاری طرح ان مفروضہ علوم کے گھڑنے والوں کو سخت سست کہیں ان کی برتر حکمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ انھیں یا ہمیں دونوں کو ملامت کریں۔ وہ کہیں گے "ایک ذرا صبر کرو فیڈرس اور سقراط تھیں ان لوگوں پر اس قدر غصہ نہیں آنا چاہیے جو علم کلام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے خطابت کی ماہیت کا تعین نہیں کر سکتے اس لیے اس کی تمہید ہی کو اصل فن سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں کو سکھا کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے خطابت کا فن سکھا دیا۔ اب رہا اس فن کے مختلف آلات سے اچھی طرح کام لینا یا تقریر و تحریر کو مربوط اور مکمل شکل میں پیش کرنا ــــــ اس قسم کے عملی مسائل کو وہ ایک آسان چیز سمجھتے ہیں جنھیں اُن کے شاگرد خود ہی حل کرلیں گے"۔

فیڈرس۔ میں یہ مانتا ہوں سقراط کہ وہ فن خطابت جس کی یہ لوگ تعلیم دیتے ہیں اور جس کے متعلق وہ کتاب لکھتے ہیں ایسا ہی ہے جیسا تم نے بیان کیا ــــ ــــ اس میں مجھے تم سے اتفاق ہے مگر اب بھی میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ حقیقی خطابت اور ترغیب کا فن کہاں اور کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟

سقراط۔ وہ کمال جو ایک منجھے ہوئے مقرر میں ہونا چاہیے دوسرے کمالات کی طرح کچھ تو خداداد ہوتا ہے اور کچھ فن بھی اس کی نشو و نما میں مدد دیتا ہے۔ اگر کسی میں فطری طور پر قوت بیان موجود ہے اور پھر اس میں علم اور مشق بھی شامل ہو جائے تو وہ اعلیٰ درجے کا مقرر بن جائے گا لیکن اگر اس میں ان میں سے کسی چیز کی کمی ہو تو وہ اس حد تک ناقص رہ جائے گا۔ البتہ خطابت کے فن کی جہاں تک کہ وہ واقعی ایک

فن ہے وہ راہ نہیں ہے جو لیسیاس یا تھریسی ماکس کی ہے۔

فیڈرس۔ تو پھر کس کی راہ ہے؟

سقراط۔ میرے خیال میں تو پیری کلیس سب سے بڑا مقرر تھا۔

فیڈرس۔ اچھا پھر؟

سقراط۔ ہر بڑے فن کے لیے حقائق فطرت پر بحث اور غور و فکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اسی سے خیال میں بلندی اور عمل میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور یہ میرے خیال میں وہ صفت ہے جو پیری کلیس نے اپنی فطری صفات کے علاوہ انیکساگورس کی صحبت میں حاصل کی تھی جس سے اس کی شناسائی تھی۔ اس طرح اعلیٰ فلسفے کے خیالات اس کے دل و دماغ میں بس گئے تھے اور اس نے مثبت اور منفی ذہن کا علم جو انیکساگورس کا پسندیدہ موضوع حاصل کیا تھا اور جو باتیں اس کے مطلب کی تھیں اُن سے فن تقریر میں کام لیتا تھا۔

فیڈرس۔ ذرا وضاحت سے سمجھاؤ۔

سقراط۔ بات یہ ہے کہ خطابت بھی طب کی طرح ہے۔

فیڈرس۔ وہ کیسے؟

سقراط۔ بھئی یہ تو بالکل صاف بات ہے۔ طب کو جسم کی ماہیت کا تعین کرنا پڑتا ہے اور خطابت کو روح کی ماہیت کا ——— اگر ہم تجربی حیثیت سے نہیں بلکہ علمی حیثیت سے جسم کو دوا اور غذا کے ذریعے صحت اور قوت بخشنا چاہتے ہیں اور روح میں الفاظ کے صحیح استعمال اور تربیت کے لیے صحیح طریقے سے وہ عقیدہ یا وصف پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ہمیں مطلوب ہے۔

فیڈرس۔ کچھ تعجب نہیں سقراط کہ تمھاری یہ بات صحیح ہو۔

سقراط۔ اور کیا تمھارے خیال میں ہم حقیقتِ روح کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں

جب تک یہ نہ جانتے ہوں کہ روح من حیث الکل کیا ہے؟

فیڈرس۔ بقراط اسکلیپی تو کہتا ہے کہ خود جسم کی حقیقت بھی من حیث الکل ہی سمجھی جا سکتی ہے۔

سقراط۔ ہاں میرے دوست اور وہ بالکل صحیح کہتا ہے:۔ پھر بھی ہمیں صرف بقراط کے نام کو کافی نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ خود غور کرنا چاہیے کہ آیا اس کا قول اس کے تصورِ حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟

فیڈرس۔ مجھے تم سے اتفاق ہے۔

سقراط۔ تو پھر آؤ اس پر غور کریں کہ روح کی حقیقت یا مطلق حقیقت کے متعلق بقراط حق کا ہم زبان ہو کر کیا کہتا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جس چیز کو ہم سیکھنا یا سکھانا چاہتے ہیں وہ بسیط ہے اور ایک ہی صورت رکھتی ہے یا متعدد صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر ایک ہی صورت رکھتی ہے تو اس میں دوسری اشیا پر اثر ڈالنے اور ان سے متاثر ہونے کی کیا قوت ہے، اور اگر متعدد صورتیں رکھتی ہے تو یہ صورتیں کون کون سی ہیں؟ پھر ہمیں ان سب صورتوں پر ایک ایک کر کے نظر ڈالنی ہے کہ ان میں تاثیر و تاثر کی وہ کونسی قوت ہے جو انھیں مخصوص اور ممتاز کرتی ہے؟

فیڈرس۔ شاید ایسا ہی ہو سقراط۔

سقراط۔ جو طریقۂ تحلیل سے کام نہ لے وہ اندھے کی طرح ٹٹولتا پھرتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ایک فن کار کو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اسے اندھے یا بہرے سے تشبیہ دی جا سکے۔ فنِ خطابت کا ماہر جو اپنے شاگرد کو باقاعدہ تقریر کرنا سکھاتا ہے خاص طور پر اس چیز کی حقیقت کو تفصیل سے بیان کرتا ہے جو اس کی تقریر دل کی مخاطب ہے اور وہ میرے خیال میں روح ہے۔

فیڈرس ۔ یقیناً ۔

سقراط ۔ اس کی ساری کوشش کا مرکز روح ہوتی ہے اس لیے کہ اس کے اندر وہ کسی بات کا یقین پیدا کرنا چاہتا ہے ۔

فیڈرس ۔ ہاں ۔

سقراط ۔ تو پھر ظاہر ہے کہ تھریسی ماکس یا کوئی اور شخص جو سچ مچ خطابت کی تعلیم دینا چاہتا ہے روح کی فضیلت کو صحت کے ساتھ بیان کرے گا جس سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آیا وہ واحد اور بسیط ہے یا جسم کی طرح متعدد صورتیں رکھتی ہے اسی کا نام روح کی حقیقت بتانا ہے ۔

فیڈرس ۔ بالکل ٹھیک ہے ۔

سقراط ۔ پھر وہ اس کے فعل و انفعال کے طریقے کو سمجھائے گا ۔

فیڈرس ۔ ٹھیک ہے ۔

سقراط ۔ اس کے بعد وہ اشخاص اور تقریروں کی قسمیں اور ان کی خصوصیات بیان کرے گا، ان میں مناسب ربط و ترتیب پیدا کرے گا، اپنی ترتیب کی وجوہ سمجھائے گا اور یہ بتائے گا کہ کیونکر ایک خاص قسم کی روح ایک خاص قسم کی دلیل سے متاثر ہوتی ہے اور دوسری نہیں ہوتی ۔

فیڈرس ۔ تم نے تو بڑا اچھا طریقہ نکالا ۔

سقراط ۔ ہاں یہی سچا اور واحد طریقہ ہے کسی موضوع پر اصول فن کے مطابق بحث کرنے کا خواہ تقریر میں ہو یا تحریر میں ۔ لیکن آج کل کے لکھنے والے جن کے آگے تم نے زانوے ادب تہ کیا ہے چالاکی سے روح کی حقیقت کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ اسے اچھی طرح جانتے ہیں اور جب تک وہ ہمارا لکھنے پڑھنے کا طرز نہ اختیار کرلیں ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ اصول فن کے مطابق لکھتے ہیں ۔

فیڈرس۔ ہمارا طرز کیا ہی؟

سقراط۔ میں صحت کے ساتھ پوری تفصیلات تو نہیں بیان کر سکتا لیکن جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا فن کے مطابق لکھنے کے عام اصول تمھیں بتا دوں گا۔

فیڈرس۔ بتاؤ۔

سقراط۔ خطابت روح کو موہ لینے کا فن ہی، اس لیے جو شخص خطیب بننا چاہتا ہی اسے انسانی روحوں کے باہمی اختلافات سے واقف ہونا چاہیے ———— کہ وہ اتنے ہیں اور اس قسم کے ہیں اور انھی کی بنا پر انسان انسان میں فرق ہوتا ہی۔ اپنی تحلیل کو یہاں تک پہنچانے کے بعد وہ تقریر کو مختلف قسموں میں تقسیم کرے گا۔ وہ کہے گا "فلاں فلاں اشخاص پر فلاں قسم کی تقریر کا یہ اثر ہوتا ہی" اور پھر اس کی وجہ بھی بتائے گا۔ سیکھنے والے کے ذہن میں پہلے ان کا ایک معقول نظری تصور ہونا چاہیے اور پھر اسے عملی زندگی میں ان کا تجربہ حاصل کرنا چاہیے اور اس میں یہ قابلیت ہونی چاہیے کہ ہوش گوش سے ان اصول پر عمل کرے ورنہ محض اپنے استادوں کی لکیر کا فقیر بن کر رہ جائے گا۔ لیکن جب وہ یہ سمجھتا ہو کہ کون لوگ کن دلیلوں سے قائل ہوتے ہیں اور اس شخص کو جس کا مجرد تصور اس کے ذہن میں تھا سچ مچ اپنے سامنے دیکھ کر پہچان لے کہ یہ وہی ہی اور اپنے دل میں کہے "یہ اس قسم کا آدمی ہی یا اس قسم کی طبیعت رکھتا ہی جس کے لیے فلاں دلیل سے کام لینا چاہیے تاکہ وہ فلاں بات کا قائل ہو جائے"؛ جب وہ یہ سب کچھ جانتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ کب بولنا چاہیے اور کب خاموش رہنا چاہیے۔ اور کہاں پر مغز اقوال، درد انگیز التجا، ہیجان خیز اثرات اور تقریر کے دوسرے طریقوں سے جو اس نے سیکھے ہیں کام لینا چاہیے، غرض جب وہ ان سب چیزوں کا موقع اور محل جانتا ہو تبھی وہ اپنے فن کا کامل استاد کہا جا سکتا ہو لیکن اگر اس کی تحریر یا تقریر یا تعلیم میں ان

میں سے کسی ایک بات کی بھی کمی رہ جائے اور پھر بھی وہ یہ دعوے کرے کہ میں فن خطابت کے اصول کی پابندی کرتا ہوں تو وہ شخص حق بجانب ہوگا جو یہ کہے "مجھے تمھاری بات کا یقین نہیں" اچھا تو اب خطابت کا معلم ہم سے یہ پوچھے گا کہ" اے فیڈرس اور سقراط فن خطابت کی تعریف یہی ہے جو تم نے بیان کی یا میں کوئی اور تعریف تلاش کروں؟"

فیڈرس - اس کو اسی پر قناعت کرنی چاہیے سقراط' اس لیے کہ اور تو کوئی تعریف ہو ہی نہیں سکتی مگر یہ ضرور ہے کہ ایسے فن کا وجود میں لانا کوئی سہل کام نہیں۔

سقراط - بالکل ٹھیک ہے۔ اسی لیے ہمیں یہ چاہیے کہ اس معاملے پر ہر پہلو سے غور کر کے دیکھیں کہ آیا کوئی اس سے زیادہ قریب کی اور زیادہ آسان راہ نکل سکتی ہے یا نہیں۔ اگر کوئی سیدھا اور سہل راستہ مل جائے تو اتنی طول طویل سنگلاخ اور پُرپیچ راہ کے اختیار کرنے سے کیا فائدہ۔ زرا سوچو تو شاید تمھیں کوئی ایسی بات یاد آجائے جو تم نے لیسیاس یا کسی اور شخص سے سنی ہو اور اس سے ہمیں کچھ مدد مل سکے۔

فیڈرس - اگر سوچنے سے کچھ فائدہ ہوتا تو میں سوچتا بھی۔ مگر اس وقت تو کوئی بات خیال میں نہیں آتی۔

سقراط - تو میں تمھیں ایک بات بتاؤں جو ایک جاننے والے نے مجھے بتائی تھی؟

فیڈرس - ضرور۔

سقراط - مثل ہے کہ بھیڑیے کی بھی ضرور سُن لینی چاہیے۔

فیڈرس - جو کچھ اس کی طرف سے کہا جا سکتا ہے تم کہ ڈالو۔

سقراط - وہ کہے گا اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ ہم ان باتوں پر اس قدر

مقطع بن کر غور کریں یا ان کے بنیادی اصول معلوم کرنے کے لیے اتنے چکر کھائیں، اس لیے کہ جیسا میں نے پہلے کہا تھا۔ جب سوال عدل اور نیکی کا ہو یا ایسے اشخاص سے تعلق رکھتا ہو جو خلقتاً یا عادتاً عادل یا نیک ہیں تو ہوشیار خطیب کو حق سے کوئی بحث نہیں ——— کیونکہ عدالتوں میں سچ مچ لوگ حق کی مطلق پروا نہیں کرتے بلکہ اُنھیں صرف دوسروں کو قائل کرنے کی فکر رہتی ہے اور اس کا تعلق حق سے نہیں بلکہ قیاس سے ہے۔ چنانچہ ایک ہوشیار خطیب سارا زور اسی پر صرف کر دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض صورتوں میں سچے واقعات کو اگر وہ خلاف قیاس ہوں چھپانا چاہیے اور استغاثے یا صفائی میں صرف وہی باتیں پیش کرنی چاہییں جو قیاس کے مطابق ہوں۔ غرض مقرر کو اپنی تقریر میں ہمیشہ قیاس کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور حق کو خیر باد کہہ دینا چاہیے۔ سارا فن خطابت یہی ہے کہ اس اصول کو اول سے آخر تک مدنظر رکھا جائے۔

فیڈرس۔ واقعی خطابت کے استاد یہی بات کہتے ہیں سقراط۔ مجھے یاد ہے کہ ہم پہلے ہی اس مسئلے پر مختصر سی بحث کر چکے ہیں۔ ان حضرات کے لیے یہ امر انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔

سقراط۔ غالباً تم ٹیسیاس سے تو اچھی طرح واقف ہو گے۔ اس نے قیاس کی یہی تعریف کی ہے نہ کہ وہ خیال جو جمہور رکھتے ہیں؟

فیڈرس۔ بے شک یہی تعریف کی ہے۔

سقراط۔ میرے خیال میں وہ اس معاملے کو نہایت ہوشیاری اور سلیقے سے کچھ اس طرح پیش کرتا ہے:- وہ یہ فرض کرتا ہے کہ ایک کمزور اور بہادر آدمی نے ایک قوی اور بزدل شخص پر حملہ کر کے اس کا کوٹ یا کوئی اور چیز چھین لی ہے اور وہ عدالت میں لایا گیا ہے۔ اب ٹیسیاس یہ کہتا ہے کہ دونوں فریقوں کو جھوٹ بولنا چاہیے بزدل کو

یہ کہنا چاہیے کہ اس پر ایک سے زیادہ آدمیوں نے حملہ کیا تھا۔ دوسرے شخص کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ وہ دونوں اکیلے تھے اور اپنی صفائی میں یہ دلیل پیش کرنی چاہیے" بھلا مجھ جیسا کمزور آدمی اس جیسے مضبوط آدمی پر کیونکر حملہ کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ستنیٹ یہ پسند نہیں کرے گا کہ اپنی بزدلی کا اعتراف کرے، اس لیے وہ کوئی اور جھوٹ گھڑے گا اور پھر اس کے حریف کو اس کی تردید کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اسی قسم کی اور ترکیبیں ہیں جو اس طریقے میں شامل ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ فیڈرس؟

فیڈرس۔ بے شک۔

سقراط۔ بھئی واللہ کس قدر عجیب و غریب فن ہے جو ٹیسیاس نے یا کسی اور بزرگ نے خواہ وہ کسی نام یا کسی ملک کے ہوں، اختراع کیا ہے۔ ذرا ہم ان حضرات سے دو دو باتیں کریں؟

فیڈرس۔ آخر ہم ان سے کہیں گے کیا؟

سقراط۔ ہم انھیں یہ بتائیں گے کہ ان کے تشریف لانے سے پہلے ہم تم یہ کہہ رہے تھے کہ قیاس جس کا وہ ذکر فرما رہے ہیں جمہور کے ذہن میں حق سے مشابہ ہونے کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور ہم نے ابھی یہ دعوے کیا تھا کہ جو شخص حق کا علم رکھتا ہے وہ ہر حالت میں اچھی طرح جان لے گا کہ کون سی چیزیں حق کے مشابہ ہیں۔ اور اگر وہ فن خطابت کے متعلق کوئی اور بات کہنا چاہتا ہے تو ہم شوق سے سننے کو تیار ہیں۔ ورنہ پھر ہم اپنی ہی رائے سے مطمئن ہیں کہ جب تک کوئی شخص اپنے سامعین کی مختلف طبیعتوں کا اندازہ نہ کر سکے اور اشیا کو قسموں میں تقسیم کر کے مفرد تصورات کے تحت میں نہ لا سکے وہ انسانوں کے محدود دائرے میں بھی باکمال خطیب نہیں بن سکتا، اور اس کمال کے حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے

انسانوں کو خوش کرے بلکہ اس لیے کہ جہاں تک اس سے ممکن ہو وہ بات کہے جو خدا کو پسند ہو اور وہ طرز کلام اختیار کرے جو اس کی بارگاہ میں مقبول ہو۔ ہم سے زیادہ دانش مند لوگوں کا قول ہے کہ ایک سمجھدار آدمی کو اپنے جیسے بندوں کی خوشنودی کی کوشش نہیں کرنی چاہیے (کم سے کم اس کا مقصدِ اوّلین یہ نہ ہونا چاہیے) بلکہ اپنے پاک اور برتر آقاؤں کی خوشنودی کی۔ لہذا اگر راہ طویل اور پُرپیچ ہو تو اس پر تعجب نہ کرو کیونکہ ایک بڑے مقصد ہی کے لیے ہم دور تر راہ اختیار کرتے ہیں نہ کہ ان چھوٹے چھوٹے مقصدوں کے لیے جو تمہارے سامنے ہیں سچ تو یہ ہے ٹیسیاس اگر تم اس دور دراز منزل تک جانے کو تیار ہو کہ خطابت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

فیڈرس۔ میرے خیال میں سقراط یہ تو نہایت ہی عمدہ بات ہے بشرطیکہ قابلِ عمل بھی ہو۔

سقراط۔ لیکن ایک بلند و قابلِ قدر مقصد میں ناکام رہنا بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں۔

فیڈرس۔ سچ ہے۔

سقراط۔ اچھا تو اب ہم سچے اور جھوٹے فن تقریر کے متعلق تو کافی بحث کر چکے۔

فیڈرس۔ بے شک۔

سقراط۔ مگر ابھی تحریر کی اچھائی اور برائی کی بحث باقی ہے۔

فیڈرس۔ ہاں۔

سقراط۔ تم جانتے ہو کہ خطابت میں تقریر اور طرزِ ادا کا کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو خدا کو پسند ہو؟

فیڈرس۔ میں تو نہیں جانتا۔ کیا تم جانتے ہو؟

سقراط۔ میں نے ایک روایت سنی ہے جو اگلوں سے منسوب ہے۔ اب یہ

صحیح ہو یا غلط۔ یہ تو وہی جانیں۔ لیکن اگر یہ نکتہ ہم نے خود ہی دریافت کیا ہوتا تب بھی کیا تمھارے خیال میں اس کی پروا کرنی چاہیے تھی کہ لوگ اسے تسلیم کریں گے یا نہیں؟

فیڈرس تمھارا سوال جواب کا محتاج نہیں۔ مجھے یہ تو بتاؤ وہ بات کیا ہے جو تم کہتے ہو کہ تم نے دوسروں سے سنی ہے۔

سقراط۔ مصر کے قدیم شہر نوکراٹیس میں تھیوٹ نام ایک دیوتا تھا۔ وہ پرندہ جو ایبس کہلاتا ہے اسی کی نسبت سے قابلِ تعظیم سمجھا جاتا ہے۔ اس دیوتا نے بہت سے علم و فن ایجاد کیے تھے مثلاً حساب تخمین، ہندسہ، ہیئت، ڈرافٹ اور پانسے کے کھیل، مگر اس کی سب سے بڑی دریافت حروفِ تہجی کا استعمال تھا۔ ان دنوں تھامس دیوتا سارے مصر پر حکومت کرتا تھا اور وہ بالائی مصر کے ایک عظیم الشان شہر میں رہتا تھا اسے اہلِ یونان مصری تھیبس کہتے ہیں اور خود اس دیوتا کو وہ آمون کے نام سے پکارتے ہیں ایک بار تھیوٹ نے اس دیوتا کے پاس آکر اسے اپنی ایجاد کی ہوئی چیزیں دکھائیں اور یہ خواہش ظاہر کی کہ دوسرے مصریوں کو بھی اُن سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی جائے۔ اس نے ان سب چیزوں کو ایک ایک کر کے بیان کیا اور تھامس نے ہر ایک کے استعمال کے متعلق سوالات کیے جو چیز پسند آئی اس کی تعریف کی اور جو ناپسند ہوئی اس کی مذمت کی۔ جو کچھ تھامس نے تھیوٹ سے مختلف فنون کی تعریف یا مذمت میں کہا اسے دہرانے کے لیے بہت وقت چاہیے۔ مگر جب حروف تہجی کی باری آئی تو تھیوٹ نے کہا کہ ان سے مصریوں کی عقل و دانش میں اضافہ ہوگا اور ان کا حافظہ بہتر ہو جائے گا۔ یہ حافظے اور عقل دونوں کے لیے بہترین نسخہ ہے۔ تھامس نے جواب دیا' اے جدت آفریں تھیوٹ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص کسی فن کا بانی یا موجد ہو وہ ہر صورت

ہیں اس کا فیصلہ کرنے کا اہل ہو کہ اس کی ایجادات استعمال کرنے والوں کے لیے مفید ہیں یا غیر مفید۔ چنانچہ موجودہ صورت میں تم جو حروفِ تہجی کے باپ ہو الفتِ پدری کے تقاضے سے اپنی اولاد کی طرف ایک ایسی صفت منسوب کرتے ہو جو اس میں ہو ہی نہیں سکتی۔ تمھاری یہ ایجاد سیکھنے والوں کے ذہن میں بھولنے کی عادت پیدا کر دے گی اس لیے کہ وہ اپنے حافظے سے کام ہی نہیں لیں گے وہ خارجی نقوش پر بھروسا کر کے بیٹھ رہیں گے اور خود کچھ یاد نہیں رکھیں گے۔ جو نسخہ تم نے دریافت کیا ہے وہ حافظے کو نہیں بلکہ محض قوتِ تذکر کو مدد دیتا ہے اور اس سے تمھارے شاگردوں کو حق نہیں بلکہ محض شائبہ حق حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ سنیں گے بہت کچھ اور سیکھیں گے کچھ نہیں۔ بظاہر ہمہ داں معلوم ہوں گے لیکن عموماً ہیچمداں ثابت ہوں گے، دوسروں کے لیے بارِ خاطر ہوں گے اس لیے کہ اُن میں حکمت کی نمود ہوگی، اصلیت نہیں ہوگی۔"

فیڈرس۔ واقعی سقراط مصر کی یا کسی اور ملک کی کہانیاں گھڑنا تو تمھارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

سقراط۔ ڈوڈونا کے مندر میں ایک روایت چلی آتی ہے کہ سب سے پہلے غیب کی آواز شاہ بلوط کے درختوں سے آئی تھی۔ اگلے زمانے کے بھولے بھالے لوگ آج کل کے نوجوان فلسفیوں کی طرح نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق کا پیام" اگر شاہ بلوط کے درخت یا پتھر کی چٹان" سے بھی سنائی دے تو ان کے لیے کافی ہے مگر تم اس پر غور نہیں کرتے کہ بات سچی ہے یا نہیں بلکہ یہ دیکھتے ہو کہ کہنے والا کون ہے اور کہانی کس ملک کی ہے؟

فیڈرس۔ میں مانتا ہوں کہ تمھاری ملامت بجا ہے اور میرے خیال میں تھیبی دیوتا کی رائے حروفِ تہجی کے بارے میں صحیح ہے۔

سقراط۔ وہ بڑا سادہ لوح آدمی ہوگا اور تھامس یا آمون کے ارشادات سے بالکل بے خبر جو کسی فن کی تحریر کو اس شکل میں چھوڑے یا اس شکل میں قبول کرے اس خیال سے کہ قلم بند کیے ہوئے الفاظ قابلِ فہم یا قابلِ وثوق ہوں گے یا یہ سمجھو کہ ایک چیز کو لکھ لینا اس کے جاننے اور یاد رکھنے سے کسی طرح بھی بہتر ہے۔

فیڈرس۔ بالکل ٹھیک ہے۔

سقراط۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خیال آتا ہے۔ فیڈرس کی تحریر بھی بدقسمتی سے مصوری کی طرح ہے اس لیے کہ مصور کے کارنامے، زندگی کا انداز تو رکھتے ہیں لیکن اگر ان سے کوئی سوال پوچھو تو بالکل گم صم اور یہی حال لکھی ہوئی تقریروں کا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ فہم و ادراک رکھتی ہیں لیکن اگر ہم کوئی بات معلوم کرنا چاہیں یا ان سے کوئی سوال پوچھیں تو ہمیشہ وہی بندھا ٹکا جواب ملتا ہے اور جب وہ ایک بار قلم بند ہو جائیں تو اٹھا کر ہر طرح کے لوگوں کے درمیان پھینک دی جاتی ہیں چاہے وہ انھیں سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں اُنھیں یہ تمیز نہیں ہوتی کہ کسے جواب دیں اور کسے نہ دیں۔ اگر لوگ ان کے ساتھ بدسلوکی کریں یا انھیں بُرا بھلا کہیں تو ان کا کوئی والی وارث نہیں جو انھیں بچائے اور خود وہ اپنی حفاظت کر نہیں سکتیں۔

فیڈرس۔ یہ بھی تم نے بالکل ٹھیک کہا۔

سقراط۔ کیا الفاظ اور کلام کی ایک اور قسم نہیں جو اس سے کہیں بہتر ہے اور کہیں زیادہ قوت رکھتی ہے ——— اسی خاندان کی اولاد لیکن جائز اولاد؟

فیڈرس۔ تمھاری مراد کس چیز سے ہے اور اس کی کیا اصل ہے؟

سقراط۔ میری مراد اس معقول کلام سے ہے جو سیکھنے والے کے دل پر نقش ہو جو اپنی حفاظت آپ کر سکے اور یہ جانتا ہو کہ کب بولنا چاہیے اور کب خاموش رہنا چاہیے۔

فیڈرس۔ کیا تمھارا مطلب علم کے زندہ الفاظ سے ہی جو روح رکھتے ہیں اور جن کی لکھے ہوئے الفاظ محض شبیہیں ہیں ؟

سقراط۔ ہاں بے شک میرا یہی مطلب ہی۔ اب اگر اجازت ہو تو میں تم سے ایک سوال پوچھوں ؟ کیا ایک سمجھدار کاشتکار اس بیج کو لے کر اس کی وہ قدر کرتا ہی اور چاہتا ہی کہ پھل لائے پوری سنجیدگی سے عین موسم گرما میں اڈونس کے باغ میں بودے گا اس امید پر کہ آٹھ دن کے اندر ایک خوش نما کھیت لہلہاتا ہوا نظر آئے گا اور اس کے دل کو سرور بخشے گا ؟ اگر وہ ایسا کرے گا بھی تو محض تفریح اور دل لگی کے لیے۔ لیکن سنجیدگی کی حالت میں وہ اس بیج کو مناسب زمین میں بوتا ہی اور کاشتکاروں کے اصول کے مطابق اس کی پرداخت کرتا ہی اور اگر اس کا بویا ہوا بیج آٹھ مہینے میں پروان چڑھ جائے تو اس کے اطمینان کے لیے کافی ہی۔

فیڈرس۔ ہاں سقراط سنجیدگی کے ساتھ تو وہ یہی طریقہ اختیار کرے گا۔ دوسرا کام جس کا ذکر آیا تھا بقول تمھارے محض دل لگی کے لیے ہوگا ؟

سقراط۔ اور کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ جو شخص عدل، نیکی اور عزت کی حقیقت کو جانتا ہی وہ اپنے بیج کے معاملے میں ایک کاشتکار سے کم عقل رکھتا ہی ؟

فیڈرس ہرگز نہیں۔

سقراط۔ تو پھر وہ سنجیدگی کے ساتھ کبھی اس طرف مائل نہ ہوگا کہ اپنے خیالات کو قلم دوات سے "سطحِ آب" پر لکھے اور ان الفاظ کا بیج بوئے جو نہ خود اپنے خیالات کی ترجمانی کر سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو حق کی تعلیم جیسا کہ چاہیئے دے سکتے ہیں۔

فیڈرس۔ نہیں یہ تو قرینِ قیاس نہیں —— حرفوں کی کیاری

میں وہ تخم ریزی تو کرے گا اور پود بھی لگائے گا لیکن محض تفریح اور دل بستگی کے لیے وہ اپنے خیالات کو لکھ لے گا تاکہ وہ خود یا کوئی اور بوڑھا جو اس کا رفیقِ راہ ہو انھیں یادگار کے طور پر حفاظت سے رکھے کہ وہ بڑھاپے کے عالمِ نسیان میں کام آئیں۔ وہ اپنے ننھے ننھے پودوں کو بڑھتے دیکھ کر خوش ہوگا اور جب دوسرے لوگ روحانی دعوتوں کا لطف اٹھاتے ہوں گے تو وہ اس کھیل میں اپنی زندگی گزارے گا۔

فیڈرس۔ یہ کھیل اتنا ہی بلند ہے سقراط جتنا دوسرا کھیل پست ہے یعنی اس شخص کا کھیل جو سنجیدہ گفتگو کو تفریح کا ذریعہ بناتا ہے اور عدل وغیرہ کا ذکر تمسخر کے پیرائے میں کرتا ہے۔

سقراط۔ سچ ہے فیڈرس لیکن اس سے کہیں بلند تر ایک منطقی کا سنجیدہ شغل ہے جو ایک ہم مذاق طبیعت تلاش کر کے اس میں علم کی مدد سے ان الفاظ کا بیج بوتا ہے اور پود لگاتا ہے جو خود اپنی حفاظت بھی کر سکتے ہیں اور لگانے والے کی مدد بھی یہ الفاظ پھلنے پھولنے سے محروم نہیں رہتے بلکہ ان کا بیج مختلف زمینوں میں نشو و نما پا کر لافانی بن جاتا ہے اور جس کے پاس ہو اس کو انسانی مسرت کے انتہائی درجے پر پہنچا دیتا ہے۔

فیڈرس۔ بے شک یہ شغل کہیں زیادہ بلند ہے۔

سقراط۔ اچھا فیڈرس اب ہم مقدمات پر متفق تو ہو ہی گئے ہیں لاؤ نتیجے کے متعلق بھی فیصلہ کر ڈالیں۔

فیڈرس۔ کس نتیجے کے متعلق؟

سقراط۔ لیسیاس کے بارے میں جس پر ہم نے اعتراضات کیے تھے اور اس کے فن تحریر اور خطبات اور ان کی خطیبانہ خوبیوں یا خامیوں کے متعلق

ـــــــــ یہی مسائل تھے جنھیں ہم طے کرنا چاہتے تھے اور جن کے سلسلے میں ہم یہاں تک پہنچ گئے۔ میرے خیال میں اب ہمیں فن خطابت اور اس کی ضد سے اچھی خاصی واقفیت ہوگئی ہے۔

فیڈرس۔ ہاں میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ اس وقت کہا گیا اسے پھر دہرا دو۔

سقراط۔ جب تک کوئی شخص ان جزئیات کی حقیقت سے واقف نہ ہو جو اس کی تحریر یا تقریر کا موضوع ہیں' ان کی صحیح تعریف نہ کرسکے اور تعریف کرنے کے بعد انھیں اس حد تک تقسیم نہ کرسکے کہ مزید تقسیم کی گنجایش نہ رہے اور اس طرح جب تک وہ اس قابل نہ ہو کہ روح کی طبیعت دریافت کرسکے اور تقریر کے وہ مختلف طرز معلوم کرسکے جو مختلف طبیعتوں کے لیے مناسب ہیں اور اس کا انتظام کرسکے کہ سادہ طبیعت سے سادہ طرز میں خطاب کیا جائے اور پیچیدہ طبیعت سے پیچیدہ طرز میں ـــــــــ جب تک اس میں یہ سب باتیں نہ ہوں وہ دلیلوں سے اصول فن کے مطابق جہاں تک کہ وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے فن کے تحت میں لائی جاسکتی ہے۔ کام نہیں لے سکے گا خواہ وہ تعلیم دینا چاہتا ہو یا محض قائل کرنا ـــــــــ یہ خیال ہے جس پر ہماری ساری پچھلی بحث دلالت کرتی ہے۔

فیڈرس۔ بے شک ہمارا یہی خیال تھا۔

سقراط۔ دوسرے جہاں تک ان اعتراضات کا تعلق ہے جو خطبات کے پڑھنے یا لکھنے پر کیے گئے تھے اور جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ اعتراض کا کون سا طریقہ صحیح ہے اور کون سا غلط ـــــــــ کیا ہماری پچھلی بحث سے یہ ثابت نہیں ہوگیا۔

فیڈرس۔ کیا ثابت ہو گیا؟

سقراط۔ کہ خواہ لیسیاس ہو یا اور کوئی اگلا پچھلا مصنف خواہ کوئی عام آدمی ہو یا کوئی مدبر، جو شخص بھی قوانین کے مسودے پیش کرتا ہے اور اس طرح ایک سیاسی رسالے کا مصنف بن جاتا ہے یہ سمجھ کر کہ اس کی تصنیف زیادہ قابلِ وثوق اور واضح ہوگی، اس کا یہ فعل اس کے لیے باعثِ شرم ہے چاہے لوگ کچھ بھی کہیں۔ اس کے عدل اور ظلم نیکی اور بدی کی حقیقت کو نہ جاننا اور خواب اور واقعے میں تمیز نہ کر سکنا یقیناً شرم ناک ہے خواہ ساری دنیا اس کی تعریف کرتی ہو۔

فیڈرس۔ بے شک۔

سقراط۔ لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ تحریری مقالوں کا بہت بڑا حصہ لازمی طور پر سنجیدگی سے خالی ہوتا ہے اور کوئی نظم و نثر خواہ زبانی ہو یا تحریری اس وقت تک کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتی جب تک وہ رجز خوانوں کی تصنیف کی طرح تنقید یا تعلیم کے لیے نہیں بلکہ محض اس غرض سے پڑھی جائے کہ لوگ اُسے سُن کر یقین کر لیں، اور جس کا خیال ہے کہ اچھی سے اچھی تحریریں بھی محض ایک تذکرہ ہیں اس چیز کا جس کا ہم کبھی علم رکھتے تھے، اور وضاحت اور تکمیل اور سنجیدگی صرف عدل اور نیکی اور شرافت کے اُن اصولوں میں ہے جو تعلیم کی غرض سے زبانی بیان کیے جائیں اور سننے والے کی روح پر نقش ہو جائیں کہ یہی تحریر کا حقیقی طریقہ ہے۔ اور یہی اصول ہے جو انسان کا اپنا مال اور اس کی جائز اولاد ہیں۔ ایک تو وہ بات جو خود اس کے دل میں ہے، دوسرے اس کے تصور کے بھائی بند اولاد اور رشتہ دار جنھیں کہ اس نے دوسروں کے دلوں پر اچھی طرح نقش کر دیا ہے ——— جو شخص ان کے سوا کسی چیز کی پروا نہیں کرتا ——— وہی

معقول آدمی ہے اور مجھ کو تم کو فیڈرس، یہ دعا کرنی چاہیے کہ ہم بھی اس کی طرح ہو جائیں۔

فیڈرس۔ یقیناً میری یہی خواہش اور دعا ہے۔

سقراط۔ اچھا تو اب یہ کھیل ختم ہوا اور خطابت کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے۔ تم جا کر لیسیاس سے کہو کہ ہم جنگ کی دیویوں کے سرچشمۂ علم اور مکتب میں گئے تھے اور وہاں سے ہمیں یہ حکم ملا کہ اسے اور دوسرے خطبہ نویسوں کو یہ پیام پہنچا دو ——— ہومر وغیرہ کو جنھوں نے نظمیں لکھی ہیں خواہ وہ نغمے میں ڈھالی گئی ہوں یا نہ ڈھالی گئی ہوں، سولن وغیرہ کو جنھوں نے سیاسی رسالوں کی شکل میں خطبے لکھے ہیں اور انھیں قوانین کہتے ہیں۔ کہ اگر ان کی تصانیف حق کے علم پر مبنی ہیں اور زبانی بحث کے معیار پر جس کے مقابلے میں ان کی تحریر کچھ حقیقت نہیں رکھتی پرکھی اور صحیح ثابت کی جا سکتی ہیں تو وہ نہ صرف شاعر اور خطیب اور واضعانِ قوانین کہلانے کے بلکہ اس سے بھی زیادہ اونچے نام سے یاد کیے جانے کے مستحق ہیں۔ جو ان کی سنجیدہ زندگی کے شایانِ شان ہو۔

فیڈرس۔ تم ان کے لیے کیا نام تجویز کرتے ہو؟

سقراط۔ حکیم تو میں انھیں نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ یہ بہت بڑا نام ہے اور خدا کے لیے مخصوص ہے ——— محبِ حکمت یا فلسفی کا سیدھا سادا خطاب ان کے لیے موزوں ہے۔

فیڈرس۔ بہت موزوں ہے۔

سقراط اور وہ شخص جو اپنی تالیفات و تصنیفات کے دائرے سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور ایک مدت سے انھی میں کچھ کاٹ چھانٹ کرتا کچھ گھٹاتا بڑھاتا رہا ہے، بجا طور پر شاعر یا مقرر یا واضعِ قوانین کہا جا سکتا ہے۔

فیڈرس۔ بے شک۔

سقراط۔ تو جا کر اپنے رفیق سے یہ کہہ دو۔

فیڈرس۔ مگر تمھارا بھی ایک دوست ہی جسے بھولنا نہیں چاہیے۔

سقراط۔ وہ کون ہی؟

فیڈرس۔ حسین ایسوکراٹیس:۔ اسے تم کیا پیام بھیجو گے اور اس کا کیا نام رکھا جائے گا!

سقراط۔ ایسوکراٹیس ابھی کم سن ہی فیڈرس، مگر میں اس کے بارے میں ایک پیش گوئی کی جرأت کرنے کو تیار رہوں۔

فیڈرس۔ تم کیا پیش گوئی کرتے ہو؟

سقراط۔ میرے خیال میں اُسے ایک خداداد ذہن ملا ہی جس کی پرواز لیسیاس کی تقریروں سے کہیں اونچی ہی اور اس کی طبیعت اس سے کہیں زیادہ بہتر سانچے میں ڈھلی ہی میری رائے اس کے بارے میں یہ ہی کہ وہ عمر کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز ترقی کرتا جائے گا اور سب اگلے خطیب اس کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوں گے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ خطابت پر قناعت نہیں کرے گا بلکہ اس کے اندر وہ فیضانِ الٰہی موجود ہی جو اسے بلند تر مدارج پر پہنچائے گا اس لیے کہ اس کی طبیعت میں فلسفے کا مادہ موجود ہی۔ یہ ہی اُن دیوتاؤں کا پیام جو اس جگہ رہتے ہیں۔ میں یہ پیام ایسوکراٹیس کو پہنچاؤں گا جو میرا محبوب ہی اور تم وہ دوسرا پیام لیسیاس کو پہنچانا جو تمھارا محبوب ہی۔

فیڈرس۔ اچھا میں پہنچا دوں گا اور اب چونکہ گرمی کم ہوگئی ہی اس لیے ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔

سقراط۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ پہلے ہم مقامی دیوتاؤں سے ایک دعا مانگیں؟

فیڈرس۔ ضرور۔

سقراط۔ پیارے پین اور دوسرے دیوتاؤ جو اس جگہ رہتے ہو میری روح کو حسنِ باطن عطا کرو اور ظاہر و باطن کو ہم آہنگ کر دو۔ مجھے یہ توفیق دو کہ دانش مندوں کو دولت مند سمجھوں اور سونے کی اتنی مقدار بخش دو جو صرف ایک اعتدال پسند آدمی اٹھا سکتا ہے ——— اور کچھ؟ میرے لیے تو یہی دُعا کافی ہے۔

فیڈرس۔ میرے لیے بھی یہی مانگو اس لیے کہ دوستوں میں ہر چیز مشترک ہونی چاہیے۔

سقراط۔ آؤ اب چلیں۔

بزمِ طرب

(اپولوڈورس اپنے ایک ساتھی کے سامنے وہ مکالمہ دہرا رہا ہے جو اس نے ارسٹوڈیمس سے سنا ہے اور ایک بار گلاکن کو سنا چکا ہے۔)

اشخاصِ مکالمہ

فیڈرس
پاسینیاس
اریکسیمیکس
سقراط
الکیبیاڈیس
مستوں کی ایک ٹولی

مقامِ مکالمہ

اگاتھن کا گھر

تم جو کچھ دریافت کر رہے ہو اس کے جواب کے لیے میں پہلے سے اچھی طرح تیار ہوں۔ ابھی پرسوں کی بات ہے میں اپنے گھر سے، جو فلیرم میں ہے، شہر آ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے میرے ایک شناسا چلے آ رہے تھے۔ ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور انھوں نے مذاق میں دور سے پکارا۔ "اپولوڈورس، او میاں فلیری، ٹھیر جاؤ۔" میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ انھوں نے کہا "اپولوڈورس، میں اس وقت تمھیں کو ڈھونڈ رہا تھا

کہ تم سے ان تقریروں کا حال پوچھوں جو اگاتھن کے ہاں رات کے کھانے پر سقراط اور الکبیاڈیس وغیرہ نے عشق کی شان میں کی تھیں۔ فلپ کے بیٹے فنیکس نے ایک اور شخص سے ذکر کیا اور اس نے مجھے بتایا۔ اس کا بیان بہت ہی مبہم تھا مگر اس نے تمہارا حوالہ دیا کہ ان کو معلوم ہے۔ اب تم سے ساری سرگزشت سننے کو جی چاہتا ہے۔ تم سے بہتر اپنے دوست کے الفاظ کو نقل کرنے کے لیے اور کون ہو سکتا ہے۔ مگر پہلے یہ بتاؤ کہ تم خود اس محفل میں موجود تھے؟"

میں نے کہا "گلاکن معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے تم سے ذکر کیا اس کا بیان واقعی بہت مبہم تھا۔ تم یہ سمجھے کہ حال کا ذکر ہے اور میں اس صحبت میں شریک تھا"۔

"اور کیا، میں تو یہی سمجھا"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمھیں معلوم نہیں کہ اگاتھن برسوں سے ایتھنس میں نہیں رہتا ہے اور جب میری ملاقات سقراط سے ہوئی اور میں نے اس کے ہر قول و عمل سے واقف ہونے کا التزام کیا اسے تو ابھی تین سال بھی نہیں ہوئے۔ میں ایک زمانے میں دنیا بھر میں مارا مارا پھر رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ بڑا اچھا شغل ہے لیکن دراصل میں بدبختی میں مبتلا تھا اور میری حالت وہی تھی جو آج تمہاری ہے۔ میرا خیال تھا کہ اور چاہے جو کچھ کروں مگر فلسفے کے پھیر میں نہیں پڑنا چاہیے"۔

"بس اب مذاق تو رہنے دو اور یہ بتاؤ یہ محفل کب ہوئی تھی"۔

ہمارے لڑکپن کے زمانے میں جب اگاتھن نے اپنے پہلے المیے پر انعام حاصل کیا تھا۔ یہ اسی دن کا واقعہ ہے جس دن اس نے اور اس کے کورس نے کامیابی کی خوشی میں قربانی کی"۔

"پھر تو بہت دن ہوئے تم سے کہا کس نے، سقراط نے؟"

"نہیں، نہیں اسی شخص نے جس نے فنیکس سے کہا تھا۔ ایک ٹھنگنا سا

آدمی تھا، قصبہ سائیڈ بتھینیم کا باشندہ جو ہمیشہ ننگے پیر رہا کرتا تھا۔ وہ اگاتھن کی دعوت میں شریک تھا اور میرے خیال میں ان دنوں اس سے بڑھ کر کوئی سقراط کا معتقد نہ ہوگا۔ پھر میں نے اس کے بیان کے بعض حصوں کے متعلق خود سقراط سے دریافت کیا اور اس نے تصدیق کی"۔

گلاکن بولا "تو پھر یہ داستان ایک بار اور سنا دو۔ ایتھنس کا رستہ تو گویا باتیں کرنے ہی کے لیے بنایا گیا ہے"۔

غرض راستے بھر ان تقریروں کا ذکر ہوتا رہا جو عشق کے موضوع پر ہوئی تھیں۔ "اسی لیے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ میں تمھاری فرمائش پوری کرنے کے لیے پہلے سے تیار ہوں اور اگر تم چاہو تو یہ تقریریں پھر دہرائی جا سکتی ہیں۔ فلسفے کے موضوع پر گفتگو کرنے یا سننے سے مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے قطع نظر فائدے کے۔ لیکن جب کوئی اور گفتگو سنتا ہوں خصوصاً تم جیسے دولت مندوں اور سوداگروں کی، تو جی گھبرانے لگتا ہے اور مجھے تم لوگوں پر جو میرے رفیق ہو رحم آتا ہے کیونکہ تم سمجھتے ہو ہم کوئی کام کر رہے ہیں حالانکہ تم کچھ بھی نہیں کرتے ہو۔ مجھے ایک بدنصیب شخص سمجھ کر تم کو مجھ پر رحم آتا ہوگا اور شاید تم حق بجانب ہو لیکن مجھے تمھارے بارے میں اس بات کا یقین ہے جس کا تمھیں میری بابت محض گمان ہے بس اتنا ہی فرق ہے"۔

ساتھی۔ میں دیکھتا ہوں اپولوڈورس تمھارا اب بھی وہی رنگ ہے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو برا کہا کرتے ہو مجھے تو یقین ہے کہ تمھیں سقراط کے سوا ساری دنیا کی حالت قابلِ رحم معلوم ہوتی ہے اور سب سے زیادہ خود اپنی۔ تمھارا وہ پرانا لقب "پگلا اپولوڈورس" تم پر بالکل صادق آتا ہے۔ نہ معلوم کیسے یہ نام پڑ گیا۔ مگر بھئی ہے بالکل ٹھیک۔ اس لیے کہ جب دیکھو تم اپنے آپ کو اور دوسروں کو بجز سقراط کے پاگلوں کی طرح بکتے جھکتے رہتے ہو۔

اپولوڈورس۔ جی ہاں اسی وجہ سے تو میں مجنوں اور فاتر العقل کہلاتا ہوں کہ آپ کی اور اپنی نسبت ایسے خیالات رکھتا ہوں۔ اس سے زیادہ ثبوت اور کیا چاہیے۔

ساتھی۔ اجی ان باتوں کو چھوڑو۔ میں پھر درخواست کرتا ہوں کہ وہ گفتگو سنا دو۔

اپولوڈورس۔ اچھا تو سنو یہ عشق کی داستان کہتا ہوں ـــــ مگر شاید بہتر یہی ہوگا کہ میں شروع سے کہ چلوں اور ارسٹوڈیمس کا بیان لفظ بہ لفظ دہرانے کی کوشش کروں۔ وہ کہتا ہے:۔

"سقراط سے رستے میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ سیدھا حمام سے آرہا تھا اور پانو میں چپل پہنے تھا۔ اس کا چپل پہننا ایک انوکھی بات تھی۔ اس لیے میں نے پوچھا کہ "آج کہاں جارہے ہو، جو یوں چھیلا بنے ہوئے ہو؟"

سقراط نے جواب دیا "اگاتھن کے ہاں دعوت ہے۔ اس نے کل بھی جشن قربانی میں بلایا تھا، میں نے کل تو اس خوف سے کہ بڑی بھیڑ ہوگی انکار کر دیا مگر آج کا وعدہ کر لیا تھا۔ میں نے یہ ٹھاٹھ کے کپڑے اس لیے پہنے ہیں کہ جس کے ہاں جاتا ہے وہ اس قدر ٹھاٹھ کا آدمی ہے، کہو کیا ارادہ ہے! میرے ساتھ بن بلائے چلتے ہو؟"

میں نے کہا "جیسا تم کہو۔"

اس نے کہا "تو پھر آؤ ہم اس مثل کو بدل دیں" نیچ لوگوں کی دعوت میں شریف بن بلائے جاتے ہیں" اس کی جگہ ہماری یہ مثل ہوگی "شریفوں کی دعوت میں شریف بن بلائے جاتے ہیں۔" اور اس تبدیلی کی سند خود ہومر کے کلام میں ملتی ہے جس نے نہ صرف اس مثل میں تصرف کیا ہے بلکہ سچ مچ اسے الٹ ہی دیا ہے اس لیے کہ اس نے اگامیمنن کو سب سے بڑے سورما کی حیثیت سے پیش کرنے کے بعد یہ دکھایا ہے کہ مینیلاس جو محض ایک کم ہمت سپاہی ہے بن بلائے اگامیمنن کی دعوت میں، جہاں جشن منایا جارہا ہے اور قربانیاں ہو رہی ہیں، پہنچ جاتا ہے اعلیٰ ادنیٰ کے ہاں نہیں

بلکہ ادنیٰ اعلیٰ کے ہاں ؟"

میں نے کہا "سقراط مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں میری بھی یہی صورت نہ ہو اور ہومر کے میںیلاس کی طرح میں بھی وہ ادنیٰ درجے کا آدمی نہ ثابت ہوں جو :-

دانش مندوں کی دعوت میں بن بلائے جاتا ہے۔

مگر میں تو یہ کہہ دوں گا کہ مجھے تم نے دعوت دی ہے اور تمہیں کوئی بہانہ کرنا پڑے گا۔"

سقراط نے بالکل ہومر کے رنگ میں جواب دیا۔ "جب دو آدمی اکٹھے ہو جاتے ہوں، تو شاید ان میں سے کوئی نہ کوئی راستے میں بہانہ گھڑ لے۔"

ہم اس انداز میں باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ سقراط کسی خیال میں محو ہو کر پیچھے رہ گیا اور اس نے مجھ سے جو اس کا انتظار کر رہا تھا کہا تم آگے بڑھے چلو۔ جب میں اگاتھن کے گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سب دروازے کھلے ہوئے ہیں اور پھر ایک عجیب مضحک واقعہ ہوا۔

ایک نوکر نے جو باہر جا رہا تھا مجھے دیکھا اور فوراً دعوت کے کمرے میں پہنچا دیا۔ یہاں مہمان گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے تھے اس لیے کہ دعوت شروع ہونے والی تھی۔ میرے داخل ہوتے ہی اگاتھن نے کہا "بھئی خوب آئے" ارسٹوڈیمس، بالکل ٹھیک وقت پر پہنچے ہو کہ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاؤ۔ اگر کسی اور کام سے آئے ہو تو اسے ملتوی رکھو اور ہماری صحبت میں مل جاؤ۔ میں تو کل تمہیں ڈھونڈتا رہا اگر تم مل جاتے تو ضرور دعوت دیتا۔ مگر سقراط کو تم نے کہاں چھوڑا!"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سقراط کہیں نظر نہیں آیا اور مجھے یہ بتانا پڑا کہ ابھی ابھی وہ میرے ساتھ تھا اور اسی کے بلانے پر میں کھانا کھانے آیا تھا۔

اگاتھن نے کہا "بہت اچھا کیا کہ تم آ گئے مگر وہ خود کہاں ہے؟"

میں نے کہا "ابھی جب میں نے دروازے میں قدم رکھا وہ میرے پیچھے

پیچھے آرہا تھا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں غائب ہوگیا۔"

اگاتھن نے ایک نوکر سے کہا "جاؤ سقراط کو ڈھونڈو اور انھیں یہاں بلالاؤ اور تم ارسٹوڈیمس، اتنی دیر اریکسمکس کے پاس آبیٹھو۔"

نوکر نے میرے ہاتھ دھلائے اور میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں دوسرے نوکر نے آکر خبر دی کہ ہمارا دوست سقراط برابر کے مکان میں برساتی کے نیچے کھڑا ہے اس نے کہا "وہ تو وہیں جم کر رہ گئے ہیں۔ میں نے آواز دی مگر انھیں جنبش تک نہ ہوئی۔"

اگاتھن بولا "یہ عجیب بات ہے۔ جاؤ تم پھر پکارو اور برابر پکارتے رہو۔"

میں نے کہا "اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اس کی عادت ہے خواہ مخواہ جہاں جی چاہے کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے خیالات میں کھو جاتا ہے۔ میرے خیال میں وہ تھوڑی دیر میں خود ہی آجائے گا اس لیے اسے چھیڑنا نہیں چاہیے۔"

اگاتھن نے کہا "خیر اگر تمھاری یہ رائے ہے تو میں اسے چھوڑے دیتا ہوں" پھر نوکروں کی طرف مخاطب ہو کر بولا "کھانا لاؤ ان کا انتظار نہ کرو جو کچھ چاہو لا کر رکھ دو اس لیے کہ کوئی تمھیں حکم دینے والا نہیں ہے۔ اب تک میں نے کبھی تمھیں اپنی مرضی سے کام کرنے کا موقع نہیں دیا مگر اس وقت یہ سمجھ لو کہ تم میزبان ہو اور ہم سب تمھارے مہمان ہیں، تم ہماری اچھی طرح خاطر کرو گے تو ہم بھی تمھاری خوب تعریف کریں گے۔"

کھانا چن دیا گیا مگر اب تک سقراط کا کہیں پتا نہ تھا۔ کھانے کے دوران میں اگاتھن نے کئی بار سقراط کو بلوانا چاہا مگر میں نے مخالفت کی۔ مگر جب کھانا آدھے سے زیادہ ہو چکا ــــ اس لیے کہ سقراط کا دورہ حسب معمول زیادہ دیر تک نہیں رہا ــــ دیکھتے کیا ہیں کہ حضرت چلے آرہے ہیں۔ اگاتھن نے جو دسترخوان کے سرے پر اکیلا بیٹھا تھا سقراط سے درخواست کی کہ میرے پاس بیٹھو تاکہ تمھیں چھو کر اس حکیمانہ خیال سے فائدہ اٹھا سکوں جو اس برساتی میں تمھارے ذہن میں آیا اور اس وقت بھی موجود ہے کیونکہ مجھے یقین ہے

کہ تھیں جس چیز کی تلاش تھی اسے پائے بغیر تم ہرگز واپس آنے والے نہ تھے۔

سقراط، اگاتھن کی فرمائش کے مطابق اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے کہا " کاش حکمت چھونے کے ذریعے سے بھرے دماغ سے خالی دماغ میں منتقل ہو سکتی جس طرح پانی اون کے ذریعے بھرے برتن سے خالی برتن میں پہنچ جاتا ہی؟ ایسا ہوتا تو میں تمھارے قریب بیٹھنے کے شرف کو بہت غنیمت سمجھتا اس لیے کہ تم مجھے حکمت کے چشمۂ بے پایاں سے سیراب کر دیتے۔ رہی میری حکمت سو وہ ایک موہوم اور بے قدر چیز ہی۔ اس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں مگر تمھاری حکمت روشن اور درخشاں ہی اور اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں اس کا جوشِ شباب اور اس کی آب و تاب پرسوں تیس ہزار یونانیوں کے سامنے ظاہر ہو چکی ہی۔"

اگاتھن بولا " سقراط، تم تو مجھے بناتے ہو۔ ایک دن تم میں اور مجھ میں یہ طے ہونا ہی کہ کون حکمت و دانش میں فوقیت رکھتا ہی اور ڈایونیسس اس کا فیصلہ کرے گا۔ مگر اس وقت تو تمھیں اس سے بہتر کام کرنا ہی یعنی کھانا کھانا ہی۔"

سقراط کوچ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور سب کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔ اس کے بعد دیوتاؤں کے نام کی شراب زمین پر چھڑکی گئی اور ایک بھجن گایا گیا۔ معمولی رسمیں ادا کی گئیں۔ اب شراب کا دور چلنے کو تھا کہ پاسینیاس نے کہا " یہ تو بتاؤ دوستو شراب پینے کا وہ کون سا طریقہ ہی جس میں ہمیں کم سے کم نقصان پہنچے؟ سچ کہتا ہوں جو کل پی تھی اس کا خمار آج تک بھگت رہا ہوں۔ مجھے اتنی مہلت ملنی چاہیے کہ حواس درست کر لوں اور مجھے تو یہ شبہہ ہی کہ تم میں سے اکثر کا یہی حال ہی کیونکہ تم بھی کل اس صحبت میں شریک تھے۔ اس لیے اس پر غور کرو کہ شراب پینے کا سب سے سہل طریقہ کیا ہی؟"

ارسٹوفینس نے کہا "مجھے بالکل اتفاق ہے کہ ہمیں زیادہ پینے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں جو کل تک شراب میں سر سے پیر تک ڈوب گئے تھے۔"

اکومینس کے بیٹے اریکسیمکس نے کہا "مگر میں تو ایک اور آدمی کی رائے بھی سننا چاہتا ہوں۔ کیا اگاتھن زیادہ پینے کے قابل ہے؟"

اگاتھن بولا "مجھ میں تو اس کی ہمت نہیں۔"

اریکسیمکس نے کہا "پھر تو ارسٹوڈیمس، فیڈرس اور مجھ جیسے کچے پینے والوں کی خوش نصیبی ہے کہ ہمارے دعادت شرابیوں کی طبیعت پینے کے لیے موزوں نہیں ہے (سقراط کو میں ان میں شامل نہیں کرتا کیونکہ وہ پینے اور نہ پینے دونوں پر قادر ہے اور ہمارا جو کچھ بھی فیصلہ ہو اسے کوئی عذر نہ ہوگا) خیر چونکہ اس صحبت میں کوئی زیادہ پینے کی طرف مائل نہیں ہے اس لیے خطا معاف، میں بہ حیثیت طبیب کے عرض کرتا ہوں کہ کثرتِ مے نوشی بُری چیز ہے۔ میں خود جہاں تک ممکن ہے اس سے بچتا ہوں اور ظاہر ہے کہ کسی کو بھی اس کی رائے نہیں دیتا، چہ جائے کہ ایسے شخص کو جو کل کی بدمستی کا اثر اب تک محسوس کر رہا ہو۔"

فیڈرس مرہونیشی نے اس کے جواب میں کہا "میں تو ہمیشہ تمھاری ہدایت پر خصوصاً اس مشورے پر جو تم طبیب کی حیثیت سے دیتے ہو عمل کرتا ہوں اور دوسرے حضرات بھی اگر دانش مندی سے کام لیں تو یہی کریں گے۔"

غرض یہ طے ہو گیا کہ مے نوشی مجلس کی کارروائی میں داخل نہیں ہوگی۔ البتہ جس کا جی چاہے گا تھوڑی بہت پی لے گا۔

اریکسیمکس نے کہا "اب چونکہ ہم سب اس پر متفق ہیں کہ مے نوشی اختیاری چیز ہوگی کسی پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ میں دوسری تحریک یہ پیش کرتا ہوں کہ

بانسری بجانے والی سے جو ابھی آئی ہے کہا جائے کہ یہاں سے چلی جائے اور اپنے ساز کا آپ ہی لطف اٹھائے یا اندر جا کر عورتوں کو سنائے۔ آج تو آپس میں گفتگو رہے اور اجازت ہو تو یہ بھی عرض کر دوں کہ کس موضوع پر۔ اس تجویز کے منظور ہو جانے کے بعد اریکسیمکس نے سلسلۂ گفتگو چھیڑا :-

میں یوری پدیس کے میلانیپ کی طرز میں بات یوں شروع کروں گا کہ "عزیزو یہ الفاظ میرے نہیں جو میں آپ کے سامنے کہوں گا بلکہ فیڈرس کے ہیں وہ اکثر غصے کے لہجے میں مجھ سے کہا کرتا ہے :-

"کس قدر تعجب کی بات ہے اریکسیمکس کہ اور دیوتاؤں کی شان میں تو قصیدے اور بھجن کہے گئے مگر عشق کے عظیم الشان اور جلیل القدر دیوتا کی مدح سرائی اتنے شعرا میں کسی ایک نے بھی نہیں کی۔ پھر یہ سوفسطائی حضرات ہیں۔ مثلاً فاضل پروڈیکس جنھوں نے ہراکلیس اور دوسرے سورماؤں کی تعریف شرح و بسط سے کی ہے اور تعجب تو یہ ہے کہ میری نظر سے ایک فلسفیانہ تصنیف گزری جس میں نمک کے فوائد پر ایک بلیغ بحث ہے۔ اسی طرح بہت سی چیزوں کو یہ شرف حاصل ہے۔ مگر ذرا خیال تو کیجیے کہ آج ان سب چیزوں سے تو لوگوں کو اس قدر شوق اور دلچسپی پیدا ہو گئی لیکن آج تک کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ عشق کے گن گاتا۔ یہ انتہا ہے اس غفلت کی جو اس عظیم الشان دیوتا سے برتی گئی، میرے خیال میں فیڈرس کی یہ بات بالکل صحیح ہے اس لیے میں اپنی طرف سے نذرِ عقیدت پیش کرتا ہوں اور میرے خیال میں نہایت مناسب ہو گا کہ آپ سب حضرات بھی جو یہاں جمع ہیں عشق کے دیوتا کے آگے سر نیاز جھکائیں۔ اگر آپ مجھ سے متفق ہوں تو گفتگو کا سلسلہ رکنے نہیں پائے گا کیونکہ میری تجویز یہ ہے کہ بائیں سرے سے چل کر داہنے سرے تک ہر شخص باری باری سے عشق کی شان میں تقریر

کرے اور اس میں اپنا پورا زور صرف کردے اور چونکہ فیڈرس بائیں سرے پر بیٹھا ہی اور یہ خیال اصل میں اسی کا ہی لہذا وہی یہ سلسلہ شروع کرے"۔ اس پر سقراط نے کہا" اریکسیمکس کوئی شخص تمہارے خلاف رائے نہیں دے گا۔ بھلا میں کیونکر تمھاری تجویز کی مخالفت کرسکتا ہوں جب کہ میرا یہ دعویٰ ہی کہ کہ میں عشق و محبت کے معاملات کے سوا کسی چیز کو سمجھتا ہی نہیں اور غالباً اگاتھن اور پاسینیاس بھی مخالف نہیں ہوں گے۔ رہا ارسٹوفنیس جسے ہمیشہ ڈایونیسس اور افروڈائٹ سے کام رہتا ہے اس کی نسبت تو اس کا شبہہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اور جتنے آدمی مجھے یہاں نظر آتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تجویز ہم میں سے بعض کے حق میں جو یہاں آخر میں بیٹھے ہیں کسی قدر غیر منصفانہ معلوم ہوگی لیکن اگر ہمارے بولنے سے پہلے اچھی تقریریں ہوجائیں تو ہماری شکایت جاتی رہے گی۔ اچھا ہی میاں فیڈرس ہی عشق کی تعریف شروع کریں۔ بسم اللہ۔"

نہ تو ارسٹوڈیمس کو اس صحبت کی ساری گفتگو یاد تھی اور نہ مجھے وہ سب باتیں یاد رہیں جو اس نے سنائی تھیں۔ مگر جو کچھ میرے خیال میں یاد رکھنے کے قابل تھا اور جو کچھ خاص خاص مقرروں نے کہا تھا وہ میں سناتا ہوں۔

فیڈرس نے سلسلۂ کلام اس طرح شروع کیا"عشق ایک زبردست دیوتا ہی جو دیوتاؤں اور انسانوں میں اپنا نظیر نہیں رکھتا خصوصاً اپنی پیدائش کے معاملے میں سب سے ممتاز ہی اس لیے کہ وہ عمر میں سب دیوتاؤں سے بڑا ہی عشق کی قدامت کا ایک ثبوت یہ ہی کہ اس کے ماں باپ کے نام بھی روایات میں محفوظ نہیں رہے۔ کسی شاعر یا نثر نگار نے آج تک ان کا ذکر نہیں کیا ہیسیڈ نے کہا:۔

"پہلے فساد کا ظہور ہوا اور پھر ارض بسیط کا جو ابد تک
کل موجودات کی حامل ہے اور اس کے ساتھ عشق کا"۔

دوسرے الفاظ میں فساد کے بعد ارض اور عشق کی تکوین ہوئی پارمینڈیس اپنی ایک نظم میں تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"دیوتاؤں کے سلسلے میں سب سے پہلے اس نے عشق کو بنایا"۔

اور اکوسیلاس بھی ہیسیڈ کا ہم زبان ہے۔ غرض بے شمار شاہد ہیں جو عشق کو سب دیوتاؤں میں سب سے بڑا مانتے ہیں اور سب سے معمر ہونے کے علاوہ وہ ہمارا سب سے بڑا محسن بھی ہے کیونکہ ایک نوجوان کے لیے جو پہلے پہل زندگی میں قدم رکھتا ہے، ایک پاک نفس عاشق سے بڑھ کر اور عاشق کے لیے ایک نوخیز معشوق سے بڑھ کر کیا نعمت ہوسکتی ہے۔ جو لوگ دنیا میں بلند و برتر زندگی بسر کرنا چاہیں ان کے دل میں اس اصول جو ہماری زندگی کا رہنما ہے جس قدر گہرا احساسِ عشق پیدا کرتا ہے نہ عزیزوں کی محبت پیدا کر سکتی ہے نہ جاہ و منصب یا دولت کی خواہش نہ کوئی اور محرک۔ آپ سمجھے ہیں کس چیز کا ذکر کر رہا ہوں؟ عزت اور ذلت کے احساس کا جس کے بغیر ریاستیں کوئی اچھا یا بڑا کام کر سکتی ہیں اور نہ افراد۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر کسی عاشق سے کوئی حرکت شرافت کے خلاف سرزد ہو یا وہ بزدلی کی وجہ سے ذلت گوارا کرے اور اس کا معشوق یہ دیکھ پائے تو اسے اس سے کہیں زیادہ تکلیف ہوگی جتنی اپنے باپ یا رفیق یا کسی اور شخص کے دیکھنے سے ہوتی۔ اسی طرح اگر معشوق ذلت کی حالت میں پایا جائے تو وہ بھی اپنے عاشق کے سامنے یہی محسوس کرتا ہے۔ اگر کوئی ایسی تدبیر ہوسکتی ہے کہ ایک ریاست یا فوج صرف عاشقوں اور ان کے معشوقوں پر مشتمل ہوتی تو وہ اپنے شہر کے بہترین حاکم ثابت ہوتے کیونکہ وہ ہر ذلت سے بچنے اور عزتِ نفس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور جب وہ میدانِ جنگ

میں پہلو بہ پہلو لڑتے تو تعداد میں کم ہونے کے باوجود ساری دنیا پر غالب آجاتے۔ اس لیے کہ کون عاشق ہے جس کا یہ خیال نہ ہو کہ چاہے اور سب انسان اسے اپنی جگہ چھوڑتے ہوئے یا ہتھیار ڈالتے ہوئے دیکھ لیں مگر اس کا معشوق نہ دیکھنے پائے؟ وہ ہزار بار جان دے گا مگر یہ کبھی گوارا نہ کرے گا۔ کون عاشق ہے جو اپنے معشوق کو چھوڑ کر بھاگ جائے گا یا جوکھم میں اس کے کام نہ آئے گا۔ ایسے وقت میں تو بزدل سے بزدل بھی توفیقِ الٰہی سے سورما بن جائے گا اور بڑے سے بڑے بہادر کا مقابلہ کرے گا عشق کا فیضان اس کے رگ دپے میں سما جائے گا۔ وہی شجاعت کی روح جو بقول ہومر کے خدا بعض سورماؤں کے بدن میں پھونکتا ہے، عشق فطرتاً عاشق کے بدن میں پھونک دیتا ہے۔

"عشق ہی ہے جو انسانوں میں یہ جرأت پیدا کر دیتا ہے، صرف مردوں ہی میں نہیں بلکہ عورتوں میں بھی کہ معشوق کی خاطر جان دے دیں۔ اس کی ابدی یادگار تمام یونانیوں کے سامنے پیلیاس کی بیٹی السیس ٹِس موجود ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی اس کے شوہر کے لیے جان دینے پر آمادہ نہیں ہوا، حالانکہ ماں باپ بھی موجود تھے۔ اس کی محبت اتنی لطیف تھی کہ جس کے مقابلے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ماں باپ اپنے بیٹے کے کوئی نہیں بس نام کے عزیز ہیں، اور اس کا یہ کام انسانوں کے علاوہ دیوتاؤں کی نظر میں اس قدر بلند و برتر ہے کہ زندہ ہو کر دوبارہ زمین پر لوٹنے کا خاص حق جو بہت سے نیک لوگوں سے چند کو ملتا ہے اس کو اس شاندار کارنامے کے عوض دیا گیا ہے۔ اتنی زیادہ قدر ہے عشق کی نیکی اور وفاداری کی دیوتاؤں کے نزدیک۔ مگر اوئیگرس کے بیٹے آرفیس بربط نواز کو انھوں نے یوں ہی ٹال دیا اور بجائے اس کے کہ اس کی مطلوبہ کو اس کے حوالے کرتے صرف اس کا ایک خیالی پیکر دکھا دیا کیونکہ اس نے بہادری سے کام نہیں لیا۔ وہ شخص

ایک ستار جی تھا اور اس میں یہ جرأت نہ تھی کہ الیسٹس کی طرح عشق کے لیے جان دے دے بلکہ اس فکر میں تھا کہ جیتا جاگتا عالمِ ارواح میں داخل ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ آگے چل کر انھوں نے اسے اس کی بزدلی کی سزا میں عورتوں کے ہاتھ قتل کرا دیا۔ اس سے بالکل مختلف تھا اس سچی محبت کا بدلا جو اچیلیس کو اپنے عاشق پیٹراکلس سے تھی (وہ اس کا عاشق تھا نہ کہ معشوق۔ پیٹراکلس کو معشوق قرار دینا ایسکائلس کی غلطی ہے کیونکہ اچیلیس دونوں میں زیادہ خوب صورت بلکہ سورماؤں میں سب سے بڑھ کر حسین تھا اور جیسا ہومر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ ابھی اس کی ڈاڑھی موچھ نہیں نکلی تھی اور عمر میں بہت کم تھا) اور ہر چند کہ دیوتا عاشق کے عشق کی بہت قدر کرتے ہیں لیکن وہ محبت جو معشوق اس کے عوض میں عاشق سے کرتا ہے اس سے زیادہ قابلِ قدر سمجھی جاتی ہے اس لیے کہ عاشق فیضانِ الٰہی کی بدولت دیوتاؤں سے قریب تر ہے۔ اچیلیس اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ اسے اپنی ماں سے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ موت سے بچ کر گھر لوٹ سکتا ہے اور بڑی عمر تک زندہ رہ سکتا ہے اگرچہ وہ ہیکٹر کو قتل کرنے سے باز رہے۔ تاہم اس نے اپنے دوست کا بدلا لینے کے لیے مرنا گوارا کیا یہ نہیں کہ وہ اسے بچانے کی کوشش میں مارا گیا بلکہ اس لیے کہ اس سے زیادہ جرأت دکھائی یعنی اس کے مرنے کے بعد جان دے دی چنانچہ دیوتاؤں نے اس کی الیسٹس سے بھی زیادہ قدر کی اور اسے مبارک روحوں کے جزیرے میں بھیج دیا۔ ان وجوہ کی بنا پر میرا دعوے ہے کہ عشق دیوتاؤں میں سب سے قدیم، برتر اور قوی ہے اور سب سے بڑھ کر زندگی میں نیکی اور مرنے کے بعد راحت بخشنے والا ہے۔"

یہ یا اس سے ملتی جلتی فیڈرس کی تقریر تھی اور اس کے بعد کچھ اور تقریریں ہوئیں جو ارسٹوڈیمس کو یاد نہیں رہیں۔ دوسری تقریر جو اس نے سنائی پاسینیاس

کی تھی۔ اس نے کہا "فیڈرس، میرے خیال میں تقریر کا موضوع ہمارے سامنے بالکل صحیح شکل میں پیش نہیں کیا گیا —— ہم سے یہ مطالبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس طرح اندھا دھند عشق کی تعریف کریں۔ اگر صرف ایک ہی عشق ہو تو جو کچھ تم نے کہا سب ٹھیک ہے مگر چونکہ عشق ایک سے زیادہ ہیں اس لیے تمہیں سب سے پہلے اس کا تعین کر لینا چاہیے تھا کہ ان میں سے کون ہماری ثنا و صفت کا موضوع ہے۔ میں اس کمی کو پورا کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ کون سا عشق تعریف کے لائق ہے اور پھر دل کھول کر اس کی ایسی مدح کروں گا جو اس کے شایان شان ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ عشق اور افروڈائٹ لازم و ملزوم ہیں اور اگر افروڈائٹ ایک ہوتی تو عشق بھی ایک ہوتا مگر چونکہ اس نام کی دو دیویاں ہیں اس لیے عشق بھی دو ہونے چاہییں۔ میں نے جو آپ سے کہا کہ دیویاں دو ہیں یہ بالکل صحیح ہے۔ بڑی جس کی کوئی ماں نہیں ہے آسمانی افروڈائٹ کہلاتی ہے اور یورینس کی بیٹی ہے، اور چھوٹی یعنی زیس اور ڈیون کی بیٹی کو دنیاوی افروڈائٹ کہتے ہیں۔ وہ عشق جو اس کا ساتھی ہے بجا طور پر دنیاوی عشق کے نام سے اور دوسرا آسمانی عشق کے نام سے موسوم ہے۔ تعریف تو سبھی دیوتاؤں کی کرنی چاہیے لیکن اس طرح نہیں کہ ان کی سیرت میں امتیاز نہ کیا جائے اس لیے میں دونوں عشقوں کی سیرت کا فرق بتانے کی کوشش کروں گا۔

"ظاہر ہے کہ اعمال میں طریقِ عمل کے لحاظ سے بہت اختلاف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان چیزوں کو لے لیجیے جن میں ہم اس وقت مصروف ہیں۔ پینا، پلانا، گانا بجانا اور باتیں کرنا —— یہ کام بجائے خود نہ اچھے ہیں نہ برے بلکہ جس طرح کیے جائیں وہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اچھی طرح کیے جائیں تو اچھے ہیں بری طرح کیے جائیں تو برے۔ اسی طرح ہر عشق برتر اور قابلِ ستائش

نہیں ہے بلکہ صرف وہ عشق جس کا مقصد بلند و برتر ہے وہ عشق جو دنیاوی افروڈائیٹ سے پیدا ہوا ہے دراصل ایک معمولی چیز ہے اور اس میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا۔ یہ وہی جذبہ ہے جو ادنیٰ آدمیوں کو محسوس ہوتا ہے عورتوں اور مردوں دونوں کی طرف مائل ہو سکتا ہے اور روح سے نہیں بلکہ جسم سے تعلق رکھتا ہے۔ احمق سے احمق اشخاص بھی اس عشق کے موضوع ہو سکتے ہیں۔ اسے تو ایک غرض پوری کرنی ہے اس کی فکر نہیں کہ یہ غرض بہتر طریقے سے پوری ہو اس لیے وہ بلا تفریق اچھے بُرے سبھی کام کر گزرتا ہے۔ جو دیوی اس کی ماں ہے وہ اپنی ہم نام سے عمر میں بہت چھوٹی ہے اور مرد و عورت کے میل سے پیدا ہوئی ہے اس لیے اس میں دونوں کی صفات پائی جاتی ہیں۔ مگر آسمانی افروڈائیٹ کا بیٹا ایسی ماں رکھتا ہے جس کی ولادت میں عورت کو کوئی دخل نہیں، وہ صرف مرد سے پیدا ہوئی ہے۔ یہی عشق ہے جو صرف مردوں سے ہوتا ہے اور چونکہ وہ دیوی جو اس کی ماں ہے سن رسیدہ ہے اس لیے اس کا دل نفسانی خواہشات سے پاک ہے۔ جن لوگوں پر اس عشق کا سایہ ہے جنسِ رجال سے اُنس رکھتے ہیں جس کی فطرت عقل و شجاعت میں برتر ہے۔ ان کے تعلقات کی سیرت ہی سے ہر شخص جان لیتا ہے کہ وہ خالص جذبۂ محبت رکھتے ہیں اس لیے کہ انھیں عشق لڑکوں سے نہیں ہوتا بلکہ ذی ہوش انسانوں سے جن کی عقل نے حال ہی میں نشو و نما پانی شروع کی ہے قریب قریب اسی زمانے میں جب ان کی ڈاڑھی نکلنی شروع ہوتی ہے اور جب وہ نوجوانوں کو اپنی رفاقت کے لیے منتخب کرتے ہیں تو ان سے پیمان وفا کو نبھاتے ہیں اور ساری عمر ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان کی ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھائیں، انھیں دھوکا دیں اور بے وقوف بنائیں یا ایک کو چھوڑ کر دوسرے کے ہو رہیں۔ مگر لڑکوں کا عشق قانوناً ممنوع ہونا چاہیے، اس لیے کہ ان کا مستقبل غیر یقینی ہے۔

کوئی نہیں کہہ سکتا جسمانی یا روحانی حیثیت سے ان کا اٹھان اچھا ہوگا یا بُرا اور اکثر محبت کا برتر جذبہ جوان پر صرف کیا جائے رایگاں ثابت ہوتا ہے۔ اس معاملے میں پاک نفسوں کے لیے کسی قانون کی ضرورت نہیں لیکن بدوضع عاشقوں کو قانوناً روکنا چاہیے جس طرح ہم انھیں آزاد عورتوں سے عشق کرنے سے روکتے ہیں یا روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو عشق کو بدنام کرتے ہیں اور بعضوں نے جو ان تعلقات کے جواز سے انکار کیا ہے وہ ان کی بدنمائی اور بدی کو دیکھ کر کیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی چیز جو شائستگی سے اور جائز طریقے سے کی جائے بُری نہیں کہی جا سکتی۔ ہمارے ہاں اور لیکیڈیمن میں عشق کے متعلق قوانین کچھ عجیب پیچیدہ قسم کے ہیں لیکن اکثر شہروں میں بالکل سیدھے سادے ہیں اور آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ ایلس اور بیوشیا اور ان ملکوں میں جو خطابت کے مادے سے محروم ہیں یہ قوانین بالکل صاف ہیں۔ قانون نے ان تعلقات کو جائز رکھا ہے اور چھوٹا بڑا کوئی بھی ان کو بُرا نہیں کہتا، شاید اس وجہ سے کہ اس خطے کے لوگ بہت کم سخن ہیں اور عاشق یہ نہیں چاہتے کہ انھیں مقدمے میں پیروی کی زحمت گوارا کرنی پڑے۔ آیونیا وغیرہ میں اور عام طور پر ان ملکوں میں جہاں غیر یونانی قوموں کی حکومت ہے یہ دستور معیوب سمجھا جاتا ہے۔ وہاں امردوں کی محبت بھی فلسفے اور ریاضت جسمانی کی طرح بدنام ہے اس لیے کہ وہ استبداد کی دشمن ہے۔ حکمرانوں کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ رعایا بے حس ہو اور اس میں باہمی دوستی یا رفاقت کا قوی رشتہ موجود نہ ہو۔ اس کا سب سے بڑا محرک عشق ہے جیسا کہ ہمارے ایتھنس کے مستبد حکمرانوں کو تجربے سے معلوم ہوا۔ اس لیے کہ ارسٹوجائٹن کے عشق اور ہارموڈیس کی وفاداری میں اتنی قوت تھی کہ اس نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ لہٰذا ان تعلقات کی بدنامی کی ذمہ دار ان لوگوں

کی خرابی ہے جنھوں نے اسے بدنام کیا ہے یعنی حاکموں کی خود غرضی اور محکوموں کی بزدلی۔ دوسری طرف ان تعلقات کی بلا تفریق تعریف جو بعض ملکوں میں کی جاتی ہے اسے ان لوگوں کی کاہلی سے منسوب کرنا چاہیے جن کا یہ خیال ہے۔ ہمارے ملک میں بہت اچھا اصول رائج ہے مگر جیسا کہ میں کہہ رہا تھا اس کی تفصیلات ذرا پیچیدہ ہیں آپ دیکھیں گے کہ کھلے عشق کو چھپے عشق پر ترجیح دی جاتی ہے اور شریفوں اور عالی خاندانوں سے محبت کرنا خواہ وہ دوسرے سے کم حسین ہوں خاص طور پر قابلِ قدر ہے۔ اس پر بھی غور کیجیے کہ ساری دنیا عاشق کی کس درجہ ہمت افزائی کرتی ہے کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ وہ کوئی بری بات کر رہا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو تو اس کی تعریف ہوتی ہے اگر ناکامیاب ہو تو اسے الزام دیا جاتا ہے۔ اور عشق کے معاملے میں اسے دنیا کے دستور کے مطابق بہت سی ایسی انوکھی حرکتوں کی اجازت ہے کہ اگر وہ ذاتی فائدے کے یا جاہ و منصب کی خاطر کی جائیں تو فلسفہ انھیں بہت ہی برا کہے۔ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ گڑگڑائے، منت سماجت کرے، قسمیں کھائے، آستانِ یار پر پڑا رہے اور غلاموں سے بڑھ کر غلام بن جائے — — اور کوئی صورت ہوتی تو دوست دشمن سب اسے روکتے لیکن اب نہ کوئی اس کا دوست اس کی حرکت پر شرما کر اسے برا بھلا کہتا ہے اور نہ دشمن اس پر کمینہ پن یا خوشامد کا الزام لگاتا ہے۔ عاشق کے ہر فعل میں ایک دلکشی کی ادا پائی جاتی ہے اور رسم و رواج نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ افعال مستحسن ہیں اور ان میں کوئی رسوائی کی بات نہیں سب سے زیادہ تعجب تو یہ ہے کہ (لوگ کہتے ہیں) عاشق جھوٹی سچی قسمیں کھائے تو کوئی حرج نہیں۔ دیوتا اس کی ان لغزشوں سے درگزر کریں گے اس لیے کہ عاشق کی قسم دراصل قسم ہی نہیں کہی جا سکتی۔ یہ انتہائی آزادی ہمارے ملک کے دستور کے مطابق دیوتاؤں اور انسانوں نے عاشق کو

سے رکھی ہے اور اس لحاظ سے اگر کوئی شخص یہ کہے تو حق بجانب ہے کہ ایتھنس میں عاشقی اور معشوقی بڑی قابلِ عزت چیز سمجھی جاتی ہے۔ جب کہ والدین اپنے لڑکوں کو عاشقوں سے بات چیت کرنے سے منع کرتے ہیں اور ان کی حفاظت کے لیے ایک اتالیق رکھتے ہیں جو ان معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے، ان کے رفیق اور ہم چشم اگر اس طرح کی کوئی بات دیکھ پائیں تو انھیں طعنے دیتے ہیں اور ان کے بزرگ طعنہ دینے والوں کا منہ بند نہیں کرتے اور انھیں بُرا نہیں کہتے، تو ہر شخص جو ان چیزوں پر غور کرتا ہے یہی کہے گا کہ ہم لوگ عشق و عاشقی کو نہایت مذموم سمجھتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ رہا تھا میرے خیال میں درحقیقت ان چیزوں کے مذموم یا مستحسن ہونے کا سوال ایک پیچیدہ سوال ہے۔ جو شخص انھیں مستحسن طریقے سے برتے اس کے لیے مستحسن ہیں اور جو مذموم طریقے سے برتے اس کے لیے مذموم ہیں۔ بدی کا پہلو یا بدنما طریقہ اختیار کرنا مذموم ہے نیکی کا پہلو یا خوش نما طریقہ اختیار کرنا مستحسن ہے۔ بڑا ہی بد ہے وہ بازاری عاشق جو روح سے زیادہ جسم سے محبت رکھتا ہے۔ اس کے عشق میں یہ صفت بھی تو نہیں کہ پایدار ہو اس لیے کہ جس چیز سے اسے عشق ہے وہ خود ہی ناپایدار ہے۔ چنانچہ جب جوانی کی بہار جس پر وہ مرتا ہے گزر جاتی ہے تو سب قول و اقرار دھرے رہ جاتے ہیں اور اس کا عشق ہوا ہو جاتا ہے۔ مگر حسنِ سیرت کا عشق جان کے ساتھ ہے اس لیے کہ وہ ابدیت کا ہم ساز ہے۔ پس ہمارے ملک کا دستور یہ چاہتا ہے کہ دونوں کو خوب جانچا اور پرکھا جائے ایک قسم کے عاشق کی قدر کی جائے اور دوسری قسم والے سے پرہیز کیا جائے۔ چنانچہ وہ کسی کو شوق و آرزو کی اور کسی کو بے مہری و بے نیازی کی تعلیم دیتا ہے تاکہ عاشق معشوق دونوں کو مشکلوں اور آزمائشوں میں پرکھ کر معلوم کر لیا جائے کہ وہ پہلی قسم میں داخل ہیں یا دوسری میں۔ اسی وجہ سے زود آشنائی بری سمجھی جاتی ہے کیونکہ جس طرح اور سب چیزوں کا معیار وقت ہے دوستی کا بھی یہی معیار ہے۔ دوسرے مال و دولت

اور قوت و اقتدار کی محبت مذموم خیال کی جاتی ہے خواہ انسان انھیں کھو کر خوف سے مغلوب ہو جائے یا ان کا لطف اٹھانے کے بعد ان کی کشش سے نہ بچ سکے اس لیے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی پایدار نہیں۔ غرض رسم و رواج نے معشوق کے لیے محبت کا صرف ایک ہی طریقہ جائز اور مستحسن قرار دیا ہے اور وہ عفت کا طریقہ ہے کیونکہ جہاں ہم نے یہ مانا ہے کہ عاشق معشوق کی جو خدمت بھی کرے وہ نہ خوشامد سمجھی جائے گی اور نہ اس کے لیے باعثِ ذلت ہوگی وہاں معشوق کے لیے اپنی خوشی سے عاشق کی خدمت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے جو مذموم نہیں سمجھا جاتا اور وہ باعفت خدمت کا طریقہ ہے۔

"ہمارے ہاں ایک دستور ہے اور اس دستور کے مطابق اگر کوئی شخص دوسرے کی خدمت کرے یہ سمجھ کر کہ اس سے اس کی صحبت میں حکمت یا کوئی اور نیکی حاصل کرے گا تو یہ خدمت جو اپنی خوشی کی جاتی ہے باعثِ ذلت نہیں سمجھی جاتی اور اس پر خوشامد کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ یہ دونوں چیزیں یعنی ایک طرف نوجوانوں کی محبت اور دوسری طرف حکمت اور دوسری خوبیاں یکجا ہو جائیں تو معشوق باعزت طریقے سے عاشق کی آرزو پوری کر سکتا ہے اس لیے کہ جب عاشق و معشوق ملتے ہیں اور دونوں اپنے اپنے اصول پر چلتے ہیں یعنی عاشق یہ سمجھتا ہے کہ اپنے دلبر کی ہر قسم کی خدمت مناسب ہے اور معشوق یہ سمجھتا ہے کہ اس شخص کے ساتھ جو اسے حکمت اور نیکی کی تلقین کرتا ہے ہر طرح کا لطف و کرم زیبا ہے، ان میں سے ایک علم و خبر سکھاتا ہے اور دوسرا تعلیم و حکمت کی خاطر سیکھتا ہے اور جب محبت کے یہ دونوں قانون ساتھ ساتھ پورے ہوتے ہیں، تبھی یہ ممکن ہے کہ معشوق باعزت طریقے سے عاشق کی دلداری کرے۔ جب عشق ایسا بے غرض ہو تو اس میں دھوکا کھانے میں بھی کچھ ذلت نہیں مگر اور ہر طرح کے عشق میں ذلت ہی ذلت ہے خواہ انسان

دھوکا کھائے یا نہ کھائے۔ کیونکہ جو شخص اپنے عاشق کو دولت مند سمجھ کر اس کی دلداری کرتا ہے اور اسے مفلس پا کر مایوس ہوتا ہے اسے بہر حال ذلت نصیب ہوتی ہے اس لیے کہ اس نے بہ خوبی ثابت کر دیا کہ وہ زر کے لیے ہر گاہک کے ہاتھ بکنے کو تیار ہے اور یہ کوئی غیرت کی بات نہیں۔ اسی اصول پر وہ شخص جو اپنے عاشق کو نیک نفس سمجھ کر اور اس کی صحبت میں فیض پانے کی امید میں اس کا ہو رہتا ہے بہر حال اپنی نیکی کا ثبوت دیتا ہے خواہ اس کی محبت کا موضوع بدی کا پتلا اور نیکی سے کورا نکلے اگر اس سے غلطی بھی ہوئی تو یہ ایک شریفانہ غلطی ہے۔ کیونکہ اس نے ثابت کر دیا کہ اپنی طرف سے وہ نیکی اور تہذیبِ نفس کی خاطر ہر شخص کی ہر ایک خدمت کرنے کو موجود ہے اس سے زیادہ عالی ظرفی اور کیا ہو سکتی ہے۔ غرض ہر صورت میں نیکی کی خاطر دوسرے کی صحبت قبول کرنا شرافت اور عالی ظرفی ہے۔ یہی وہ محبت ہے جو آسمانی دیوی سے منسوب ہے۔ یہ ایک آسمانی چیز ہے اور شخصوں اور شہروں کے لیے بڑی نعمت ہے، کیونکہ یہ عاشق و معشوق دونوں کے دل میں تہذیبِ نفس کا شوق پیدا کرتا ہے۔ مگر اور ہر طرح کا عشق دوسری دیوی سے پیدا ہوا ہے جو دنیادی دیوی ہے تمھاری خدمت میں فیڈرس میں عشق کی یہ مدح پیش کرتا ہوں۔ یہ میری بہترین کوشش ہے جو میں فی البدیہہ کر سکتا تھا۔"

پاسنیاس حق شناس نے سلسلۂ کلام اختتام کو پہنچایا مگر اس مرصع زبان میں گفتگو کرنا میں نے اربابِ دانش سے سیکھا ہے ارسطوڈیمس کہتا ہے کہ اس کے بعد ارسطوفینس کی باری تھی مگر یا تو وہ کھا بہت گیا یا کوئی اور وجہ تھی کہ اُسے برابر ہچکیاں آ رہی تھیں اور اسے اپنی باری اریکسیمکس طبیب سے بدلنی پڑی جو اس سے دوسرے کوچ پر ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ اس نے کہا اریکسیمکس یا تو میری ہچکیوں کو روک دو یا ان کے بند ہونے تک میرے بدلے تم تقریر کر دو۔"

اریکیمیکس نے جواب دیا: "میں یہ بھی کروں گا اور وہ بھی۔ میں تمھاری باری پر بولوں گا اور تم میری باری پر بولنا۔ اتنے میں تقریر کروں تم پہلے سانس روکنے کی کوشش کرو اور اگر کچھ دیر سانس روکنے سے ہچکیاں کم نہ ہوں تو ذرا سا پانی لے کر غرغرہ کر ڈالو اور اگر اس پر بھی آتی رہیں تو کسی چیز سے ناک کو چھیڑ کر چھینکو۔ جہاں دو ایک چھینکیں آئیں سخت سے سخت ہچکی بھی رُک جائے گی۔" ارسٹوفینیس نے کہا "میں تمھاری ہدایت پر عمل کروں گا تم بسم اللہ کرو۔"

اریکیمیکس نے اپنی تقریر یوں شروع کی: "پاسینیاس نے ابتدا تو اچھی خاصی کی تھی مگر آخر میں گڑبڑ کر دی۔ اب میں اس کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرے خیال میں وہ تفریق جو اس نے عشق کی دونوں قسموں میں کی ہے بالکل درست ہے۔ مگر میرا فن مجھے یہ بھی بتاتا ہے کہ عشق کی یہ دونوں قسمیں صرف روحِ انسانی کی اس رغبت تک محدود نہیں جو وہ حُسن یا کسی اور چیز سے رکھتی ہے۔ انسان کے علاوہ یہ سب حیوانات اور نباتات بلکہ کل موجودات میں پائی جاتی ہیں۔ یہ نتیجہ میں نے خود اپنے فن طب کے مطالعے سے اخذ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق کی دیوی کیا عظمت و شان رکھتی ہے اور کس قدر عالمگیر اثر رکھتی ہے۔ اس کی حکومت انسانوں کی دنیا سے لے کر دیوتاؤں کی دنیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ سب سے پہلے میں طب کی مثال پیش کرتا ہوں تاکہ اپنے فن کا حق ادا کروں۔ انسان کے جسم میں محبت کی یہ دونوں قسمیں موجود ہیں۔ وہ صریحاً ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں اور اسی کی وجہ سے ان کے رجحانات اور خواہشات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ صحیح کی خواہش کچھ اور ہوتی ہے اور مریض کی کچھ اور۔ پاسینیاس نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اچھوں کی آرزو پوری کرنی جائز ہے اور بُروں کی آرزو پوری کرنی ناجائز۔ اسی طرح جسم کے اندر بھی صحیح عناصر کی خواہش پوری کرنی چاہیے مگر

مریض عناصر کی نہیں کرنی چاہیے بلکہ انھیں دبانا چاہیے۔ یہی طبیب کو کرنا پڑتا ہے اور اسی پر طب کا فن مشتمل ہے۔ ہم طب کی عام تعریف یوں کر سکتے ہیں، وہ علم جو اس بات سے بحث کرتا ہے کہ جسم کی خواہشیں اور رغبتیں اور انھیں پورا کرنے یا نہ کرنے کے طریقے کیا ہیں؟ بہترین طبیب وہ ہے جو اچھی اور بُری خواہش میں تمیز کر سکتا ہے اور بُری خواہش کی جگہ اچھی خواہش پیدا کر سکتا ہے۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ ایک رغبت کو دور کر کے دوسری مطلوبہ رغبت کیسے پیدا کی جا سکتی ہے اور طبیعت کے متضاد اور متقابل عناصر میں ہم آہنگی پیدا کر کے انھیں ایک دوسرے کا دوست کیونکر بنایا جا سکتا ہے، وہی باکمال معالج سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اختلاف ان چیزوں میں پایا جاتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مثلاً سرد و گرم، تلخ و شیریں، خشک و تر وغیرہ۔ میرے جد اسکلیپیس نے جو ان چیزوں میں امتزاج اور اختلاط پیدا کرنے کا گُر جانتا تھا، طب کا فن ایجاد کیا۔ یہ روایت ہمارے دوست شاعر جو یہاں موجود ہیں بیان کرتے ہیں، میں اسے صحیح سمجھتا ہوں۔ نہ صرف طب کی کل شاخوں بلکہ جمناسٹک اور زراعت میں بھی یہی اصول کارفرما ہے اور جو شخص ذرا سا بھی غور کرے اسے صاف نظر آجائے گا کہ موسیقی میں بھی یہی اضداد کا امتزاج موجود ہے۔ شاید ہراکلائیٹس کا یہی مطلب تھا گو اس کے الفاظ کچھ مبہم سے ہیں وہ کہتا ہے:۔ وحدت متضاد چیزوں کے اتحاد سے پیدا ہوتی ہے جیسے زخمہ و بربط کی ہم آہنگی۔ ظاہر ہے کہ یہ کہنا تو بالکل مہمل ہے کہ ہم آہنگی تضاد کا نام ہے یا ان عناصر پر مشتمل ہے جو اب تک تضاد کی حالت میں ہیں۔ غالباً اس کا مدعا یہ تھا کہ ہم آہنگی ان اونچے یا نیچے سُروں کو یکجا ہونے سے وجود میں آتی ہے جو کبھی بے میل تھے مگر اب فن موسیقی نے ان میں میل پیدا کرا دیا ہے اس لیے کہ اگر اونچے یا نیچے سُر کبھی بے میل ہوتے تو اُن میں ہم آہنگی کیونکر ہو سکتی تھی۔ یہ تو

کھلی ہوئی بات ہے اس لیے کہ ہم آہنگی کئی سُروں کے اتحاد کا نام ہے اور اتحاد مطابقت کو کہتے ہیں ۔ متضاد چیزوں میں جب تک وہ حالت تضاد میں ہوں مطابقت ہو ہی نہیں سکتی ۔ آپ اضداد میں ہرگز ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکتے ۔ اسی طرح وزن ، سبب اور وتد کی ترکیب ہے جن میں پہلے اختلاف تھا اور اب اتحاد ہے ۔ یہ اتحاد پہلی مثال میں فن طب نے پیدا کیا ہے اور سب مثالوں میں موسیقی نے اسی کی بدولت سُروں میں محبت اور یک جہتی پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ موسیقی میں بھی وہی عشق کے قوانین ہم آہنگی اور وزن کے اندر کارفرما ہیں ۔ ہم آہنگی اور وزن کے مجرد تصور میں ہمیں آسانی سے اس عشق کا جلوہ نظر آ سکتا ہے جس میں ابھی تک دوئی کا دخل نہیں ہے لیکن جب ان چیزوں سے واقعی زندگی میں کام لینا ہو مثلاً گیت بنانے میں یا بنے بنائے راگوں اور بحروں کو صحیح طریقے سے ادا کرنے میں ، جسے تعلیم کہتے ہیں ، تو مشکل پیش آتی ہے اور استاد فن کی ضرورت پڑتی ہے ۔ تب وہ پرانی کہانی دہرانی پڑتی ہے ۔ ایک طرف آسمانی عشق یعنی حسین و جمیل آسمانی دیوی یورانیا کا عشق ، عفت پسندی کی ضرورت ، عفت و استقلال کی تلقین اور دوسری طرف دنیاوی دیوی پولی ہمنیا کی محبت اور اس کے برتنے میں احتیاط کی تاکید تاکہ لذت حاصل کی جائے لیکن عیاشی کی حد تک نہ پہنچنے پائے ۔ اسی طرح جیسے میرے فن میں یہ نہایت اہم مسئلہ ہے کہ جس شخص کو اچھے کھانے کا شوق ہے اس کی خواہشات میں ضبط پیدا کیا جائے تاکہ وہ اپنا شوق بھی پورا کر سکے اور بیماری سے بھی محفوظ رہے ۔ اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ موسیقی طب اور زمین و آسمان کی ہر چیز میں ہمیں عشق کی ان دونوں قسموں پر نظر رکھنی چاہیے اس لیے کہ یہ دونوں موجود ہوتی ہیں ۔

موسمی تغیرات میں بھی اول سے آخر تک یہ دونوں چیزیں موجود ہیں ۔ جیسا کہ

میں نے کہا ہی جس وقت گرم و سرد، خشک وتر عناصر میں متوازن محبت ہوتی ہی اور وہ اعتدال اور ہم آہنگی کے ساتھ آپس میں ملتے ہیں تو وہ انسان، حیوانات نباتات سب کے لیے صحت اور فراغت کا باعث ہوتے ہیں اور کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتے۔ لیکن جب بے قید محبت غالب آجائے اور موسموں پر اثر انداز ہو تو وہ سخت مضر اور مہلک ثابت ہوتی ہی اس کی وجہ سے وبا پھیل جاتی ہی اور حیوانات و نباتات کو طرح طرح کے روگ لگ جاتے ہیں۔ انھیں عناصر کے عشق کی بے اعتدالی اور بے ترتیبی اولے پالے یا لو کی شکل میں ظاہر ہوتی ہی اور ان کا اجرامِ سماوی کی گردش اور موسموں کی ردو بدل کے ساتھ جاننا علمِ ہیئت کہلاتا ہی۔ اس کے علاوہ مذہبی قربانیاں وغیرہ اور کہانت کا سارا کاروبار یعنی انسانوں اور دیوتاؤں کا تعلق اسی پر منحصر ہی کہ نیک عشق قائم رکھا جائے اور بدعشق کو دور کر دیا جائے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنے تمام افعال اور جذبات میں خواہ وہ دیوتاؤں سے متعلق ہوں یا ماں باپ سے، مُردوں سے یا زندوں سے ہم آہنگ اور معتدل محبت کی جگہ غیر معتدل محبت اختیار کرے اور اس کے آگے سر جھکائے تو طرح طرح کی بے دینی پھیل جائے گی۔ چنانچہ کہانت کا کام یہ ہی کہ اس قسم کی محبت کا تدارک اور اصلاح کرے۔ کہانت انسانوں اور دیوتاؤں میں صلح کرانے والی ہی اور اس کے عمل کی بنیاد اس علم پر ہی کہ انسان کے عشق و محبت میں کون سے رجحانات دین داری کے ہیں اور کون سے بے دینی کے۔ یہاں تک تو عام عشق کی عظمت و قدرت کا ذکر تھا۔ اب رہا وہ خاص عشق جو نیکی سے وابستہ ہی اور عدل و عفت سے آراستہ ہی خواہ انسانوں کا ہو یا دیوتاؤں کا وہ قوت کا خزانہ اور ہماری مسرت اور یک جہتی کا سرچشمہ ہی۔ وہی ہمیں عالمِ بالا کے دیوتاؤں سے اور اپنے ہم جنس انسانوں سے رشتۂ الفت میں مربوط کرتا ہی

ممکن ہے کہ میں بھی بعض باتیں جو عشق کی مدح میں کہی جا سکتی ہیں چھوڑ گیا ہوں لیکن ممکن ہے کہ یہ قصور مجھ سے نادانستہ ہوا ہو گا اور اب ارسطوفینیس تم اس کمی کو پورا کر دو یا مدح سرائی کا کوئی دوسرا انداز اختیار کرو کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ تمھاری ہچکیاں بند ہو گئی ہیں۔"

ارسطوفینیس نے کہا" ہاں بھئی ہچکیاں تو چلی گئیں مگر اسی وقت گئیں جب میں نے آچھیں کا نسخہ استعمال کیا۔ شاید جسم کی ہم آہنگی کو ناک میں گدگدانے اور چھینک کی آواز سے عشق ہے اس لیے کہ چھینک آتے ہی میں اچھا ہو گیا"۔

اریکیمیکس بولا" خبردار، دوست ارسطوفینیس اب تمھاری بولنے کی باری ہے اور پھر بھی تم میری ہنسی اڑا رہے ہو اب میں گھات میں رہوں گا کہ جہاں ذرا موقع ملے میں بھی تم پر ہنسوں ورنہ میں تمھیں اطمینان سے گفتگو کرنے دیتا"۔

ارسطوفینیس نے ہنس کر کہا" تم سچ کہتے ہو۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں خدا کے لیے تم میری گھات میں نہ رہو مجھے ڈر ہے کہ جو تقریر میں کرنے والا ہوں بجائے اس کے کہ آپ لوگ اس سے محظوظ ہو کر ہنسیں جو ظرافت کا نتیجہ ہے اور بڑی اچھی چیز ہے وہ خود مجھی پر ہنسیں گے"۔

" تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اپنا وار کر کے دوسروں کے وار سے بچ جاؤ گے؟ خیر اگر تم احتیاط سے کام لو اور اس کا خیال رکھو کہ تمھاری لغزشوں کی گرفت کی جائے گی تو شاید مجھے رحم آجائے اور میں تمھیں چھوڑ دوں"۔

ارسطوفینیس کا یہ دعویٰ تھا کہ میں بحث کا ایک اور پہلو پیش کروں گا اور عشق کی تعریف کا ایک نیا طرز اختیار کروں گا جو پاسینیاس اور اریکیمیکس دونوں کے طرز سے الگ ہوگا۔ اس نے کہا بنی نوع انسان عشق کی جیسی بے قدری کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس کی قدرت کا مطلق اندازہ نہیں کیونکہ اگر انھیں

اندازہ ہوتا تو وہ اس کے لیے شاندار مندر اور قربان گاہیں بناتے اور اس کے نام پر قربانیاں کرتے۔ ایسا نہیں ہوتا حالانکہ یقیناً ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ سب دیوتاؤں میں وہی انسان کا سب سے بڑا دوست اور ان سب مصیبتوں کا دور کرنے والا ہے جو انسان کی راحت میں سدراہ ہیں میں کوشش کروں گا کہ اس کی قدرت وقوت آپ کے سامنے بیان کروں اور جو کچھ میں آپ کو بتاتا ہوں آپ ساری دنیا کو بتائیں گے۔ اگر اجازت ہو تو پہلے اس پر روشنی ڈالوں کہ انسانی فطرت کیا تھی اور اس میں کیا تغیر ہوا اس لیے کہ ابتدا میں انسان ایسے نہ تھے جیسے آج کل ہیں بلکہ اس سے مختلف تھے۔ جنسیں دو نہ تھیں جیسی کہ اب ہیں بلکہ تین تھیں۔ مرد، عورت اور ان دونوں کا مجموعہ جس کا نام اس دوئی کے لحاظ سے خنثے تھا۔ یہ جنس پہلے حقیقی وجود رکھتی تھی مگر اب معدوم ہو گئی۔ صرف اس کا نام رہ گیا ہے اور اب گالی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ابتدائی انسان گول ہوتا تھا یعنی اس کی پشت اور پہلوؤں سے ایک دائرہ بن جاتا تھا۔ اس کے چار ہاتھ اور چار پانو تھے اور ایک سر جس میں ادھر اُدھر دو بالکل یکساں چہرے۔ گول گردن میں جڑے ہوتے تھے، چار کان تھے، دو اعضائے تناسل اور اسی مناسبت سے بقیہ اعضا۔ وہ کھڑا بھی چل سکتا تھا جیسے انسان اب چلتے ہیں چاہے آگے کی طرف چاہے پیچھے کی طرف اور اپنے آٹھ ہاتھ پیروں پر تیزی سے لڑھک بھی سکتا تھا جیسے لوٹن کبوتر ٹانگیں اٹھا کر لوٹ لگاتے ہیں۔ یہ اس وقت کرتا تھا جب اسے تیز دوڑنا ہو غرض جنسیں جیسا کہ میں نے کہا ہے تین تھیں۔ اس لیے کہ چاند سورج اور زمین مل کر تین ہیں اور مرد اصل میں سورج سے پیدا ہوا ہے عورت چاند سے اور خنثے زمین سے جو چاند اور سورج سے مرکب ہے۔ یہ سب گول تھے اور اپنے ماں باپ کی طرح گردش کرتے تھے۔ ان کی طاقت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور ان کے حوصلے

اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ انھوں نے ایک بار دیوتاؤں پر حملہ کر دیا۔ اوٹائس اور ایفیالیٹس یہی تھے جن کا قصہ ہومر نے لکھا ہے کہ بے باکی سے آسمان پر چڑھ گئے اور قریب تھا کہ دیوتاؤں پر ہاتھ اٹھائیں۔ آسمانی مجلس عجب شش و پنج میں تھی، کیا انھیں ہلاک کر ڈالیں، اور بجلیاں گرا کر ساری نسل کو معدوم کر دیں جیسا جنات کے ساتھ کیا تھا؟ اس صورت میں وہ قربانیاں اور وہ عبادت جو انسان دیوتاؤں کے لیے کرتے ہیں بند ہو جائیں گی۔ مگر یہ بھی ناممکن تھا کہ دیوتا ان کی گستاخیوں کو حد سے بڑھ جانے دیں۔ آخر بڑے غور و فکر کے بعد زیس کو ایک بات سوجھی۔ اس نے کہا "میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی ہے جو ان کے غرور کو توڑ دے گی اور ان کو سیدھا کر دے گی۔ انسان زندہ رہنے دیے جائیں گے لیکن میں ان کے دو ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ ان کی طاقت گھٹ جائے گی اور تعداد بڑھ جائے گی۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہمارے لیے زیادہ کارآمد بن جائیں گے وہ کھڑے دو ٹانگوں پر چلا کریں گے اور اگر ان کی گستاخی کا یہی حال رہا اور وہ کسی طرح نہ مانے تو میں پھر ان کے دو ٹکڑے کر دوں گا اور وہ ایک ٹانگ پر پھدکا کریں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے ان کے دو ٹکڑے کر دیے جیسے سورب[۱] کا پھل اچار کے لیے تراشیں یا جیسے انڈے کو بال سے کاٹ دیں اور جب وہ انھیں باری باری سے کاٹتا تھا تو اس کے حکم سے اپالو ان کے چہرے اور آدھی گردن کو موڑ دیتا تھا تاکہ انسان اپنی تقسیم کو دیکھ سکے اور عاجزی کا سبق سیکھے۔ پھر اپالو کو یہ حکم دیا گیا کہ ان کے زخموں کو اچھا کر دے اور ان کے جسم کو سڈول بنا دے چنانچہ اس نے ان کا چہرہ پھر موڑ دیا اور اس جگہ پر جسے ہم اپنی زبان میں پیٹ کہتے اس نے سمٹنے والی تھیلیوں کی طرح ہر طرف سے کھال کو سمیٹا اور بیچ میں ایک منہ بنا کر گرہ لگا دی

[۱] شمالی یورپ کا ایک پھل جو چھوٹی ناشپاتی کی شکل کا ہوتا ہے۔

(وہی جسے ناف کہتے ہیں) پھر اس نے سینے کو ٹھیک کیا اور بہت سی سلوٹیں نکالیں جیسے موچی چمڑے کو ہموار کرتا ہے لیکن پیٹ اور ناف کے قریب کچھ سلوٹیں چھوڑ بھی دیں تاکہ اس کی ابتدائی حالت کی یادگار باقی رہے۔ اس تقسیم کے بعد انسان کے دونوں ٹکڑے جن کا دل ایک دوسرے کی طرف کھنچتا تھا آپس میں ملتے اور گلے میں باہیں ڈال کر لپٹ جاتے اس آرزو میں کہ پھر سے جڑ کر ایک ہو جائیں۔ قریب تھا کہ وہ بے پروائی اور بھوک سے مر جائیں اس لیے کہ الگ الگ رہ کر ان کا جی کچھ بھی کرنے کو نہیں چاہتا تھا اور جب ایک ٹکڑا مر جاتا اور دوسرا زندہ رہتا تو وہ کوئی اور جوڑا (یعنی ہماری اصطلاح میں کوئی مرد یا عورت در اصل میں پورے مرد یا عورت کا ایک ٹکڑا) تلاش کر لیتا اور اس سے چمٹا رہتا۔ وہ تباہ ہوئے جاتے تھے کہ ایک دن زیس نے ان پر ترس کھا کر ایک اور تدبیر سوچی۔ اس نے ان کے اعضائے نہانی کو آگے کی طرف کر دیا ورنہ پہلے ان کی یہ جگہ نہ تھی اور اب وہ اپنا تخم ٹڈے کی طرح زمین پر نہیں ڈالتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے اندر۔ اس تبدیلی کے بعد نر نے مادہ کے اندر تولید کا عمل شروع کیا تاکہ مرد عورت کے وصل سے بچے پیدا ہوں اور نسل چلتی رہے یا اگر ایک مرد دوسرے سے ملے تو ان کا دل خوش ہو، وہ آرام کریں اور پھر جا کر اپنے اپنے کام میں لگ جائیں۔ اس قدر قدیم ہے ایک دوسرے کی خواہش جو ہمارے خمیر میں ہے، باہمی وصل سے ہماری فطرت اصلی کو بحال کرتی ہے، دو کو ملا کر ایک کر دیتی ہے اور انسان کی شکست کو جوڑ دیتی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک جب اکیلا ہو اور چپٹی مچھلی کی طرح صرف ایک رُخ رکھتا ہو پورا انسان نہیں بلکہ صرف اس کا مثنّیٰ ہے اور ہمیشہ دوسرے کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ مرد جو ایک حصہ ہیں اس مرکب جنس کا، جسے کسی زمانے میں مخنث کہتے تھے عورتوں سے محبت کرتے ہیں۔ بدکار مرد عموماً اسی نسل کے

ہوتے ہیں اور یہی حال بدکار عورتوں کا ہے جو مردوں سے ناجائز محبت رکھتی ہیں۔ وہ عورتیں جو عورت کے جسم کا ایک حصہ ہیں مردوں سے رغبت نہیں رکھتیں بلکہ عورتوں سے مانوس ہوتی ہیں۔ وہ جو دوگانا کہلاتی ہیں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ مگر وہ مرد جو مرد کے جسم کا ایک حصہ ہیں۔ مردوں کے پیچھے پھرتے ہیں۔ کم سنی میں وہ مردوں کے ساتھ رہتے ہیں اور ان سے بغل گیر ہوتے ہیں اور وہ خود لڑکوں اور نوجوانوں میں سب سے بہتر ہوتے ہیں اس لیے کہ ان میں سب سے زیادہ مردانگی ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ انھیں بے شرم کہتے ہیں مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل بے شرمی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ مردانہ شجاعت اور وجاہت رکھتے ہیں اور ان لوگوں سے جو ان چیزوں میں اُن سے مشابہ ہیں، شوق سے گلے ملتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو بڑے ہو کر ہمارے سیاست داں اور مدبر بنتے ہیں اور یہ بھی میرے دعوے کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ جب یہ پورے مرد ہو جاتے ہیں تو امردوں سے عشق رکھتے ہیں اور انھیں فطری طور پر شادی کرنے یا بچّے پیدا کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اگر ایسا کرتے ہیں تو محض قانون کی پابندی کے لیے۔ لیکن وہ خوش تبھی ہوتے ہیں کہ تجرد کی حالت میں ایک دوسرے کی صحبت میں زندگی بسر کریں۔ ایسی طبیعتوں میں عشق و محبت کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ اپنی سی طبیعت رکھنے والوں سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ اور جب ان سب لوگوں میں سے کوئی اس دوسرے ٹکڑے سے جو حقیقت میں خود اسی کا ٹکڑا ہے ملتا ہے خواہ وہ امردوں کا عاشق ہو یا دوسری قسم کا عاشق تو دونوں محبت اور دوستی اور اختلاط کے حیرت کدے میں محو ہو کر رہ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو لمحے بھر کے لیے بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ساری عمر ایک دوسرے کی صحبت میں بسر کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم ایک

دوسرے سے کیا چاہتے ہو تو کچھ نہ بتا سکیں گے، اس لیے کہ ان کے دل میں جو شدید آرزو ایک دوسرے کی ہے وہ جسمانی وصل کی خواہش نہیں معلوم ہوتی بلکہ کسی اور چیز کی جسے دونوں کی روح صریحاً چاہتی ہے مگر بتا نہیں سکتی کہ کیا ہے بلکہ اس کا ایک دھندلا اور مبہم سا تصور رکھتی ہے۔ فرض کرو کہ ہیفیسٹس اپنے آلات لیے ہوئے ایک جوڑے کے پاس آئے جو ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹا ہوا ہے اور پوچھے "آخر تم ایک دوسرے سے کیا چاہتے ہو" اور ان کی الجھن دیکھ کر کہے "کیا تم چاہتے ہو کہ بالکل ایک ہو جاؤ اور دن رات ایک دوسرے کی صحبت میں رہو اس لیے اگر تمھاری یہ خواہش ہو تو میں اس پر تیار ہوں کہ تمھیں پگھلا کر جوڑ دوں اور تم دو ہوتے ہوئے بھی ایک ہو جاؤ اور جب تک ایک واحد شخص کی طرح جیو اور مرنے کے بعد عالمِ اسفل میں دو کے بجائے ایک روح کی طرح داخل ہو ۔۔۔ میں پوچھتا ہوں کیا تمھاری دلی تمنا یہی ہے اور اگر یہ حاصل ہو جائے تو تم مطمئن ہو جاؤ گے؟" تو ان میں سے ایک شخص بھی نہ ہوگا جو اس تجویز کو سن کر رد کر دے اور یہ اعتراف نہ کرے کہ اس طرح ملنا اور گھل مل جانا دو جانوں کی بجائے ایک جان ہو جانا اس کی عین تمنا ہے جو ہمیشہ سے اس کے دل میں چھپی ہوئی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانی فطرت اصل میں ایک تھی، ہم سب ایک کل کے اجزا ہیں اور اس کل کی طلب کو عشق کہتے ہیں جیسا میں نے کہا ایک زمانے میں ہم ایک تھے لیکن ہمارے اعمال کی پاداش میں خدا نے ہمیں جدا کر دیا ہے جس طرح لکیڈیمونیا والوں نے آرکیڈیا والوں کو دیہات میں ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا اور اگر ہم نے دیوتاؤں کا حکم نہ مانا تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو ہم پھر سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیے جائیں اور نبت کاری کے نیم رخ مجسموں کی طرح جو یادگاروں پر بنائے جاتے ہیں آدھی ناک لیے ہوئے پھریں اور ہماری حالت

ان چوبی مہروں کی سی ہو جائے جن کے آدھے آدھے ٹکڑے شمار کے لیے الگ کر لیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ سب لوگوں کو پرہیزگاری کی تلقین کریں تاکہ ہم بدی سے محفوظ رہیں اور نیکی حاصل کریں جس کا مالک عشق ہی اور جو ہمیں اس کے توسط سے حاصل ہو سکتی ہی کسی کو عشق کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس کا مخالف سب دیوتاؤں کا دشمن ہی۔ اگر عشق کے دیوتا سے ہماری دوستی اور صلح ہو تو ہمیں اپنے اصلی معشوق مل جائیں۔ یہ آج کل اس دنیا میں بہت کم ہوتا ہی۔ میں بہت سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہوں اس لیے مجھے امید ہی کہ اریکسیمکس صاحب اس کی ہنسی نہ اڑائیں گے اور نہ یہ سمجھیں گے کہ میرا اشارہ پاسنیاس اور اگاتھن کی طرف ہی۔ یہ دونوں بھی میرے خیال میں مردانہ طبیعت رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے زمرے میں داخل ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہی مگر میں تو ایک عام بات کہہ رہا ہوں جس کا تعلق ہر ملک و قوم کے مردوں اور عورتوں سے ہی۔ میرا عقیدہ ہی کہ اگر ہماری محبت مکمل ہو اور ہر شخص اپنی ابتدائی فطرت کی طرف رجوع کرتے ہوئے اپنے اصلی معشوق کو پالے تو ہماری قوم کو حقیقی راحت میسر آجائے۔ گو بہترین صورت تو یہی ہی مگر اس کے بعد اور موجودہ حالات میں سب سے بہتر یہ ہی کہ جہاں تک ہو سکے ہم محبت کے اس نصب العین سے قریب تر پہنچ جائیں یعنی ہمیں ایک ہم مذاق اور ہم ساز معشوق مل جائے۔ اس لیے اگر ہم پر ان لوگوں کا شکریہ واجب ہی جنھوں نے ہم پر احسان کیا ہو تو ہمیں عشق کے دیوتا کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو ہمارا سب سے بڑا محسن ہی ہمیں اس زندگی میں ہماری اصلی فطرت کی طرف لوٹاتا ہی اور آیندہ کے لیے بڑی امیدیں بندھاتا ہی۔ اس کا وعدہ ہی کہ اگر ہم پرہیزگاری کی زندگی بسر کریں تو وہ ہمیں پھر ہماری اصلی حالت پر لے آئے گا، ہمارے زخموں کو مندمل کر دے گا اور ہمیں راحت و سعادت عطا کرے گا

یہ ہے اریکسیمیکس عشق کی مدح جو مجھے کرنی تھی۔ اگرچہ میری تقریر تمھاری تقریر سے مختلف ہے مگر میری التجا ہے کہ تم اس کی ہنسی نہ اڑاؤ تاکہ جو لوگ باقی ہیں ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی باری تقریر کرے اور ہر شخص کیا دو ہی آدمی تو باقی ہیں اگاتھن اور سقراط۔"

اریکسیمیکس نے کہا "نہیں بھئی میں تم پر حملہ نہیں کرنے کا، مجھے تو تمھاری تقریر بہت ہی پسند آئی اور اگر میں نہ جانتا کہ سقراط اور اگاتھن دونوں عشق و محبت کے فن میں استاد ہیں تو مجھے واقعی یہ اندیشہ ہوتا کہ جس قدر باتیں اب تک کہی جا چکی ہیں اس کے بعد ان کے لیے کچھ بھی کہنے کو نہ رہے گا۔ لیکن مجھے اب بھی ان سے بہت کچھ امید ہے۔"

سقراط بولا "اریکسیمیکس تم نے اپنا حق ادا کر دیا لیکن اگر تمھارا وہ حال ہوتا جو میرا ہے بلکہ جو اگاتھن کے بولنے کے بعد میرا ہوگا تب تمھیں مشکل پڑتی۔"

اگاتھن نے کہا "اب تم ایسا منتر پڑھنا چاہتے ہو کہ لوگ مجھ سے بہت اچھی تقریر کی توقع کریں اور میں اور بھی گھبرا جاؤں۔"

سقراط نے جواب دیا "اگاتھن اگر میں یہ سمجھوں کہ تم چند دوستوں کے سامنے گھبرا جاؤ گے تو گویا میں نے یہ بات بھلا دی کہ جس وقت تمھارا ڈراما ہو رہا تھا تم نے کس قدر جرأت و ہمت سے کام لیا اور کس طرح ایکٹروں کے ساتھ اسٹیج پر آ کر بے دھڑک اس زبردست مجمع کے سامنے کھڑے ہو گئے۔"

اگاتھن نے کہا سقراط کیا تمھارے خیال میں تھیٹر سے میرا سر پھر گیا ہے اور میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ ایک سمجھ دار آدمی چند اچھے مبصروں سے زیادہ مرعوب ہوتا ہے بہ نسبت بہت سے بے وقوفوں کے؟"

سقراط نے جواب دیا "ہرگز نہیں۔ میری سخت غلطی ہوگی اگر میں یہ یا اسی قسم کا کوئی اور ناشائستہ خیال تمھاری طرف منسوب کروں، اور میں اچھی طرح

جانتا ہوں کہ اگر تمھیں ایسے لوگ مل جائیں جنھیں تم دانش مند سمجھتے ہو تو تم عوام کی رائے کے مقابلے میں ان کی رائے کی زیادہ قدر کروگے لیکن ہم لوگ خود ہی اُن بہت سے بے وقوفوں میں شامل ہیں جو تھیٹر میں موجود تھے۔ ہمارا شمار منتخب دانش مندوں میں کیونکر ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ مجھے یقین ہے کہ اگر تم ہم جیسے لوگوں کے سامنے نہیں بلکہ کسی سچ مچ کے دانش مند آدمی کے سامنے ہوتے تو تمھیں اس کے سامنے ذلت اٹھاتے شرم آتی۔ ہے نہ یہی بات؟"

اگاتھن نے کہا "جی ہاں"۔

"لیکن عام لوگوں کے سامنے تم اپنے خیال میں کوئی ذلیل حرکت کر رہے ہوتے تو تمھیں شرم نہ آتی؟" یہاں فیڈرس نے قطع کلام کرکے کہا "دوست اگاتھن تم ان کے سوال کا جواب نہ دینا جہاں انھیں کوئی بات کرنے کو مل گیا خصوصاً کوئی خوبصورت آدمی تو پھر اس کا ذرا بھی دھیان نہیں کرتے کہ جو بات ہم نے طے کی ہے اُسے پورا کریں۔ یوں تو مجھے ان کی باتیں دل سے پسند ہیں مگر اس وقت عشق کی مدح کو نہیں بھولنا چاہیے جو ان کو اور ہر شخص کو کرنی ہے۔ جب تم اور وہ عشق کے دیوتا کے سامنے خراجِ عقیدت پیش کر لو تو پھر شوق سے باتیں کرنا۔"

اگاتھن بولا "بہت خوب فیڈرس۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں اپنی باری تقریر نہ کروں اس لیے کہ سقراط سے باتیں کرنے کے اور بہت سے موقع مل جائیں گے۔ پہلے میں یہ بتا دوں کہ کس انداز سے تقریر کروں گا۔ پھر جو کچھ کہنا ہے کہوں گا۔

"جو لوگ مجھ سے پہلے بولے وہ بجائے اس کے کہ عشق کے دیوتا کے اوصاف بیان کرتے اور اس کی سیرت پر روشنی ڈالتے نوعِ انسانی کو ان نعمتوں پر مبارکباد دیتے رہے جو اسے عشق نے بخشی ہیں مگر میں پہلے دیوتا کے اوصاف بیان کروں گا اور پھر اس کی نعمتوں کا ذکر کروں گا۔ یہی ہر چیز کی تعریف کا صحیح طریقہ ہے اگر آپ

بے ادبی نہ سمجھیں اور بُرا نہ مانیں تو میں عرض کروں کہ سب پاک دیوتاؤں میں وہ سب سے حسین اور سب سے اچھا ہے۔ اول تو وہ سب سے کم سن ہے اور اپنی کم سنی کا آپ ہی گواہ ہے کیونکہ وہ بڑھاپے سے دور رہتا ہے گو بڑھاپا بہت تیز رو ہے اور اس کی تیز روی ہم میں سے بہتوں کو بُری معلوم ہوتی ہے۔ عشق کو اس سے نفرت ہے اور اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔ مگر شباب اور عشق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بہ قول شخصے ع کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ فیڈرس نے عشق کے متعلق بہت سی باتیں کہی ہیں جن سے مجھے اتفاق ہے مگر میں یہ نہیں مان سکتا کہ وہ ایاپٹیس اور کرونس سے زیادہ معمر ہے۔ نہیں میرے خیال میں تو سب دیوتاؤں سے کم عمر اور سدا جوان ہے۔ دیوتاؤں کے جن کاموں کا ذکر ہیسیڈ اور پارمینڈیز کے ہاں ہے، بہ شرطیکہ یہ روایات صحیح مان لی جائیں، وہ عشق دیوتا کے کارنامے نہیں بلکہ احتیاج کی دیوی کے ہیں۔ اگر عشق دیوتا ان دنوں موجود ہوتا تو نہ دیوتا ایک دوسرے کو قید یا مجروح کرتے نہ اور کسی قسم کے تشدد سے کام لیتے بلکہ امن و امان اور لطف و کرم کا دور دورہ ہوتا جیسا کہ آسمان پر اس روز سے ہے جس روز عشق کی حکومت شروع ہوئی۔ عشق کم سن بھی ہے اور نازک بھی۔ اس کی نزاکت کو بیان کرنے کے لیے ہومر جیسا شاعر چاہیے جس نے اپنے دیوی کی نزاکت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اس کے پانو نازک اور سبک ہیں، وہ زمین پر
قدم نہیں رکھتی بلکہ انسانوں کے سروں پر۔"

اس کی نزاکت کا کتنا اچھا ثبوت ہے کہ وہ کسی سخت چیز پر نہیں بلکہ نرم چیز پر چلتی ہے۔ آؤ ہم بھی اسی طرح عشق کی نزاکت کا ثبوت پیش کریں۔ وہ نہ تو زمین پر چلتا ہے نہ انسانوں کی کھوپڑیوں پر کیونکہ وہ بھی کچھ ایسی کچھ زیادہ نرم نہیں ہوتیں اس کی رہ گزر انسانوں اور دیوتاؤں کے دل ہیں اور ان کی روحیں جن سے زیادہ نرم دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ انھیں میں چلتا پھرتا ہے اور انھیں میں رہتا سہتا ہے لیکن

ہر قلب بلا استثنا اس کا مسکن نہیں ہے اس لیے کہ جہاں سختی ہو وہاں سے وہ بھاگتا ہے اور جہاں نرمی ہو وہاں بس جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب وہ سب سے نرم جگہ پر پانو سکوڑ کر اور طرح طرح سے دبک کر آرام سے بیٹھ سکتا ہے تو اس سے زیادہ نرم کیا چیز ہو سکتی ہے؟ درحقیقت وہ سب سے کم سن اور سب سے نازک ہے اور اس کے جسم میں لچک ہے اس لیے کہ اگر وہ سخت اور بے لوچ ہوتا تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ہر چیز سے لپٹ جائے اور انسان کے دل میں اس طرح آتا جاتا ہو کہ اسے خبر بھی نہ ہو اس کی لچک اور چھبن کی دلیل اس کا سجیلا پن ہے جو سب لوگ خاص طور پر عشق کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بھدا پن اور عشق ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس کے رنگ کی خوشنمائی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا مسکن پھولوں کی کیاری ہے۔ وہ بے رونق یا مرجھائے ہوئے حسن کی صحبت میں خواہ وہ جسمانی ہو یا روحانی کبھی نہیں رہتا بلکہ پھولوں کے سایے میں اور خوشبوؤں کی فضا میں۔ بس یہی اس کا ٹھکانا ہے۔

"عشق دیوتا کے حسن کی میں کافی تعریف کر چکا لیکن پھر بھی بہت کچھ باقی ہے اب مجھے اس کی نیکیوں کا ذکر کرنا ہے اس کی سب سے بڑی شان یہ ہے کہ نہ تو وہ خود کسی انسان یا کسی دیوتا سے بے انصافی کرتا ہے اور نہ ان کی بے انصافی برداشت کرتا ہے اس کو اگر کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ تشدد سے نہیں پہنچتی۔ نہ تشدد اس کے قریب آتا ہے اور نہ وہ اپنے عمل میں تشدد سے کام لیتا ہے۔ سب لوگ اس کی ہر خدمت خوشی سے انجام دیتے ہیں اور بہ قول ان قوانین کے جو ہمارے شہر پر حکومت کرتے ہیں جہاں لوگ خوشی سے اطاعت کرتے ہوں وہاں عدل کا دور دورہ ہے اور علاوہ عادل ہونے کے عشق کا دیوتا باعفت بھی ہے اس لیے کہ عفت لذتوں اور خواہشوں پر حکومت کرنے کا نام ہے اور عشق پر حکومت کرنے والا نفس کا بندہ نہیں بلکہ آقا ہے اور خواہشات نفس کو غلام بنا کر رکھتا ہے۔ اور جب وہ ان پر غالب آجاتا ہے تو پھر اس کی عفت کا کیا کہنا

ایسی شجاعت، کہ اس میں جنگ کا دیوتا بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ خود عشق میں گرفتار ہے اس لیے کہ ایک روایت کے مطابق وہ افرودائٹ کی محبت کا بندہ ہے اور آقا بندے سے زیادہ قوی ہوتا ہے اور جب عشق سب سے بڑے بہادر پر غالب آتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ خود بہادروں کا سرتاج ہے۔ اس کی شجاعت اور عدالت اور عفت کا تو میں نے ذکر کیا مگر ابھی اس کی حکمت کا ذکر باقی ہے۔ اپنی محدود قابلیت کے مطابق مجھے اپنی سی کوشش کرنی ہے۔ اول یہ کہ وہ شاعر ہے (اور یہاں اریکیمیکس کی طرح میں بھی اپنے فن کی تعریف میں مبالغہ کرتا ہوں) بلکہ دوسروں میں بھی شاعری کا مادّہ پیدا کر دیتا ہے اور یہ وہی کر سکتا ہے جو خود شاعر ہو۔ اس کا سایہ پڑتے ہی آدمی شاعر ہو جاتا ہے خواہ پہلے اسے موسیقی کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ عشق باکمال شاعر اور کل فنونِ لطیفہ کا ماہر ہے اس لیے کہ جو چیز آدمی خود نہ رکھتا ہو وہ دوسروں کو کیا دے گا جو خود نہ جانتا ہو دوسروں کو کیا سکھائے گا۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جانداروں کی تولید عشق ہی کا کام ہے؟ یہ اسی کی حکمت کا نتیجہ ہیں اور اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اب صنّاعوں کو لیجیے۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ ان میں شعلۂ حقیقت کا نور صرف اسی کے حصے میں آتا ہے جس میں عشق نے اپنی روح پھونک دی ہو۔ جسے عشق سے مس نہ ہو وہ تاریکی میں بھٹکتا ہے۔ طب اور تیر اندازی اور کہانت کے فن اپالو نے عشق و آرزو ہی کی رہنمائی میں ایجاد کیے پس وہ بھی عشق کا چیلا ہے۔ اسی طرح میوزوں کا نغمہ ہفیسٹس کا علم فلزات، اتھینے کی پارچہ بافی اور زیس کی حکومت انسانوں اور دیوتاؤں پر، یہ سب عشق کے کرشمے ہیں اور وہی ان کا موجد ہے چنانچہ عشق ہی نے دیوتاؤں کی سلطنت قائم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد حسن کی محبت ہے اس لیے کہ بدصورتی سے محبت کو کوئی واسطہ نہیں۔ قدیم زمانے میں جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا، دیوتاؤں سے بہت افسوسناک

حرکتیں سرزد ہوتی تھیں اس لیے کہ ان پر احتیاج کی حکومت تھی لیکن عشق کے پیدا ہونے کے بعد حسن کی محبت کی بدولت زمین و آسمان کی ساری اچھی چیزیں وجود میں آئیں اس لیے فیڈرس میں عشق کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ وہ خود بھی سب سے حسین اور سب سے اچھا ہے اور دوسری کل چیزوں میں حسن و خوبی کا باعث ہے مجھے ایک شعر یاد آگیا کہ عشق وہ دیوتا ہے:

"جو زمین کو امن اور طوفانی سمندر کو سکون بخشتا ہے"۔

ہواؤں کو روک دیتا ہے اور دکھ کے ماروں کو تھپک کے سلا دیتا ہے"

وہی لوگوں کے دلوں سے نفرت کو دور کرکے انھیں محبت سے معمور کرتا ہے، وہی لوگوں کو ایسی مجلسوں میں جیسی یہ ہماری صحبت ہے جمع کرتا ہے۔ قربانیوں میں، دعوتوں میں وہ خوش خُلقی کا تحفہ لاتا ہے اور کج خلقی کو دور کرتا ہے۔ ہمیشہ مہر و محبت سے پیش آتا ہے اور کبھی بے مہری سے کام نہیں لیتا۔ وہ نیکوں کا دوست، حکیموں کے لیے باعثِ فخر، دیوتاؤں کے لیے باعثِ حیرت ہے جو اس سے بے بہرہ ہیں اس کی آرزو رکھتے ہیں، جو اس سے بہرہ مند ہیں اس کی دل سے قدر کرتے ہیں وہ لطف و لطافت، عیش و عشرت، شوق و محبت، رعنائی و نزاکت کا سرچشمہ ہے نیکی کا لحاظ رکھنے والا، بدی سے منہ پھیرنے والا، ہر قول، ہر فعل، ہر خواہش اور ہر خوف میں ناجی، ہادی، رفیق، مددگار، انسانوں اور دیوتاؤں کے لیے مایۂ ناز، رہبر، پیشوا، روشن ضمیر، سرافراز، ہر شخص کو چاہیے کہ عشق کی تقلید کرے اس کی مدح کے گیت گائے اور اس نغمۂ شیریں میں شریک ہو جائے جس سے وہ انسانوں اور دیوتاؤں کے دلوں کو موہ لیتا ہے۔ یہ ہے فیڈرس وہ خطبہ جو کچھ تو مذاق میں اور کچھ سنجیدگی سے میں اپنی قابلیت کے عشق کے دیوتا کی خدمت میں پیش کرتا ہوں"۔

ارسٹوڈیمس کہتا ہے کہ جب اگاتھن نے اپنی تقریر ختم کی تو سب نے تحسین و

آفریں کے نعرے بلند کیے لوگوں کا خیال تھا کہ اس نوجوان نے اس انداز سے تقریر کی جو اس کے اور عشق دیوتا کے شایانِ شان تھا اور سقراط نے اریکسیمیکس کی طرف دیکھ کر کہا "کھوجی اکومینس کے بیٹے کیا میرا اندیشہ بجا نہ تھا؟ میری یہ پیشین گوئی صحیح نکلی یا نہیں کہ اگاتھن نہایت عمدہ تقریر کرے گا اور میرے لیے بڑی مشکل پڑ جائے گی؟"

اریکسیمیکس نے جواب دیا "پیشین گوئی کا وہ حصّہ تو مجھے صحیح معلوم ہوتا ہے جو اگاتھن کے متعلق ہے لیکن دوسرا حصہ کہ تمھارے لیے مشکل پڑ جائے گی صحیح نہیں ہے۔"

سقراط نے کہا "عزیزِ من، جب مجھے اور مجھ پر کیا موقوف ہے کسی شخص کو بھی ایسا پُرمغز اور جامع خطبہ سننے کے بعد تقریر کرنی ہو تو مشکل پڑ جائے گی یا نہیں؟ خصوصاً آخری الفاظ کی خوش نمائی نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ کون ہے جو انھیں سن کر محوِ حیرت نہ ہو جائے گا؟ جب میں نے سوچا کہ میری قابلیت اس کے پاسنگ بھی نہیں تو اس قدر شرم آئی کہ اگر ممکن ہوتا تو میں بھاگ جاتا۔ مجھے گورگیاس یاد آگیا اور تقریر کے خاتمے پر ایسا معلوم ہوا کہ اگاتھن مجھے خطابت کے علم کا گورگسی یا گورگنی[۱] چہرہ دکھا رہا ہے محض اس لیے کہ ہومر کی روایات کے مطابق میرا دم میری تقریر پتھرا کر رہ جائے اور میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلے تب میری آنکھیں کھلیں کہ یہ میں نے کیا حماقت کی جو تم لوگوں کے ساتھ عشق کی مدح پر راضی ہو گیا اور یہ دعویٰ کر بیٹھا کہ میں بھی اس فن میں استاد ہوں حالانکہ مجھے خبر تک نہیں کہ کس چیز کی مدح کیونکر کی جاتی ہے۔ میں اپنی سادگی سے یہی سمجھتا تھا کہ مدح سچی ہونی چاہیے اور جب یہ بات مسلم ہے تو مقرر کا کام بس اتنا ہے کہ سچی باتوں میں سے بہترین باتیں چھانٹ لے اور انھیں بہترین طریقے سے بیان کر دے۔ اور مجھے اس پر بڑا ناز تھا کہ میں مدح کی حقیقت سے واقف ہوں اور بڑی اچھی تقریر کروں گا۔ مگر اب معلوم ہوا مقصد

---

[۱] ایک تو مشہور سوفسطائی گورگیاس کی طرف اشارہ ہے دوسرے عجیب الخلقت گورگن کی طرف جس سے نظر ملاتے ہی انسان پتھر کا بن جاتا تھا۔

یہ ہے کہ عشق سے ہر طرح کی عظمت و شان منسوب کی جائے چاہے وہ اس میں ہو یا نہ ہو اور جھوٹ سچ کا لحاظ نہ کیا جائے۔ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ شاید اصل تجویز یہ تھی کہ ہم سب در اصل عشق کی مدح کریں نہ بلکہ ایسا معلوم ہو کہ ہم سب اس کی مدح کر رہے ہیں! اسی لیے آپ لوگوں نے ہر صفت جو خیال میں آسکتی تھی عشق کی طرف منسوب کر دی۔ کہ وہ ایسا ہے ویسا ہے۔ یہ کرتا ہے وہ کرتا ہے۔ تاکہ جو لوگ اس سے ناواقف نہیں انھیں وہ سب سے حسین اور سب سے اچھا نظر آئے چونکہ جو اس سے ناواقف ہیں وہ تو دھوکا کھاتے نہیں۔ اور واقعی آپ نے بڑا شاندار اور موثر بھجن اس کی تعریف میں سنایا لیکن چونکہ میں نے یہ وعدہ کرتے وقت کہ میں بھی اپنی باری پر اس کی مدح کروں گا، مدح کا مطلب ہی غلط سمجھا تھا۔ اس لیے میری التجا ہے کہ اس وعدے کو پورا کرنے سے معذور رکھا جاؤں۔ یہ وعدہ میں نے نادانستہ کیا تھا اور (یوریپیڈیس ہوتا تو کہتا) محض زبان کا وعدہ تھا دل کا وعدہ نہ تھا۔ لہذا اب مجھے تو اس سے معاف کیجیے۔ میں اس طرح مدح نہیں کیا کرتا بلکہ سچ پوچھو تو مجھ سے ہو ہی نہیں سکتی لیکن آپ عشق کے متعلق حق بات سننا چاہتے ہیں تو میں اپنے انداز میں تقریر کرنے کو تیار ہوں اگرچہ آپ لوگوں کی برابری کا دعوے کر کے میں اپنی ہنسی نہیں اڑاؤں گا۔ تو اب کہو میاں فیڈرس، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں عشق کے بارے میں سچی باتیں جن الفاظ میں اور جس طرح میرے جی میں آئیں بے تکلف بیان کر دوں؟ تم اسے پسند کرو گے؟"

ارسٹوڈیمس کا بیان ہے کہ فیڈرس اور دوسرے لوگوں نے اس سے کہا جس طرح آپ کے جی میں آئے تقریر کیجیے۔ اس پر سقراط بولا "تو پھر مجھے اجازت ہو کہ اگاتن سے چند سوال اور کر لوں اور اس کے جوابوں کو اپنی تقریر کی تمہید قرار دوں۔"

فیڈرس نے کہا "میں اجازت دیتا ہوں۔ جو پوچھنا ہے پوچھو" تب سقراط نے اس طرح گفتگو شروع کی:۔

"میاں اگاتھن اس خطبے میں جو تم نے ابھی دیا ہے تمھاری یہ تجویز بالکل صحیح تھی کہ پہلے عشق کی ماہیت بتائی جائے اس کے بعد اس کے کارناموں کا ذکر کیا جائے۔ یہ طریقہ شروع کرنے کا مجھے بہت ہی پسند آیا۔ اور چونکہ تم نے ا٘ر ٘کی اہمیت کے بارے میں اس قدر فصاحت و بلاغت سے تقریر کی اس لیے اجازت ہو تو میں تم سے یہ سوال کروں کہ عشق کسی چیز کا ہوتا ہے یا نہیں؟ یہاں میں اپنے مطلب کو صاف کر دوں تو اچھا ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم یہ جواب دو کہ عشق باپ کا یا ماں کا ہوتا ہے، یہ تو ایک مہمل بات ہوگی۔ میں اس طرح کا جواب چاہتا ہوں جیسے تم سے پوچھا جائے کہ ہر باپ کسی کا باپ ہوتا ہے کہ نہ؟ تو تم بغیر کسی دقت کے کہہ دوگے کہ ہاں بیٹے کا یا بیٹی کا اور یہ جواب بالکل صحیح ہوگا۔"

"بالکل صحیح" اگاتھن نے کہا۔

"اسی طرح تم ماں کے متعلق بھی کہوگے؟"

اگاتھن نے اقرار کیا۔

"اچھا ایک سوال اور کر لوں تاکہ میرا مطلب واضح ہو جائے۔ کیا ہر بھائی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی کا بھائی ہو؟"

"بے شک"۔

"یعنی یا تو کسی بھائی کا یا کسی بہن کا۔"

"جی ہاں"۔

"اچھا اب میں عشق کے متعلق پوچھتا ہوں" سقراط نے کہا "عشق کسی چیز کا ہوتا ہے یا نہیں؟"

"ظاہر ہے کہ کسی چیز ہی کا ہوتا ہے"۔

"اس کو اپنے ذہن میں رکھ کر مجھے یہ بتاؤ کہ جس چیز کا عشق ہوتا ہے اس کی

خواہش بھی ہوتی ہے؟"۔

"ضرور ہوتی ہے"۔

"اور انسان کو جس چیز کا عشق اور خواہش ہو وہ اس کے پاس موجود ہوتی ہے"۔

"غالباً نہیں ہوتی"۔

"غالباً کیا معنی؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہاں غالباً کہنا چاہیے یا لازماً؟ میرے خیال میں تو اگاتھن، یہ نتیجہ کہ جس شخص کو کسی چیز کی خواہش ہو اس کے پاس اس چیز کی کمی ہے اور جس شخص کو کسی چیز کی آرزو نہ ہو اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں قطعاً اور لازماً صحیح ہے۔ تمھاری کیا رائے ہے؟"

"مجھے تم سے اتفاق ہے"۔

"بہت خوب — تو کیا بڑا آدمی بڑائی کی اور طاقت ور آدمی طاقت کی خواہش رکھتا ہے"۔

"نہیں یہ تو اس بات کے خلاف ہے جو ہم پہلے تسلیم کر چکے ہیں"۔

"ٹھیک ہے اس لیے انسان میں جو صفت پہلے سے موجود ہے وہ اس کی خواہش نہیں کر سکتا"۔

"بالکل ٹھیک ہے"۔

پھر بھی اگر کوئی شخص طاقت ور ہوتے ہوئے طاقت کی، تیز ہوتے ہوئے تیزی کی، تندرست ہوتے ہوئے تندرستی کی خواہش رکھتا ہو تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ وہ اس چیز کی خواہش رکھتا ہے جو اس کے پاس موجود ہے۔ میں یہ مثال اس لیے دے رہا ہوں کہ ہم غلط فہمی سے محفوظ رہیں، اس لیے کہ جو لوگ ان صفات کے حامل ہیں ان میں اس وقت وہ صفات یقیناً موجود ہیں خواہ وہ چاہیں یا نہ

چاہیں اور جو چیز موجود ہو اس کی خواہش کیا معنی؟ اس لیے اگر کوئی شخص کہے کہ میں دولت مند ہوں اور دولت مند ہونے کی خواہش رکھتا ہوں۔ تندرست ہوں اور تندرست ہونے کی خواہش رکھتا ہوں غرض جو چیز میرے پاس موجود ہے اس کی خواہش رکھتا ہوں تو ہم اسے یہ جواب دیں گے۔ میرے دوست بات یہ ہے کہ تمھارے پاس دولت، تندرستی اور طاقت موجود ہے اور تم چاہتے ہو کہ یہ سب چیزیں قائم رہیں۔ اس لیے کہ اس وقت تو تم چاہو یا نہ چاہو یہ چیزیں تمھارے پاس موجود ہی ہیں اگر تم کہو کہ میں تو صرف وہی چیزیں چاہتا ہوں جو میرے پاس موجود ہیں تو ظاہر ہے اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ تم چاہتے ہو جو چیزیں تمھارے پاس اس وقت موجود ہیں آیندہ بھی موجود رہیں۔ اس شخص کو مجبوراً ہم سے اتفاق کرنا پڑے گا۔"

"ضرور کرنا پڑے گا۔"

"تو اس کی خواہش یہ ہے کہ جو چیز اس وقت اس کے پاس ہے وہ آیندہ بھی باقی رہے۔ گویا دراصل وہ ایک غیر موجود چیز کی خواہش کرتا ہے جو ابھی تک اس کے پاس نہیں ہے"۔

"بالکل درست ہے"۔

"غرض وہ اور ہر شخص جو کوئی خواہش رکھتا ہے وہی چیز چاہتا ہے جو اب تک اس کے پاس نہیں، جو مستقبل ہے موجود نہیں، وہی جو اس کی ملک نہیں، اس کی صفت نہیں، اس میں پائی نہیں جاتی؟"

"بالکل صحیح ہے"۔

"اچھا اب ہم اپنے استدلال کو ایک بار دہرا جائیں" سقراط نے کہا "اول یہ کہ عشق کسی چیز کا ہوتا ہے یعنی اس چیز کا جو کہ انسان میں نہ ہو۔"

"جی ہاں۔"

اور وہ بات یاد رہے جو تم نے اپنی تقریر میں کہی تھی اگر بھول گئے ہو تو میں یاد دلا دوں۔ تم نے کہا تھا کہ حسن کے عشق نے دیوتاؤں کی حکومت کو سنبھالا اس لیے کہ قبح کا عشق تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس قسم کے الفاظ تم نے کہے تھے یا نہیں؟"

"کہے تھے"۔

"اور عزیز من، تمھارا کہنا بالکل بجا تھا۔ عشق حسن ہی کا ہوتا ہے قبح کا نہیں ہوتا۔"

اگاتھن نے اس سے اتفاق کیا۔

"اور یہ پہلے ہی مانا جا چکا ہے کہ عشق اس چیز کا ہوتا ہے جو انسان میں موجود نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے"۔

"تو پھر عشق میں حسن موجود نہیں ہے"۔

"بے شک نہیں ہے"۔

"کیا تم اس چیز کو جس میں حسن موجود نہ ہو حسین کہو گے؟"

"ہرگز نہیں"۔

"تو پھر تمھارا وہ دعویٰ کہاں گیا کہ عشق حسین ہے؟"

"میں نے یونہی بے سوچے سمجھے کہہ دیا تھا" اگاتھن نے جواب دیا۔

"تقریر تو تمھاری بہت خوب تھی، اگاتھن۔ مگر مجھے ایک چھوٹا سا سوال پوچھنا ہے "کیا حسن اور نیکی ایک نہیں ہیں؟[1]"

"ضرور ہیں"۔

"تو جب عشق میں حسن موجود نہیں تو نیکی بھی نہ ہو گی"۔

"میں تمھاری تردید نہیں کر سکتا، سقراط" اگاتھن نے کہا "جو کچھ تم نے کہا

---

[1] یونانیوں کا عام عقیدہ تھا کہ حسن خیر اور حق ایک ہی چیز کے تین پہلو ہیں جو چیز خوب صورت ہے وہی اچھی اور سچی بھی ہے۔

وہ ٹھیک ہی ہوگا۔"

"یوں کہو، پیارے اگاتھن، کہ تم حق کی تردید نہیں کر سکتے، ورنہ سقراط کی تردید کیا مشکل ہے۔ اچھا اب میں تمھاری اجازت سے ایک کہانی سناتا ہوں جو میں نے مین تنایا کی رہنے والی دیو تیما سے سنی تھی۔ یہ عورت اس علم اور دوسرے علوم میں ماہر تھی اور اس نے ایک زمانے میں، جب ایتھنس والوں نے پلیگ شروع ہونے سے پہلے قربانی کی تھی، دس سال تک بیماری کو نہیں آنے دیا۔ وہ عشق کے فن میں میری استاد تھی اور جو کچھ اس نے کہا تھا وہ میں تمھارے سامنے دہراتا ہوں۔ اس سلسلے کو میں اس اعتراف سے شروع کروں گا جو اگاتھن ابھی کر چکا ہے اس لیے کہ قریب قریب یہی اعتراف میں نے اس دانش مند عورت کے سوال کے جواب میں کیا تھا۔ میرے خیال میں یہ طریقہ سب سے آسان ہوگا اور میں اپنا اور دیو تیما دونوں کا پارٹ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا ادا کروں گا اور پھر اس کے کارناموں کا۔ پہلے میں نے قریب قریب انھیں الفاظ میں جو اگاتھن نے مجھ سے کہے تھے، اس سے کہا کہ عشق ایک طاقت ور اور خوب صورت دیوتا ہے۔ اس نے مجھے قائل کر دیا جس طرح میں نے اگاتھن کو قائل کیا ہے کہ عشق نہ تو خوب صورت ہے اور نہ نیک ہے" تمھارا کیا مطلب ہے دیو تیما کیا عشق برا اور بدصورت ہے؟" میں نے پوچھا۔" واہ کیا یہ لازمی ہے کہ جو چیز خوب صورت نہ ہو وہ بدصورت ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "یقیناً" "اور جو دانش مند نہ ہو وہ جاہل ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ علم اور جہل کے بین بین ایک تیسری چیز بھی ہے؟" "وہ کیا چیز ہے؟" "صحیح قیاس" وہ علم تو اس وجہ سے نہیں ہے کہ انسان اس کی کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتا (کیونکہ بھلا علم بے دلیل کیونکر ہو سکتا ہے) اور اسے جہل بھی نہیں کہہ سکتے (اس لیے کہ جہل حقیقت کو نہیں پا سکتا)

"لیکن وہ کوئی ایسی چیز ضرور ہی جو جہل اور علم کے بین بین ہی"۔ "یہ تو بالکل ٹھیک ہی"
"تب تو تمھیں اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ جو چیز خوب صورت نہ ہو وہ لازمی طور پر بدصورت ہی یا جو نیک نہ ہو وہ لازمی طور پر بد ہی۔ اصل میں وہ ان کے بین بین ہی"۔ "خیر مگر کم سے کم یہ بات تو سب مانتے ہیں کہ وہ ایک عظیم الشان دیوتا ہی"۔ "کون وہ لوگ جو اسے جانتے ہیں۔ یا وہ جو نہیں جانتے؟" "سب لوگ" "اچھا یہ بتاؤ سقراط" اس نے مسکرا کر کہا "کیا وہ لوگ بھی عشق کو ایک عظیم الشان دیوتا مانتے ہیں جو سرے سے اس کے دیوتا ہونے ہی سے انکار کرتے ہیں؟" "ایسے کون ہیں؟" "تم اور میں دو تو یہی ہو گئے"۔ "یہ کیسے"۔ "بالکل صاف بات ہی۔ خود تم تسلیم کرو گے کہ دیوتا خوب صورت اور خوش نصیب ہوتے ہیں۔ ظاہر ہی تمھیں یہ ماننا پڑے گا۔ تمھاری مجال ہی کہ یہ کہہ سکو کہ کوئی ایسا نہیں ہی؟" "ہرگز نہیں کہہ سکتے"۔ "اور خوش نصیب سے تمھاری مراد ہی وہ لوگ جن کے پاس اچھی اور خوش نما چیزیں ہوں؟" "جی ہاں"۔ "اور تم مان چکے ہو کہ عشق میں بعض چیزوں کی کمی ہی اور وہ انھیں اچھی اور خوش نما چیزوں کی خواہش رکھتا ہی جن کی اس میں کمی ہی"۔ "ہاں مان چکا ہوں"۔ "مگر جو اچھی اور خوش نما چیزوں سے بے بہرہ ہو وہ دیوتا کیونکر ہو سکتا ہی"۔
"کبھی نہیں ہو سکتا"۔ "تو دیکھو نہ تم خود ہی عشق کے دیوتا ہونے سے انکار کر رہے ہو"۔

میں نے پوچھا "تو پھر عشق کیا ہی؟ فانی انسان؟" "نہیں"۔ "پھر کیا ہی"۔ "جیسا میں نے پہلی مثال میں کہا نہ وہ فانی ہی اور نہ لافانی بلکہ ان کے بین بین ہی"۔ "وہ آخر ہی کیا دیوتھا؟" "وہ ایک روح ہی اور مثل دوسری ارواح کے دیوتاؤں اور فانی انسانوں کے بین بین ہی"۔ "اور اس کا کام کیا ہی؟" "وہ دیوتاؤں اور انسانوں کے درمیان

ترجمان کا کام دیتا ہے انسانوں کی دعائیں اور قربانیاں دیوتاؤں کے پاس لے جاتا ہے اور دیوتاؤں کے جوابات اور احکام انسانوں کے پاس لاتا ہے۔ اسی کے واسطے سے ان دونوں کا فصل دور ہوتا ہے۔ اسی کے رشتے نے ان سب کو مربوط کر رکھا ہے۔ اسی کے ذریعے کاہن اور پجاری کے کرتب ان کی قربانیاں، رسمیں، عمل، فال، منتر غرض سب کام انجام پاتے ہیں اس لیے خدا انسانوں سے نہیں ملتا بلکہ عشق کے ذریعے خدا اور انسان کے درمیان سوتے جاگتے سب پیام سلام ہوتا ہے۔ وہ حکمت جو ان حقائق کو سمجھتی ہے، روحانی ہے اور ہر چیز مثلاً فنون اور صنعتیں محض بازاری حکمت ہے یہ ارواح یا درمیانی قوتیں متعدد ہیں اور ان میں سے ایک کا نام عشق ہے۔" اچھا یہ بتاؤ کہ اس کا باپ کون تھا اور ماں کون تھی؟" "یہ کہانی ذرا وقت چاہتی ہے مگر پھر بھی میں تمہیں سنائے دیتی ہوں۔ افروڈائٹ کی سالگرہ کے دن دیوتاؤں کی دعوت تھی۔ اس میں تمول کا دیوتا پوروس بھی جو دور اندیشی کی دیوی میٹس کا بیٹا ہے مہمان آیا ہوا تھا۔ جب دعوت ختم ہو گئی تو پینیا یعنی مفلسی بھی جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ دروازے پر بھیک مانگنے آگئی۔ یہاں تمول آبِ حیات کے نشے میں (کیونکہ شراب تو ان دنوں تھی نہیں) مست زئیس کے باغ میں جا پہنچا اور پڑ کر سو گیا۔ مفلسی نے اپنی تنگ دستی کے خیال سے یہ ترکیب سوچی کہ تمول کے نطفے سے اس کے ایک بچہ پیدا ہو جائے چنانچہ وہ اس سے ہم بستر ہوئی اور اسے حمل رہ گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام عشق رکھا گیا عشق کچھ تو اس وجہ سے کہ اسے فطری طور پر حسن سے محبت ہے اور افروڈائٹ بہت حسین ہے اور کچھ اس لیے کہ وہ اس کی سالگرہ کے دن پیدا ہوا تھا افروڈائٹ کا پیرو ہے اور اس کی حالت وہی ہے جو ایسے ماں باپ کے بچے کی ہونی چاہیے۔ ایک تو وہ سدا کا غریب ہے اور ہرگز حسین اور نازک نہیں جیسا کہ بہت سے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے بلکہ بھدا اور بے ڈول ہے اور پھٹے حالوں نظر آتا ہے۔ نہ پانو میں جوتا نہ رہنے کو مکان۔ کھری زمین پر

کھلے آسمان کے نیچے، گلیوں میں، مکانوں کے دروازوں پر پڑکر سو جاتا ہے۔ اپنی ماں کی طرح ہمیشہ عسرت میں بسر کرتا ہے۔ مگر کچھ باتیں اس میں اپنے باپ کی بھی ہیں۔ وہ ہمیشہ حسینوں اور نیکوں کے خلاف سازش کرتا رہتا ہے۔ بڑا جری ہے چلا اور مضبوط ہے اور ایسا زبردست شکاری ہے کہ جب دیکھو کسی نہ کسی کی گھات میں لگا ہے۔ وہ علم دوست ہے اور خوش تدبیر، پکا فیلسوف، بے پناہ عامل، جادوگر، سوفسطائی۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے نہ وہ فانی ہے نہ لافانی بلکہ جس دم خوش حال ہے زندہ ہے، دم بھر میں مرگیا اور مر کر پھر جی اٹھا اُس سیرت کی بدولت جو اس نے اپنے باپ سے پائی ہے۔ اس کی دولت کا یہ حال ہے، اِدھر آئی اُدھر گئی اس لیے نہ وہ کبھی محتاج ہے اور نہ کبھی دولت مند۔ اس کے علاوہ عشق علم اور جہل کے بین بین ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ دیوتا فیلسوف یعنی طالبِ حکمت نہیں ہوتا اس لیے کہ وہ تو خود حکیم ہے اور حکیم حکمت کیوں طلب کرنے لگا۔ اسی طرح جاہل بھی حکمت کا طالب نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جہالت کی سب سے بڑی خرابی تو یہی ہے کہ نیکی اور دانش مندی سے محروم ہونے کے باوجود انسان اپنی حالت پر مطمئن رہتا ہے۔ جس چیز کی ضرورت اسے محسوس ہی نہیں ہوتی اس کی خواہش کیا ہوگی"۔ "مگر یہ تو بتاؤ دیوتیما کہ جب حکمت کے طالب نہ دانش مند ہیں نہ بے وقوف تو پھر کون ہیں؟" "واہ اس کا جواب تو ایک بچہ بھی دے سکتا ہے۔ وہ جوان دونوں کے بین بین ہیں۔ انھیں میں سے ایک عشق بھی ہے۔ حکمت نہایت حسین چیز ہے اور عشق حُسن ہی کا ہوتا ہے، اس لیے عشق بھی فیلسوف ہے یعنی محبِ حکمت چنانچہ وہ بھی حکیموں اور جاہلوں کے بین بین ہے۔ اس کی بنا بھی اس کا نسب ہے کیونکہ اس کا باپ تو مال دار اور عقلمند ہے اور اس کی ماں غریب اور بے وقوف۔ یہ ہے پیارے سقراط اس روح کی ماہیت جو عشق کہلاتی ہے۔ تمھارے تصورِ عشق میں جو غلطی ہے وہ بالکل قدرتی چیز ہے، اور جہاں تک تمھاری گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے

یہ غلط فہمی عشق اور معشوق میں تمیز نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی سے تمھیں خیال ہوا کہ عشق بہت حسین ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معشوق حسین اور نازک، باکمال اور بابرکت سبھی کچھ ہے لیکن عشق کا جوہر کچھ اور ہی ہے جو میں نے تمھیں ابھی بتایا۔"

تو میں نے کہا" اے اجنبی عورت تم نے بہت خوب بات کہی مگر ہم یہ بات مان بھی لیں کہ عشق ایسا ہی ہے جیسا تم نے بتایا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے انسانوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔" اس نے جواب دیا" یہ بھی سقراط میں تمھیں سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس کی ماہیت اور پیدائش کا حال میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ یہ تو تم مانتے ہو کہ عشق حسن کا ہوتا ہے۔ لیکن ممکن ہے کوئی پوچھے سقراط اور دیو تیما یہ تو بتاؤ کہ حسن سے کس چیز کا حسن مراد ہے؟ بلکہ میں اپنے سوال کو اور واضح کر دوں: جب انسان کو حسن کا عاشق ہوتا ہے تو وہ کیا چاہتا ہے؟ "یہی کہ حسین چیز اس کی ہو جائے۔" یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسین چیز پر قبضہ کرنے سے کیا مل جاتا ہے؟" "یہ جو تم نے پوچھا اس کا تو کوئی جواب اس وقت میرے پاس نہیں" "اچھا تو میں حسن کی جگہ خیر کا لفظ رکھ کر اس سوال کو پھر دہراتی ہوں، جو شخص خیر کا عاشق ہوتا ہے وہ کیا آرزو رکھتا ہے" "یہ کہ خیر اس کے قبضے میں آجائے" "اور خیر پر قبضہ کر کے اسے کیا ملتا ہے۔" "راحت۔ اس سوال کا جواب اتنا مشکل نہیں" "بے شک انسان خیر کا مالک ہو کر راحت حاصل کرتا ہے۔ اب اس مزید سوال کی گنجائش نہیں کہ وہ راحت کیوں چاہتا ہے۔ تمھارا جواب بجائے خود مختتم ہے۔" "ٹھیک کہا تم نے" "مگر کیا یہ خواہش اور آرزو سب انسانوں میں عام ہے؟ کیا سب انسان ہر حال میں خیر یا راحت کے طالب ہوتے ہیں یا صرف بعض انسان؟ تمھاری کیا رائے ہے؟" "یہ خواہش سب میں مشترک ہے۔" "پھر یہ کیا بات ہے کہ سب لوگ عاشق نہیں کہلاتے بلکہ بعض لوگ۔ حالانکہ تمھارے قول کے مطابق سب لوگ ایک ہی طرح کی

چیزوں کے طلب گار ہیں۔" "ہاں اس پر تو مجھے بھی تعجب ہے" "تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق کے ایک جز کو جدا کر کے کل کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے لیکن بقیہ اجزا کے دوسرے نام رکھ دیے گئے ہیں۔" "اس کی کوئی مثال تو دو" "شاعری کو لے لو تم جانتے ہو کہ یہ بہت سی اقسام پر مشتمل ہے۔ اصل میں ہر قسم کی تخلیق یعنی عدم کو وجود میں منتقل کرنا شاعری ہے کل فنونِ لطیفہ کا کام تخلیقی ہے اور کل فن کار شاعر ہیں" "بالکل صحیح ہے۔" "لیکن تم جانتے ہو سب شاعر نہیں کہلاتے بلکہ ان کے اور نام ہیں۔ صرف فن کے ایک حصے کو جو دوسرے حصوں سے الگ کر دیا گیا ہے اور لے اور وزن سے تعلق رکھتا ہے، شاعری کہتے ہیں اور جو لوگ اس معنی میں شاعری پر قدرت رکھتے ہیں شاعر کہے جاتے ہیں۔" "بالکل درست ہے۔" "یہی بات عشق پر صادق آتی ہے۔ ہم کلیے کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ خیر و راحت کی ہر خواہش عشق ہی کی زبردست اور پُراسرار قوت ہے لیکن جو لوگ راحت کی طرف دوسری راہوں سے کھنچ کر آتے ہیں خواہ وہ دولت کی راہ ہو یا ورزشِ جسمانی کی یا فلسفہ و حکمت کی وہ عاشق نہیں کہلاتے ــــــ کل کا نام صرف اُن لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا جن کی محبت ایک خاص شکل اختیار کرے۔ صرف انھی کی محبت کو عشق اور خود ان کو عاشق کہتے ہیں۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔" "بے شک ایسا ہی ہے۔ اور یہ جو تم لوگوں سے سنتے ہو کہ عاشق اپنے جوڑ کے آدھے انسان کو ڈھونڈھا کرتے ہیں تو اصل میں نہ وہ آدھے کو ڈھونڈھتے ہیں نہ سارے کو سوا اس کے کہ وہ آدھا یا سارا نیک یا خیر کا حامل ہو۔ اگر خود ان کے ہاتھ یا پیر بد ہوں تو وہ انھیں کاٹ کر پھینک دیں گے۔ اس لیے کہ محبت اس سے نہیں ہوتی جو اپنا ہے بلکہ اس سے جو نیک ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص نیک کو اپنا اور بد کو پرایا کہنے لگے۔ سچ پوچھو تو انسان کو دنیا

میں خیر کے سوا کسی چیز سے محبت ہی نہیں ہوتی، یا کوئی چیز ایسی ہے جس سے ہوتی ہے؟" "حقیقت میں کوئی چیز بھی نہیں" "تو سیدھی سادی بات یہ ہے کہ انسان خیر کا عاشق ہوتا ہے"۔ "بے شک"۔ "مگر اس میں اتنا اور بڑھا دینا چاہیے کہ خیر پر قبضہ کرنے کا"۔ "ہاں یہ اور بڑھا دینا چاہیے"۔ "اور قبضہ ہی نہیں دائمی قبضہ"۔ "ہاں یہ بھی"۔ "ہاں تو پھر عشق کی کل تعریف یہ ہوئی کہ وہ خیر پر دائمی قبضہ کرنے کی آرزو ہے"۔ "یہ بالکل ٹھیک ہے"۔

"اچھا یہ تو عشق کی ماہیت ہوئی۔ اب تم یہ بھی بتا سکتے ہو کہ عشق کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ جو لوگ اس قدر شوق اور جوش ظاہر کرتے ہیں جس کا نام عشق ہے وہ کیا کر رہے ہیں اور ان کا کیا مقصد ہے؟ مجھے تو اس کا جواب دو"۔ "واہ دیوتیما۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں تمھاری دانش مندی کا اس قدر معترف کیوں ہوتا اور یہی مسئلہ دریافت کرنے کے لیے تمھارے پاس کیوں آتا؟"

"اچھا سنو میں بتاتی ہوں۔ ان کا مقصد ہے حسن کے اندر تولید خواہ وہ روحانی ہو یا جسمانی"۔ "میں سمجھا نہیں یہ ابہام ذرا تشریح چاہتا ہے"۔ "میں اپنا مفہوم واضح کیے دیتی ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے جسم اور روح میں تولید کا عمل کرتا رہتا ہے۔ ایک خاص عمر میں فطرتِ انسانی عملِ تناسل کا تقاضا کرتی ہے جو حسن کے اندر ہونا چاہیے نہ کہ قبح کے اندر۔ یہ تناسل مرد اور عورت کا اختلاط ہے اور ایک آسمانی چیز ہے اس لیے حمل اور تولید ایک لافانی جوہر ہے فانی مخلوق کے اندر جو چیزیں بے آہنگ ہوں ان میں یہ جوہر نہیں پایا جا سکتا۔ قبح ہمیشہ آسمانی چیزوں سے بے آہنگ اور حسن ہم آہنگ ہوتا ہے۔ غرض حسن حمل کی دیوی ہے اور اسی کے سلسلے میں تولید واقع ہوتی ہے۔ اس لیے حسن سے واصل ہو کر قوت تولید ساز گار، نفوذ پذیر اور مفید بن جاتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے لیکن قبح کو دیکھتے ہی وہ ٹھٹھر جاتی ہے۔ تکلیف محسوس کرتی ہے، منہ پھیر لیتی ہے اور افسوس کے ساتھ تولید سے باز رہتی ہے۔ اسی لیے جب

عملِ تناسل کا وقت آتا ہی اور فطرت کا خزانہ معمور ہوتا ہی تو حسن سے ایک وجدو اہتزاز حاصل ہوتا ہی اور اس سے واصل ہوکر تولید کی خلش مٹ جاتی ہی اس لیے کہ عشق صرف حسن کی محبت نہیں جیسا تم نے سمجھ رکھا ہی سقراط"۔ "تو پھر کیا ہی؟" "حسن کے اندر تولید وتخلیق کی محبت"۔ "اچھا؟" "اور کیا"۔ "مگر تولید کی یہ محبت کیوں ہوتی ہی؟" "اس لیے کہ فانی مخلوق کے لیے تولید ایک طرح کی بقاے ابدی ہی اور اگر جیسا کہ ہم تسلیم کر چکے ہیں، عشق خیر پر دائمی قبضہ کرنے کی آرزو ہی تو ظاہر ہی کہ کون انسان خیر کے ساتھ بقاے ابدی کا طالب نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ عشق اصل میں بقاے ابدی کا ہوتا ہی"۔

یہ سب باتیں اس نے مجھے مختلف اوقات میں عشق کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے تعلیم کیں۔ مجھے یاد ہی کہ ایک بار اس نے مجھ سے پوچھا "جانتے ہو سقراط کہ عشق کا اور اس آرزو کا جو اس کے ساتھ ہوتی ہی کیا سبب ہی؟ تم نے دیکھا ہوگا کہ کل جانوروں کو چاہے چوپائے ہوں یا پرندے جب تولید کی خواہش میں عشق کا روگ لگ جاتا ہی تو وہ کیسی اذیت اٹھاتے ہیں۔ ابتدا آرزوے وصل کی خلش سے ہوتی ہی۔ پھر بچوں کی پرورش کی باری آتی ہی جس میں کمزور سے کمزور بھی قوی سے قوی کا جان توڑ مقابلہ کرتے ہیں اور جان پر کھیل جاتے ہیں، خود فاقے مرتے ہیں دنیا بھر کی تکلیفیں سہتے ہیں مگر اپنے بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں؟ انسان ایسا کرے تو کہا جا سکتا ہی کہ عقل کا تقاضا ہی مگر جانوروں میں جذبات کا یہ جوش کس لیے ہوتا ہی؟ کیا تم مجھے اس کی وجہ بتا سکتے ہو؟" میں نے پھر کہا کہ مجھے معلوم نہیں تو وہ کہنے لگی "اگر تم یہ نہیں جانتے تو پھر تمھیں یہ توقع کیونکر ہو سکتی ہی کہ عشق کے فن میں استاد بن جاؤ گے؟" "مگر دیوتیما میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا کہ اسی ناواقفیت کی وجہ سے میں تمھارے پاس آیا ہوں، میں یہ احساس رکھتا ہوں کہ مجھے استاد کی ضرورت ہی۔ لہٰذا تم مجھے اس کا سبب اور عشق کے دوسرے اسرار بتاؤ"۔ اس نے کہا "اس میں حیرت کی کیا بات ہی جب

تمھارے خیال میں عشق بقاے ابدی کا ہوتا ہے جیسا کہ ہم کئی بار تسلیم کر چکے ہیں۔ یہاں بھی اسی اصول کے مطابق فانی فطرت جہاں تک ہو سکتا ہے، لافانی اور لازوال بننے کی کوشش کرتی ہے اور اس کا تولید کے سوا کوئی ذریعہ نہیں، اس لیے کہ تولید ہمیشہ پرانی ہستی کی جگہ ایک نئی ہستی چھوڑ جاتی ہے۔ خود ایک فرد واحد کی زندگی میں بھی کامل وحدت نہیں نظر آتی۔ انسان ایک ہی کہلاتا ہے لیکن اس مختصر مدت کے اندر جو بچپن اور بڑھاپے کے درمیان گزرتی ہے اور جس میں ہر جاندار کی زندگی ایک وحدت سمجھی جاتی ہے تحلیل و تبدیل کا ایک مسلسل عمل جاری رہتا ہے، بال، گوشت، ہڈیاں، خون اور سارا جسم برابر بدلتا رہتا ہے۔ یہ بات صرف جسم پر نہیں بلکہ روح پر بھی صادق آتی ہے۔ اس کی عادتیں، مزاجی کیفیتیں، رائیں، خواہشیں، راحت والم اور خوف وغیرہ ہم میں سے کسی شخص میں یکساں نہیں رہتے بلکہ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ یہی صورت علم کی ہے۔ ہم فانی انسانوں کے لیے یہ اور بھی زیادہ تعجب کی بات ہے کہ نہ صرف علوم بہ حیثیت کلی جیتے اور مرتے ہیں اور ہمارا تعلق ان سے ہمیشہ بدلتا رہتا ہے بلکہ الگ الگ ہر علم میں بھی اسی طرح کا تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ لفظ 'یاد' علم کے غائب ہو جانے پر دلالت کرتا ہے۔ ہر علم کو لوگ ایک طرف بھولتے رہتے ہیں اور دوسری طرف حافظے کے ذریعے سے نئے سرے سے حاصل کرتے رہتے ہیں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی علم ہے لیکن حقیقت میں یہ نیا علم ہوتا ہے۔ اسی قانونِ توالی کے مطابق کل فانی انسان دنیا میں زندہ رہتے ہیں، وہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتے بلکہ ان میں تحلیل و تبدیل کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ ان کی ہستی فانی کا پرانا نقش مٹ جاتا ہے اور اپنی جگہ بالکل ویسا ہی نیا نقش چھوڑ جاتا ہے ——— بہ خلاف ذاتِ الٰہی کے جو ہمیشہ یکساں رہتی ہے اسی طرح سقراط، فانی جسم اور فانی شے میں بقاے ابدی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر لافانی ہستیوں کی بقا کی دوسری شان ہے اس لیے انسانوں کو بچوں سے جو محبت ہوتی ہے اس پر حیرت نہ کرو کیونکہ یہ عالمگیر

محبت اور شوق دراصل بقاے ابدی کی خاطر ہی"۔

مجھے اس کے ان الفاظ سے تعجب ہوا اور میں نے کہا "اے دانش مند دیوتیما کیا یہ بات سچ ہی؟" اس نے ایک فاضل سوفسطائی کی طرح پورے وثوق سے کہا 'اے بالکل یقینی بات سمجھو سقراط' ——— ذرا لوگوں کی جاہ پسندی پر غور کرو تمھیں ان کی حماقتوں پر تعجب ہوگا جب تک تم اس بات کا لحاظ نہ رکھو کہ شہرتِ دوام کا شوق ان کے دل کو ابھارتا ہی۔ وہ ایسی ایسی جوکھم اٹھاتے ہیں کہ اپنے بچوں کی خاطر کبھی نہ اٹھاتے، رُپیہ خرچ کرنے کو طرح طرح کی تکلیفیں اٹھانے کو بلکہ مرنے تک کو تیار ہو جاتے ہیں اس لیے کہ ان کا نام دنیا میں ہمیشہ باقی رہے۔ کیا تمھارے خیال میں السیسٹس اڈمیٹس کو بچانے کے لیے اپنی جان دے دیتا یا اخیلیس پٹروکلس کا بدلا لینے کے لیے یا تمھارا کوڈرس سلطنت کو اپنے بیٹوں کے حق میں محفوظ رکھنے کے لیے اگر انھیں یہ امید نہ ہوتی کہ ان کی خوبیوں کی یاد جو ہمارے دلوں میں آج تک موجود ہی ہمیشہ باقی رہے گی؟ مجھے یقین ہی آدمی ہر کام اسی امید پر کرتا ہی اور جو جتنا اچھا ہو اتنا ہی زیادہ کرتا ہی کہ اسے خیرِ دوام کی شاندار شہرت حاصل ہو جائے اس لیے کہ سب کو بقاے ابدی کی آرزو ہی۔

'وہ لوگ جو صرف جسمانی تولید کا مادہ رکھتے ہیں عورتوں کے پاس جا کر بچے پیدا کرتے ہیں۔ ان کے عشق کی یہی فطرت ہی۔ انھیں یہ امید ہوتی ہی کہ ہماری اولاد ہمارے نام کو زندہ رکھے گی اور اس کے ذریعے سے ہمیں وہ سعادتِ سرمدی اور بقاے ابدی حاصل ہوگی جو ہم آنے والے زمانے میں چاہتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جن کی روحیں تولید کے قابل ہیں (کیونکہ دنیا میں یقیناً ایسے بھی آدمی ہوتے ہیں جن کی روح میں بہ نسبت جسم کے تخلیق کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہی) اس چیز کے حامل ہوتے ہیں جس کا حمل روح کے شایانِ شان ہی۔

ان کا حل کیا ہے؟ حکمت اور خیر۔ یہ خلاق طبیعتیں شعرا اور صناعوں کی ہیں جو موجد کہلانے کے مستحق ہیں لیکن حکمت کی سب سے بہتر اور برتر قسم وہ ہے جو ریاست اور خاندان کے نظم سے تعلق رکھتی ہے اور عفت و عدل کہلاتی ہے جس کسی کے اندر لڑکپن میں اس کا بیج ڈال دیا جاتا ہے اور یہ روح پھونک دی جاتی ہے وہ بڑا ہو کر تولید کا آرزومند ہوتا ہے۔ وہ حسن کی تلاش میں پھرتا ہے تاکہ اولاد پیدا کرے۔ کیونکہ قبح کے بطن سے وہ کوئی چیز پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ ہم آغوشی کے لیے خوب صورت جسم کو بدقطع جسم پر ترجیح دیتا ہے خصوصاً جب اسے کوئی خوب صورت شریف اور شائستہ ہستی مل جائے تو وہ جسم اور روح دونوں سے ایک ہی شخص کے اندر ہم آغوش ہوتا ہے اور اس شخص سے نیکی اور نیک آدمی کی عادات و خصائل کے بارے میں دل کھول کر باتیں کیا کرتا ہے اور اس کی تربیت کی کوشش کرتا ہے۔ حسن سے واصل ہو کر جس کی یاد حاضر غائب ہمیشہ اس کے ذہن میں رہتی ہے وہ اس چیز کو جس کا دہ عرصے سے حامل تھا جنتا ہے اور دونوں اس مولود کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان میں ازدواج و اُلفت کا رشتہ ان لوگوں کے باہمی رشتے سے کہیں زیادہ قریبی ہوتا ہے جو فانی بچے پیدا کرتے ہیں، اس لیے کہ ان دونوں کی اولاد زیادہ حسین اور لافانی ہوتی ہے۔ کون شخص ہے جو ہومر ہیسیڈ اور دوسرے بڑے شاعروں کو یاد کرتے وقت حقیقی اولاد کے مقابلے میں ان کی معنوی اولاد رکھنا پسند نہ کرے؟ کون ہے جو اُن کی ریس میں ایسی اولاد کے پیدا کرنے کا آرزومند نہ ہو جس کی بدولت ان کا نام زندہ رہا اور انھیں قبولِ دوام نصیب ہوا؟ کون نہ چاہے گا کہ اسے لگرگس کی سی اولاد ملے جو نہ صرف لکیڈیمونیا بلکہ کل یونان کی نجات کا باعث تھی۔ اسی طرح سولن ایتھنس کے قوانین کا پدر محترم ہے اور دوسرے ملکوں میں یونانی اور غیر یونانی قوموں کے اندر بہت سے لوگ گزرے ہیں جو دنیا میں اپنے کارنامے چھوڑ گئے

اور ہر طرح کی خیر و برکت کے مورث قرار پائے۔ ان کی اولادِ معنوی کی بدولت ان کے نام پر بہت سے مندر بنائے گئے جو کسی شخص کو اپنی فانی اولاد کی بدولت کبھی نصیب نہیں ہوئے۔

"یہ عشق کے ادنیٰ اسرار ہیں جن کے لے سقراط، تم بھی محرم ہو سکتے ہو۔ اب یہ وہ برتر اور پوشیدہ تر اسرار، جنھیں چوٹی کے بھید کہنا چاہیے اور جو، اگر تم صحیح راہ پر چلو، تم پر اسی سلسلے میں منکشف ہو جانے چاہییں، میں نہیں کہہ سکتی کہ تمھاری رسائی ان تک ہو سکے گی یا نہیں، لیکن میں اپنی طرف سے سمجھانے کی پوری کوشش کروں گی اور تم سے ہو سکے تو انھیں سمجھو۔ اس لیے کہ جو شخص اس معاملے میں صحیح راہ پر چلنا چاہے اسے لازم ہے کہ لڑکپن میں بہت سی حسین صورتوں سے ملے اور پہلے اگر اس کے استاد نے مناسب ہدایت کی ہو ان میں سے ایک سے محبت کرے اور اس میں خوش نما خیالات کی تخلیق کرے۔ تھوڑے دن میں اسے خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ ایک صورت کا حسن دوسری صورت کے حُسن سے مشابہ ہے اور پھر اگر وہ عام حسن صورت کی تلاش میں سرگرم ہے تو سخت احمق ہوگا اگر یہ نہ پہچان لے کہ حُسن ہر شکل میں ایک ہی ہے! اور جب وہ یہ دیکھے گا تو اس کے دل میں ایک معشوق کے عشق کا جوش سرد پڑ جائے گا، وہ اسے حقیر سمجھنے لگے گا، اور کل حسین صورتوں کا عاشق ہو جائے گا۔ دوسری منزل میں وہ یہ سمجھنے لگے گا کہ حسنِ باطن حسن ظاہر سے برتر ہے۔ چنانچہ جو نیک روح ذرا سی بھی قبول صورت ہو وہ اس سے محبت کرے گا، اس کی تربیت کرے گا، ان خیالات کو ڈھونڈ کر نکالے گا اور پیدا کرے گا جن سے نوجوانوں کو فائدہ پہنچے یہاں تک کہ وہ رسوم و قوانین کے حسن کو پہچاننے لگے اور یہ سمجھ جائے کہ ان سب کا حُسن ایک ہی اصل سے تعلق رکھتا ہے اور شخصی حُسن ایک ادنیٰ چیز ہے۔ رسوم و قوانین کے بعد وہ علوم کی طرف قدم بڑھائے گا تاکہ ان کے حسن کا مشاہدہ کرے۔ وہ ایک

خدمت گار کی طرح کسی ایک لڑکے یا مرد یا رسم کا عاشق اور خود ایک کمینہ اور تنگ نظر غلام نہیں ہو گا بلکہ حُسن کے بحرِ ذخار کے قریب پہنچ کر اس کا مشاہدہ کرے گا اور حکمت کی اتھاہ محبت میں بہت سے لطیف اور برتر افکار و خیالات کی تخلیق کرتا رہے گا یہاں تک کہ اس ساحل پر اس کی قوت ترقی کرتی چلی جائے اور آخر کار اسے ایک واحد علم کا جلوہ نظر آ جائے جو حُسنِ مطلق کا علم ہے۔ اسی کا اب میں ذکر کرتی ہوں، مہربانی کر کے خوب توجہ سے سنو:۔

"جو شخص عشق کے اسرار کا اس حد تک محرم ہو چکا ہے اور حسن کے جلووں کا صحیح ترتیب اور سلسلے کے ساتھ مشاہدہ کرتا رہا ہے اسے آخر میں یکایک ایک سراپا حسن ذات کا جلوہ نظر آتا ہے (یہی سقراط علتِ غائی ہے ان سب زحمتوں کی جو ہم نے اب تک اُٹھائی ہے) یہ ذات اول تو لا یزال ہے، عروج و زوال، نشیب و فراز سے بری، دوسرے یہ نہیں کہ وہ ایک نقطۂ نظر سے حسین ہو اور دوسرے سے قبیح ایک وقت میں یا ایک اعتبار سے یا ایک مقام پر حسین اور دوسرے وقت میں یا دوسرے اعتبار سے یا دوسرے مقام پر قبیح، گویا بعض کے لیے حسین اور بعض کے لیے قبیح یا چہرے ہاتھ یا کسی اور عضو سے مشابہت رکھتی ہو، یا کسی دوسری چیز مثلاً کسی جانور کے اندر، یا زمین آسمان یا کسی اور مقام پر موجود ہو بلکہ وہ مطلق، مستقل بسیط اور قدیم حسن ہے جو بغیر کسی کمی بیشی اور بغیر کسی تغیر کے دوسری اشیا کے تغیر پذیر اور فانی حسن میں جلوہ گر ہے۔ وہ شخص جو ان اشیا سے سچے عشق کی بدولت درجہ بدرجہ گزر کر حسنِ مطلق کی جھلک دیکھنے لگے وہ منزل مقصود سے دور نہیں ہے۔ مدارجِ عشق کو بطور خود یا کسی دوسرے کی رہنمائی میں طے کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسان دنیا کی حسین چیزوں سے شروع کر کے رفتہ رفتہ اس حسن حقیقی تک ترقی کرتا چلا جائے، وہ ان چیزوں سے صرف سیڑھیوں کا کام لے، ایک حسین صورت سے دوسری کی طرف قدم بڑھائے اور دو سے کل کی طرف،

پھر ان حسین صورتوں سے حسین اعمال کی طرف، حسین اعمال سے حسین تصورات کی طرف یہاں تک کہ وہ ان تصورات سے گزر کر حسنِ مطلق کے تصور تک پہنچ جائے اور اس پر حسن کی ماہیت و حقیقت آشکارا ہو جائے۔ یہ ہی پیارے سقراط، وہ برتر زندگی جو انسان کو بسر کرنی چاہیے حسنِ مطلق کے تصور میں۔ یہ ایسا حُسن ہے کہ اگر تمھیں ایک بار اس کا جلوہ نظر آ جائے تو تم مستغنی ہو جاؤ زر و مال سے، پر تکلف لباس سے، حسین لڑکوں اور نوجوانوں سے جن کی صورتیں تمھیں مسحور کر لیتی ہیں۔ تم اور بہت سے دوسرے لوگ اسی میں خوش ہو کہ ان کی صورتیں دیکھتے رہو اور ان سے باتیں کرتے رہو یہاں تک کہ اگر ممکن ہوتا تو تم کھانا بھی چھوڑ دیتے۔ ان کا دیدار اور ان کی صحبت بس یہی تمھاری آرزو ہے مگر فرض کرو انسان کے پاس آنکھیں ہوں حسن مطلق کو دیکھنے والی —— وہ حسنِ ایزدی خالص بے داغ، بے میل، جو فنا کی آلایشوں سے پاک اور انسانیت کے رنگ و نمود سے بَری ہے —— وہ اسی طرف نظر جمائے اور اس حسن بسیط سے لو لگائے رہے۔

"یاد رکھو کہ صرف یہی مراقبہ اور چشمِ باطن سے حسنِ حقیقی کا مشاہدہ اسے اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ حسن کے خیالی پیکر نہیں بلکہ حقیقی نمونے پیدا کرے (کیونکہ وہ محض مجاز کا حامل نہیں بلکہ حقیقت کا ہے) حقیقی خیر کو وجود میں لائے اور نشو و نما دے تاکہ وہ خدا کا دوست اور لافانی بن جائے اگر یہ فانی انسان کے لیے ممکن ہے۔ کیا یہ زندگی کوئی بُری زندگی ہوگی؟"

یہ ہیں فیڈرس —— میرا خطاب اکیلے تمھیں سے نہیں بلکہ تم سب سے ہے۔ دیوتیما کے الفاظ میں ان کی سچائی کا قائل ہوں اور چونکہ خود قائل ہوں اس لیے دوسروں کو بھی قائل کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس منزل تک پہنچنے میں فطرتِ انسانی کو عشق سے بہتر کوئی رہبر نہیں مل سکتا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ

ہر شخص کو میری طرح اس کا احترام کرنا چاہیے اس کی پیروی کرنی چاہیے اور دوسروں سے کرانی چاہیے اور اپنی بساط کے مطابق عشق کی روح اور قوت کو سراہتا ہوں اور ہمیشہ سراہتا رہوں گا۔

"میرے ان الفاظ کو فیڈرس خواہ تم عشق کی شان میں قصیدہ سمجھو یا جو چاہو سمجھو۔"

سقراط کی تقریر ختم ہوتے ہی حاضرین میں تعریف کا شور برپا ہوا۔ ارسٹوفنیس ان الفاظ کے جواب میں جن میں سقراط نے اس خطبے کی طرف اشارہ کیا تھا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ یکایک بڑے زور زور سے دروازہ دھم دھمایا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مستوں کی ٹولی ہو اور ایک بانسری بجانے والی کی آواز بھی آئی۔ اگاتھن نے نوکروں سے کہا جا کر دیکھو یہ دخل در معقولات کرنے والے کون ہیں؟ اگر ہمارے دوست ہوں تو اندر بلا لو ورنہ کہہ دو کہ مے نوشی کا دور ختم ہو چکا"۔ تھوڑی دیر کے بعد الکبیاڈیس کی آواز صحن میں گونجتی ہوئی سنائی دی" اگاتھن کہاں ہے، مجھے اگاتھن کے پاس لے چلو"۔ آخر بانسری والی اور اپنے نوکروں کے سہارے سے وہ ان لوگوں کے پاس پہنچا۔ عشق پیچہ اور بنفشے کے پھولوں کا ایک بھاری مکٹ سجائے سر پر فیتے لہراتا، وہ دروازے میں نظر آیا اور کہنے لگا" کیا تم ایک بدمست کو بادہ نوشی کے دور میں شریک کرو گے؟ یا میں اگاتھن کے سر پر مکٹ رکھ کر جس کے لیے میں آیا تھا واپس چلا جاؤں؟ کل میں نہیں آسکا اس لیے آج سر پہ یہ فیتے لیے ہوئے آیا ہوں تاکہ انھیں اپنے سر سے اتار کر سب سے حسین اور دانش مند انسان کے سر پر سجا دوں۔ اجازت ہے کہ میں اسے اس لقب سے پکاروں؟ کیا تم مجھ پر ہنس رہے ہو اس لیے کہ میں نشے میں ہوں؟ خیر مجھے یقین ہے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں چاہے تم کتنا ہی ہنسو؟ مگر پہلے یہ تو کہو کہ اگر میں اندر آجاؤں تو میری وہ شرط پوری کرو گے؟ بتاؤ میرے ساتھ شراب

پیوگے یا نہیں؟"

حاضرین میں ایک شور برپا ہو گیا اور ہر شخص درخواست کرنے لگا کہ آکر ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ خصوصاً اگاتھن نے خاص طور پر اصرار کیا۔ اس پر وہ اپنے ساتھیوں کے سہارے اندر داخل ہوا اور اسی حالت میں اگاتھن کے سر پر مکٹ رکھنے کے ارادے سے اس نے اسے اپنے سر سے اتار کر اور ہاتھوں پر اٹھا کر آنکھوں کے آگے کر لیا۔ اس طرح وہ سقراط کو نہیں دیکھ پایا۔ سقراط اسے جگہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹا اور الکبیاڈیس نے اگاتھن اور سقراط کے بیچ میں بیٹھ کر اگاتھن کو گلے لگایا اور مکٹ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اگاتھن نے نوکر سے کہا ان کے پانو سے چپل اتار لو تاکہ یہ آرام سے ہم دونوں کے ساتھ اس کوچ پر بیٹھ سکیں۔

"ضرور۔ مگر ہماری صحبت میں یہ تیسرا ساتھی کون ہے؟" اس نے مڑ کر کہا اور سقراط کو دیکھ کر چونک پڑا۔" ارے ہراقلیس کی قسم یہ کیا؟ یہ تو سقراط ہے جو ہمیشہ میری گھات میں رہا کرتا ہے اور ایسی ایسی جگہوں سے نکل پڑتا ہے جہاں اس کے ہونے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ کہو اب کیا کہتے ہو اور یہاں کیوں لیٹے ہوئے ہو؟ میں دیکھتا ہوں تم نے ایسی ترکیب کی کہ مسخرے ارسٹوفنیس کے پاس نہیں بلکہ اس شخص کے پہلو میں جگہ پائی جو اس صحبت میں سب سے حسین ہے۔"

سقراط نے اگاتھن سے مخاطب ہو کر کہا" اگاتھن خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ اس شخص کا جذبۂ رشک تو میرے لیے مصیبت ہو گیا ہے۔ جب سے میں اس پر عاشق ہوا مجھے کسی اور حسین سے بات کرنے کی بلکہ اس کی طرف دیکھنے تک کی اجازت نہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو وہ رشک و رقابت کے مارے آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور یہی نہیں کہ مجھے برا بھلا کہتا ہو بلکہ مجھ پر ہاتھ اٹھانے تک کو تیار ہو جاتا ہے اس وقت بھی مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کے ہاتھ سے نقصان نہ پہنچ جائے۔ ذرا ادھر توجہ کر د

اور یا تو میری اس کی صلح کرادو یا اگر وہ ہاتھا پائی پر آمادہ ہو تو مجھے بچا لو مجھے تو اس کی مجنونانہ حرکتوں سے ڈر لگتا ہے۔"

الکبیاڈیس بولا "صلح تو مجھ میں اور تم میں کبھی نہیں ہو سکتی مگر اس وقت میں تمہیں سزا دینا ملتوی کیے دیتا ہوں۔ اگاتھن مہربانی کر کے مجھے چند فیتے واپس کر دو تاکہ میں اس عالمگیر مستبد کے عجیب و غریب سر پر مکٹ سجا دوں۔ میں نہیں چاہتا وہ اس بات کی شکایت کرے کہ میں نے تمہارے سر پر مکٹ رکھا اور اسے نظر انداز کر دیا جو گفتگو میں ساری دنیا کا فاتح ہے۔ تم نے پرسوں ایک ہی بار ایک مقابلے میں میدان جیتا مگر وہ ہمیشہ جیتتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فیتے لیے اور سقراط کے سر پر مکٹ رکھ کر پھر کوچ کے سہارے لیٹ گیا۔

اس کے بعد اس نے کہا "دوستو تم تو ہوش میں معلوم ہوتے ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تمہیں پینا پڑے گا کیونکہ میں اسی شرط پر اندر آیا تھا۔ میں خود اس محفل میں پیر مغاں بنتا ہوں یہاں تک کہ تم سب مدہوش ہو جاؤ۔ اگاتھن ایک بڑا سا پیالہ منگاؤ۔ بلکہ دیکھو بھئی" اس نے نوکر سے مخاطب ہو کر کہا" وہ شراب کو ٹھنڈا کرنے کا برتن اٹھا دو۔" یہ برتن جس پر اس کی نظر پڑ گئی کوئی آدھے گیلن کی سمائی کا ہوگا۔ وہ اسے بھر کر چڑھا گیا اور اس کے بعد نوکر سے کہا کہ سقراط کے لیے بھر لائے۔ "آپ لوگ دیکھیے گا کہ میری اس ترکیب کا سقراط پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اسے جتنی شراب پلائیے پی لے گا مگر نشہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔ سقراط اس ظرف کو جو نوکر بھر کر لایا تھا پی گیا۔

اریکسیمکس نے پوچھا " الکبیاڈیس یہ کیا معاملہ ہے۔ کیا شراب کے دور کے ساتھ قیل و قال اور نغمہ و سرود کچھ نہیں ہوگا اور ہم پیاسوں کی طرح صرف پیتے ہی رہیں گے؟"

الکبیاڈیس بولا "مرحبا اے لائق اور دانش مند باپ کے لائق بیٹے!"

"تم پر بھی مرحبا۔ مگر یہ تو بتاؤ ہم کیا کریں؟"

"یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔

طبیب حاذق، ہمارے زخموں پر مرہم رکھنے والا

جو ہدایت کرے گا ہم اس پر عمل کریں گے۔ تم کیا چاہتے ہو؟ بھئی بات یہ ہے کہ تمھارے آنے سے پہلے ہم نے یہ تجویز منظور کی تھی کہ ہم میں سے ہر شخص باری باری سے عشق کی تعریف میں تقریر کرے جتنی اچھی اس سے ہو سکے۔ سلسلہ بائیں طرف سے داہنی طرف چل رہا تھا اور ہم سب بول چکے تھے۔ تم نے تقریر نہیں کی بلکہ شراب پینے میں لگ گئے۔ اب تم تقریر کرو اس کے بعد تمھیں اختیار ہے کہ جو کہ تم چاہو سقراط پر لگاؤ اور وہ اپنے سیدھے ہاتھ والے پر وقس علیٰ ہذا۔"

"بہت خوب اریکسیمکس، لیکن ایک مست کی تقریر کا مقابلہ ہوشیاروں کی تقریروں سے کرنا انصاف کی بات نہیں۔ اور یہ تو بتاؤ کہ تم ان باتوں کو جو سقراط ابھی کہہ رہا تھا سچ سمجھتے ہو؟ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے اور اگر میں اُن حضرت کے سامنے خود ان کے سوا کسی کی بھی خواہ وہ انسان ہو یا خدا، تعریف کروں تو مجھے مار ہی بیٹھیں گے۔"

سقراط نے کہا "ارے خدا سے شرم کرو۔"

الکیبیاڈیس بولا "بس چپ رہو۔ قسم ہے پوسائڈن کی جس صحبت میں تم موجود ہو میں تمھارے سوا کسی کی تعریف نہیں کروں گا۔"

اریکسیمکس نے کہا "اچھا تمھارا جی چاہے تو سقراط ہی کی تعریف کرو!"

الکیبیاڈیس بولا "تمھاری کیا رائے ہے اریکسیمکس اس کی خبر لوں اور تم سب کے سامنے سزا دوں؟"

سقراط کہنے لگا "آخر تمھارا ارادہ کیا ہے؟ کیا سب کو مجھ پر ہنسواؤ گے؟

تعریف سے تمھارا یہی مطلب ہی؟"

"سچی بات کہوں گا اگر تمھاری اجازت ہو۔"

"میری طرف سے صرف اجازت ہی نہیں بلکہ اصرار ہی کہ تم سچی بات کہو"

"اچھا تو میں فوراً شروع کیے دیتا ہوں۔ اگر میں کوئی ایسی بات کہوں جو سچی نہ ہو تو تم فوراً پکار اٹھنا کہ یہ جھوٹ ہی۔ اگرچہ میری نیت یہی ہی کہ سچ بولوں گا لیکن اس پر تعجب نہ کرنا کہ میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جو کچھ سمجھ میں آئے گا کہتا چلا جاؤں گا۔ تمھاری انوکھی باتوں کو روانی اور سلیقے سے بیان کرنا اس شخص کے لیے جس کی میری سی حالت ہو سہل نہیں ہی۔

"لو سنو، یارو۔ میں سقراط کی تعریف میں ایک تشبیہ استعمال کروں گا جسے وہ شاید پھبتی سمجھے گا۔ لیکن میں اس کی ہنسی اڑانے کے لیے نہیں بلکہ سچ جان کر کہتا ہوں۔ میرا کہنا یہ ہی کہ وہ بالکل سائلینس کے نیم قدبت کی طرح ہی جو منہ میں شہنائی اور بانسری لیے مجسمہ فروشوں کی دکان پر رکھا رہتا ہی۔ وہ بیچ میں سے کھلتا ہی اور اس کے اندر دیوتاؤں کی مورتیں بھری ہوتی ہیں۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ وہ ساطیر مارسیاس سے مشابہ ہی۔ تم خود اس سے انکار نہیں کر سکتے، سقراط کہ تمھارا چہرہ ساطیر سے ملتا ہی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی باتوں میں مشابہت ہی۔ مثلاً تم مردم آزار ہو اور اس کے میں گواہ پیش کر سکتا ہوں اگر تم اعتراف نہیں کرتے۔ اور تم بانسری بجاتے ہو یا نہیں؟ یقیناً بجاتے ہو؟ اور وہ بھی اتنی اچھی طرح کہ مارسیاس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ سچ ہی کہ وہ اپنی بانسری سے، اپنی سانس کی تاثیر سے، انسانوں کی روحوں کو مسحور کر لیتا تھا اور اس کے نغموں کے بجانے والے اب بھی کر لیتے ہیں اس لیے کہ اولمپس کے نغمے مارسیاس سے ماخوذ اور اسی کے سکھائے ہوئے ہیں اور انھیں خواہ کوئی استاد بجائے یا ایک معمولی سی بانسری والی، وہ اثر ہوتا ہی جو

اور کسی نغمے بس نہیں ہوتا۔ صرف یہی ہیں جو روح پر چھا جاتے ہیں اور ان لوگوں کی کوتاہیوں کو ظاہر کر دیتے ہیں جنھیں دیوتاؤں سے اور مذہبی رسوم سے سروکار ہی اس لیے کہ ان میں ریاست کی شان ہی۔ لیکن تم وہی اثر اپنے الفاظ سے پیدا کر دیتے ہو۔ تمھیں بانسری کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ فرق ہی تم میں اور اس میں۔ جب ہم کسی اور کی تقریر سنتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی اچھا مقرر ہو تو ہم پر مطلق اثر نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہی حالانکہ تمھارے متفرق فقرے اور الفاظ بھی خواہ وہ دوسرے کی زبانی ہوں اور وہ انھیں کتنے ہی ناقص طریقے سے دہرائے۔ ہر مرد عورت اور بچے کو جو انھیں سنتا ہی حیرت میں ڈال دیتے ہیں اور اس کے دل کو موہ لیتے ہیں۔ اور اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم لوگ مجھے بالکل مدہوش سمجھو گے تو میں قسم کھا کر بیان کرتا کہ ان کا مجھ پر کیا اثر ہوتا تھا اور ہوتا ہی جب میں انھیں سنتا ہوں تو میرا دل سینے میں اس طرح اچھلتا ہی کہ سبیل دیوی کے کتھک کو مات کر دیتا ہی اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہی اور میں دیکھتا ہوں کہ اور بہت سے لوگ بھی میری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ میں نے پیریکلیس اور دوسرے زبردست خطیبوں کو سنا ہی اور مجھے ان کی تقریر پسند آئی لیکن اس طرح کا احساس کبھی نہیں ہوا۔ وہ میری روح میں یہ جوش پیدا نہیں کر سکے اور نہ کبھی مجھے اپنی غلامی کی حالت پر یہ طیش آیا لیکن اس مارسیاس نے اکثر میری یہ حالت کر دی کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اپنی موجودہ زندگی کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا (یہ تو سقراط تم ضرور تسلیم کرو گے) اور میں جانتا ہوں کہ اگر میں اس کی باتوں کی طرف سے کان نہ بند کر لوں اور اس کی آواز سے اس طرح دور نہ بھاگوں گو یا وہ سائرن کی آواز ہی تو میرا بھی وہی انجام ہو گا جو اوروں کا ہوا

کرا لیتا ہے کہ میرا اس طرح زندگی گزارنا ٹھیک نہیں کہ اپنی روح کی ضرورتوں سے غافل ہوں اور سارے ایتھنس کے جھگڑے نبٹاتا پھرتا ہوں۔ اس لیے اپنے کانوں میں انگلی دے لیتا ہوں اور اس سے رخصت ہو جاتا ہوں۔ اور عمر بھر میں یہی ایک شخص ملا ہے جس نے مجھے شرمندہ کر دیا حالانکہ تم جانتے ہو یہ چیز میری فطرت میں نہیں اور کوئی دوسرا کبھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس کی دلیلوں کا جواب نہیں دے سکتا اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس کی ہدایتوں پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن جب اس کے سامنے سے ہٹتا ہوں تو ہر دلعزیزی کا شوق غالب آ جاتا ہے۔ اس لیے میں اس سے بھاگتا ہوں اور اسے دیکھ کر تو مجھے ان باتوں کے خیال سے شرم آتی ہے جن کا میں اس کے سامنے اعتراف کر چکا ہوں۔ اکثر سوچتا ہوں کہ کاش یہ مر جائے لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر وہ مر گیا تو مجھے خوشی نہیں بلکہ رنج ہوگا۔ غرض عقل گم ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

"یہ ہے وہ بیداد جو مجھ پر اور بہت سے دوسرے لوگوں پر اس ساطیر کی نے نوازی سے گزری۔ مگر سنو میں پھر ایک بار ثابت کر دوں کہ یہ تشبیہ کس قدر صحیح ہے اور اس شخص میں کتنی حیرت انگیز قوت ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ تم میں سے کوئی اسے نہیں جانتا مگر میں تمھیں اس کی شخصیت سے آگاہ کر دوں گا۔ جب ایک بات چھیڑی ہے تو پھر کہہ ڈالنی چاہیے۔ تم دیکھتے کہ وہ حسینوں پر کس قدر مائل ہے؟ جب دیکھو ان کی صحبت میں موجود، ان کی محبت میں مبتلا اور جو پوچھو تو کچھ جانتا ہی نہیں کسی بات کی خبر ہی نہیں — یہ طرز ہے جو اس نے اختیار کر رکھا ہے کیا اس بات میں وہ سائلینس سے مشابہ نہیں؟ یقیناً ہے، اس کا ظاہری روپ سائلینس کے ترشے ہوئے سر کا سا ہے لیکن اے یارانِ بزم، کھول کر دیکھو تو ضبط و عفت کا حیرت انگیز خزانہ ہے۔ تم جانتے ہو کہ حسن اور دولت اور عزت جن پر عوام مٹے ہوئے ہیں اس کے نزدیک

کوئی اہمیت نہیں رکھتیں اور اس کی نظروں میں بالکل حقیر ہیں ۔جن لوگوں کو یہ چیزیں عطا ہوئی ہیں انھیں وہ خاطر میں نہیں لاتا۔ انسانوں سے اسے کوئی لگاؤ نہیں ۔ اس کی ساری عمر ان کو بنانے اور ان کی ہنسی اڑانے میں گزری ہے لیکن جب میں نے اسے کھولا اور اس کے سنجیدہ مقصد کو دیکھا تو مجھے حسنِ سیرت کے وہ ربانی جلوے نظر آئے کہ میں دم بھر میں سقراط کا ہر حکم ماننے پر تیار ہوگیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ سچ مچ میرے حسن کا شیدا ہے اس لیے مجھے ان اسرار کے سننے کا بہت اچھا موقع ملے گا جن کا وہ محرم ہے ۔مجھے اپنے حسن و شباب کی کشش پر بڑا ناز تھا۔ اس منصوبے کو پورا کرنے کے لیے جب میں اگلی دفعہ اس سے ملنے گیا میں نے نوکر کو جو میرے ساتھ رہا کرتا تھا رخصت کر دیا (میں سارا واقعہ سچ سچ بیان کرتا ہوں اور تم لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ غور سے سنو ۔ اگر میں کوئی بات غلط کہوں تو سقراط، تم اسے جھٹلا دینا) اب میں اور وہ اکیلے رہ گئے اور میں سمجھا کہ اس وقت جب کوئی اور موجود نہیں ہے وہ مجھ سے اس طرح باتیں کرے گا جیسے عاشق و معشوق کرتے ہیں اور اس خیال سے اپنے دل میں بہت خوش ہوا۔ لیکن ان باتوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے معمولی طریقے سے گفتگو کی ۔ سارے دن میرے ساتھ رہا اور پھر رخصت ہوگیا اس کے بعد میں نے اسے ورزش گاہ میں کشتی کا چیلنج دیا اور کئی بار تنہائی میں گتھم گتھا ہوئی میں سمجھتا تھا کہ اس طرح مقصد حاصل ہو جائے گا ۔ مگر توبہ کیجیے اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ آخر کار یہ دیکھ کر کہ میں اب تک ناکام رہا میں نے سوچا اب زیادہ سخت تدبیریں اختیار کروں اور دلیری سے حملہ کر دوں ۔جب قدم اٹھا لیا تو رکنا نہیں چاہیے بلکہ صاف صاف معلوم کر لینا چاہیے کہ میرے اور اس کے کیا تعلقات ہیں۔ اس لیے میں نے اسے رات کے کھانے پر بلایا گویا وہ ایک حسین نوجوان تھا اور میں پرکار عاشق ۔ اسے راضی کرنے میں بڑی مشکلیں پیش آئیں۔ بہرحال ایک

مدت کے بعد خدا خدا کر کے اس نے دعوت قبول کی۔ پہلی بار وہ کھانا کھاتے ہی جانے کو تیار ہو گیا اور میری ہمت نہ پڑی کہ اس کو روکوں۔ دوسری بار اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لیے مَیں نے کھانے کے بعد بڑی رات گئے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا اور جب اس نے رخصت ہونا چاہا تو یہ حیلہ کیا کہ اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ تم یہیں رہ جاؤ تو اچھا ہے۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ اس کوچ پر لیٹ گیا جس پر ہم نے کھانا کھایا تھا اور ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی نہیں سویا۔ یہاں تک جو کچھ تھا اس کا بیان کرنا کسی کے لیے شرمناک نہیں۔ لیکن جو اس کے بعد ہوا وہ میں تمھیں کبھی نہ بتاتا اگر اپنے ہوش میں ہوتا۔ لیکن مَثَل ہے کہ بالے اور متوالے سچ بولتے ہیں اس لیے کہے ڈالتا ہوں۔ پھر یہ کہ جب میں سقراط کی تعریف کرنے پر آیا ہوں تو اس کے بلند کارناموں کو چھپانا نہیں چاہیے۔ اس کے علاوہ مَیں ایک سانپ کا ڈسا ہوا ہوں اور لوگ کہتے ہیں کہ انسان اپنا دکھڑا انھیں کو سناتا ہے جو اس کی طرح مصیبت زدہ ہوں اس لیے کہ وہی اس کی بات سمجھ سکتے ہیں اور جو کچھ ...... بے چین ہو کر کہہ ڈالے یا کر گزرے اس کی زیادہ سختی سے گرفت نہیں کرتے۔ مجھے جس سانپ نے ڈسا ہے وہ افعی سے زیادہ زہریلا ہے۔ مَیں نے اپنی روح میں اپنے قلب میں اور دوسرے اعضا میں اس درد کی ٹیس محسوس کی ہے جو سمجھ دار نوجوانوں کے لیے سانپ کے زہر سے کہیں زیادہ سخت ہے یعنی طلبِ حکمت کا درد جس کی وجہ سے انسان سب کچھ کہنے اور کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور تم جنھیں میں اپنے آس پاس دیکھتا ہوں، فیڈرس اور اگاتھن اور اریکسیمیکس اور پانیاس اور ارسٹوڈیمس اور ارسٹوفینیس تم سب نے، اور یہ تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ خود سقراط نے بھی، طلبِ حکمت کے اس جوش اور جنون کا تجربہ کیا ہے۔ اس لیے غور سے سنو اور جو کچھ مَیں نے اس وقت کیا تھا اور اب کہہ رہا ہوں اس سے درگزر کرو۔ لیکن نوکر اور

دوسرے غیر محرم اور بے تمیز اشخاص اپنے کان بند کر لیں ۔

جب چراغ گل ہو گیا اور نوکر چلا گیا تو میں نے سوچا کہ اب اس سے صاف صاف بات کروں لگی لپٹی نہ رکھوں ۔ چنانچہ میں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا "سقراط سو گئے ؟" اس نے کہا "نہیں ۔" "جانتے ہو میں اس وقت کس فکر میں ہوں ؟" "بتاؤ کس فکر میں ہو" "میں سوچ رہا ہوں کہ اب تک مجھے جتنے عاشق ملے ان سب میں ایک تم ہی میرے لائق ہو اور تمھارا یہ حال ہے کہ حجاب سے زبان نہیں کھولتے ، میں محسوس کرتا ہوں کہ سخت حماقت ہوگی اگر میں تم سے اس بات میں بلکہ کسی بات میں بھی انکار کروں لہٰذا جو کچھ میرے اور میرے دوستوں کے پاس ہے وہ تمھارے قدموں میں ڈالتا ہوں اس امید پر کہ تم مجھے نیکی کی راہ دکھاؤ گے جس پر چلنے کی مجھے دل سے آرزو ہے اور جس میں تم اور سب سے بہتر میری رہنمائی کر سکتے ہو ۔ مجھے اس خیال سے کہ دانش مند کیا کہیں گے اگر میں نے تم سے انکار کر دیا زیادہ شرم آتی ہے بہ نسبت اس کے کہ دنیا جس میں اکثر احمق ہیں ، کیا کہے گی اگر میں نے تمھاری مراد پوری کر دی ۔" ان الفاظ کا جواب اس نے اس طنز کے ساتھ دیا جو اس کا مخصوص انداز ہے ۔ "میرے دوست الکیبیاڈیس ، اگر تمھارا کہنا سچ ہے اور واقعی مجھ میں کوئی ایسی قوت ہے جس سے تمھارے اخلاق پر اچھا اثر پڑ سکے تو تمھارا یہ مقصد نہایت بلند ہے ۔ یقیناً تمھیں میرے اندر کوئی انوکھا اور اس سے بہت برتر حسن نظر آتا ہوگا جو مجھے تمھارے اندر نظر آتا ہے ۔ اس لیے اگر میرے شریک بن کر اپنے حسن سے میرا حسن بدلنا چاہتے ہو تو تم بڑے فائدے میں رہو گے ۔ تمھیں نمائشی حسن کے بدلے حقیقی حسن ہاتھ آ جائے گا —— جس طرح ڈیومیڈ کو پیتل کے بدلے سونا مل گیا ۔ مگر پیارے دوست ، اچھی طرح غور کر لو کہ کہیں تمھیں میرے بارے میں دھوکا تو نہیں ہوا ۔ بصیرت اور تنقید کی قوت ذہن میں اس وقت

پیدا ہوتی ہے جب بصارت جواب دینے لگتی ہے اور ابھی تمھارے بوڑھے ہونے میں بہت دن باقی ہیں۔ یہ سن کر میں نے کہا 'میں نے تمھیں اپنا مقصد بتا دیا اور وہ بالکل سنجیدہ ہے۔ اب تم سوچو کہ میرے لیے اور تمھارے لیے سب سے بہتر کیا ہے؟' اس نے کہا 'اچھی بات ہے۔ کسی اور وقت ہم سوچیں گے کہ اس امر میں اور دوسرے امور میں سب سے بہتر کیا ہے اور اس پر عمل بھی کریں گے۔' اس سے میں سمجھا کہ اب اس پر اثر ہو گیا اور ان لفظوں نے جو تیر کی طرح میری زبان سے نکلے تھے اسے گھایل کر دیا۔ اس لیے قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہے میں اٹھا اور اپنا کوٹ اس پر ڈال کر اس کے پرانے گھسے ہوئے جبّے میں گھس گیا کیونکہ جاڑوں کا زمانہ تھا اور یونہی ساری رات اس عجیب الخلقت جانور کو آغوش میں لیے لیٹا رہا۔ اس بات سے بھی سقراط تم انکار نہیں کر سکتے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود اس نے میری التجاؤں سے بے نیازی برتی، میرے حسن کی، جو میرے خیال میں دلکشی سے خالی نہ تھا سخت تحقیر، ذلت اور اہانت کی۔ سنو اے منصفو! اس لیے کہ تمھیں سقراط کی پرغرور عفت کی تصدیق کرنی پڑے گی۔ اس رات اور کچھ نہیں ہوا بلکہ صبح کو (سب دیوتا اور دیویاں اس کی گواہ ہیں) میں کوچ سے اس طرح اٹھا جیسے اپنے باپ یا بڑے بھائی کے پہلو سے۔

"تم سمجھ سکتے ہو اپنی درخواست کے اس طرح رد ہو جانے کے بعد مجھے کس قدر ذلت محسوس ہوئی ہو گی؟ پھر بھی میں اس کی قدرتی عفت اور ضبط مردانگی پر عش عش کرتا تھا۔ میں نے کبھی اپنی عمر میں اس قدر دانش مند اور متحمل آدمی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے نہ مجھے اس پر غصہ آیا اور نہ میں نے اس کی صحبت ترک کی اگرچہ اس کی کوئی امید نہیں رہی کہ میں اس کے دل کو لبھا سکوں گا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جب اجاکس پر فولاد اثر نہیں کرتا تھا تو سقراط پر دولت کیا اثر کرے گی۔ میرے

لیے صرف یہی ایک صورت تھی کہ اپنی خوب صورتی کے جادو سے اسے رام کروں اور وہ بھی ناکام ثابت ہوئی۔ ان لیے میں حیران تھا کہ اب کیا کروں کوئی شخص میری طرح کسی کی محبت میں بے بس نہ ہوا ہوگا۔ یہ واقعات اس سے پہلے کے ہیں جب میں اور وہ پوٹیڈایا کی مہم پر روانہ ہوئے تھے۔ وہاں ہم دونوں ساتھ کھانا کھاتے تھے اور مجھے یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ وہ جفاکشی کی کتنی غیر معمولی قوت رکھتا ہے۔ خصوصاً اس وقت اس کی قوت برداشت کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی جب ہمیں رسد بند ہو جانے کی وجہ سے فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ ایسے موقعوں پر، جو لڑائی میں اکثر پیش آتے ہیں، وہ مجھی سے نہیں بلکہ سب سے بڑھ جاتا تھا۔ کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ تیوہاروں میں صرف وہی تھا جو سچ مچ خوشی سے منا سکتا تھا۔ اگرچہ اسے شراب پینے سے رغبت نہ تھی مگر موقع آن پڑے تو ہم سب کو مات کر دیتا تھا۔ کیسی عجیب و غریب بات ہے! کسی شخص نے آج تک سقراط کو نشے میں نہیں دیکھا۔ اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو اس کے ظرف کا ابھی امتحان ہو جائے گا۔ سردی کو برداشت کرنے میں بھی اس کا استقلال حیرت انگیز تھا۔ اس علاقے میں بڑا کڑا جاڑا ہوتا ہے۔ پالا زور شور سے پڑ رہا تھا۔ ہر شخص یا تو گھر میں بند رہتا تھا یا نکلتا بھی تھا تو ڈھیروں کپڑے لاد کر، موٹا سا جوتا پہن کر اور پیروں میں نمدہ اور بھیڑ کی کھال لپیٹ کر۔ اس فضا میں سقراط معمولی کپڑے پہنے، ننگے پانو برف پر رکھتا ہوا دوسرے سپاہیوں سے، جن کے پیروں میں جوتے تھے، بہتر مارچ کرتا تھا اور وہ لوگ اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کو حقیر سمجھتا ہے۔

"ایک واقعہ تو، میں تمہیں سنا چکا اب ایک اور بیان کروں گا۔ یہ قصہ بھی سننے کے قابل ہے۔

'اس مرد جفاکش کے آلام و مصائب کا'

اسی مہم کے دوران میں ایک دن وہ کسی مسئلے پر غور کر رہا تھا جو اس سے حل نہیں ہوتا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری بلکہ صبح تڑکے سے دوپہر تک سوچتا رہا۔ اپنے خیال میں ڈوبا بُت بنا کھڑا تھا۔ دوپہر کو لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوئی اور یہ خبر پھیل گئی جسے سن کر لوگ حیرت میں تھے کہ سقراط سویرے سے کھڑا کوئی بات سوچ رہا ہے۔ آخر شام کو کھانے کے بعد کچھ آیونیوں نے تجسس کے شوق میں (میں بتا دوں کہ یہ ذکر جاڑے کا نہیں بلکہ گرمی کا ہے) اپنی چٹائیاں باہر نکال لیں اور زیر آسمان سوئے تاکہ سقراط پر نظر رکھیں اور یہ دیکھیں کہ آیا وہ رات بھر کھڑا رہے گا۔ اگلی صبح تک وہ اسی جگہ کھڑا رہا اور جب اجالا ہوا تو سورج کے آگے پرارتھنا کر کے چل دیا۔ اجازت ہو تو میدان جنگ میں اس کی شجاعت کا بھی ذکر کر دوں۔ بلکہ یہ تو میرا فرض ہے کیونکہ اسی نے میری جان بچائی۔ یہی وہ لڑائی تھی جس میں مَیں نے بہادری کا انعام پایا اس لیے کہ جب میں زخمی ہو گیا تو اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا اور مجھے ہتھیار سمیت بچا کر نکال لایا۔ اصل میں بہادری کا انعام اسے ملنا چاہیے تھا خود فوج کے جنرل کسی حد تک میرے مرتبے اور منصب کی بنا پر، مجھے دینا چاہتے تھے۔ اور مَیں نے ان سے کہا بھی (اسے بھی سقراط نہیں جھٹلا سکتا)، لیکن سقراط کو ان جنرلوں سے بھی زیادہ اصرار تھا کہ انعام اُسے نہیں بلکہ مجھے دیا جائے۔ ایک اور موقع پر اس کا طرزِ عمل نہایت حیرت انگیز تھا جب کہ ڈیلیم کی لڑائی کے بعد جس میں سقراط نے گراں پوش سپاہی کی حیثیت سے کام کیا تھا

ہماری فوج بھاگ رہی تھی۔ یہاں میں پوٹیڈایا کی بہ نسبت اسے زیادہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا اس لیے کہ میں گھوڑے پر سوار تھا اور مقابلۃً محفوظ تھا۔ وہ اور لاکس فوج کے ساتھ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ راستے میں مجھ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں نے ان سے کہا کہ تم نہ گھبرانا میں تمھارے ساتھ رہوں گا۔ ارسٹوفینس تم وہاں ہوتے تو دیکھتے کہ جیسے تم نے اپنے ناٹک میں ذکر کیا ہی بالکل اسی طرح جیسے ایتھنس کی گلیوں میں، وہ سارس کے سے قدم رکھتا ہوا آنکھیں پھیلائے دوستوں اور دشمنوں کو یکساں اطمینان کے ساتھ گھورتا چلا جاتا ہی اور لوگ دور سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو کوئی اس پر حملہ کرے اسے کڑا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اسی طرح وہ اور اس کے ساتھی صاف بچ کر نکل آئے کیونکہ اس قسم کے لوگوں کا لڑائی میں بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ پیچھا انھی لوگوں کا کیا جاتا ہی جو بے تحاشا بھاگتے ہیں۔ میں نے خاص طور پر دیکھا کہ سکون و اطمینان میں وہ لاکس سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ میں اور بہت سے عجیب وغریب واقعات سقراط کی تعریف میں سنا سکتا ہوں۔ ممکن ہی کہ اکثر باتوں میں کوئی دوسرا شخص اس کا ہمسر ہو لیکن نہایت حیرت کی بات ہی کہ مجموعی طور پر وہ موجودہ اور گزشتہ کل انسانوں سے قطعاً مختلف ہی۔ تم براسیڈاس وغیرہ کو اچیلیس کا اور نیسٹر اور اینٹنر کو پیریکلیس کا ثانی کہہ سکتے ہو اور یہی بات اور سب مشاہیر پر صادق آتی ہی لیکن ایسا شخص جو اس انوکھی ہستی سے خفیف سی بھی مشابہت رکھتا ہو نہ ہی اور نہ ہوا ہی —— قطع نظر اس مشابہت کے جو سائلینس اور ساطیروں سے پائی جاتی ہی اور جس کی طرف میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں۔ اس لیے کہ گو میں پہلے تم سے کہنا بھول گیا، اس کے الفاظ سائلینس کی مورتوں کی طرح ہیں جو بیچ سے کھل جاتی ہیں۔ اُنھیں پہلی بار سنو تو مضحک معلوم ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کو ایسی زبان کا لباس پہناتا ہی جو وحشی ساطیر کی کھال سے مشابہ ہی۔ کیونکہ جب دیکھیے وہ لدو گدھوں کا، لُہاروں کا،

چماروں کا، کھٹیکوں کا ذکر کیا کرتا ہی اور وہی باتیں انھیں الفاظ میں بار بار دہرایا کرتا ہی۔ کوئی ناواقف یا ناتجربہ کار آدمی سنے تو اسے بے اختیار ہنسی آجائے۔ لیکن جو شخص اس مورت کو کھول کر دیکھتا ہی کہ اس کے اندر کیا ہی اسے یہ نظر آتا ہی کہ یہ بڑے معنی خیز اور ربانی الفاظ ہیں، نیکی کے حسین تصورات سے مالا مال، اور ان کا مفہوم اتنا وسیع ہی کہ ایک نیک اور شریف آدمی کے کل فرائض پر حاوی ہی۔

"یہ ہی دوستو میرا قصیدہ سقراط کی شان میں۔ میں نے اپنے ساتھ اس کی بدسلوکی کی شکایت بھی کر دی ہی۔ اس قسم کی بدسلوکی اس نے صرف مجھی سے نہیں بلکہ گلاکن کے بیٹے چارمڈیس، ڈایوکلیس کے بیٹے یوتھیڈیمس اور بہت سے دوسرے لوگوں سے بھی کی ہی۔ شروع میں تو ان کا عاشق بنا لیکن آخر میں انھیں اپنا عاشق بنا کے چھوڑا۔ اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں، اگاتھن اس کے دھوکے میں نہ آؤ اور مجھ کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو۔ مثل ہی احمق نہ بنو، تجربے سے سبق لو۔"

جب الکیبیاڈیس کی تقریر ختم ہوئی تو لوگ اس کی صاف گوئی پر ہنسنے لگے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے اب تک سقراط سے محبت ہی۔ سقراط نے کہا "الکیبیاڈیس تم بالکل ہوش میں ہو ورنہ اپنی اس اساطیر کی تعریف کا اصل مقصد چھپانے میں اس قدر اہتمام نہ کرتے۔ تمھاری یہ ساری رام کہانی محض ہیر پھیر ہی اصل بات وہ ہی جو تم نے ضمنی طور پر آخر میں کہی تم مجھ میں اور اگاتھن میں لڑائی کرانا چاہتے ہو۔ تمھارا خیال یہ ہی کہ صرف تم ہی کو اگاتھن سے محبت کرنے کا حق ہی مگر اس ساطیری یا سائلینس ناٹک کا سارا پلاٹ کھل گیا۔ اگاتھن تم اس کی یہ کوشش نہ چلنے دو کہ ہم دونوں میں پھوٹ پڑ جائے۔"

اگاتھن نے کہا "میں سمجھتا ہوں تمھارا خیال صحیح ہی اور مجھے تو یہ شبہہ ہی کہ وہ میرے اور تمھارے بیچ میں اسی نیت سے آکر بیٹھا کہ ہم دونوں میں فصل پیدا کر دے لیکن اس چال سے اسے کچھ فائدہ نہیں ہوگا اور میں کوچ پر تمھارے پاس آکر بیٹھ جاؤں گا۔"

الکیبیاڈیس بولا "افسوس یہ شخص مجھے کیسا بے وقوف بناتا ہی اس نے ٹھان لی ہی کہ ہر قدم پر مجھے شکست دے گا۔ خدا کے لیے اگاتھن کو یہیں ہم دونوں کے بیچ میں رہنے دو۔"

سقراط نے کہا "ہرگز نہیں چونکہ تم نے میری تعریف کی ہے اور مجھے اپنی باری پر اپنے سیدھے ہاتھ والے کی تعریف کرنا ہے لہٰذا یہ بے قاعدہ بات ہوگی کہ وہ دوبارہ میری تعریف کرے"

اگاتھن پکار اٹھا "اہا ہا! اب تو میں فوراً اٹھتا ہوں تاکہ سقراط میری تعریف کرے"۔

الکبیاڈیس نے کہا "یہ تو ہونا ہی ہے۔ جہاں سقراط موجود ہو وہاں اور کسی کو حسینوں سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکتا اور دیکھنا کس طرح اس نے فوراً اگاتھن کو اپنے پاس بلانے کا حیلہ سوچ لیا جو بظاہر بالکل معقول معلوم ہوتا ہے"۔

اگاتھن اٹھا کہ کوچ پر سقراط کے قریب بیٹھ جائے۔ یکایک مستوں کی ایک ٹولی اندر گھس آئی اور اس نے ساری محفل درہم برہم کر دی۔ کسی نے جاتے ہوئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح یہ لوگ آ کر مزے میں براجنے لگے۔ ایک گڑبڑ مچ گئی۔ اور ہر شخص کو زبردستی بہت بہت سی شراب پینی پڑی۔ ارسٹوڈیمس کہتا ہے کہ اریکیمکس، فیڈرس وغیرہ چلے گئے تو خود اس کی آنکھ لگ گئی اور چونکہ راتیں لمبی تھیں خوب جی بھر کر سویا۔ صبح تڑکے مرغ کی بانگ سے اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بعض لوگ اب تک سو رہے تھے اور بعض جا چکے تھے۔ صرف سقراط، ارسٹوفینس اور اگاتھن باقی تھے اور ایک بڑے سے پیالے میں شراب کا دور چل رہا تھا اور سقراط تقریر کر رہا تھا۔ ارسٹوڈیمس پر غنودگی طاری تھی اور اس نے تقریر کا ابتدائی حصہ نہیں سنا۔ خاص بات جو اسے یاد رہ گئی یہ تھی کہ سقراط ان دونوں سے یہ منوانا چاہتا تھا کہ المیہ اور فرحیہ ناٹک کی روح ایک ہی ہوتی ہے اور جو المیہ لکھنے میں استاد ہو وہ فرحیہ میں بھی استاد ہوگا۔ انھیں یہ بات چار و ناچار ماننی پڑی اس حالت میں کہ دونوں اونگھ رہے تھے اور بحث کو اچھی طرح سمجھ بھی نہ سکتے تھے پہلے ارسٹوفینس نے لوٹ لگائی اور پھر دن نکلتے اگاتھن نے۔ سقراط ان دونوں کو سلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور ارسٹوڈیمس حسب معمول اس کے پیچھے پیچھے چلا لیسیم میں سقراط نے غسل کیا اور دن معمولی مشاغل میں گزرا۔ رات کو اس نے اپنے گھر آرام کیا۔